علم الاخلاق جلد دوم

(قرآن کی روشنی میں)

مؤلف

آیۃ اللہ العظمیٰ ناصر مکارم شیرازی

ترجمہ

ڈاکٹر سید نیاز محمد ہمدانی (پی ایچ۔ڈی)

ناشر

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور پاکستان

قرآن سینٹر 24 الفضل مارکیٹ اُردو بازار لاہور۔ 0321-4481214,042-37314311

علم الاخلاق جلد دوم

(قرآن کی روشنی میں)

مؤلف

آیۃ اللہ العظمیٰ ناصر مکارم شیرازی

ترجمہ

ڈاکٹر سید نیاز محمد ہمدانی (پی ایچ۔ڈی)

ناشر

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور پاکستان

قرآن سینٹر 24 الفضل مارکیٹ اُردو بازار لاہور۔ 0321-4481214,042-37314311

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں

نام کتاب۔۔۔

فہرست مضامین

عرضِ ناشر 13
اچھے اور بُرے اخلاق۔۔قرآن کی روشنی میں 14
تمہید 14
پہلا باب: تکبر اور استکبار 16
تفسیر 19
انسانی تاریخ کا سب سے بڑا المیہ:۔ 19
تکبر، احادیث کی روشنی میں 32
تکبر، عقل کی روشنی میں 34
1۔تکبر کی حقیقت اور تعریف:۔ 36
2۔تکبر کا شاخیں:۔ 36
3۔تکبر کس کے سامنے! 37
4۔تکبر کے محرکات:۔ 39
(1)۔علم 39
(2)۔عمل:۔ 40
(3)۔حسب ونسب:۔ 41
(4)۔حسن وجمال اور ظاہری خوبصورتی:۔ 42
(5)۔مال ودولت:۔ 43
(6)۔جسمانی، سیاسی اور معاشرتی قوت:۔ 43
(7)۔دوستوں اور مددگاروں کی کثرت:۔ 44
5۔تکبر کی جڑیں:۔ 44
6۔تکبر کی علامات:۔ 45
7۔تکبر اور استکبار کے نتائج:۔ 46

(1)۔کفر وشرک سے آلودگی:۔ 46
(2)۔علم ودانش سے محرومی:۔ 47
(3)۔تکبر بہت سے گناہوں کا اصل سبب ہے:۔ 47
(4)۔تکبر لوگوں کی نفرت کا سبب:۔ 48
(5)۔تکبر اور وسائلِ زندگی سے محرومی:۔ 49
(8)۔تکبر کا علاج:۔ 49
علمی طریقہ:۔ 49
عملی طریقہ:۔ 51
(9)۔علاج اور آزمائش:۔ 53
دوسرا باب: تواضع اور فروتنی 56
تواضع احادیث کی روشنی میں 59
تواضع کی تعریف: 62
تواضع اور انسانی احترام:۔ 63
تیسرا باب: حرص اور قناعت 64
تفسیر اور نتیجہ:۔ 66
حرص اور دنیا پرستی احادیث کی روشنی میں 74
حرص کی تعریف 77
انفرادی اور معاشرتی زندگی پر حرص کے اثرات 78
باطن کی بے نیازی 79
پسندیدہ اور ناپسندیدہ حرص 79
حرص کا علاج 81
ایک غلط فہمی کا ازالہ 83
چوتھا باب: حُبِّ دنیا 84
دُنیا پرستی احادیث کی روشنی میں 88

مطلوب دُنیا اور مذمُومِ دُنیا 91
پانچواں باب: حسد 95
تفسیر اور نتیجہ: 97
حسد، احادیث کی روشنی میں 105
چند اہم مسائل:۔ 107
1۔حسد کے معنی اور حسد ورشک میں فرق: 107
2۔حسد کے محرکات:۔ 108
3۔حسد کی علامات:۔ 111
4۔حسد کے منفی اثرات:۔ 112
5۔حسد کے درجات:۔ 115
6۔حسد کا علاج:۔ 116
7۔نُصح وخیر خواہی:۔ 119
چھٹا باب: غرور وخود بینی 121
1۔غرور کا مفہوم:۔ 122
غرور قرآن مجید کی روشنی میں 123
تفسیر اور نتیجہ:۔ 125
غرور کی مذمت احادیث میں 132
2۔غرور کے اسباب:۔ 133
3۔غرور کی نشانیاں:۔ 135
4۔فرد اور معاشرے پر غرور کے اثرات:۔ 136
5۔غرور کا علاج:۔ 138
ساتواں باب: طُولِ اَمل (لمبی آرزوئیں) 140
تفسیر اور نتیجہ 143
طولِ اَمل کے اسباب:۔ 143

طُولِ اَمل احادیث کی روشنی میں 148
طولِ امل کے نتائج:۔ 151
بہت سے گناہوں کا سبب:۔ 151
قساوتِ قلب کا سبب:۔ 152
آخرت فراموشی کا سبب:۔ 152
موجبِ زحمت ومشقت:۔ 153
ذِلت آمیز زندگی:۔ 154
نعمتوں سے محرومی:۔ 154
حقیقت سے دُوری کا سبب:۔ 154
کفرانِ نعمت:۔ 155
طُولِ اَمل کے اسباب ومحرکات 155
طُول اَمل کا علاج 157
مثبت اور تعمیری آرزوئیں:۔ 159
آٹھواں باب: تعصُّب اور ضد 162
تفسیر اور نتیجہ 165
گمراہ اقوام کی عمومی روِش:۔ 165
تعصب اور ھٹ دھرمی احادیث کی روشنی میں 172
تعصب کا مفہوم اور اس کے محرکات 174
1۔آباؤاجداد سے غیر معمولی محبت:۔ 175
2۔کوتاہ نظری:۔ 175
3۔شخصیت پرستی:۔ 175
4۔فکری اور معاشرتی گوشہ نشینی:۔ 176
تعصب اور لجاجت کے منفی اثرات 176
پسندیدہ اور ناپسندیدہ تعصب:۔ 178

مثبت تقلید اور اندھی تقلید:۔ 179
1۔ جاہل کا جاہل کی تقلید کرنا:۔ 180
2۔ عالم کا جاہل کی تقلید کرنا:۔ 180
3۔ عالم کا کسی اور عالم کی تقلید کرنا:۔ 180
4۔ جاہل کا عالم کی تقلید کرنا:۔ 180
راہِ علاج:۔ 181
حق کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنا:۔ 182
نواں باب: بُزدلی اور شجاعت 184
انبیائے الٰہی بزدل نہیں ہوتے:۔ 187
خوف اور بُزدلی احادیث کی روشنی میں 193
معقول خوف اور غیر معقول خوف 195
انفرادی اور قومی زندگی پر بزدلی کے منفی اثرات 196
بزدلی کے اسباب:۔ 197
علاج اور احتیاط 198
انسان کی زندگی پر شجاعت کے اثرات 200
دسواں باب: توکل 204
انبیاؑ کی زندگی میں توکل کا عکس:۔ 207
توکل احادیث کی روشنی میں 215
توکل کی حقیقت:۔ 218
توکل کے آثار و نتائج:۔ 222
توکل کے اسباب:۔ 224
توکل کے درجات:۔ 225
توکل تک پہنچنے کے راستے:۔ 226
گیارہواں باب: شہوت پرستی 228

شہوت پرستی احادیث کی روشنی میں 237
شہوت پرستی کے بارے میں امیر المومنین علیہ السلام کے ارشادات 238
شہوت پرستی کے نقصانات:۔ 240
گناہ سے آلودگی:۔ 241
عقل کی خرابی:۔ 242
معاشرتی حیثیت کا نقصان:۔ 242
نفس کی غلامی:۔ 243
رُسوائی اور بے عزتی:۔ 243
شہوت پرستی کے اسباب:۔ 244
1۔ایمان کی کمزوری:۔ 244
2۔معاشرتی حیثیت اور احترام کو نظر انداز کرنا:۔ 245
3۔غفلت اور بے خبری:۔ 245
4۔بری صحبت اور ناپاک ماحول:۔ 245
شہوت پرستی کا علاج 246
الف:علمی طریقہ:۔ 246
ب۔عملی طریقہ:۔ 248
شکم پرستی اور جنسی شہوت:۔ 250
بارھواں باب:عفّت:ایک عظیم اخلاقی فضیلت 253
آبرومند محتاج:۔ 255
عفت:مومن کی نمایاں صفت:۔ 259
عفت:فلاح کی کنجی:۔ 260
عفت احادیث کی روشنی میں 260
بے عفّتی کے سدِّ باب کے طریقے 263
1۔حجاب:۔ 263

2۔مخلوط محافل کی روک تھام:۔ 264
3۔ذرائع ابلاغ کا کردار:۔ 264
تیرھواں باب:غفلت و بے خبری 266
غفلت،احادیث کی روشنی میں 276
غفلت کے بارے میں اہم نکات 279
غفلت کے اسباب 279
الف۔جہالت:۔ 279
ب۔غروراورخود پسندی:۔ 280
ج۔نعمتوں کا نشہ:۔ 280
د۔جسمانی صحت:۔ 281
ھ۔لمبی آرزوئیں:۔ 281
غفلت کے نتائج 281
ا۔سنگدلی:۔ 281
ب۔دل کی موت:۔ 282
ج۔عقل کی خرابی:۔ 282
د۔اللہ سے دُوری:۔ 283
ھ۔ہلاکت:۔ 283
غفلت کی علامات 283
غفلت کا علاج 285
1۔تاریخ سے عبرت:۔ 285
2۔ہمیشہ اللہ کا ذکر کرنا:۔ 286
3۔قلبی توجہ کے ساتھ نماز پڑھنا:۔ 286
4۔غوروفکر:۔ 287
5۔ماحول کی تبدیلی:۔ 287

یقظہ اور بیداری 288
مثبت تغافل 291
تغافل، اقوالِ معصومینؑ کی روشنی میں 292
چودھواں باب: بُخل 294
بُخل احادیث کے آئینے میں 308
بخل کے نتائج:۔ 312
بخل کے درجات:۔ 314
بُخل کی روک تھام اور علاج 316
پندرھواں باب: جُود وسخاوت 318
سخاوت، احادیث کی روشنی میں 323
سخاوت کے آثار ونتائج 325
سخاوت کی حدود 327
سخاوت کی صفت کیسے حاصل کی جائے:۔ 327
سولھواں باب: عجلت اور جلد بازی 330
عجلت اور جلد بازی احادیث کی روشنی میں 341
1۔عجلت اور شتاب زدگی کا مفہوم:۔ 343
2۔نیکی میں سرعت 344
عجلت اور شتاب زدگی کے منفی اثرات 346
1۔وقت اور توانائی کا ضیاع:۔ 346
2۔یاس وناامیدی:۔ 347
3۔ندامت اور پشیمانی:۔ 347
4۔غم واندوہ:۔ 348
5۔اغلاط کی کثرت:۔ 348
عجلت کے اسباب 349

1۔نفس پرستی:۔ 349
2۔حُبِ دُنیا:۔ 349
3۔کم ظرفی:۔ 349
4۔جہالت اور نادانی:۔ 350
راہِ علاج 350
سترھواں باب 351
صبر وشکیبائی 351
1۔صبر براطاعت:۔ 351
2۔صبر برمعصیت:۔ 351
3۔صبر برمصیبت:۔ 351
صبر،احادیث کی روشنی میں 368
صبر کے اثرات اور نتائج 371
صبر کی شاخیں 373
صبر واستقامت کے محرکات 375
جزع وبیتابی:۔ 377
جزع اور بے صبری کا علاج 381
1۔بیماری کی تشخیص اور بہترین طریقۂ علاج تجویز کرنا:۔ 381
2۔جزع کے منحوس نتائج کی یادآوری:۔ 381
3۔صابرین کے اجر کے بارے میں آیات واحادیث کا مطالعہ:۔ 382
4۔انبیأ واولیأ کے حالات کا مطالعہ:۔ 382
5۔تلقین بہ نفس:۔ 382
جزع اور معقول جذبات کے درمیان فرق 383

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

عرضِ ناشر

محترم قارئین!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

اَلْحَمْدُلِلّٰہِ ! مصباح القرآن ٹرسٹ۔۔۔۔۔عرصہ دراز سے دورِ حاضر کی بعض عظیم ترین تفاسیر وتالیفات کی نشرواشاعت کے سلسلہ میں ایک عظیم اور پُروقار مرکز کی حیثیت سے اُمت مسلمہ کیلئے اپنی عاجزانہ خدمات انجام دے رہا ہے۔

اللہ تعالیٰ کی توفیق سے ادارہ مصباح القرآن ٹرسٹ، آیت اللہ ناصر مکارم شیرازی کی زیرسرپرستی لکھی جانے والی کتاب ''اخلاق درقرآن'' کا ترجمہ ''علم الاخلاق (قرآن کی روشنی میں)'' کے نام سے اُردو زبان میں پیش کرنے کی سعادت حاصل کررہا ہے۔اس کتاب کی دُوسری جلد اس وقت آپ کے ہاتھوں میں ہے۔جن حضرات نے پہلی جلد کو بغور پڑھا ہے، وہ یقیناً اس بات کے قائل ہوئے ہوں گے کہ ایسی کتابوں کی ہر گھر میں اشد ضرورت ہے۔ بلاشبہ یہ کتاب انسان کی زندگی میں انتہائی مثبت تبدیلی لانے کا ذریعہ ثابت ہوسکتی ہے۔ آج کل دُنیا اخلاقی حوالہ سے جس جگہ پہنچ چکی ہے، اُس میں اخلاقیات کی خرابی ہی سب سے بڑی وجہ ہے۔لہٰذا اس قسم کی کتابوں کی کثرت سے اشاعت لازمی طور پر معاشرہ میں مثبت تبدیلی لاسکتی ہے۔

مزید برآں آپ ہماری کتب مصباح القرآن ٹرسٹ کی ویب سائٹ۔۔۔۔۔

www.misbahulqurantrust.com کے ذریعے گھر بیٹھے پڑھ سکتے ہیں۔

ہمیں اُمید ہے کہ صاحبانِ علم وتحقیق حسبِ سابق ''مصباح القرآن ٹرسٹ'' کی اس کوشش کو بھی پسندیدگی کی نظر سے دیکھیں گے اور اس گوہرنایاب سے بھرپور علمی وعملی استفادفرمائیں گے۔اور ادارہ کو اپنی قیمتی تجاویز وآراء سے ضرور مستفید فرمائیں گے۔۔۔۔۔۔۔والسلام

اراکین

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور پاکستان

اچھے اور بُرے اخلاق۔۔قرآن کی روشنی میں

تمہید

اس کتاب کی پہلی جلد میں ہم نے اخلاقی مسائل سے متعلق کلی اصولوں، تہذیبِ نفس کے مختلف طریقوں، مختلف اخلاقی مکاتبِ فکر اور اخلاقیات کے محرکات ونتائج پر قرآن شریف کی روشنی میں تفصیل سے بحث کی ہے۔

اب وقت آن پہنچا ہے کہ ان اصولوں کی روشنی میں ایک ایک کر کے فضائل ورذائلِ اخلاقی کا جائزہ لیں اور آیاتِ قرآنی کی روشنی میں ان سے بحث کریں۔

اس بحث کو شروع کرتے وقت ہمیں یہ مسئلہ درپیش آیا کہ اس وسیع وعریض بحث کو کس نظم وترتیب پر منظم ومرتب کیا جائے۔ کیا حکمائے یونان کی روش کی پیروی کرتے ہوئے اخلاق کو چار شعبوں (حکمت، عدالت، شہوت اور غضب) میں تقسیم کرنے ہی پر قناعت کر لیں؟ لیکن یہ روش نہ تو قرآنی آیات کے ساتھ ہم آہنگ ہے جن کی روشنی میں ہم ان مسائل پر بحث کریں گے اور نہ ہی بذاتِ خود یہ نظم وترتیب سے خالی ہے جیسا کہ جلد اوّل میں ہم اس طرف اشارہ کر چکے ہیں۔

دوسرا راستہ یہ تھا کہ رذائلِ اخلاقی کو حروفِ تہجی کی ترتیب سے زیر بحث لایا جائے۔ لیکن اس قسم کے موضوعات میں ایسی ترتیب منطقی روش سے ہٹ جاتی ہے اور مباحث میں ہم آہنگی باقی نہیں رہتی۔

یا یہ کہ مشرق ومغرب کے فلسفی مکاتبِ فکر کی پیروی کرتے ہوئے اپنے اخلاقی مباحث کے نظم وترتیب میں ان کی پیروی کی جائے۔ یہ بھی ممکن نہ تھا، اس لیے کہ ان میں سے ہر مکتبہ فکر اپنی کچھ مخصوص مشکلات لکھتا ہے اور اخلاقیات کے بارے میں قرآن شریف کی موضوعی تفسیر کے ساتھ ہم آہنگ بھی نہیں ہے۔

اچانک اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک الہامی رہنمائی نے ہمارا کام آسان کر دیا اور خود قرآن مجید کی روشنی میں ہمیں ایک نئی روش نظر آئی۔ ہم یہ بات بخوبی جانتے ہیں کہ قرآن مجید گزشتہ اُمتوں کے حالات وواقعات بیان کرتے ہوئے اس کے ذیل میں اہم اخلاقی مباحث پر روشنی ڈالتا ہے اور اس بات کو روزِ روشن کی طرح واضح کر دیتا ہے کہ رذائل وفضائلِ اخلاقی میں سے ہر ایک انسانی معاشرے پر کتنا گہرا اثر ڈالتا ہے اور اس کا نتیجہ کیا برآمد ہوتا ہے! درحقیقت قرآن مجید نے اخلاقی مسائل کو ایسے امتحانات اور آزمائشوں کی بنیاد پر پیش کیا جو معاشرے میں ایک مسلمہ حقیقت ہیں تاکہ ہر پڑھنے اور سننے والا ان سے تیزی سے نتیجہ اخذ کر سکے۔

اس لئے ہم نے سوچا کہ اپنے مباحث کی مخصوص اہمیت کے پیشِ نظر ان کی ترتیب، انسانی تاریخ کی اس ترتیب کے مطابق رکھی جائے جو قرآن مجید نے اپنائی ہے۔

بالفاظِ دیگر سب سے پہلے ہم آدم وحوا، شیطان کے وسوسوں اور آدم وحوا کے جنت سے نکالے جانے کے واقعہ کا جائزہ لیں

گےاوران رذائلِ اخلاقی کا مطالعہ کریں گےجن کی وجہ سے شیطان کے بارگاہِ الٰہی سے نکالے جانے اورآدم وحوا کے جنت سے نکالے جانے والے واقعات رونما ہوئے۔

ہم یہ بات جانتے ہیں کہ شیطان نے استکبار،خود پسندی،احساس برتری اوراس کے بعدضداورتعصب کی بنیاد پرآدم کوسجدہ کرنے سے انکارکیا جبکہ آدم وحواحرص ولالچ کی وجہ سے اپنے دشمن کے غیرمنطقی وسوسوں کا شکار ہو گئے اورشیطان کے دامِ فریب میں آ گئے۔

اس کے بعد ہابیل اورقابیل کاواقعہ اورقابیل کےقتل کا سبب بننے والے رذائل اخلاقی کا مطالعہ کیا جائے گا۔اسی طرح اس کے بعدحضرت نوحؑ،بنی اسرائیل اورحضرت موسیٰ علیہ السلام اوردیگرانبیا کی زندگی کے آئینہ میں اخلاقی فضائل اوران کے آثارنتائج کا مطالعہ کریں گے۔اسی طرح وہ گمراہ اقوام جوعذاب ہائے الٰہی کا نشانہ بنیں،ان کے واقعات کا تجزیہ کرکے اخلاقی رذائل اوران کے نتائج کا مشاہدہ کریں گے۔

یہ روش نہ صرف یہ کہ پُرکشش اورشریں ہے بلکہ قرآنی مباحث کے ساتھ زیادہ ہم آہنگ بھی ہے۔اس کے علاوہ اس ترتیب سےفضائل ورذائل کی حقیقی تصویرسامنے آجاتی ہے،گویاہم انہیں حس اورتجربے کی روشنی میں دیکھ رہے ہوں۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کوتوفیق عطا فرمائے کہ اپنے اندر سے ان رذائل اخلاقی کا خاتمہ کرسکیں جنہوں نے انسانی معاشرے کو ایک جہنم بنا کررکھ دیا ہےاوراپنے آپ کوان فضائلِ اخلاقی سے مزین کریں جوہمیں اورہمارے معاشرےکوزیادہ سے زیادہ پاکیزگی ،نورانیت،اطمینان قلب اورترقی وپیش رفت کی دولت سے مالا مال کردیں اورہم سب سے بڑی سعادت یعنی اللہ تعالیٰ کے قرب سے آراستہ ہوجائیں۔

آمین یارب العالمین

ربیع الاوّل 1420ھ

قم،ناصرمکارم شیرازی۔

پہلا باب

تکبر اور استکبار

داستانِ انبیاؑ اور آغازِ خلقت میں سب سے پہلے جو صفتِ رذیلہ ہمارے سامنے آتی ہے، وہ تکبر اور استکبار ہے۔ تمام علمائے اخلاق اس بات پر متفق ہیں کہ یہ صفتِ اُم المفاسد یعنی تمام برائیوں کی ماں ہے۔ اس صفت کا اظہار داستانِ آدم و ابلیس میں ہوا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو حکم دیا کہ آدم کو سجدہ کریں تو سب فرشتوں نے سجدہ کیا مگر ابلیس نے اپنے تکبر اور استکبار کی وجہ سے سجدہ کرنے سے انکار کر دیا۔

آدم و ابلیس کا یہ واقعہ تمام انسانوں اور تمام انسانی معاشرے کے لئے درس آموز اور عبرت انگیز ہے۔ یہ نکتہ قابلِ غور ہے کہ تکبر و استکبار اور ان کے برے نتائج صرف تخلیق آدم کے واقعہ سے مخصوص نہیں ہیں بلکہ جیسا کہ آگے چل کر ہم دیکھیں گے، تمام انبیاؑ کی تاریخ میں اس نے ایک واضح تخریبی کردار ادا کیا ہے۔

دورِ حاضر میں تمام انسانی معاشروں میں اور تمام عالمی حوادث اور خرابیوں میں سب سے بڑا اور اوّلین سبب استکبار ہے۔ اس کی لگائی ہوئی آگ میں سب جل رہے ہیں لیکن کوئی اس دردانگیز بیماری کا علاج سوچنے کی زحمت گوارا نہیں کرتا۔

اس تمہیدی بیان کے بعد ہم قرآن مجید کی طرف رجوع کرتے ہیں اور حضرت آدم سے حضرت خاتم تک اس موضوع سے متعلق آیات پر نظر ڈالتے ہیں۔

1۔ وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ؕ اَبٰى وَاسْتَكْبَرَ ۫ وَكَانَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۳۴﴾

''اور یاد کرو جب ہم نے فرشتوں سے کہا کہ آدم کیلئے سجدہ اور خضوع کرو، ابلیس کے سوا سب نے سجدہ کیا۔ اس نے انکار کیا اور تکبر کیا (اور اپنی نافرمانی و تکبر کی وجہ سے) کافر ہو گیا۔'' (بقرہ۔34)

2۔ قَالَ فَاهْبِطْ مِنْهَا فَمَا يَكُوْنُ لَكَ اَنْ تَتَكَبَّرَ فِيْهَا فَاخْرُجْ اِنَّكَ مِنَ الصّٰغِرِيْنَ ﴿۱۳﴾

''(اللہ نے) کہا (اپنے مقام و مرتبہ سے) نیچے اُتر جا، تجھے حق نہیں کہ (اس مقام و مرتبہ میں) تکبر کرے اور نکل جا، تو پست اور حقیروں میں سے ہے۔'' (اعراف 13)

3۔ وَاِنِّيْ كُلَّمَا دَعَوْتُهُمْ لِتَغْفِرَ لَهُمْ جَعَلُوْٓا اَصَابِعَهُمْ فِيْٓ اٰذَانِهِمْ وَاسْتَغْشَوْا ثِيَابَهُمْ وَاَصَرُّوْا وَاسْتَكْبَرُوا اسْتِكْبَارًا ۚ ﴿۷﴾

''(داستانِ نوح علیہ السلام میں ہے کہ اُنہوں نے اللہ تعالیٰ سے کہا) میں نے جب بھی انہیں دعوت دی (کہ وہ ایمان لے آئیں) تاکہ تو انہیں بخشش دے تو انہوں نے اپنی انگلیاں اپنے کانوں میں ٹھونس لیں اور اپنے کپڑے اپنے اوپر لپیٹ لئے اور مخالفت پر اصرار کیا اور شدت کے ساتھ استکبار کیا۔''(نوح:7)

4۔ فَاَمَّا عَادٌ فَاسْتَكْبَرُوْا فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَقَالُوْا مَنْ اَشَدُّ مِنَّا قُوَّةً ۭ اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ الَّذِيْ خَلَقَهُمْ هُوَ اَشَدُّ مِنْهُمْ قُوَّةً ۭ وَكَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يَجْحَدُوْنَ۝۱۵

''قوم عاد نے زمین میں ناحق تکبر کیا اور کہا ہم سے زیادہ طاقتور کون ہے؟ کیا وہ نہیں جانتے تھے کہ اللہ، جس نے انہیں پیدا کیا، ان سے زیادہ طاقتور ہے اور وہ (اپنے اس گمان کی بنیاد پر) ہماری آیات کا انکار کرتے تھے۔''(فصلت:15)

5۔ قَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ لَنُخْرِجَنَّكَ يٰشُعَيْبُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَكَ مِنْ قَرْيَتِنَآ اَوْ لَتَعُوْدُنَّ فِيْ مِلَّتِنَا ۭ قَالَ اَوَلَوْ كُنَّا كٰرِهِيْنَ۝۸۸ [۷:۸۸]

''(قومِ شعیبؑ کے) متکبر افراد نے کہا: اے شعیبؑ! ہم تمہیں اور تم پر ایمان لانے والوں کو شہر بدر کر دیں گے یا یہ کہ تم ہمارے طریقے پر لوٹ آؤ۔ شعیبؑ نے کہا: (کیا تم ہمیں واپس پلٹا دو گے؟) خواہ ہم نہ چاہتے ہوں؟''(اعراف:88)

6۔ وَقَارُوْنَ وَفِرْعَوْنَ وَهَامٰنَ ۣ وَلَقَدْ جَاۗءَهُمْ مُّوْسٰى بِالْبَيِّنٰتِ فَاسْتَكْبَرُوْا فِي الْاَرْضِ وَمَا كَانُوْا سٰبِقِيْنَ۝۳۹ۚ [۲۹:۳۹]

''اور ہم نے قارون، فرعون اور ہامان کو ہلاک کر دیا اور موسیٰؑ ان کے پاس روشن نشانیاں لے کر آئے تھے لیکن انہوں نے زمین میں تکبر کیا مگر اللہ سے آگے نہ نکل سکے''۔(عنکبوت:39)

7۔ لَتَجِدَنَّ اَشَدَّ النَّاسِ عَدَاوَةً لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا الْيَهُوْدَ وَالَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا ۚ وَلَتَجِدَنَّ اَقْرَبَهُمْ مَّوَدَّةً لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّا نَصٰرٰى ۭ ذٰلِكَ بِاَنَّ مِنْهُمْ قِسِّيْسِيْنَ وَرُهْبَانًا وَّاَنَّهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ۝۸۲ [۵:۸۲]

''یقیناً آپ مسلمانوں کے بدترین دشمن یہودیوں اور مشرکوں کو پائیں گے اور مسلمانوں سے سب سے قریب ان لوگوں کو پائیں گے جنہوں نے کہا کہ ہم نصاریٰ ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان میں ایسے علماء اور راہب ہیں جو (حق کے سامنے) تکبر نہیں کرتے''۔(مائدہ:82)

8۔ ثُمَّ عَبَسَ وَبَسَرَ ﴿۲۲﴾ ثُمَّ اَدْبَرَ وَاسْتَكْبَرَ ﴿۲۳﴾ فَقَالَ اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ يُّؤْثَرُ ﴿۲۴﴾

''پھر اس نے تیوری چڑھائی اور جلد بازی کی، پھر (حق کی طرف) پشت کی اور تکبر کیا اور (آخرکار) کہا: یہ (قرآن) گزشتہ جادوگروں کے جادو کے سوا کچھ نہیں ہے''۔(مدثر:22 تا24)

9۔ اَلَّذِيْنَ يُجَادِلُوْنَ فِيْٓ اٰيٰتِ اللّٰهِ بِغَيْرِ سُلْطٰنٍ اَتٰىهُمْ ؕ كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ وَعِنْدَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ؕ كَذٰلِكَ يَطْبَعُ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ قَلْبِ مُتَكَبِّرٍ جَبَّارٍ ﴿۳۵﴾

''جو بغیر دلیل کے اللہ کی آیات کے بارے میں بحث کرتے ہیں (ان کا یہ عمل) اللہ اور اہلِ ایمان کے نزدیک ایک عظیم گناہ ہے اور اسی طرح اللہ تعالیٰ ہر متکبر اور جبار کے دل پر مہر لگا دیتا ہے''۔(مؤمن:35)

10۔ قِيْلَ ادْخُلُوْٓا اَبْوَابَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا فَبِئْسَ مَثْوَى الْمُتَكَبِّرِيْنَ ﴿۷۲﴾

''ان سے کہا جائے گا: جہنم کے دروازوں سے داخل ہو جاؤ اور ہمیشہ وہاں رہو، متکبروں کا کیا بُرا ٹھکانہ ہے''۔(زمر:72)

11۔ سَاَصْرِفُ عَنْ اٰيٰتِيَ الَّذِيْنَ يَتَكَبَّرُوْنَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ ؕ وَاِنْ يَّرَوْا كُلَّ اٰيَةٍ لَّا يُؤْمِنُوْا بِهَا ۚ وَاِنْ يَّرَوْا سَبِيْلَ الرُّشْدِ لَا يَتَّخِذُوْهُ سَبِيْلًا ۚ وَاِنْ يَّرَوْا سَبِيْلَ الْغَيِّ يَتَّخِذُوْهُ سَبِيْلًا ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَكَانُوْا عَنْهَا غٰفِلِيْنَ ﴿۱۴۶﴾

''عنقریب ہم ان لوگوں کو اپنی آیات سے پھیر دیں گے جو زمین میں ناحق تکبر کرتے ہیں، ان کا یہ حال ہے کہ اگر وہ ہر آیت کو دیکھ لیں تو بھی ایمان نہیں لائیں گے، اگر انہیں ہدایت کی راہ نظر آ جائے تو اسے اختیار نہیں کرتے اور اگر گمراہی کی راہ دیکھیں تو اسے اختیار کر لیتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا اور ان سے غافل تھے۔''(اعراف:146)

12۔ لَا جَرَمَ اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا يُسِرُّوْنَ وَمَا يُعْلِنُوْنَ ؕ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْتَكْبِرِيْنَ ﴿۲۳﴾

''جو کچھ وہ چھپاتے ہیں اور جو کچھ ظاہر کرتے ہیں۔ اللہ اسے جانتا ہے اور اللہ متکبرین کو پسند نہیں کرتا''۔

(نحل:23)

13۔ لَنْ يَّسْتَنْكِفَ الْمَسِيْحُ اَنْ يَّكُوْنَ عَبْدًا لِّلّٰهِ وَلَا الْمَلٰٓئِكَةُ الْمُقَرَّبُوْنَ ؕ وَمَنْ يَّسْتَنْكِفْ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَيَسْتَكْبِرْ فَسَيَحْشُرُهُمْ اِلَيْهِ جَمِيْعًا ﴿۱۷۲﴾

فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَيُوَفِّيْهِمْ اُجُوْرَهُمْ وَيَزِيْدُهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ ۚ وَاَمَّا

الَّذِيْنَ اسْتَنْكَفُوْا وَاسْتَكْبَرُوْا فَيُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ۙ وَّلَا يَجِدُوْنَ لَهُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا ﴿۱۷۳﴾

''مسیح ہرگز اس بات سے انکار نہیں کرے گا کہ وہ اللہ کا بندہ ہے، نہ ہی فرشتے اس سے انکار کریں گے اور جو لوگ اس کی بندگی سے منہ موڑیں اور تکبر کریں، اللہ تعالیٰ انہیں اپنے پاس اکٹھا کرے گا۔ جو لوگ ایمان لائے اور عملِ صالح کرتے رہے، انہیں ان کا پورا اجر دے گا اور اپنے فضل سے ان کو مزید عطا کرے گا۔ جن لوگوں نے انکار کیا اور تکبر کیا، انہیں دردناک سزا دے گا۔ اللہ کے سوا وہ کوئی سرپرست اور مددگار نہیں پائیں گے۔'' (نسا: 172 تا 173)

14۔ اِنَّ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَاسْتَكْبَرُوْا عَنْهَا لَا تُفَتَّحُ لَهُمْ اَبْوَابُ السَّمَآءِ وَلَا يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ حَتّٰى يَلِجَ الْجَمَلُ فِيْ سَمِّ الْخِيَاطِ ۭ وَكَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُجْرِمِيْنَ ﴿۴۰﴾

''جن لوگوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا اور ان کے سامنے تکبر کیا، ان کیلئے آسمان کے دروازے ہرگز نہیں کھولے جائیں گے مگر یہ کہ اونٹ سوئی کے سوراخ سے گزر جائے، اس طرح ہم گنہگاروں کو سزا دیتے ہیں۔'' (اعراف: 40)

تفسیر

انسانی تاریخ کا سب سے بڑا المیہ:۔

استکبار اور اس کے نتیجہ میں انسانی تاریخ میں جتنے المیے رونما ہوئے ہیں، قرآنی آیات ان سے بھری پڑی ہیں۔ انسان کی مادی اور معنوی ترقی کی راہ میں جو رکاوٹیں اس صفتِ رذیلہ نے پیدا کی ہیں، وہ کسی پر پوشیدہ نہیں ہیں۔ مندرجہ بالا اس موضوع سے متعلق آیات میں سے ایک انتخاب تھا۔

پہلی اور دوسری آیات میں آدم و ابلیس کے واقعہ کا ذکر ہے۔ جب اللہ تعالیٰ نے تمام فرشتوں کو حکم دیا کہ آدمؑ کی خلقت کی عظمت کے پیش نظر سجدہ کریں تو سوائے ابلیس کے سب نے سجدہ کیا۔ (ابلیس اس وقت اپنے اعلیٰ مقام کی وجہ سے فرشتوں میں شامل تھا) ابلیس نے اللہ کے حکم کے سامنے سرکشی کی اور استکبار کا مظاہرہ کیا اور کافر ہو گیا۔ اس کی اس سرکشی، نافرمانی اور استکبار کی وجہ سے اللہ نے اسے حکم دیا کہ وہ اپنے مقام سے اُتر جائے اور یہ بھی بتا دیا کہ وہ پست اور حقیر ہوگا۔

وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰۗىِٕكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ۭ اَبٰى وَاسْتَكْبَرَ ۡ وَكَانَ مِنَ

الْكٰفِرِيْنَ﴿۳۴﴾

قَالَ فَاهْبِطْ مِنْهَا فَمَا يَكُوْنُ لَكَ اَنْ تَتَكَبَّرَ فِيْهَا فَاخْرُجْ اِنَّكَ مِنَ الصّٰغِرِيْنَ﴿۱۳﴾

درحقیقت یہ پہلا گناہ ہے جو دنیا میں وقوع پذیر ہوا۔ اس گناہ کے نتیجہ میں ابلیس جیسا فرد، جس نے طویل عرصہ تک، خطبۂ قاصعہ میں امیر المومنین علیہ السلام کے فرمان کے مطابق چھ ہزار سال اللہ کی عبادت کی تھی، اپنے اس عظیم مقام سے گر گیا اور ذرا سی دیر کے تکبر نے اس کے چھ ہزار سالہ عبادت کو برباد کر دیا۔

"اِذْ اَحْبَطَ عَمَلَهُ الطَّوِيْلَ وَجَهْدَهُ الْجَهِيدَ، وَكَانَ قَدْ عَبَدَ اللهَ سِتَّةَ آلَافِ سَنَةٍ ..... عَنْ كِبْرِ سَاعَةٍ وَاحِدَةٍ" (نہج البلاغہ، خطبہ: 192)

اس عبرت انگیز داستان میں تکبر کے خطرات کے بارے میں اہم نکات پوشیدہ ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ممکن ہے کہ یہ صفتِ رذیلہ انسان کو کفر اور بے ایمانی کے مقام تک گرا دے۔ جیسا کہ مذکورہ آیت کے یہ الفاظ اسی حقیقت پر دلالت کرتے ہیں:

اَبٰى وَاسْتَكْبَرَ ۫ وَكَانَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ﴿۳۴﴾" (بقرہ: 34)

اس واقعہ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ابلیس غرور و تکبر کے خطرناک حجاب کی وجہ سے واضح ترین حقائق کو جاننے کی صلاحیت سے بھی محروم ہو چکا تھا، اس لئے کہ جب اس نے اللہ تعالیٰ کے حکم کے بارے میں زبانِ اعتراض کھولی تو اُس نے کہا:

"قَالَ لَمْ اَكُنْ لِّاَسْجُدَ لِبَشَرٍ خَلَقْتَهٗ مِنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ﴿۳۳﴾"

''اس نے کہا میں ایسے بشر کو سجدہ کرنے والا نہیں ہوں جسے تو نے اس خشک مٹی سے پیدا کیا جو سڑے ہوئے کیچڑ سے لی گئی تھی۔ (حجر: 33)

ظاہری بات ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آدم کو جو شرف عطا کیا تھا وہ اس لئے نہیں تھا بلکہ اس کی وجہ یہ تھی کہ اللہ نے ان کے اندر وہ روح پھونکی تھی جس کا تین آیت پہلے ذکر ہو چکا ہے:

فَاِذَا سَوَّيْتُهٗ وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِيْنَ﴿۲۹﴾

''اور جب میں اسے موزوں بنالوں اور اس میں اپنی روح پھونک دوں تو اس کے لئے سجدہ کرو۔'' (حجر: 29)

ابلیس کی حالت یہ تھی کہ وہ آگ پر خاک کی برتری کو نہ سمجھ سکا۔ زندگی کی پیدائش، زندگی کی تمام برکات، انسانوں کی رہائش کیلئے مناسب جگہ، مختلف قسم کے معدنیات اور زیر زمین ذخائر، حتیٰ کہ پانی کے ذخائر، یہاں تک کہ آگ پکڑنے والے معدنی وسائل (تیل، گیس، لکڑی اور کوئلہ وغیرہ) سب خاک سے ہی پیدا ہوتے ہیں۔ اس نے انتہائی حماقت اور خیرہ سری سے کہا:

"خَلَقْتَنِيْ مِنْ نَّارٍ وَّخَلَقْتَهٗ مِنْ طِيْنٍ"

''تو نے مجھے آگ سے پیدا کیا اور اسے مٹی سے پیدا کیا۔''

مزید برآن یہ کہ بہت سے لوگ غلطی اور خطا کے مرتکب ہوتے ہیں لیکن جب انہیں غلطی کا احساس ہو جائے تو حق کی طرف پلٹ آتے ہیں، توبہ کر لیتے ہیں اور اپنے طرزِ عمل کی اصلاح کر لیتے ہیں۔ لیکن تکبر اور استکبار ایسی بیماری ہیں جو انسان کو احساسِ گناہ کے بعد بھی اعترافِ گناہ کی اجازت نہیں دیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شیطان نے اپنی خطا کی طرف متوجہ ہو جانے کے بعد بھی توبہ نہ کی۔ اس کے تکبر و غرور نے اسے اجازت نہ دی کہ انسان جیسی عظیم مخلوق کے سامنے سرِ تعظیم جھکا دیتا، بلکہ اس نے اپنی ضد اور ہٹ دھرمی پر قائم رہتے ہوئے قسم کھائی کہ وہ تمام انسانوں کو گمراہ کر کے چھوڑے گا۔ مگر اس کے ساتھ ہی اس نے یہ اعتراف بھی کر لیا کہ اللہ کے مخلص بندوں پر اس کا بس نہیں چلے گا۔ ابلیس نے نہ صرف یہ کہ انسان کو گمراہ کرنے کی قسم کھائی بلکہ اللہ تعالیٰ سے عمرِ جاوداں کا مطالبہ بھی کیا تا کہ وہ اپنے اس گمراہ کن عمل کو دنیا کے خاتمہ تک جاری رکھ سکے۔

اس طرح اللہ تعالیٰ کے سامنے تکبر، خود پسندی اور احساسِ برتری اس کی ضد اور ہٹ دھرمی کا باعث بن گئیں اللہ تعالیٰ کے سامنے اس کا حسد، کفر اور ناشکری مخلوقِ خدا کی بربادی اور خرابی کا سبب بنے۔

اس طرح شیطان نے روئے زمین پر تعصب و تکبر کی بنیاد رکھی اور اللہ تعالیٰ کی عظمت کے سامنے محاذ آرائی کا آغاز کیا۔ اس بات کو امیر المومنین علی علیہ السلام نے خطبۂ قاصعہ میں اس طرح بیان فرمایا ہے:

"فَعَدُوُّ اللّٰهِ اِمَامُ الْمُتَعَصِّبِيْنَ وَسَلَفُ الْمُسْتَكْبِرِيْنَ الَّذِیْ وَضَعَ أَسَاسَ الْعَصَبِيَّةِ وَنَازَعَ اللّٰهَ رِدَاءَ الْجَبْرِيَّةِ وَادَّرَعَ لِبَاسَ التَّعَزُّزِ، وَخَلَعَ قِنَاعَ التَّذَلُّلِ"۔

''اللہ کے دشمن، متعصبین کے امام اور متکبرین کے پیشوا نے عصبیت کی بنیاد ڈالی۔ مقامِ جبروت میں اللہ سے نزاع کیا، تکبر کا لباس پہن لیا اور تواضع کا لباس اُتار دیا۔'' (نہج البلاغہ، خطبہ: 192)

اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اسے ذلیل و خوار اور پست و حقیر کر دیا۔ امیر المومنین علیہ السلام اسی خطبہ میں آگے چل کر فرماتے ہیں:

اَلَا تَرَوْنَ كَيْفَ صَغَّرَهُ اللّٰهُ بِتَكَبُّرِهِ وَوَضَعَهُ بِتَرَفُّعِهِ فَجَعَلَهُ فِی الدُّنْيَا مَدْحُوراً، وَاَعَدَّلَهُ فِی الْآخِرَةِ سَعِيْراً"۔

''کیا تم نہیں دیکھتے ہو کہ کس طرح اللہ تعالیٰ نے اس کے تکبر کی وجہ سے اسے حقیر کیا، اس کی رفعت پسندی کی وجہ سے اسے پست کر دیا، دنیا میں اسے مردود قرار دیا اور آخرت میں اس کیلئے جہنم تیار کی۔''

مختصر یہ کہ جس قدر ہم داستانِ ابلیس اور اس کے اثرات کے بارے میں غور کریں، ہمیں تکبر اور استکبار کے خطرات کے بارے میں زیادہ سے زیادہ آگاہی حاصل ہوتی جاتی ہے۔

تیسری آیت میں ہم حضرت نوح علیہ السلام کے واقعہ پر پہنچتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کے پہلے اولوالعزم اور صاحبِ شریعت نبی

تھے۔اس سے بھی یہی حقیقت واضح وآشکار ہوتی ہے کہ ان کے زمانے کے کفار کی ضد، کفر، ہٹ دھرمی کا سبب بھی استکبار تھا۔

جب انہوں نے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں اپنی قوم کی شکایت کی تو کہا:

''اے میرے رب! میں نے جب بھی انہیں ایمان لانے کی دعوت دی تا کہ تو ان کی بخشش فرمائے تو انہوں نے اپنی انگلیاں اپنے کانوں میں ٹھونس لیکن اور اپنے کپڑے اپنے اوپر اوڑھ لئے، انہوں نے اپنے کفر اور حق کی مخالفت پر اصرار کیا اور سخت استکبار کیا۔''

وَاِنِّیۡ کُلَّمَا دَعَوۡتُہُمۡ لِتَغۡفِرَ لَہُمۡ جَعَلُوۡۤا اَصَابِعَہُمۡ فِیۡۤ اٰذَانِہِمۡ وَاسۡتَغۡشَوۡا ثِیَابَہُمۡ وَاَصَرُّوۡا وَاسۡتَکۡبَرُوا اسۡتِکۡبَارًا ۚ﴿۷﴾

''اس آیت میں یہ بات واضح اور نمایاں طور پر نظر آتی ہے کہ ان کا استکبار، خود پسندی اور احساسِ برتری ہی ان کے کفر اور حق کے ساتھ ان کی دشمنی کا سبب تھا۔ان کے اندر استکبار کی بیماری اس حد تک بڑھی ہوئی تھی کہ وہ اس خوف سے کہ کہیں حق کی آواز ان کے سوئے ہوئے ضمیر کو بیدار نہ کر دے، اپنے کانوں میں انگلیاں دے دیتے تھے اور اپنے کپڑے اپنے سروں پر اوڑھ لیتے تھے۔ پیامِ حق کے ساتھ ان کی اس دشمنی اور عداوت کی صرف ایک وجہ تھی۔۔۔۔استکبار!

وہ حضرت نوح علیہ السلام پر تنقید کرتے تھے کہ معاشرے کے سادہ لوح اور پست افراد ہی تم پر ایمان کیوں لائے ہیں؟ جب تک یہ تمہارے اردگرد ہیں، ہم تم پر ایمان نہیں لائیں گے۔واقعی تکبر اور خود پسندی ایک ایسی بلا ہے جو تمام فضائل کو جلا کر راکھ کر دیتی ہے۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ ان کا طرزِ عمل اس بات کی واضح دلیل تھا کہ وہ حضرت نوحؑ کی باتوں کی حقانیت اور اثر انگیزی کو مانتے تھے، ورنہ کانوں میں انگلیاں دینے اور اپنے کپڑے اپنے سر اور چہروں پر اوڑھنے کی کوئی وجہ نہیں تھی

ہوسکتا ہے کہ لباس اپنے اوپر اوڑھ لینے کے معنی یہ بھی ہوں کہ وہ حضرت نوحؑ کو دیکھ کر اس لئے اپنے کپڑے اپنے چہروں پر ڈال لیتے ہوں تا کہ وہ اور حضرت نوحؑ ایک دوسرے کو دیکھ نہ سکیں اور نہ ہی حضرت نوحؑ انہیں دعوت دے سکیں۔

آخر کار نتیجہ یہ ہوا کہ جب تک مہلت ان کے پاس تھی، وہ حضرت نوحؑ کی نصیحت اور دعوت کو اپنی پسندی اور احساسِ برتری کی وجہ سے نظر انداز کرتے رہے۔انہوں نے ایک لحظہ کیلئے یہ سوچنے کی زحمت بھی گوارا نہ کی کہ ہوسکتا ہے کہ انہیں نصیحت کرنے والا اور دعوت دینے والا سچ کہہ رہا ہو۔لہٰذا جب حضرت نوحؑ کشتی بنا رہے تھے تو ان کی قوم کے لوگ ٹولیاں بن بن کر ان کے پاس سے گزرتے اور ان کا مذاق اڑاتے۔حضرت نوحؑ انہیں خبردار کرتے:

اِنۡ تَسۡخَرُوۡا مِنَّا فَاِنَّا نَسۡخَرُ مِنۡکُمۡ کَمَا تَسۡخَرُوۡنَ ﴿۳۸﴾

''اگر آج تم ہمارا مذاق اُڑا رہے ہو، ہم بھی تمہارا مذاق اُڑائیں گے (لیکن اس دن جب تم طوفان میں گھرے ہوئے ہو گے اور خوفزدہ وسراسیمہ ہو کر اِدھر اُدھر بھاگ رہے ہو گے، فریاد اور التجا کرو گے مگر تمہارے پاس کوئی

جائے پناہ نہیں ہوگی)''۔(ہود:38)

بنیادی طور پر متکبرین اور مستکبرین کا شیوہ ہی یہی ہے کہ سنجیدہ ترین بات بھی اگر ان کے مفادات کے ساتھ مطابقت نہ رکھتی ہو، وہ اس کو ہنسی مذاق میں اُڑا دیتے ہیں۔معاشرے کے کمزور اور مستضعف طبقات کا مذاق اُڑانا اور ان کی تحقیر کرنا مستکبرین کا معمولی مشغلہ ہوتا ہے۔اکثر دیکھا گیا ہے کہ ایسے افراد اپنی گناہ آلودہ محافل میں کسی غریب، باایمان شخص کو تلاش کر رہے ہوتے ہیں تاکہ اس پر ہنس کر اور اس کی تحقیر کر کے اپنی تفریح طبع کا سامان مہیا کر سکیں۔

اپنے تکبر اور استکبار کی وجہ سے وہ اپنے آپ کو عقلِ کُل سمجھتے ہیں۔وہ اپنی دولت کی فراوانی کو، جو زیادہ تر حرام پر مشتمل ہوتی ہے، اپنی لیاقت اور قابلیت کی دلیل سمجھتے ہیں اور اسی وجہ سے دوسروں کی تحقیر و تذلیل کو اپنا حق سمجھتے ہیں۔

چوتھی آیت میں حضرت نوحؑ کے دور سے گزر کر ہم قومِ عاد اور ان کے نبی حضرت ہود علیہ السلام کے واقعہ پر جا پہنچتے ہیں۔ یہاں بھی ہمیں یہی نظر آتا ہے کہ اس قوم کی بدبختی کا اصل سبب بھی اس کا تکبر تھا۔اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

قومِ ہودؑ نے زمین میں ناحق استکبار کیا اور کہا کہ ہم سے زیادہ طاقتور کون ہوسکتا ہے؟ کیا وہ نہیں جانتے کہ جس اللہ نے ان کو پیدا کیا ہے، وہ ان سے زیادہ طاقتور ہے اور وہ ہماری آیات کا انکار کرتے رہے۔''

"فَاَمَّا عَادٌ فَاسْتَكْبَرُوْا فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَقَالُوْا مَنْ اَشَدُّ مِنَّا قُوَّةً ۭ اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ الَّذِيْ خَلَقَهُمْ هُوَ اَشَدُّ مِنْهُمْ قُوَّةً ۭ وَكَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يَجْحَدُوْنَ۔"

اس قوم نے اپنے تکبر و استکبار کی وجہ سے اپنے آپ کو دنیا کی سب سے بڑی طاقت سمجھنا شروع کر دیا تھا۔اس معاملہ میں وہ اس حد تک چلے گئے کہ اللہ کی طاقت کو بھی فراموش کر دیا جس کی وجہ سے وہ اللہ کی آیات کا انکار کرنے لگے اور اس طرح انہوں نے اپنے اور حق کے درمیان فاصلے اور حجاب پیدا کر لئے۔

یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ اگلی آیت میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان متکبروں کو ذلیل و خوار کرنے کیلئے نحس ایام میں ان پر شدید آندھی کا عذاب بھیجا۔(جس نے ان کو بھوسے اور تنکوں کی طرح اِدھر اُدھر اُڑا کر رکھ دیا)۔

تکبر ایک ایسا حجاب ہے جس کی وجہ سے انسان اس قدر اندھا ہو جاتا ہے کہ اپنی حقیر اور ناچیز طاقت کو اتنا زیادہ سمجھنے لگتا ہے کہ اللہ کی قدرت اور طاقت بھی اسے نظر نہیں آتی۔

اس آیت میں ''بِغَيْرِ الْحَقِّ'' کے الفاظ اس حقیقت کی وضاحت کیلئے استعمال ہوئے ہیں کہ انسان کیلئے تکبر اور استکبار کسی حال میں صحیح اور برحق نہیں ہوسکتے۔یہ ایک ایسی حقیقت ہے جو انسان کے وجود کے ساتھ کوئی مناسبت نہیں رکھتی بلکہ یہ صرف اللہ تعالیٰ کا حق ہے۔

پانچویں آیت ہمیں حضرت شعیبؑ کے زمانے میں لے جاتی ہے۔یہاں بھی یہی حقیقت نظر آتی ہے کہ قومِ شعیبؑ کی بدبختی اور گمراہی کا اصل سبب بھی ان کا تکبر تھا۔اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

''قومِ شعیبؑ کے متکبر اشراف نے کہا: اے شعیبؑ! ہم قسم کھا کر کہتے ہیں کہ تمہیں اور تمہارے ساتھ ایمان لانے والوں کو ضرور شہر بدر کر دیں گے۔ ہاں! اگر تم ہم میں واپس آ جاؤ تو اور بات ہے۔'' (اعراف:88)

قَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ لَنُخْرِجَنَّكَ يٰشُعَيْبُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَكَ مِنْ قَرْيَتِنَآ اَوْ لَتَعُوْدُنَّ فِيْ مِلَّتِنَا ؕ قَالَ اَوَلَوْ كُنَّا كٰرِهِيْنَ ۝۸۸

حضرت شعیب علیہ السلام اور ان کی قوم کے افراد جوان پر ایمان لائے اور تقویٰ و خدا پرستی کی راہ پر چل رہے تھے، ان کو شہر بدر کرنے کی دھمکی کی اس کے سوا کیا وجہ ہو سکتی ہے کہ وہ حضرت شعیبؑ پر ایمان لانے اور ان کے پیروکار مؤمنین کے ساتھ ملحق ہونے کو اپنی شان کے خلاف سمجھتے تھے، لہٰذا وہ ان کے مقابلہ پر اُتر آئے۔

ان کا یہ کہنا کہ ''اَوْ لَتَعُوْدُنَّ فِيْ مِلَّتِنَا'' (یا یہ کہ تم ہم میں واپس آ جاؤ) کی وجہ یہ نہ تھی کہ وہ اپنے دین و مذہب پر ایمان رکھتے تھے بلکہ اس کی وجہ یہ تھی کہ چونکہ وہ ان کی طرف منسوب تھا، لہٰذا ان کے تکبر اور حُبِ ذات کا تقاضا یہ تھا کہ وہ اس کے ساتھ وابستگی کا اظہار کریں۔

چھٹی آیت حضرت موسیٰ علیہ السلام اور فرعون و قارون کے زمانہ سے متعلق ہے۔ ان کے انحراف، گمراہی اور بدبختی کا اصل سبب ان کا تکبر تھا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

''ہم نے قارون، فرعون اور ہامان کو بھی ہلاک کیا۔ موسیٰؑ روشن نشانیاں لے کر ان کے پاس آئے مگر انہوں نے استکبار اور بڑائی سے کام لیا (لہٰذا انہوں نے حق کو قبول نہیں کیا اور ہم نے انہیں ہلاک کر دیا) اور وہ اللہ سے آگے نہ نکل سکے (اور اللہ کے عذاب سے نہ بچ سکے)''۔

وَقَارُوْنَ وَفِرْعَوْنَ وَهَامٰنَ ۫ وَلَقَدْ جَآءَهُمْ مُّوْسٰى بِالْبَيِّنٰتِ فَاسْتَكْبَرُوْا فِي الْاَرْضِ وَمَا كَانُوْا سٰبِقِيْنَ ۝۳۹ (عنکبوت)

قارون ایک دولت مند شخص تھا اور اپنی دولت کی وجہ سے اپنے آپ کو اللہ کی بارگاہ میں بھی بڑا سمجھتا تھا۔ وہ یہ سمجھتا تھا کہ وہ اپنی قابلیت کی وجہ سے اس بے پناہ دولت کا مالک بنا ہے۔ وہ دولت کی وجہ سے تکبر کرتا تھا اور اپنی دولت کی نمائش کے ذریعے فقراً و مساکین کی تحقیر و تذلیل کرتا تھا۔ اسے جس قدر سمجھایا جاتا کہ اپنی دولت کو اخروی فلاح و سعادت کے حصول کیلئے استعمال کرے، اس پر کوئی اثر نہ ہوتا۔ اس کا غرور و تکبر اسے زندگی کے حقائق کو دیکھنے کی اجازت نہ دیتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اس حقیقت کو نہ پا سکا کہ اس کی دولت چند روزہ زندگی میں اس کے پاس اللہ کی امانت ہے جو اس کے اصل حقداروں تک پہنچ جانی چاہئے۔

فرعون جو تختِ حکومت پر متمکن تھا، اس سے بھی زیادہ غرور و تکبر کا شکار تھا۔ وہ اس بات پر بھی قانع نہ تھا کہ لوگ اس کی پرستش کریں بلکہ وہ چاہتا تھا کہ لوگ اسے ربِ اعلیٰ سمجھیں۔

ہامان، فرعون کا قریبی ساتھی اور اس کا وزیر تھا اور اس کے تمام مظالم میں اس کا شریک کار تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ فرعون

کے تمام ظالمانہ فیصلوں پر عمل درآمد کرنا اُسی کی ذمہ داری تھا۔قرآن شریف کے الفاظ کی روشنی میں معلوم ہوتا ہے کہ وہ بھی شدید غرور وتکبر کا شکار تھا۔

ان تینوں نے ایک ہو کر اللہ تعالیٰ کے عظیم پیغمبر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے خلاف محاذ بنالیا۔انہوں نے زمین میں فتنہ وفساد برپا کیا اور آخر کار اللہ تعالیٰ کی طرف سے شدید ترین عذاب میں گرفتار ہو گئے۔فرعون اور ہامان دریائے نیل میں غرق ہو گئے جوان دونوں کی قوت وطاقت کا اصل سرچشمہ تھا جبکہ قارون اپنی دولت سمیت زمین میں دھنس گیا۔

ساتویں آیت میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی قوم کا ذکر ہے۔یہ آیت یہودیوں اور قومِ عیسیٰ کے فرق کو بیان کر رہی ہے۔اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

''اے رسول! آپ یہودیوں اور مشرکین کو سب سے بڑھ کر مسلمانوں کا دشمن پائیں گے اور مسلمانوں سے محبت کرنے میں ان لوگوں کو دوسروں سے بڑھ کر پائیں گے جنہوں نے کہا کہ ہم نصاریٰ ہیں۔اس کی وجہ یہ ہے کہ ان میں عالم اور زاہد ہیں اور وہ تکبر نہیں کرتے۔''

لَتَجِدَنَّ اَشَدَّ النَّاسِ عَدَاوَةً لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا الْيَهُوْدَ وَالَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا ۚ وَلَتَجِدَنَّ اَقْرَبَهُمْ مَّوَدَّةً لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّا نَصٰرٰى ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّ مِنْهُمْ قِسِّيْسِيْنَ وَرُهْبَانًا وَّاَنَّهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ ﴿۸۲﴾ (مائدہ)

یہاں سے یہ بات بخوبی واضح ہوجاتی ہے کہ اہلِ ایمان کے ساتھ یہودیوں کی دشمنی کا سبب ان کا تکبر تھا جبکہ اہلِ ایمان کے ساتھ نصاریٰ کی محبت کا سبب یہ ہے کہ ان میں تکبر اور استکبار نہیں تھا۔

متکبر اور مستکبر افراد کی ہمیشہ یہ خواہش ہوتی ہے کہ دوسرے ان کے سامنے کمزور، ذلیل اور حقیر ہوں۔یہی وجہ ہے کہ جب انہیں کوئی نعمت ملتی ہے تو ان کی دشمنی میں شدت آجاتی ہے اور وہ ان کے خلاف محاذ آرائی پر اتر آتے ہیں۔بلاشبہ تکبر حسد، کینہ اور دشمنی کا باعث ہوتا ہے۔

یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ یہاں نصاریٰ سے مراد تمام نصاریٰ نہیں ہیں بلکہ زیادہ تر نجاشی اور اس کی قوم مراد ہیں جنہوں نے حبشہ میں مسلمانوں کا استقبال کیا اور ان کے خلاف قریش کے نمائندوں کی بات کو کوئی اہمیت نہ دی۔اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حبشہ میں مسلمانوں کو ایک قابلِ اطمینان پناہ گاہ مل گئی۔بہرحال اس آیت میں یہ بات اچھی طرح واضح ہوجاتی ہے کہ استکبار، حق اور اہلِ حق کے ساتھ دشمنی کی بنیادی سبب ہوتا ہے جبکہ تواضع، حق اور اہلِ حق کے ساتھ محبت اور حق کے ساتھ خضوع کا سبب ہوتا ہے۔

آٹھویں آیت اس بات پر زور دیتی ہے کہ استکبار کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان کفر، بے ایمانی اور حق کے مقابلہ میں ضد اور ہٹ دھرمی کا رویہ اختیار کر لیتا ہے۔اس آیت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ظہورِ اسلام کے دور کا ذکر کیا گیا ہے۔یہ آیت ولید بن مغیرہ کے بارے میں بات کر رہی ہے:

''اس نے تیوری چڑھائی اور جلد بازی کی، اس نے حق کی طرف پشت کی اور تکبر کیا اور کہا کہ یہ قرآن گزشتہ اقوام کے جادو کی طرح ایک جادو ہے۔''

"ثُمَّ عَبَسَ وَبَسَرَ ۔ ثُمَّ اَدْبَرَ وَاسْتَكْبَرَ ۔ فَقَالَ اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ يُّؤْثَرُ"۔

''سحر'' کا لفظ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ ولید بن مغیرہ قرآن کی غیر معمولی کشش اور انسانی قلب وذہن پر اس کی گہری تاثیر کا اعتراف کرتا تھا۔ اگر وہ حقیقت پسندی سے دیکھتا تو قرآن مجید کی اس خاصیت کو اس کا اعجاز سمجھتا اور اس کی صداقت اور حقانیت پر ایمان لے آتا۔ مگر چونکہ اُس نے غرور واستکبار کی نظر سے دیکھا، لہٰذا یہ فیصلہ دیا کہ قرآن گزشتہ اقوام کے جادو کی مانند ایک جادو ہے۔ جب بھی انسان کی آنکھوں پر استکبار کی پٹی بندھ جائے، وہ حق کو باطل اور باطل کو حق دیکھنے لگتا ہے۔

ولید بن مغیرہ کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ اس قدر مغرور اور خود پسند تھا کہ کہا کرتا تھا:

"اَنَا الْوَحِيْدُ بْنُ الْوَحِيْدِ، لَيْسَ فِي الْعَرَبِ نَظِيْرٌ، وَلَا لِاَبِيْ نَظِيْرٌ!"

''میں بھی اپنی مثال آپ ہوں اور میرا باپ بھی اپنی مثال آپ تھا۔ عرب میں کوئی میری نظیر ہے، نہ میرے باپ کی کوئی نظیر ہے۔''

اس کے ساتھ وہ اپنے لوگوں میں ایک تعلیم یافتہ اور دانش مند انسان سمجھا جاتا تھا۔ اس نے قرآن مجید کی عظمت کا اندازہ بخوبی کرلیا تھا۔ اس بات کا ثبوت اس کا وہ جملہ ہے جو اس نے رازداری کے ساتھ اپنے قبیلے بنی مخزوم سے کہا تھا:

"اِنَّ لَهٗ لَحَلَاوَةً، وَاِنَّ عَلَيْهِ لَطَلَاوَةً، وَاِنَّ اَعْلَاهُ لَمُثْمِرٌ وَاِنَّ اَسْفَلَهٗ لَمُغْدِقٌ وَاِنَّهٗ لَيَعْلُوْ وَلَا يُعْلٰى عَلَيْهِ۔" (تفسیر قرطبی، 10:6866 ودیگر کتبِ تفسیر وتاریخ)

''قرآن میں ایک ایک خاص شیرینی اور طراوت پائی جاتی ہے۔ اس کی شاخیں پُرثمر اور اس کی جڑیں مضبوط ہیں۔ یہ ایک ایسا کلام ہے جو ہر کلام سے برتر ہے اور اس سے برتر کوئی کلام نہیں ہے۔''

اس کا یہ بیان اس بات کی دلیل ہے کہ وہ اپنے زمانہ میں سب سے بڑھ کر قرآن کی عظمت سے آشنا تھا۔ لیکن اس کے غرور وتکبر نے اسے قرآن کے آفتابِ عالم تاب کو دیکھنے، اس کی حقانیت کا اعتراف کرنے اور اس کے سامنے سر جھکانے کی اجازت نہ دی۔

نویں آیت میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

''وسوسہ کرنے والے اسرافِ کار وہ ہیں جو بغیر کسی حجت ودلیل کے اللہ کی آیات کے بارے میں بحث کرتے ہیں۔''

"اَلَّذِيْنَ يُجَادِلُوْنَ فِيْٓ اٰيٰتِ اللّٰهِ بِغَيْرِ سُلْطٰنٍ اَتٰىهُمْ۔"

اس کے بعد مزید فرمایا گیا: ''یہ کام (حق کے مقابلہ میں بے اساس بحث وجدال) اللہ تعالیٰ اور اہلِ ایمان کی نظر میں بہت زیادہ غضب کا باعث ہے۔''

"كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ وَعِنْدَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۔"

آیت کے اختتام پر فرمایا کہ حق کو تسلیم نہ کرنے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر متکبر اور جبار کے دل پر مہر لگا دیتا ہے:

"كَذٰلِكَ يَطْبَعُ اللّٰهُ عَلٰى قَلْبِ مُتَكَبِّرٍ جَبَّارٍ ۔"

متکبر اور جبار لوگوں کے دلوں پر مہر لگانے کے معنی یہ ہیں کہ حق کے ساتھ دشمنی کی وجہ سے ان کی عقل پر اسی طرح پردہ پڑ جاتا ہے کہ وہ حقیقت کو سمجھنے کی صلاحیت کو مکمل طور پر کھو دیتے ہیں۔ انہیں اپنی ذات اور اپنے مفادات کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔ ان کے ذہن ایک ایسے بند برتن کی مانند ہو جاتے ہیں جن کے اندر کے گندے مواد کو باہر نکالنا یا باہر سے پاکیزہ مواد ان میں داخل کرنا ممکن نہیں ہوتا۔ یہ دراصل تکبر اور جباریت جیسی صفات کا نتیجہ ہے۔ درحقیقت جباریت بھی تکبر ہی سے جنم لیتی ہے، اس لئے کہ ایسے مواقع پر متکبر انسان کوشش کرتا ہے کہ جبر اور طاقت کے ذریعے اپنے مخالفوں کا خاتمہ کر دے۔ اس بارے میں وہ عقل کی کوئی بات سننے کا روادار نہیں ہوتا۔ بالفاظ دیگر وہ اپنی خود پسندی اور تکبر کی وجہ سے دوسروں کو اپنی پیروی پر مجبور کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس طرح جباریت تکبر کا نتیجہ اور ثمر قرار پاتی ہے۔

البتہ لفظ ''جبار'' اللہ تعالیٰ کے لئے بھی بولا جاتا ہے مگر اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ وہ نقائص کی تلافی اور معاملات کی شکستگی کی اصلاح کرنے والا ہے۔

دسویں آیت میں ایک عام ضابطہ بیان کیا گیا ہے جس کا کسی خاص گروہ سے تعلق نہیں ہے۔ اس آیت میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ جب کفار کو جہنم کے قریب لایا جائے گا تو ان سے کہا جائے گا۔

''جہنم کے دروازوں سے داخل ہو جاؤ اور ہمیشہ وہاں رہو، متکبرین کا کتنا بُرا ٹھکانہ ہے۔''

"قِيْلَ ادْخُلُوْٓا اَبْوَابَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا فَبِئْسَ مَثْوَى الْمُتَكَبِّرِيْنَ ۔"

یہ بات متعدد دیگر آیات میں بھی بیان کی گئی ہے جیسے سورۂ زمر، آیت 60 میں ہے:

"اَلَيْسَ فِيْ جَهَنَّمَ مَثْوًى لِّلْمُتَكَبِّرِيْنَ ۶۰ ۔"

''کیا متکبرین کا ٹھکانہ جہنم میں نہیں ہے؟''

یہ نکتہ قابلِ توجہ ہے کہ اہلِ جہنم کی صفات میں سے ان کی صفتِ تکبر کو اُجاگر کیا گیا ہے جس سے یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ انسان کی ہلاکت و بدبختی میں اس صفتِ رذیلہ کا عمل دخل کس قدر زیادہ ہے، یہاں تک کہ یہ انسان کو جہنم میں لے جاتی ہے اور جہنم میں بھی اُسے ایسی جگہ پر رکھا جاتا ہے جہاں مخصوص اور زیادہ دردناک سزا اُس کیلئے تیار کی گئی ہے۔

گیارہویں آیت میں بھی ایک عام ضابطے کی شکل میں متکبرین کے بارے میں کی گئی ہے۔اس آیت میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

''جولوگ زمین میں ناحق تکبر کرتے ہیں،عنقریب ہم اُنہیں اپنی آیات سے پھیر دیں گے۔پھر وہ حق کی جو بھی نشانی دیکھیں گے،اس پر ایمان نہیں لائیں گے،اگر راہِ ہدایت کو دیکھیں گے تو اسے اختیار نہیں کریں اور اگر گمراہی کے راستے کو دیکھیں گے تو اسے اختیار کرلیں گے۔یہ اس وجہ سے ہے کہ انہوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا اور ان سے غافل رہے''۔(اعراف:146)

"سَاَصۡرِفُ عَنۡ اٰيٰتِىَ الَّذِيۡنَ يَتَكَبَّرُوۡنَ فِى الۡاَرۡضِ بِغَيۡرِ الۡحَقِّ‌ؕ وَاِنۡ يَّرَوۡا كُلَّ اٰيَةٍ لَّا يُؤۡمِنُوۡا بِهَا‌ۚ وَاِنۡ يَّرَوۡا سَبِيۡلَ الرُّشۡدِ لَا يَتَّخِذُوۡهُ سَبِيۡلًا‌ۚ وَاِنۡ يَّرَوۡا سَبِيۡلَ الۡغَىِّ يَتَّخِذُوۡهُ سَبِيۡلًا‌ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمۡ كَذَّبُوۡا بِاٰيٰتِنَا وَكَانُوۡا عَنۡهَا غٰفِلِيۡنَ"۔

اس آیت کے دل دہلا دینے والے الفاظ ان مصائب کی شدت اور گہرائی کی خبر دیتے ہیں جن میں متکبرین کو گرفتار ہونا ہے۔اللہ تعالیٰ ان کو ایسی سزا دیتا ہے کہ یہ حق کا اثر قبول کرنے کی صلاحیت سے محروم ہو جاتے ہیں۔پھر اگر اللہ تعالیٰ کی تمام آیات ومعجزات بھی انہیں دیکھا دیئے جائیں،یہ ایمان نہیں لاتے۔حتیٰ کہ اگر ہدایت کا راستہ ان کے قدموں کے سامنے رکھ دیا جائے تو بھی اس پر قدم نہیں رکھیں گے لیکن اگر گمراہی وسرکشی کا راستہ دیکھیں تو فوراً اس کی طرف لپکتے ہیں۔''

اس آیت میں ''بِغَيۡرِ الۡحَقِّ'' کے الفاظ کی نشاندہی کرتے ہیں کہ عظمت اور کبریائی صرف اللہ تعالیٰ کی شان ہے۔اگر انسان جیسی ناچیز مخلوق تکبر کرے تو یہ ہر حال میں ناحق ہوگا۔بعض اہلِ علم نے اس کی تشریح کرتے ہوئے کہا ہے کہ تکبر کی دو اقسام ہیں:اگر تکبر اللہ کے اولیاؑ کے مقابلہ میں ہو تو ناحق ہوگا لیکن اگر دشمنانِ خدا کے مقابلہ میں ہو تو یہ ناحق نہیں ہوتا۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ ''تَ۬كَبَّرُوۡنَ فِى الۡاَرۡضِ'' یعنی ''وہ زمین میں تکبر کرتے ہیں'' سے واضح ہو جاتا ہے کہ یہ تشریح درست نہیں ہے بلکہ زمین میں تکبر ہر حال میں قابلِ مذمت ہے۔

آگے چل کر اس آیت میں تکبر کے سب سے اہم نتیجہ کا ذکر ان الفاظ میں کیا گیا ہے کہ یہ حق کی ہر نشانی اور ثبوت کو دیکھ لینے کے باوجود اسے قبول نہیں کریں گے جبکہ گمراہی وضلالت کی راہ دیکھ لیں تو فوراً اس کی طرف چل پڑیں گے۔

بلاشبہ تکبر اور غرور ایک ایسا حجاب ہے جس کی وجہ سے انسان حق کو باطل اور باطل کو حق سمجھنے لگتا ہے۔یہ حجاب حقیقی سعادت کی شاہراہ سے انسان کو دور کر دیتا ہے جبکہ ہلاکت اور بدبختی کے راستوں کو سعادت کی راہ کے طور پر انسان کو دکھاتا ہے۔کسی انسان کیلئے اس سے بڑھ کر کیا بدقسمتی ہوسکتی ہے کہ وہ حق کی نشانیوں کو نظر انداز کر کے ضلالت وہلاکت کی راہ پر چل رہا ہو اور یہ سمجھ رہا ہو کہ وہ فلاح وسعادت کی راہ پر چل رہا ہے۔

بارہویں آیت میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

''یقیناً اللہ تعالیٰ ان سب کو جانتا ہے جنہیں یہ چھپاتے ہیں اور جنہیں یہ ظاہر کرتے ہیں اور بے شک اللہ تکبر کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔''

لَا جَرَمَ اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا يُسِرُّوْنَ وَمَا يُعْلِنُوْنَ ۭ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْتَكْبِرِيْنَ ۝۲۳

قرآن مجید میں اس سے ملتی جلتی تعبیرات ہمیں بکثرت نظر آتی ہیں جیسے:

"وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ ○"

''اور اللہ ظالموں کو پسند نہیں کرتا''۔(آلِ عمران:57)

"وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الْمُفْسِدِيْنَ ○"

''اور اللہ مفسدوں کو پسند نہیں کرتا''۔(مائدہ:64)

"اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ ○"

''بے شک اللہ تعالیٰ حد سے گزر جانے والوں کو پسند نہیں کرتا''(مائدہ:87)

"اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ ○"

''بے شک وہ اسراف کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا''۔(انعام:141)

"اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْخَاۗىِٕنِيْنَ ○"

''بے شک اللہ خائنوں کو پسند نہیں کرتا''۔(انفال:58)

"اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْفَرِحِيْنَ ○"

''بے شک اللہ گمراہی وسرکشی پر خوش ہونے والوں کو پسند نہیں کرتا''۔(قصص:76)

ہماری زیر بحث آیت کے ذیل میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

"اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْتَكْبِرِيْنَ"۔

''بے شک وہ استکبار کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا''۔

اگر ان تعبیرات میں غور کیا جائے تو یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ ان کے درمیان کیسا خاص رابطہ اور تعلق موجود ہے۔ہم یہ بات بآسانی کہہ سکتے ہیں کہ مندرجہ بالا آیات میں جن افراد کو اللہ تعالیٰ کے ناپسندیدہ افراد قرار دیا گیا ہے، ان سب میں ایک صفتِ رذیلہ مشترک ہے اور وہ ہے خود پسندی اور احساسِ برتری۔یہی وہ صفتِ رذیلہ ہے جو ظلم، فساد، اسراف اور فخر وغرور کی بنیاد ہے۔

ان سات اقسام کے افراد کو اللہ تعالیٰ کے ناپسندیدہ افراد قرار دینے کا مطلب یہ ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہِ قرب سے دور ہی اس لئے ہیں کہ بدترین رذیلتِ اخلاقی جو قربِ خدا کے حصول میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے، ان کے اندر پائی جاتی ہے۔

تیرہویں آیت، جو مفسرین کے مطابق نجران کی نصاریٰ کے ساتھ گفتگو کے بارے میں ہے، کہہ رہی ہے:

''حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ کا بندہ ہونے سے کوئی انکار نہیں ہے اور نہ ہی اللہ کے مقرب فرشتے اس کی بندگی سے انکار کرنے والے ہیں۔ جو لوگ اللہ کی عبادت سے روگردانی کرنے والے ہیں، جلد ہی اللہ ان کو قیامت میں محشور کرے گا۔''

"لَنْ يَّسْتَنْكِفَ الْمَسِيْحُ اَنْ يَّكُوْنَ عَبْدًا لِّلّٰهِ وَلَا الْمَلٰٓئِكَةُ الْمُقَرَّبُوْنَ ۔ وَمَنْ يَّسْتَنْكِفْ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَيَسْتَكْبِرْ فَسَيَحْشُرُهُمْ اِلَيْهِ جَمِيْعًا ۔

اگلی آیت میں اس بات پر مزید زور دینے کیلئے کہا گیا:

''جو لوگ ایمان لائے اور عملِ صالح کرتے رہے، اللہ ان کا اجر پوری طرح دے گا اور اپنے فضل سے ان کو مزید عطا فرمائے گا۔ لیکن جن لوگوں نے انکار اور استکبار کی روش اختیار کی، اللہ انہیں سخت سزا دے گا اور وہ (اللہ کی اس سزا کے خلاف) کوئی حامی اور مددگار نہیں پائیں گے''۔

فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَيُوَفِّيْهِمْ اُجُوْرَهُمْ وَيَزِيْدُهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ ۚ وَاَمَّا الَّذِيْنَ اسْتَنْكَفُوْا وَاسْتَكْبَرُوْا فَيُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ۙ وَّلَا يَجِدُوْنَ لَهُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا ﴿۱۷۳﴾ (نساء)

یہ آیات عیسائیوں کے اُن بے بنیاد دعوؤں پر ایک تبصرہ ہیں جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی الوہیت کے قائل تھے اور سمجھتے تھے کہ اگر ان کی خدائی کا انکار کر دیا گیا تو اُن کا مقام و مرتبہ گھٹ جائے گا اور ان کی توہین ہو جائے گی۔

قرآن مجید یہ فرماتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اپنے لئے کسی ایسے مقام کے قائل تھے اور نہ ہی اللہ تعالیٰ کے مقرب فرشتوں میں سے کوئی فرشتہ اپنے لئے اس مقام کا قائل ہے۔ سب اپنے آپ کو اللہ کا بندہ سمجھتے ہیں اور اس کے حضور سر جھکائے ہوئے ہیں اور اُس کی بندگی کرتے ہیں۔ جو کوئی اللہ کی عبادت سے روگردانی اور استکبار کرے، خواہ نبی ہو یا فرشتہ، اسے دردناک عذاب دیا جائے گا اور کوئی اس عذاب سے بچانے کیلئے اس کا حامی و مددگار نہ ہوگا۔

یہ نکتہ قابلِ توجہ ہے کہ اگلی آیت میں استکبار و خود پسندی کے مقابلہ میں ایمان اور عملِ صالح کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس سے بخوبی یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ جو لوگ استکبار کی راہ اختیار کرتے ہیں، وہ درحقیقت ایمان اور عملِ صالح سے محروم ہوتے ہیں۔

اس آیت میں ''استنکاف'' کا لفظ استعمال ہوا ہے، جس کا اصل مادہ نکف ہے جو ''نَصَرَ یَنْصُرُ'' کے وزن پر ہے۔ اس لفظ

کے اصل معنی انگلی کی مدد سے چہرے سے آنسو صاف کرنے کے ہیں۔ بنابرایں اللہ کی بندگی سے استنکاف کے اصل معنی اللہ کی بندگی سے دُور ہونے کے ہیں، خواہ اس کی وجہ جہالت، غفلت اور سستی وکاہلی ہو یا کوئی اور چیز لیکن جن اس کے بعد ''اسْتَكْبَرُوْ'' کا لفظ آجائے تو اس کے معنی ہوں گے: ''استکبار کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی عبادت سے دور ہونا''۔ آیت میں ''یَّسْتَنْكِفْ'' کے بعد ''یَسْتَكْبِرْ'' کا لفظ استعمال کرنا اسی حقیقت کی طرف اشارہ ہے۔

بہرحال اس آیت کی سخت تعبیرات ان خطرات کی اہمیت کو بخوبی اُجاگر کردیتی ہے جو استکبار کی وجہ سے ہر انسان کو لاحق ہوسکتے ہیں۔ یہ وہی حقیقت ہے جسے ہم ثابت کرنا چاہ رہے ہیں۔

چودھویں اور آخری آیت میں استکبار کے ایک اور دردناک نتیجہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

''جن لوگوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا اور ان کے ساتھ استکبار سے پیش آئے، ان کیلئے آسمان کے دروازے نہیں کھولے جائیں گے جب تک کہ اونٹ سوئی کے سوراخ میں سے نہ گزر جائے اور ہم مجرموں کو اسی طرح سزا دیتے ہیں''۔

''اِنَّ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَاسْتَكْبَرُوْا عَنْهَا لَا تُفَتَّحُ لَهُمْ اَبْوَابُ السَّمَآءِ وَلَا يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ حَتّٰى يَلِجَ الْجَمَلُ فِيْ سَمِّ الْخِيَاطِ ؕ وَ كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُجْرِمِيْنَ○''(اعراف:40

اس آیت میں تکذیب کے ساتھ استکبار کا بھی ذکر کیا گیا ہے اور جیسا کہ گزشتہ بیانات میں ہم یہ بات واضح کر چکے ہیں کہ اللہ کی آیات کے انکار اور انبیائے الٰہی کی مخالفت کی اصل وجہ استکبار تھی۔ کبھی وہ کہتے تھے کہ اس شخص کو جو نبوت کا مدعی ہے، ہم پر کیا برتری حاصل ہے؟ اللہ کی آیات ہم پر کیوں نازل نہ ہوئیں؟ کبھی کہتے کہ معاشرے کے غریب اور سادہ لوح جوان کیوں اس کے گرد جمع ہوگئے ہیں؟ ہم یہ اجازت نہیں دیں گے کہ وہ ہمارے ساتھ ایک صف میں کھڑے ہوں۔ اگر رسول اللہؐ ان فقیروں کو اپنے پاس سے دور نہ کردیں تو ہم ان کی محفل میں شریک نہیں ہوں گے۔ اس طرح کے بہانوں کی آڑ میں وہ اللہ کی آیات پر ایمان لانے سے انکار کرتے تھے۔

''لَا يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ حَتّٰى يَلِجَ الْجَمَلُ فِيْ سَمِّ الْخِيَاطِ''

کے الفاظ قرآن مجید میں صرف اسی آیت میں آئے ہیں۔ یہ اس بات پر واضح تاکید ہے کہ جس طرح اونٹ کا سوئی کے سوراخ سے گزرنا ناممکن ہے، اسی طرح متکبر افراد کا جنت میں داخل ہونا ناممکن ہے۔ بالفاظِ دیگر جنت کا راستہ گویا اس قدر تنگ ہے کہ اسے سوئی کے سوراخ سے تشبیہ دی گئی ہے اور صرف متواضع افراد، جنہوں نے اپنے آپ کو اللہ کے سامنے چھوٹا کرلیا ہے، وہی اس میں سے گزر سکتے ہیں۔

(اس آیت میں لفظ ''جمل'' کا استعمال ہوا ہے۔ عربی میں جمل اس اونٹ کو بھی کہتے ہیں جس کے حال ہی میں دانت نکلے

ہوں اور اس مضبوط رسی کو بھی کہتے ہیں جس کی مدد سے کشتیوں کو قابو میں رکھا جاتا ہے۔ بعض مفسرین نے اس آیت میں جمل سے رسی مراد لی ہے)۔

"لَا تُفَتَّحُ لَهُمْ اَبْوَابُ السَّمَآءِ"

''ان کے لئے آسمان کے دروازے نہیں کھولے جائیں گے''، اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے جس کی وضاحت احادیث میں اس طرح کی گئی ہے کہ جب مؤمن فوت ہوتا ہے تو فرشتے اُس کی روح اور اعمال کو آسمانوں کی طرف لے جاتے ہیں اور آسمانوں کے دروازے ان کیلئے کھول دیئے جاتے ہیں۔ لیکن جب متکبروں کی روح اور اعمال کو اوپر لے جایا جاتا ہے تو آسمان کے دروازے ان کیلئے نہیں کھولے جاتے اور منادی ندا دیتا ہے کہ ان کو واپس لے جاؤ اور جہنم میں ڈال دو۔ (تفسیر مجمع البیان)

نتیجہ:

مندرجہ بالا آیات سے ہم یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ قرآن مجید تکبر اور استکبار کو انسان کی ناپسندیدہ ترین اور مذموم ترین صفت قرار دیتا ہے۔ یہ ایسی صفتِ خبیث ہے جو دوسری بہت سی برائیوں اور گناہوں، حتیٰ کہ کفر کا سبب بھی بن سکتی ہے۔ جن لوگوں میں یہ صفت پائی جاتی ہے، وہ ہرگز سعادت حاصل نہیں کر سکتے اور اللہ تعالیٰ کے قرب کی راہ تک نہیں پہنچ سکتے۔ پس سالکانِ الی اللہ اور راہیانِ راہِ حق پر لازم ہے کہ سب سے پہلے اپنے وجود سے استکبار اور خود پسندی کے شجرِ خبیثہ کی جڑوں کو اُکھاڑ پھینکیں، اس لئے کہ یہ ان کی راہ کی سب سے بڑی رُکاوٹ ہے۔

تکبر، احادیث کی روشنی میں

تکبر کی مذمت، اس کی حقیقت کی تشریح، اس کے نتائج اور اس کے علاج کے بارے میں کتبِ احادیث میں بہت سی احادیث پائی جاتی ہیں۔ ان سب احادیث کو یہاں نقل کرنا تو ممکن نہیں ہے لیکن ان میں سے چند منتخب احادیث ہم یہاں قارئین کی خدمت میں پیش کرتے ہیں۔

1۔ ایک حدیث میں ہے کہ رسولؐ اللہ نے فرمایا:

"اِيَّاكُمْ وَالْكِبْرَ فَاِنَّ اِبْلِيْسَ حَمَلَهُ الْكِبْرُ عَلَى اَنْ لَا يَسْجُدَ وَلِآدَمَ"۔

''تکبر سے دور رہو کیونکہ تکبر ہی کی وجہ سے ابلیس نے آدم کو سجدہ کرنے سے انکار کیا (اور ہمیشہ کیلئے مردود ہوگیا)''۔ (کنز العمال، حدیث: 7734)

2۔ نہج البلاغہ میں خطبہ قاصعہ میں بھی یہی بات ایک مختلف انداز میں بیان ہوئی ہے۔ اس خطبہ میں امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام ابلیس کے تکبر اور اس کے نتائج کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"فَاعْتَبِرُوا بِمَا كَانَ مِنْ فِعْلِ اللهِ بِإِبْلِيْسَ اِذْاَحْبَطَ عَمَلَهُ الطَّوِيْلَ وَجَهْدَهُ الْجَهِيدَ.....عَنْ كِبْرِ سَاعَةٍ وَاحِدَةٍفَمَنْ ذَابَعْدَاِبْلِيْسَ يَسْلَمُ عَلَى اللهِ بِمِثْلِ مَعْصِيَتِهِ"۔(نہج البلاغہ،خطبہ:92)

''جو کچھ اللہ نے ابلیس کے ساتھ کیا،اُس سے عبرت حاصل کرو۔اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے اُس کی عرصہ دراز کی عبادت اور مجاہدت کو تھوڑی سی دیر کے تکبر کی وجہ سے برباد کر دیا۔کیسے ممکن ہے کہ ابلیس کے بعد کوئی اُس جیسا عمل کرے اور اس کے انجام جیسے انجام سے محفوظ رہے؟''

اس جملہ کی تعبیرات سے یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ تھوڑی دیر کے تکبر اور خود پسندی کا بھی کس قدر خطرناک نتیجہ برآمد ہوتا ہے اور کس طرح عمر بھر کی کمائی پل بھر میں تکبر کی آگ میں جل کر راکھ ہو جاتی ہے اور متکبر کے نصیب میں ہمیشہ کی شقاوت اور عذاب رہ جاتے ہیں۔

3۔ایک اور حدیث میں حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

"اِحْذَرِ الْكِبْرَفَاِنَّهُ رَأْسُ الطُّغْيَانِ وَمَعْصِيَةِ الرَّحْمٰنِ۔"

''تکبر سے دُور رہو کیونکہ یہ سرکشی اور رحمٰن کی نافرمانی کی جڑ ہے''۔(غرر الحکم:2609)

اس حدیث سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ کبر تمام گناہوں اور برائیوں کا سرچشمہ ہے۔

4۔ایک حدیث میں امام محمد باقر علیہ السلام فرماتے ہیں:

"مَادَخَلَ قَلْبُ امْرِءٍ شَيْءٌ مِنَ الْكِبْرِ اِلَّانَقَصَ مِنْ عَقْلِهِ مِثْلَ مَادَخَلَهُ مِنْ ذٰلِكَ!قَلَّ ذٰلِكَ اَوْ كَثُرَ"۔

''جب انسان کے دل میں تکبر،داخل ہوتا ہے تو اس کے برابر عقل اس میں سے نکل جاتی ہے،خواہ کم ہو یا زیادہ''۔(بحار الانوار،75:186)

5۔ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

"اُصُولُ الْكُفْرِ ثَلَاثَةٌ،اَلْحِرْصُ وَالْاِسْتِكْبَارُ وَالْحَسَدُ،فَاَمَّا الْحِرْصُ فَاِنَّ آدَمَ حِينَ نُهِيَ عَنِ الشَّجَرَةِ حَمَلَهُ الْحِرْصُ عَلٰى اَنْ اَكَلَ مِنْهَاوَاَمَّا الْاِسْتِكْبَارُ فَاِبْلِيْسُ حَيْثُ اُمِرَبِالسُّجُوْدِلِآدَمَ فَاَبٰى،وَاَمَّا الْحَسَدُ فَاِبْنَا آدَمَ،حَيْثُ قَتَلَ اَحَدُهُمَا صَاحِبَه"

''تین چیزیں کفر کی بنیاد ہیں:حرص،استکبار اور حسد۔جب آدم کو اس خاص درخت سے منع کیا گیا تو حرص نے

انہیں اس درخت سے کھانے پر اُکسایا۔ جب اللہ نے ابلیس کو سجدہ کرنے کا حکم دیا تو اُس نے استکبار کی وجہ سے انکار کیا اور جہاں تک حسد کا تعلق ہے تو آدم کے ایک بیٹے نے اپنے بھائی کو حسد ہی کی وجہ سے قتل کیا''۔

(اصولِ کافی، 289:2)

6۔ ایک اور حدیث میں حضرت امام محمد باقر علیہ السلام اور امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

(اصولِ کافی، 310)

"لَا یَدْخُلُ الْجَنَّةَ مَنْ فِیْ قَلْبِهٖ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِنْ خَرْدَلٍ مِنْ کِبْرٍ"۔

''جس شخص کے دل میں رائی کے دانے کے برابر تکبر ہو، وہ جنت میں داخل نہیں ہوگا''۔

7۔ ایک حدیث میں امیر المومنین علیہ السلام فرماتے ہیں:

"اَقْبَحُ الْخُلُقِ التَّکَبُّرُ"۔

''تکبر بدترین اخلاقی بُرائی ہے''۔ (غرر الحکم: 2898)

ان احادیث میں تکبر کو دیگر تمام گناہوں کا سرچشمہ، عقل کے نقصان، اخلاقی رذائل اور جنت میں داخل ہونے سے محرومی کا سبب قرار دیا گیا ہے۔ ان میں سے ہر ایک اس بُرائی سے روکنے کیلئے ایک مؤثر عامل اور محرک کا کردار ادا کر سکتا ہے اور اس حقیقت کو آشکار کرنے کیلئے کافی ہے کہ انسان کو انسانی اور ایمانی مقام سے گرانے میں یہ صفت کس حد تک مؤثر ہے۔

تکبر، عقل کی روشنی میں

آیات و روایات کے علاوہ، عقل کی نظر میں بھی تکبر انتہائی مذموم صفت ہے، اس لئے کہ سب انسان اللہ کے بندے ہیں۔ ہر ایک کے اندر مختلف قسم کی صلاحیتیں اور خوبیاں پائی جاتی ہیں۔ سب ایک ہی ماں باپ کی اولاد ہیں اور اللہ کی مخلوق ہونے کی حیثیت سے سب ایک جیسے اور باہم برابر ہیں۔ لہٰذا کوئی وجہ نہیں ہے کہ کوئی شخص اپنے آپ کو دوسروں سے برتر اور دوسروں کو حقیر اور کم تر سمجھے۔ اگر اللہ نے انسان کو کسی خاص نعمت سے نوازا ہے تو اسے چاہئے کہ اس پر اللہ کا شکر ادا کرے اور تواضع اختیار کرے، نہ یہ کہ غرور و تکبر میں مبتلا ہو جائے۔

تکبر ایک ایسی بُرائی ہے کہ ہر وہ شخص جس کا ضمیر بیدار ہو، اس بات کا اعتراف کرنے میں کوئی رکاوٹ محسوس نہیں کرتا کہ تکبر بہت بڑی بُرائی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جو لوگ دین و مذہب نہیں رکھتے، وہ بھی اسے بدترین اخلاقی صفت سمجھتے ہیں۔

انسانی حقوق کا ضابطہ، جو بہت سے مفکرین اور دانشوروں نے اپنی مشترکہ کوششوں سے بنایا ہے، اس کا ایک بڑا حصہ استکبار کے خلاف جنگ کے بارے میں ہے۔ یہ اور بات ہے کہ عملی طور پر اس کے معکوس نتائج برآمد ہوئے ہیں اور اسے مستکبرین نے

دوسروں کو دبانے کیلئے ایک ہتھیار بنا رکھا ہے۔

یہ کیسے ممکن ہے کہ انسان تکبر کی رِداوڑھ لے جبکہ، بقولِ امیر المؤمنین علیہ السلام، اس کی حالت یہ ہے کہ اس کا نقطہ آغاز ایک حقیر نطفہ ہوتا ہے، انجام ایک بدبودار لاش اور اس کا اندر مختلف قسم کی آلائشات سے بھرا ہوا ہوتا ہے!

انسان، جو اس قدر کمزور اور عاجز ہے کہ ایک چھوٹا سا مچھر اُسے تکلیف میں مبتلا کر دیتا ہے، خوردبینی جراثیم اسے بیمار کر دیتے ہیں، گرمی ذرا سی بڑھ جائے تو بے حال ہو جاتا ہے، سردی سے ٹھٹھرنے لگ جاتا ہے، بارش نہ آئے تو اس کیلئے مصیبت بن جاتی ہے اور اگر ذرا زیادہ بارش آجائے تو اس کیلئے عذاب ہو جاتی ہے، خون کا دباؤ تھوڑا زیادہ ہو جائے تو اس کی زندگی کو خطرہ لاحق ہو جاتا ہے، اسے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ ایک گھنٹے کے بعد اس کے ساتھ کیا ہونے والا ہے، اسے اپنی زندگی کے اختتام کا کوئی علم نہیں ہوتا۔ بعض اوقات اس کا بہترین دوست اس کا قاتل بن جاتا ہے، اس کا قریب ترین عزیز اس کی جان کا دشمن بن جاتا ہے، پانی جو زندگی کی بنیادی ضرورت ہے، بعض اوقات اس کی موت کا سبب بن جاتا ہے۔ ہوا جو اس کی زندگی کیلئے سب سے زیادہ بنیادی اہمیت رکھتی ہے، آندھی بن کر اس کے گھر کو تباہ کر دیتی ہے۔

سرطان کی بیماری دورِ حاضر میں بہت سی اموات کا سبب بن رہی ہے۔ ہزاروں ماہرین کی شب و روز کی کوششوں اور اربوں ڈالر خرچ کرنے کے باوجود ابھی تک یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ اس بیماری کا اصل سبب کیا ہے۔ ایک چھوٹا سا خلیہ (Cell) جو خوردبین کے بغیر دیکھا بھی نہیں جا سکتا، سرکش ہو کر غیر منظم انداز میں اپنے جیسے خلیے پیدا کرنا شروع کر دیتا ہے اور مختصر سی مدت میں رسولی کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔

دنیا کے بڑے بڑے طاقتور حکمران اور بڑی بڑی مسلح افواج کے سالار، جن کی کمان میں لاکھوں سپاہیوں پر مشتمل افواج ہوتی تھیں، اسی بیماری کے ہاتھوں ہلاک ہو گئے۔ لاکھوں سپاہیوں پر مشتمل جدید ترین اسلحہ سے لیس ان کی فوجیں ایک خلیے کی سرکشی کا خاتمہ نہ کر سکیں۔

جس انسان کی کمزوری اور ناتوانی کا یہ عالم ہو، اُسے کیا حق حاصل ہے کہ بڑائی اور تکبر کا دعویٰ کرے۔ عظمت اور بڑائی صرف اللہ کو زیب دیتی ہے۔ اس کے سوا سب چھوٹے، ضعیف اور ناتوان ہیں۔

ہم اس بحث کو امیر المومنین علیہ السلام کے اس ارشادِ گرامی پر ختم کرتے ہیں:

"مِسْكِيْنُ ابْنُ آدَمَ مَكْتُومُ الْاَجَلِ، مَكْنُوْنُ الْعِلَلِ، مَحْفُوظُ الْعَمَلِ، تُؤْلِمُهُ الْبَقَّةُ وَتَقْتُلُهُ الشَّرْقَةُ، وَتُنْتِنُهُ الْعَرْقَةُ"۔ (نہج البلاغہ، کلماتِ قصار: 219)

''بیچارہ ابن آدم، اس کی موت نامعلوم، بیماری کے اسباب پوشیدہ، اس کے اعمال اللہ کے ہاں محفوظ، ایک مچھر اسے تکلیف میں مبتلا کر دیتا ہے، غذا کا ایک لقمہ اس کے گلے میں پھنس جائے تو اسے ہلاک کر دیتا ہے اور تھوڑا سا پسینہ اسے بدبودار کر دیتا ہے۔ جس انسان کی حالت یہ ہو، اُسے تکبر اور بڑائی کا دعویٰ زیب نہیں دیتا''۔

اہم نکات

اس سلسلہ میں چند ضروری نکات قابلِ بحث ہیں جنہیں ہم نوعناوین کے تحت زیر بحث قرار دیں گے۔

1۔تکبر کی حقیقت اور تعریف:۔

علم اخلاق کے علمائے بزرگ کے مطابق تکبر کی بنیاد یہ ہے کہ انسان اپنے آپ کو دوسروں سے بڑا سمجھ کر اطمینان اور خوشی محسوس کرتا ہے۔اس لحاظ سے دیکھا جائے تو تکبر تین عناصر سے تشکیل پاتا ہے:

ایک یہ کہ انسان اپنے لئے کسی مقام کا قائل ہوتا ہے۔

دوسرے کیلئے بھی کسی مقام کا قائل ہوتا ہے۔

اپنے مقام کو دوسرے کے مقام سے برتر سمجھ کر خوشی محسوس کرتا ہے۔

اسی لئے کہا گیا ہے کہ تکبر خود پسندی سے مختلف چیز ہے،اس لئے کہ خود پسندی یعنی عُجب میں کوئی موازنہ درکار نہیں ہوتا بلکہ انسان علم،عبادت،دولت یا کسی اور وجہ سے اپنے آپ کو بڑا سمجھتا ہے،چاہے دنیا میں اس کے سوا کوئی بھی موجود نہ ہو۔لیکن تکبر میں متکبر اپنا موازنہ دوسروں کے ساتھ کرتا ہے اور اپنے آپ کو ان سے برتر سمجھتا ہے۔

کبر اور تکبر کے الفاظ بعض اوقات مذکورہ بالا نفسانی کیفیت کے بیان کیلئے استعمال ہوتے ہیں جبکہ بعض اوقات اس کیفیت کے بنیاد پر انجام پانے والے افعال کو بھی تکبر کا نام دیا جاتا ہے،مثلاً اس کے چلنے،بیٹھنے،بات کرنے کے انداز سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو اپنے اردگرد کے لوگوں سے برتر سمجھتا ہے۔یہ اعمال وافکار جو اُس کے باطنی تکبر کی نشاندہی کرتے ہیں،انہیں بھی تکبر کہا جاتا ہے۔

تکبر کی علامات بہت زیادہ ہیں۔ان میں سے ایک یہ ہے کہ متکبر افراد لوگوں سے بہت توقعات رکھتے ہیں،مثلاً وہ توقع رکھتے ہیں کہ لوگ انہیں سلام کریں،کوئی ان سے پہلے محفل میں داخل نہ ہو،محفل میں ہمیشہ نمایاں جگہ پر بیٹھیں،لوگ ان کا احترام کریں،کوئی ان پر تنقید نہ کرے،حتیٰ کہ ان کو نصیحت یا مشورہ بھی نہ دیں بلکہ ان کے سامنے دست بستہ رہیں۔

ظاہر سی بات ہے کہ تکبر کے ضعیف یا طاقتور ہونے کے اختلاف سے یہ حالات بھی مختلف ہوتے ہیں۔ممکن ہے بعض لوگوں میں ساری علامات پائی جاتی ہوں اور بعض میں ان میں سے کچھ نشانیاں موجود ہوں۔

2۔تکبر کا شاخیں:۔

اس مقام پر ہمارے سامنے کئی مفاہیم ظاہر ہوتے ہیں جن کے بارے میں عام طور پر یہ تصور پایا جاتا ہے کہ وہ باہم

مترادف ہیں، حالانکہ ان کے درمیان بہت لطیف فرق پایا جاتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ان سب کی بنیاد تکبر ہے۔ احساسِ برتری ،خودمحوری،خود پسندی، برتری طلبی اور فخر، یہ سب ایسے مفاہیم ہیں جن کی بنیاد تکبر ہے۔

جوشخص خود کو دوسروں سے برتر سمجھتا ہو، اس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ احساسِ برتری میں مبتلا ہے۔ جوشخص اس احساسِ برتری کی وجہ سے یہ چاہتا ہو کہ ہر جگہ اور ہر میدان میں اُس کا سکہ جما ہوا ہو، اُسے ''خودمحور'' کہا جاتا ہے۔

جوشخص معاشرتی معاملات میں، خصوصاً مشکل حالات میں صرف اپنے مفادات کے بارے میں سوچتا ہو اور دوسروں کے مفادات کو اہمیت نہ دیتا ہو، اسے ''خودخواہ'' یا ''خود پسند'' کہا جاتا ہے۔

جوشخص دوسروں پر اپنی برتری قائم کرنا چاہتا ہو، اُسے ''برتری طلب'' کہا جاتا ہے۔

جوشخص اپنے مال ودولت ،طاقت واقتدار وغیرہ کی دوسروں کے سامنے نمائش کرے، اُسے ''فخر کرنے والا'' یا ''فخرفروش'' کہا جاتا ہے۔

حقیقت میں ان تمام صفات کی جڑ مشترک ہے جس کا نام تکبر ہے۔ اگرچہ یہ مختلف صورتوں میں ظاہر ہوتی ہیں۔

3۔ تکبر کس کے سامنے!

علمائے علم اخلاق نے تکبر کی تین اقسام بیان کی ہیں:

1۔ اللہ کے سامنے تکبر۔

2۔ انبیاءؑ کے سامنے تکبر

3۔ مخلوق کے سامنے تکبر

اللہ کے سامنے تکبر، تکبر کی بدترین قسم ہے جو جہل اور نادانی کی بدترین شکل کا نتیجہ ہے۔ تکبر کی اس قسم میں یہ ضعیف انسان خدائی کا دعویٰ کرنے لگتا ہے۔ وہ نہ صرف یہ کہ اپنے آپ کو اللہ کا بندہ نہیں سمجھتا بلکہ خدائی کا دعویٰ کرنے کے بعد کوشش کرتا ہے کہ اللہ کے بندوں کو اپنی بندگی کی طرف بلائے۔ یہ شخص اس حد تک آگے بڑھ جاتا ہے کہ فرعون کی طرح:

''فَقَالَ اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى ﴿۲۴﴾''

''میں تمہارا سب سے برتر رب ہوں''۔ (نازعات:24)

کا دعویٰ کرنے لگتا ہے، یا یہ کہنے لگتا ہے:

''مَا عَلِمْتُ لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرِيْ ۚ''

''میں تمہارے لئے اپنے سوا کسی خدا کو نہیں جانتا''۔ (قصص:38)

یہ بات معقول نظر نہیں آتی کہ فرعون جیسا شخص جو سالہا سال تک مصر جیسے وسیع وعریض ملک پر حکمرانی کرتا رہا، اس قدر احمق

ہوسکتا ہے کہ ربِ اعلیٰ ہونے کا دعویٰ کرے یا اپنے آپ کو کائنات کا معبود سمجھنے لگے، بلکہ جو بات قرین قیاس معلوم ہوتی ہے، وہ یہ ہے کہ فرعون جیسے افراد کو بیوقوف بنانے کیلئے اس قسم کے دعوے کرتے تھے تاکہ اپنی خدائی کا عقیدہ لوگوں پر مسلط کر کے اپنی حکومت اور اقتدار کی بنیادیں مضبوط کریں۔

اللہ کے سامنے تکبر کی ایک اور شکل وہ ہے جو ابلیس اور اس کے پیروکاروں نے اختیار کی، جنہوں نے اللہ کی اطاعت سے انکار کرتے ہوئے اپنی سمجھ بوجھ کو اللہ تعالیٰ کی حکمت سے برتر سمجھا اور کہا کہ چونکہ ابلیس آگ سے پیدا ہوا ہے، لہٰذا وہ ایک خاکی مخلوق کو کیوں سجدہ کرے؟

"لَمۡ اَکُنۡ لِّاَسۡجُدَ لِبَشَرٍ خَلَقۡتَہٗ مِنۡ صَلۡصَالٍ مِّنۡ حَمَاٍ مَّسۡنُوۡنٍ○"

''میں ہرگز اس بشر کو سجدہ نہیں کروں گا جسے تو نے سڑی ہوئی مٹی کے خشک شدہ کیچڑ سے پیدا کیا۔'' (حجر:33)

"قَالَ اَنَا خَیۡرٌ مِّنۡہُ ۚ خَلَقۡتَنِیۡ مِنۡ نَّارٍ وَّ خَلَقۡتَہٗ مِنۡ طِیۡنٍ○"

''میں اس سے بہتر ہوں، تو نے مجھے آگ سے پیدا کیا اور اسے مٹی سے پیدا کیا''۔ (اعراف:12)

بعض اوقات تکبر کا یہ ضخیم حجاب اس طرح انسان کے عقل و ہوش پر پردہ ڈال دیتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو خدائے علیم و حکیم سے زیادہ دانا اور آگاہ سمجھنے لگتا ہے۔

تکبر کی دوسری قسم اللہ کے رسولوں کے سامنے تکبر کرنا ہے۔ تکبر کی یہ قسم گزشتہ انبیاؑ کی اُمتوں میں بہت پائی جاتی تھی۔ ان اُمتوں کے بعض افراد تکبر اور استکبار کی وجہ سے اللہ کے رسولوں کی اطاعت سے انکار کرتے تھے اور فرعون کی طرح تکبر سے کہتے تھے:

"اَنُؤۡمِنُ لِبَشَرَیۡنِ مِثۡلِنَا"

''کیا ہم اپنے جیسے دو انسانوں پر ایمان لے آئیں''۔ (مؤمنون:47)

کبھی قومِ نوحؑ کے متکبر یہ کہتے ہوئے نظر آتے ہیں:

"وَ لَئِنۡ اَطَعۡتُمۡ بَشَرًا مِّثۡلَکُمۡ ۙ اِنَّکُمۡ اِذًا لَّخٰسِرُوۡنَ○"

''اگر تم نے اپنے جیسے انسان کی اطاعت اختیار کر لی تو تم ضرور نقصان اُٹھاؤ گے''۔

بعض اوقات بچگانہ بہانے بناتے اور کہتے:

"قَالَ الَّذِیۡنَ لَا یَرۡجُوۡنَ لِقَآءَنَا لَوۡ لَاۤ اُنۡزِلَ عَلَیۡنَا الۡمَلٰٓئِکَۃُ اَوۡ نَرٰی رَبَّنَا ؕ"

''جو لوگ ہماری ملاقات کی اُمید نہیں رکھتے، وہ کہتے ہیں کہ ہم پر فرشتے کیوں نازل نہیں ہوتے یا ہم اپنے رب کو کیوں نہیں دیکھتے''۔ (فرقان:21)

اگلی آیت میں قرآن مجید ان کے ان بہانوں کے جواب میں فرماتا ہے:

"لَقَدِ اسْتَكْبَرُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ وَعَتَوْ عُتُوًّا كَبِيْرًا ○"

''انہوں نے اپنے بارے میں تکبر کیا اور بہت بڑی سرکشی کی''۔(فرقان:21)

تکبر کی تیسری قسم اللہ کے سامنے تکبر ہے۔اس قسم کے متکبرین اس طرح اپنے آپ کو بڑا سمجھتے ہیں کہ اللہ کے بندوں کو حقیر اور بے مقدار سمجھنے لگتے ہیں۔وہ کسی کی بات نہیں مانتے، اپنے آپ کو سب سے برتر سمجھتے ہیں، کسی کے حقوق کا احترام نہیں کرتے اور ہمیشہ دوسروں سے توقع رکھتے ہیں کہ وہ انہیں بڑا سمجھیں اور ان کی تعظیم اور احترام کریں۔

اس قسم کے تکبر کی مثالیں معاشرے میں بکثرت نظر آتی ہیں، لہٰذا ان کی تشریح اور وضاحت کی ضرورت نہیں ہے۔بعض اوقات تکبر بڑھ کر اللہ اور اللہ کے رسولوں کے سامنے تکبر کی حد تک جا پہنچتا ہے۔

4۔تکبر کے محرکات:۔

تکبر کے محرکات اور اسباب بہت ہیں لیکن ان سب کی بنیاد ایک چیز ہے، وہ یہ کہ انسان اپنے آپ میں کوئی ایسا کمال تصور کرنے لگتا ہے جس کے بارے میں وہ سمجھتا ہے کہ دُوسرے اس کمال سے محروم ہیں۔انسان حُبِ ذات کی وجہ سے اپنے اس کمال کو بڑا (magnify) کرنے لگتا ہے اور اس حد تک چلا جاتا ہے کہ دوسروں کو اس کے نتیجہ میں حقیر سمجھنے لگتا ہے۔

علم اخلاق کے بعض علمائے بزرگ مثلاً فیض کاشانی نے اپنی کتاب محجۃ البیضاء میں سات چیزوں کو تکبر کا سبب قرار دیا ہے جن میں سے دو اسباب دینی ہیں یعنی علم اور عمل جبکہ باقی پانچ اسباب نسب، خوبصورتی، قوت، مال و دولت اور اقارب و احباب کی کثرت ہیں۔انہوں نے ان میں سے ہر ایک کی تشریح بھی کی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے:

(1)۔علم

علم بہت تیزی سے بعض علما اور دانشوروں کے غرور و تکبر کا باعث بن جاتا ہے۔ایک حدیثِ نبویؐ میں بھی آیا ہے کہ:

"آفَةُ الْعِلْمِ الْخُيَلَاءُ"

یعنی ''تکبر علم کی آفت ہے''۔

بعض افراد اِس قدر کم ظرف ہوتے ہیں کہ علم کے چند باب پڑھ کر اپنے آپ کو بڑا اور دوسروں کو چھوٹا سمجھنا شروع کر دیتے ہیں۔صرف یہی نہیں بلکہ دوسروں کو حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں اور ان کے اندر یہ خواہش پیدا ہو جاتی ہے کہ دوسرے ان کے سامنے جھکیں اور ان کا احترام کریں۔جبکہ حقیقت یہ ہے کہ حقیقی علماءؒ کے علم میں جس قدر اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے، وہ اپنے آپ کو اُتنا ہی بے علم سمجھنے لگتے ہیں، اس لئے کہ جب وہ اپنے آپ کو علم کے گہرے سمندر کے سامنے کھڑا دیکھتے ہیں تو ان پر یہ آشکار ہو جاتی ہے کہ ان کا علم اس سمندر کے سامنے چند قطروں سے زیادہ نہیں ہے۔

اس کے علاوہ ان میں یہ احساس بھی ہوتا ہے کہ جس قدر ان کا علم زیادہ ہوگا، ان کی ذمہ داری بھی اُتنی ہی زیادہ ہوگی۔ اسی حقیقت کو اس طرح بھی بیان کیا گیا ہے:

"مَنِ ازْدَادَ عِلْماً اِزْدَادَ خَوْفاً"۔

یعنی ''جس کا علم زیادہ ہوتا ہے، اس کا خوف بھی زیادہ ہوتا ہے''۔

(2)۔عمل:۔

عبادات اور نیک اعمال بھی بہت سے عبادت گزاروں اور نیکوکاروں کو تکبر میں مبتلا کر دیتے ہیں۔ یہ افراد اپنی عبادات اور اعمالِ صالحہ کی وجہ سے اپنے آپ کو دوسروں سے بڑا سمجھنے لگتے ہیں اور یہ توقع کرنے لگتے ہیں کہ لوگ انہیں نیک اور مقدس سمجھ کر ان کی زیارت کیلئے آئیں، ان کی خدمت کریں، محافل ومجالس میں انہیں خاص احترام دیں، ان کی نیکی اور زہد وتقویٰ کے چرچے ہوں۔ گویا وہ سمجھتے ہیں کہ وہ عبادت کر کے لوگوں پر احسان کر رہے ہیں۔ یہ تو ان کے تکبر کا دنیوی پہلو ہوتا ہے۔ دینی لحاظ سے یہ لوگ اس غلط فہمی میں مبتلا ہوتے ہیں کہ نجات یافتہ ہیں جبکہ دوسروں کی قسمت میں ہلاکت وبربادی لکھی جا چکی ہے۔ اس لحاظ سے وہ اپنے آپ کو دوسروں سے بہت برتر سمجھنے لگتے ہیں۔ درحقیقت ایسے لوگ خود ہلاکت کے گڑھے کے دہانے پر کھڑے ہوتے ہیں۔ ایک حدیث میں ہے کہ رسولؐ اللہ نے فرمایا:

"اِذَا سَمِعْتُمُ الرَّجُلَ يَقُوْلُ هَلَكَ النَّاسُ فَهُوَ اَهْلَكُهُمْ"۔

''جب تم کسی شخص کو یہ کہتے ہوئے سنو کہ لوگ (اپنے اعمال کی وجہ سے) ہلاک ہو گئے تو سمجھ لو کہ سب سے زیادہ وہ خود ہوا''۔

ایک اور حدیث نبویؐ میں ہے:

"كَفٰى بِالْمَرْءِ شَرّاً اَنْ يُحَقِّرَ اَخَاهُ الْمُسْلِمَ"۔

''کسی شخص کے بُرا اور بدبخت ہونے کیلئے یہی کافی ہے کہ وہ اپنے مسلمان بھائی کو حقیر جانے''۔

مرحوم فیض کاشانی محجۃ البیضاء میں ان احادیث کا ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں:

''کس قدر فرق ہے اس شخص میں جو کسی عالم یا عابد کو عالم یا عابد جان کو اس کا احترام کرتا ہے اور اس کے سامنے اپنے آپ کو چھوٹا سمجھتا ہے اور اُس عالم اور عابد میں جو اُس شخص کو چھوٹا سمجھتا ہے اور چاہتا ہے کہ وہ اس سے دور ہو جائے''۔

(محجۃ البیضاء، 169:3)

آگے چل کر وہ مزید فرماتے ہیں:

''یہ ایک ایسی آفت ہے جس سے بمشکل ہی کوئی عابد محفوظ رہ سکتا ہے۔ جب بھی کوئی اس کی بے احترامی کرتا ہے تو وہ سمجھنے لگتا ہے کہ اس کی بے احترامی کرنے والا اللہ کی نظر میں قابلِ نفرت اور مبغوض ہے۔ وہ یہ سمجھ بیٹھتا ہے کہ اللہ اس شخص کو معاف نہیں کرے گا۔ اس کے برعکس اگر وہ خود کسی کو ایسی ہی تکلیف پہنچائے تو اسے کوئی اہمیت نہیں دیتا۔ یہ ایک قسم کی جہالت اور نادانی ہے اور عُجب یعنی خود پسندی، تکبر اور غرور کا مجموعہ اور مرکب ہے۔ ایسا عابد جب دیکھتا ہے کہ اس کی بے احترامی کرنے والا کسی مصیبت میں گرفتار ہو گیا ہے تو وہ اسے اللہ کا انتقام اور اپنی کرامت سمجھنے لگتا ہے۔''

کس قدر فرق ہے ایسے مغرور اور متکبر عابد میں اور ایسے متواضع عابد میں جس کا ایک نمونہ یہ ہے کہ ایک بہت بڑے عابد نے حج کے سفر سے واپس آتے ہوئے کہا: اگر میں (گناہگار) ان حجاج میں نہ ہوتا تو شاید اللہ تعالیٰ ان سب کی مغفرت فرما دیتا۔

ہم اس گفتگو کو رسولؐ اللہ کی اس حدیث کے ساتھ ختم کرتے ہیں، روایات میں ہے کہ کسی نے آنحضرتؐ کی مجلس میں کسی شخص کی نیکی اور تقویٰ کی تعریف کی۔ تھوڑی دیر بعد وہی شخص دور سے آتا ہوا نظر آیا۔ لوگوں نے عرض کیا:

''یارسولؐ! وہ نیک اور متقی شخص یہ ہے جو ہماری طرف آ رہا ہے''۔

رسولؐ اللہ نے فرمایا: ''میں اس کے چہرے پر شیطان کی تاریکی کو دیکھ رہا ہوں۔''

وہ شخص قریب آیا، اُس نے سلام کیا اور رسولؐ اللہ اور اصحاب کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ رسولؐ اللہ نے فرمایا:

"اَسْئَلُكَ بِاللهِ حَدَّثَتْكَ نَفْسُكَ اَنْ لَيْسَ فِي الْقَوْمِ اَفْضَلُ مِنْكَ؟ فَقَالَ اَللهُمَ نَعَمْ"۔

''تمہیں اللہ کی قسم! کیا تم اپنے دل میں یہ نہیں سوچ رہے تھے کہ ان لوگوں میں کوئی تم سے افضل نہیں ہے؟''

اس نے جواب دیا: ''جی ہاں! میں ایسا ہی سوچ رہا تھا''۔ (محجۃ البیضاء، 240:6)

اصحاب سمجھ گئے کہ وہ شیطانی تاریکی جس کا مشاہدہ آنحضرتؐ نے نورِ نبوت کی روشنی میں کیا تھا، یہی تکبر اور غرور ہے۔

(3)۔ حسب ونسب:۔

تکبر کا تیسرا سبب اور محرک حسب ونسب ہے۔ جو لوگ کسی ایسے شریف گھرانے میں پیدا ہوتے ہیں جو علم وعمل، تقویٰ، شرافت اور سخاوت وغیرہ جیسی اچھی صفات کی وجہ سے شہرت رکھتا ہو، وہ اسے اپنے لئے ایک اعزاز سمجھتے ہیں اور دوسروں کو، جو ادنیٰ خاندانوں میں پیدا ہوئے ہیں، اپنے سے کم تر اور حقیر سمجھنے لگتے ہیں، حالانکہ اسلام میں حسب ونسب کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ اسلام کی نظر میں سب اللہ کے بندے اور ایک ماں باپ کی اولاد ہیں۔ اگر کسی کو کسی پر کوئی برتری حاصل ہے تو وہ تقویٰ کی وجہ سے ہے۔

یہ مسئلہ اس قدر اہم ہے کہ رسولؐ اللہ اور آئمہ معصومین علیہم السلام کسی ایسے لفظ کے استعمال کو برداشت نہیں کرتے تھے جس سے خاندانی برتری کی بو آتی ہو۔ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی موجودگی میں حضرت ابوذرؓ نے کسی کو ''یابن الوداء'' (کالی عورت کا بیٹا) کہہ کر آواز دی۔ رسولؐ اللہ نے فرمایا:

''ابوذرؓ! خاموش، سفید فام عورت کے بیٹے کو سیاہ فام عورت کے بیٹے پر کوئی برتری حاصل نہیں ہے۔''

ابوذرؓ کہتے ہیں کہ مجھے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا۔ میں زمین پر لیٹ گیا اور اُس شخص سے کہا کہ اپنا پاؤں میرے چہرے پر رکھ دے۔ (محجۃ البیضاء، 243:6)

بہر حال قرآن مجید اور احادیث میں یہ بات بار بار بیان ہوئی ہے کہ کسی انسان کو حسب ونسب کی بنیاد پر کسی پر کوئی برتری حاصل نہیں ہے۔ یہ اعتباری اُمور ہیں جو انسان کی ذات سے باہر ہوتی ہیں جبکہ انسان کی شخصیت کی قدر و قیمت ان صفاتِ معنوی کی وجہ سے ہوتی ہے جو اس کی ذات کے اندر ہوتی ہیں۔ بالفرض اگر حسب ونسب کا کسی فضیلت کے ساتھ کوئی تعلق ہو بھی تو اس کو غرور وتکبر کا سبب نہیں ہونا چاہئے۔

اگر ہم دیکھتے ہیں کہ امیر المومنین علیہ السلام نے نہج البلاغہ کے کسی خطبہ میں یا حضرت امام زین العابدین علیہ السلام نے خطبہ شام میں اپنے حسب نسب پر فخر کا اظہار کیا ہے تو اس کی وجہ یا مقصد دوسروں کے سامنے بڑائی کا مظاہرہ کرنا نہیں تھا بلکہ ان کا مقصد کچھ اور تھا۔ درحقیقت وہ چاہتے تھے کہ اپنے فضائل کا ذکر کر کے بے خبر لوگوں کو اپنے مقام اور اپنی امامت کے بارے میں آگاہ کریں۔

(4)۔ حسن وجمال اور ظاہری خوبصورتی:۔

تکبر کا چوتھا سبب یا محرک حسن وجمال اور ظاہری خوبصورتی ہے جس کی وجہ سے کوئی حسین اور خوبصورت شخص اپنے آپ کو دوسروں، خصوصاً اُن لوگوں سے جن میں کوئی جسمانی نقص ہو، برتر سمجھتا ہے اور انہیں حقارت کی نظر سے دیکھتا ہے۔ یہ بیماری خواتین میں مردوں کی نسبت زیادہ ہوتی ہے۔

ایک حدیث میں ہے کہ چھوٹے قد کی ایک عورت رسولؐ اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں آئی۔ حضرت عائشہ کہتی ہیں کہ جب وہ اپنے مسائل وغیرہ پوچھ کر واپس جا رہی تھی تو میں نے اپنے ہاتھ سے اشارہ کیا جس کا مطلب یہ تھا کہ اس کا قد کتنا چھوٹا ہے! رسولؐ اللہ نے مجھے کہا:

''تم نے اس عورت کی غیبت کی ہے''۔

فیض کاشانی اس واقعہ کا ذکر کرنے کے بعد کہتے ہیں کہ حضرت عائشہ کی اس حرکت کی وجہ ان کا تکبر تھا۔ اگر ان کا اپنا قد بھی چھوٹا ہوتا تو وہ ایسی حرکت نہ کرتیں۔

(5)۔مال ودولت:۔

تکبر کا پانچواں سبب مال ودولت ہونا ہے۔عام طور پر بادشاہ،حکمران،سرمایہ داراور جاگیردارلوگ زیادہ مال ودولت رکھنے کی وجہ سے تکبر میں مبتلا ہوجاتے ہیں۔جولوگ قیمتی لباس،اعلیٰ قسم کی سواری،عالیشان گھروں کے مالک ہوتے ہیں اوران چیزوں کی وجہ سے ان چیزوں سے محروم لوگوں پر برتری ثابت کرتے ہیں اوران کی تحقیر کرتے ہیں،وہ اس قسم کے تکبر میں مبتلا ہوتے ہیں۔یہ تکبر کی بدترین اورگھناؤنی ترین قسم ہے۔

اس قسم کے متکبر بعض اوقات اس قدر گھٹیا پن پراُتر آتے ہیں کہ کسی غریب مگر نیک اورصالح مؤمن انسان سے اس طرح کی بات بھی کہہ جاتے ہیں کہ''تیری کیا حیثیت ہے؟ میں تجھ جیسے سینکڑوں افرادکوخرید کرآزادکرسکتاہوں۔میرے ایک دن کا خرچہ تیری ساری عمر کے اخراجات سے زیادہ ہے۔''

قرآن مجید نے اس قسم کے تکبر کے کئی نمونے بیان کیے ہیں اوران کے نتائج کوبھی بیان کیاہے۔قارون کے واقعہ میں آیا ہے کہ ایک دن وہ اپنے فخروتکبر کے اظہار کیلئے اپنی زینت کے ساتھ بنی اسرائیل کے سامنے ظاہر ہوا۔اس کواس حال میں دیکھ کراس کی قوم کے لوگ حسرت سے کہنے لگے کہ کاش!ہم بھی قارون کی مانند دولت مند ہوتے۔

''فَخَرَجَ عَلٰی قَوْمِهٖ فِیْ زِیْنَتِهٖ۔ قَالَ الَّذِیْنَ یُرِیْدُوْنَ الْحَیٰوةَ الدُّنْیَا یٰلَیْتَ لَنَا مِثْلَ مَاۤ اُوْتِیَ قَارُوْنُ''۔

مزیدوضاحت کیلئے تفسیر نمونہ میں اس آیت کی تفسیر ملاحظہ فرمائیں۔

کتبِ تاریخ میں ہے وہ چار ہزارسواروں کے ساتھ اپنی قوم کے سامنے ظاہر ہوا۔وہ سب اعلیٰ گھوڑوں پر سوار تھے۔ سواروں کے لباس اورگھوڑوں کے لباس بھی انتہائی قیمتی تھے۔اس کے ساتھ انتہائی حسین کنیزیں بھی تھیں جوسفید گھوڑوں پرسوارتھیں جن کی زینیں سونے کی بنی ہوئی تھیں۔

لیکن اس کا یہ تکبر اوراس کی دولت زیادہ عرصہ باقی نہ رہے اورتھوڑی سی مدت کے بعداللہ کے حکم سے وہ اپنے تمام محلات اورساری دولت کے ساتھ زمین میں دھنس گیااور ہمیشہ کیلئے متکبروں کیلئے درسِ عبرت بن گیا۔

(6)۔جسمانی،سیاسی اورمعاشرتی قوت:۔

تکبر کی چھٹی وجہ جسمانی،سیاسی یا معاشرتی قوت اورطاقت ہے جو عام طور پر حکمرانوں اوراُمراء میں پائی جاتی ہے۔وہ اپنے آپ کو''ظِلُّ اللّٰهِ فِی الْاَرْضِیْنَ''سمجھنے لگتے ہیں۔وہ توقع رکھتے ہیں کہ دوسرے ان کے سامنے غلام بن کررہیں۔اگرکبھی کسی سے ان کی شان میں ذراسی گستاخی ہوجائے تواُسے ہرگز قابلِ معافی نہیں سمجھا جاتا۔

بعض بادشاہوں کے حالاتِ زندگی میں ملتا ہے کہ اُنہوں نے حکم دیا ہوا تھا کہ اگر کبھی رعایا کا کوئی فرداُن کے دربار میں حاضر ہوتو اپنا منہ کپڑے سے ڈھانپ کر آئے تا کہ ان کی سلطنت کی شان وشوکت عوام کے منہ کی بو سے آلودہ نہ ہوجائے۔

اس تکبر کی وجہ سے عام طور پر ان کا دماغ خراب ہوجاتا تھا جس کی وجہ سے وہ غلط فیصلے کرنے لگتے اور آخر کار انکے اقتدار کا خاتمہ ہوجاتا۔

(7)۔دوستوں اور مددگاروں کی کثرت:۔

تکبر کی ساتویں وجہ دوستوں اور مددگاروں کی کثرت ہوتی ہے۔قومیں اور قبائل اپنی عددی برتری کی وجہ سے اور حکمران وسلاطین اپنے لشکر وسپاہ کی کثرت کی وجہ سے تکبر میں مبتلا ہوجاتے ہیں۔ممکن ہے بعض علماء اپنے شاگردوں،مریدوں یا پیروگاروں کی کثرت کی وجہ سے تکبر کا شکار ہوجائیں۔حتیٰ کہ بعض اوقات فاسق وفاجر افراد اس بات پر تکبر اور غرور کا شکار ہوجاتے ہیں کہ اُنہوں نے دوسرے سے زیادہ شراب خوری کی ہے یا دوسروں کی نسبت زیادہ تعداد میں عورتوں اور لڑکوں سے بدکاری کی ہے۔

یہ سات اُمور ایسے ہیں جن کی وجہ سے عام طور پر لوگ تکبر میں مبتلا ہوجاتے ہیں۔البتہ تکبر کی وجوہات ان عوامل ومحرکات میں محدود نہیں ہیں بلکہ ہر قسم کی مادی،معنوی،حقیقی یا خیالی برتری انسان کے تکبر کا سبب بن سکتی ہے۔

ان باتوں سے یہ نتیجہ اخذ نہیں کرنا چاہئے کہ غرور وتکبر سے بچنے کے لئے انسان کو اسبابِ کمال سے دوری اختیار کر لینی چاہئے۔ان باتوں کو بیان کرنے کا مقصد یہ ہے کہ انسان کے علم،عبادت،قوت،دولت وغیرہ میں جس قدر اضافہ ہوتا جائے،انسان کو کوشش کرنی چاہئے کہ اُسی قدر وہ اللہ تعالیٰ کے حضور عاجزی وانکساری اور تواضع اختیار کرے اور اس حقیقت کو ضرور مدِنظر رکھے کہ ان چیزوں میں سے کوئی بھی پائیدار اور باقی رہنے والی نہیں ہے بلکہ یہ سب اللہ تعالیٰ کی عظمت کے سامنے ہیچ ہیں۔

5۔تکبر کی جڑیں:۔

دیگر رذائلِ اخلاقی کی طرح تکبر کی مخصوص جڑیں ہیں جنہیں تلاش کرنا ضروری ہے کیونکہ اس کے بغیر اس بیماری کی جڑوں کو اُکھاڑنا ناممکن ہے۔

فیض کاشانی نے محجۃ البیضا میں تکبر کی چار جڑوں کا ذکر کیا ہے جو عُجب (خود پسندی)،کینہ،حسد اور ریا ہیں۔ان کا کہنا ہے کہ جڑ جو انسان کے اندر ہوتی ہے،وہ عُجب یعنی خود پسندی اور احساسِ برتری ہے۔

اس کی وجہ سے وہ اپنے آپ کو دوسروں سے برتر سمجھنے لگتا ہے اور ان کے سامنے فخر وتکبر کا اظہار کرتا ہے۔تکبر کی ایک اور جڑ کینہ ہے جو کسی کے خلاف انسان کے دل میں پیدا ہوجاتا ہے۔کینہ اس بات کا سبب بنتا ہے کہ انسان اپنے واقعی یا خیالی کمالات کو اس شخص کے سامنے ظاہر کرے جس سے وہ کینہ رکھتا ہے۔اسی طرح حسد اور ریاکاری بھی اس اخلاقی بُرائی کے ظہور کا سبب بنتے ہیں۔

اگرچہ یہ چار چیزیں تکبر کی اصل جڑیں ہیں لیکن ظاہری بات ہے کہ تکبر کی جڑیں ان چار چیزوں میں محدود نہیں ہیں بلکہ ان کے علاوہ کچھ اور چیزیں بھی تکبر کی جڑیں ہوسکتی ہیں۔

6۔تکبر کی علامات:۔

جسمانی بیماریوں کی طرح اخلاقی بیماریوں کی بھی کچھ علامات ہوتی ہیں۔علمائے اخلاق نے تکبر کی علامات کا تفصیل کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ یہ علامات کبھی چہرے کے تاثرات کی صورت میں ظاہر ہوتی ہیں، مثلاً متکبر انسان دوسروں کے سامنے تیوری چڑھائے رکھتا ہے، ان کو حقارت کی نظر سے دیکھتا ہے بلکہ اپنا چہرہ پوری طرح ان کی طرف کرکے بات نہیں کرتا۔

بعض اوقات اس صفتِ رذیلہ کے آثار انسان کے اندازِ گفتگو سے نمایاں ہوجاتے ہیں۔ایسا شخص اپنے بارے میں مبالغہ آرائی پر مبنی الفاظ استعمال کرتا ہے۔اپنے بارے میں ''مَیں''، ''مجھے''، ''میرے'' کی بجائے ''ہم''، ''ہمیں''، اور ''ہمارے'' جیسے الفاظ استعمال کرتا ہے، یہاں تک کہ اس کی آواز کا اُتار چڑھاؤ بھی اس کے تکبر کی غمازی کررہا ہوتا ہے۔وہ دوسروں کی مختصر بات سننے کیلئے بھی تیار نہیں ہوتا جبکہ خود یہ چاہتا ہے کہ لوگ اس کی لمبی چوڑی اور بے معنی باتوں کو غور سے سنیں۔

بعض اوقات تکبر کے آثار وعلامات انسان کی حرکات وسکنات سے ظاہر ہوتی ہیں۔ وہ چاہتا ہے کہ وہ بیٹھا رہے اور دوسرے اُس کے سامنے کھڑے رہیں۔ جب وہ محفل میں داخل ہو، سب اُس کے احترام میں کھڑے ہوجائیں لیکن وہ خود کسی کے احترام میں کھڑا نہ ہو۔ایک حدیث میں امیرالمومنین علیہ السلام فرماتے ہیں:

"مَنْ اَرَادَ اَنْ یَنْظُرَ اِلیٰ رَجُلٍ مِنْ اَهْلِ النَّارِ فَلْیَنْظُرْ اِلیٰ رَجُلٍ قَاعِدٍ وَبَیْنَ یَدَیْهِ قَوْمٌ قِیَامٌ"۔

''جو شخص کسی جہنمی کو دیکھنا چاہتا ہو تو وہ اُس شخص کو دیکھ لے جو خود بیٹھا ہوا ہے اور کچھ لوگ اُس کے سامنے کھڑے ہیں۔متکبر انسان گلی، کوچے اور بازار میں تنہا جانا پسند نہیں کرتا بلکہ وہ چاہتا ہے کہ کچھ لوگ اس کے ساتھ ہوں جو اس کے پیچھے پیچھے چلیں''۔(بحارالانوار، 206:70)

ایک حدیث میں ہے:

"کَانَ رَسُوْلُ اللهِ فِیْ بَعْضِ الْاَوْقَاتِ یَمْشِیْ مَعَ الْاَصْحَابِ فَیَأْمُرُ هُمْ بِالتَّقَدُّمِ فِیْ غِمَارِهِمْ"۔

''بعض اوقات رسول اللہ اپنے اصحاب کے ساتھ جارہے ہوتے تھے تو انہیں حکم دیتے کہ آپ آگے چلیں اور آپؐ خود ان کے درمیان چلتے تھے''۔(المحجۃ البیضاء، 247:6)

ایسا شخص چاہتا ہے کہ لوگ اسے ملنے آئیں مگر وہ کسی سے ملنے نہ جائے۔ وہ غریبوں اور معاشرے کے پسماندہ لوگوں کے ساتھ بیٹھنا پسند نہیں کرتا۔ اگر کبھی مجبوراً ایسے لوگوں میں بیٹھنا پڑ جائے تو کوشش کرتا ہے کہ جس قدر جلد ممکن ہو، وہاں سے اُٹھ جائے۔

متکبر انسان اپنے ہاتھ سے کوئی کام کرنا پسند نہیں کرتا۔ گھریلو کاموں کو ہاتھ تک نہیں لگاتا اور چاہتا ہے کہ اس کے بیوی، بچے اور ملازم ہر وقت دست بستہ غلاموں کی طرح اس کی خدمت کے لئے حاضر ہوں۔

کبھی تکبر کے آثار اس کے لباس، سواری، گھریلو ساز و سامان وغیرہ سے ظاہر ہوتے ہیں۔ ان تمام اُمور میں اس کی کوشش ہوتی ہے کہ قارون کی طرح دوسروں کو اپنی دولت سے مرعوب کرے۔

البتہ اس کے یہ معنی ہرگز نہیں ہیں کہ انسان اچھا لباس نہ پہنے اور پھٹے پرانے کپڑے پہننا شروع کر دے بلکہ اس حدیثِ نبوی کو مدِ نظر رکھ کر اس کے مطابق عمل کرے:

"كُلُوْا وَاشْرَبُوْا وَالْبَسُوْا وَتَصَدَّقُوْا فِيْ غَيْرِ سَرَفٍ وَلَا مَخِيْلَةٍ"

''کھاؤ، پیو، پہنو اور صدقہ دو مگر اسراف اور تکبر نہ کرو''۔ (سنن ابن ماجہ، حدیث: 3605)

مختصر یہ کہ تکبر کا ظہور انسان کی زندگی کے ہر پہلو میں ہوسکتا ہے۔ یہ ہرگز ممکن نہیں ہے کہ کوئی شخص تکبر میں مبتلا ہو مگر اس کے چہرے کے تاثرات، اندازِ گفتگو اور طرزِ عمل سے اس کا اظہار نہ ہو۔

7۔ تکبر اور استکبار کے نتائج:۔

جیسا کہ پہلے اشارہ کر چکے ہیں کہ تکبر ایسی صفتِ خبیثہ ہے جو انسان کے قلب و روح، افکار و اعمال اور فردی و اجتماعی سطح پر گہرے ارتباہ کن اثرات ڈالتی ہے۔ مختصر الفاظ میں اس طرح بھی کہا جا سکتا ہے کہ ذاتی اور معاشرتی زندگی کا کوئی پہلو اس صفتِ رذیلہ کے منفی اور تباہ کن اثرات سے محفوظ نہیں رہتا۔ ذیل میں اہم ان میں سے چند چیدہ چیدہ اثرات کی طرف اشارہ کرتے ہیں:

(1)۔ کفر و شرک سے آلودگی:۔

تکبر کا سب سے پہلا اور سب سے خطرناک نتیجہ یہ ہے کہ یہ انسان کو کفر و شرک سے آلودہ کر دیتا ہے۔ آیا ابلیس کا کفر، توحید کے راستے سے اس کا بھٹک جانا بلکہ اللہ تعالیٰ کی حکمتِ کاملہ و بالغہ پر اس کے اعتراض کی وجہ تکبر کے علاوہ کوئی اور چیز تھی؟

آیا فرعون اور نمرود اور ان جیسے افراد جنہوں نے سرکشی کی وجہ سے انبیاؑ کی دعوت کو قبول نہیں کیا، ان کے انکار کی تکبر کے سوا کوئی اور وجہ تھی؟

تکبر انسان کو حق کے سامنے جھکنے نہیں دیتا، اس لئے کہ اس کی عقل و بصیرت پر پڑا ہوا تکبر کا ضخیم حجاب اسے حق کے حسین چہرے کا جلوہ نہیں دیکھنے دیتا۔ یہ تکبر کا سب سے بڑا نقصان ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ جب کسی شخص نے حضرت امام جعفر صادق علیہ

السلام سے پوچھا: ''الحاد کا سب سے ادنیٰ درجہ کونسا ہے؟''
آپؑ نے فرمایا: ''تکبر''۔(اصول کافی، 309:2)

(2)۔علم ودانش سے محرومی:۔

تکبر کے منحوس نتائج میں سے ایک یہ ہے کہ انسان علم ودانش سے محروم ہوجاتا ہے۔انسان صرف اس صورت میں علم وحکمت حاصل کرسکتا ہے جب وہ علم وحکمت کو اپنی گمشدہ دولت سمجھے اور جس کے پاس اسے پائے، اسے حاصل کرنے کیلئے اس کے پاس جائے۔لیکن متکبر انسان کا تکبر اسے اجازت نہیں دیتا کہ وہ اپنے جیسے یا اپنے سے کم تر انسان کی شاگردی اختیار کرے۔اس طرح وہ علم وحکمت کے گراں بہا موتیوں سے محروم ہوجاتا ہے۔ایسے افراد صرف ان علوم کو قبول کرتے ہیں جو ان کی اپنی سوچ اور فکر سے پیدا ہوتے ہیں۔لیکن ان کی بدقسمتی یہ ہوتی ہے کہ ان کے تکبر کی وجہ سے ان کی سوچ کا دائرہ بھی محدود ہوجاتا ہے جس کے نتیجہ میں ان کی سوچ کسی قابلِ ذکر حقیقت تک رسائی حاصل نہیں کرسکتی۔اسی حقیقت کے پیش نظر ایک حدیث میں جسے ہشام بن حکم نے حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام سے روایت کیا ہے، یہ بیان ہوا ہے:

"اِنَّ الزَّرْعَ يَنْبُتُ فِي السَّهْلِ وَلاٰ يَنْبُتُ فِي الصَّفا فَكَذٰلِكَ الْحِكْمَةُ تَعْمُرُ فِي قَلْبِ الْمُتَواضِعِ وَلاٰ تَعْمُرُ فِي قَلْبِ الْمُتَكَبِّرِ الْجَبَّارِ، لِاَنَّ اللهَ جَعَلَ التَّواضُعَ آلَةَ الْعَقْلِ وَجَعَلَ التَّكَبُّرَ مِنْ آلَةِ الْجَهْلِ"

''کھیتی نرم اور ہموار زمین میں اُگتی ہے اور کسی سنگلاخ زمین پر کوئی کھیتی نہیں اُگتی۔اسی طرح حکمت متواضع شخص کے دل میں آباد ہوتی ہے، کسی متکبر اور جبار کے دل میں نہیں۔اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ نے تواضع کو عقل کا ہتھیار اور تکبر کو جہل کا ہتھیار قرار دیا ہے''۔(بحارالانوار، 153:1)

(3)۔تکبر بہت سے گناہوں کا اصل سبب ہے:۔

اگر کبھی ہم حاسد، حریص، بدزبان یا دیگر گناہوں سے آلودہ کا جائزہ لیں تو ہمیں یہ حقیقت نظر آجائے گی کہ ان سب خرابیوں کی وجہ تکبر ہے۔ایسے افراد کسی صورت میں اس بات پر آمادہ نہیں ہوتے کہ کسی کو اپنے سے اوپر دیکھیں۔لہٰذا جب وہ دیکھتے ہیں کہ کسی کو کوئی نعمت حاصل ہوگئی ہے تو یہ آتش حسد میں جلنے لگتے ہیں۔وہ اپنے تکبر اور برتری کی بنیادیں مضبوط کرنے کیلئے زیادہ سے زیادہ مال ودولت کی خواہش کرنے لگتے ہیں جس سے ان کے اندر حرص جیسی بیماری پیدا ہوجاتی ہے۔تکبر کی وجہ سے دوسروں پر اپنی برتری ثابت کرنے کیلئے اور ان کی تحقیر کیلئے وہ دوسروں کے ساتھ بدزبانی کرتے ہیں۔ایک حدیث میں ہے کہ حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا:

"اَلْحِرْصُ وَالْكِبْرُ وَالْحَسَدُ دَوَاعٍ اِلٰى تَقَحُّمِ الذُّنُوْبِ"۔

''حرص، تکبر اور حسد کی وجہ سے انسان مختلف گناہوں کا مرتکب ہوتا ہے''۔(نہج البلاغہ، حکمت:371)

ایک اور حدیث میں آپؑ فرماتے ہیں:

"اَلتَّكَبُّرُ يُظْهِرُ الرَّذِيْلَةَ"۔

''تکبر رذائلِ اخلاق کو ظاہر کرتا ہے''۔(غرر الحکم، حدیث:523)

(4)۔تکبر لوگوں کی نفرت کا سبب:۔

تکبر کے نتائج میں سے ایک نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ لوگ تکبر انسان سے نفرت کرنے لگتے ہیں اور وہ معاشرے میں تنہائی کا شکار ہوجاتا ہے۔اس کی وجہ صاف ظاہر ہے کہ کسی انسان کی ذات شرافت اور عزتِ نفس یہ گوارا نہیں کرتی کہ متکبر و مغرور انسانوں کے سامنے اپنے آپ کو ذلیل یا چھوٹا ہونے دے۔نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ متکبر افراد کے دوست، حتیٰ کہ قریبی رشتہ دار بھی ان سے دور ہوجاتے ہیں۔اگر کسی معاشرتی ضرورت کے تحت ان کے ساتھ کوئی تعلق رکھنے پر مجبور ہوں تو دل میں ضرور ان سے نفرت کرتے ہیں۔

ایک حدیث میں حضرت علیؑ فرماتے ہیں:

"مَنْ تَكَبَّرَ عَلَى النَّاسِ ذَلَّ"۔

''جو شخص لوگوں کے ساتھ تکبر سے پیش آتا ہے، وہ ذلیل ہوجاتا ہے۔''(بحار الانوار، 235:74)

ایک اور حدیث میں حضرت امام جعفر صادق نے فرمایا کہ رسولؐ اللہ نے فرمایا:

"اَمْقَتُ النَّاسِ اَلْمُتَكَبِّرُ"۔

''متکبر سب سے زیادہ قابلِ نفرت ہوتا ہے''۔(بحار الانوار، 231:70)

ایک اور حدیث میں حضرت علیؑ فرماتے ہیں:

"ثَمَرَةُ الْكِبْرِ اَلْمَسَبَّةُ"۔

''تکبر کا پھل یہ ہوتا ہے کہ لوگ متکبر کے بارے میں بدگوئی کرتے ہیں''۔(غرر الحکم، حدیث:4614)

امیر المومنین علیہ السلام نے ایک اور حدیث میں ارشاد فرمایا:

"لَيْسَ لِلْمُتَكَبِّرِ صَدِيْقٌ"۔

''متکبر کا کوئی دوست نہیں ہوتا''۔(غرر الحکم، حدیث:7162)

ایک اور حدیث میں آپؑ نے فرمایا:

"ما جُتَلَبَ الْمَقْتَ بِمِثْلِ الْكِبْرِ"۔

''کوئی چیز تکبر کی طرح نفرت انگیز نہیں ہوتی''۔(غرر الحکم، حدیث:7167)

(5)۔تکبر اور وسائلِ زندگی سے محرومی:۔

زندگی میں کامیابی کیلئے ضروری ہے کہ انسان کو اچھے اور تعاون کرنے والے ساتھی میسر ہوں۔جن افراد کے دوست اور ساتھی نہ ہوں، ان کی انفرادی کوششیں یا تو ناکام ہوجاتی ہیں یا ان کی کامیابی کا تناسب بہت کم ہوتا ہے۔چونکہ متکبر انسان معاشرے میں ناپسندیدہ ہوتا ہے اور تکبر کی وجہ سے تنہا رہ جاتا ہے، اس کی کامیابیاں بھی ناچیز ہوتی ہیں۔

ایک حدیث میں امیر المومنین علیہ السلام فرماتے ہیں:

"بِكَثْرَةِ التَّكَبُّرِ يَكُوْنُ التَّلَفُ"۔

''زیادہ تکبر نقصان کا باعث ہوتا ہے''۔(غرر الحکم، حدیث:7169)

اس حدیث کی تشریح اس طرح بھی کی جاسکتی ہے کہ دنیا میں رونما ہونے والی تباہ کن اور خونریز جنگیں تکبر ہی کی وجہ سے رونما ہوتی ہیں۔جب متکبر افراد دنیا کے ممالک پر حکمران بن جائیں تو ہر ایک اپنی برتری ثابت کرنے کیلئے ایسے اقدامات کرتا ہے جو ان کے درمیان جنگ کا باعث بنتے ہیں۔ان جنگوں میں جو خونریزی ہوتی ہے اور جو نقصانات ہوتے ہیں، وہ کسی پر مخفی نہیں ہیں۔

بعض اوقات تکبر اجتماعی شکل میں ہوتا ہے اور کوئی خاص قوم یا نسل اپنے آپ کو دوسروں سے برتر سمجھنے لگتی ہے۔یہ احساسِ برتری اور تکبر بھی خونریز اور تباہ کن جنگوں کا سبب بنتا ہے جن سے تاریخ کے صفحات بھرے پڑے ہیں۔یہ جرمن قوم کا احساسِ برتری اور تکبر ہی تھا جو عالمی جنگوں کا سبب بنا جن میں لاکھوں افراد ہلاک اور زخمی ہوئے اور اربوں کے نقصانات ہوئے۔

مختصر یہ کہ اگر روح و جسم اور انفرادی و اجتماعی زندگی پر تکبر کے منفی اثرات کا بغور مطالعہ کیا جائے تو یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح واضح ہوجاتی ہے کہ کوئی اخلاقی بُرائی تکبر کی طرح نقصان دہ نہیں ہے۔

(8)۔تکبر کا علاج:۔

علمائے اخلاق نے تکبر کے علاج کے بارے میں مفصل مباحث کی ہیں جن میں سے اکثر نے تکبر کے علاج کے دو طریقوں پر زیادہ توجہ دی ہے: علمی طریقہ، عملی طریقہ۔

علمی طریقہ:۔

علمی طریقہ یہ ہے کہ متکبر انسان اپنے بارے میں اس طرح سے سوچے کہ وہ کیا ہے؟ کہاں تھا؟ کہاں جارہا ہے اور یہ کہ اس

کاانجام کیا ہوگا؟ اسی طرح اُسے چاہئے کہ اللہ تعالیٰ کی عظمت اوراس کے سامنے اپنی حیثیت کے بارے میں غور کرے۔

دنیا کی عبرت بھری تاریخ کا مطالعہ کرے، فرعونوں، نمرودوں اور قیصر وکسریٰ جیسے حکمرانوں کے حالات کا مطالعہ کرے تا کہ اسے معلوم ہو کہ دنیا کی عارضی اورزودگزر کامیابیاں اورفتوحات کچھ نہیں ہوتیں، ان پر بھروسہ کیا جاسکتا ہے نہ انہیں عظمت کی نشانی قرار دیا جاسکتا ہے۔

جوانسان آغاز میں ایک حقیر نطفہ اور آخر میں ایک متعفن لاش ہوتا ہے، ان دومراحل کے درمیان کس بات پر فخر اور تکبر کرتا ہے۔

پیدائش کے آغاز میں وہ اس قدر کمزور ہوتا ہے کہ چھوٹا سا کام کرنے کی قدرت اور طاقت نہیں رکھتا، یہاں تک کہ اپنے منہ سے بہنے والے پانی کو اپنے ہونٹوں کی مدد سے نہیں روک سکتا، بڑھاپے میں بھی اس کی حالت ایک بار پھر ایسی ہی ہوجاتی ہے۔ ایک حدیث میں حضرت امام محمد باقر علیہ السلام فرماتے ہیں:

"عَجِباً لِلْمُخْتَالِ الْفَخُوْرِ وَاِنَّمَا خُلِقَ مِنْ نُطْفَةٍ ثُمَّ يَعُودُ جِيْفَةً وَهُوَ فِيمَا بَيْنَ ذٰلِكَ لَايُدْرِیْ مَايُصْنَعُ بِهٖ"۔

"مجھے متکبر پر تعجب ہوتا ہے کہ وہ ایک حقیر نطفہ سے پیدا ہوتا ہے اور پھر متعفن لاش بن جاتا ہے اوران دومراحل کے درمیان کا اسے کچھ علم نہیں ہوتا کہ اس کے ساتھ کیا ہونے والا ہے"۔

اگر ہم کبھی ہسپتال جائیں تو ہمیں نظر آئے گا کہ اچھے خاصے صحت منداور تنومند افراد ایک حادثے یا بیماری کی وجہ سے بستر بیماری سے چپکے ہوئے ہوتے ہیں۔ اس سے یہ بات بخوبی واضح ہوجاتی ہے کہ جسمانی صحت اور طاقت کوئی قابلِ اعتماد چیز نہیں ہیں۔

اگر ہم ایسے دولت مند افراد کو دیکھیں جو اقتصادی حالات بدل جانے کی وجہ سے اپنی تجارت میں وسیع پیمانہ پر خسارے کا شکار ہوکر فقر وناداری کا شکار ہوجاتے ہیں تو ہم پر واضح ہوجاتا ہے کہ مال ودولت بھی کوئی ایسی چیز نہیں ہے جس پر اعتماد کیا جائے۔

اگر بڑے بڑے طاقتور حکمرانوں کے حالات کا مطالعہ کیا جائے جو سیاسی حالات بدل جانے کی وجہ سے اقتدار سے محروم ہو گئے یا جیل کی سلاخوں کے پیچھے چلے گئے یا پھانسی کے تختہ پر چڑھ گئے تو معلوم ہوتا ہے کہ ظاہری اقتدار بھی قابلِ اعتماد چیز نہیں ہے۔

اب یہ انسان کس چیز پر تکبر کرتا ہے؟ کس بات پر فخر کرتا ہے؟ کس بات پر اپنے کو دوسروں سے برتر سمجھتا ہے؟ امام زین العابدین علیہ السلام سے مروی ایک حدیث میں ہے کہ سلمان فارسی اور ایک متکبر شخص کے درمیان بحث ہورہی تھی۔ اس متکبر نے تکبر کے ساتھ سلمان فارسی سے پوچھا کہ تم کیا چیز ہو؟ سلمان فارسی نے جواب دیا کہ آغاز میں مَیں اورتم دونوں ایک حقیر نطفہ تھے، آخر میں ہم دونوں متعفن لاشیں ہوں گے۔ پھر قیامت کے دن ہم دونوں کے اعمال ترازو میں تولے جائیں گے۔ جس کے اعمال کا پلڑا بھاری ہوگا، وہ برتر ہوگا اور جس کے اعمال کا پلڑا ہلکا ہوگا، وہ پست اور حقیر ہوگا۔ (بحارالانوار، 231:70)

مختصر یہ کہ انسان ان اُمور پر جس قدر زیادہ توجہ دے، اسے تکبر وغرور کے گھوڑے سے اُترنے میں اُتنی ہی آسانی ہو

جاتی ہے۔

عملی طریقہ:۔

تکبر کے علاج کا عملی طریقہ یہ ہے کہ انسان کوشش کرے کہ متواضع افراد کا رویہ اپنائے تا کہ یہ اخلاقی فضیلت اس کے وجود کی گہرائیوں میں جڑ پکڑ لے۔ اللہ تعالیٰ کے حضور اپنی پیشانی رکھ کر اس قسم کے اذکار کا وِرد کرے:

"لَا اِلٰهَ اِلَّا اللهُ حَقّاً سَجَدْتُ لَكَ تَعَبُّداً وَرِقّاً لَا مُسْتَنْكِفاً وَلَا مُسْتَكْبِراً"

سادہ لباس پہنے، سادہ کھانا کھائے، نوکروں کے ساتھ ایک دسترخوان پر بیٹھے، سلام کرنے میں پہل کرے، محفل میں نمایاں مقام پر نہ بیٹھے اور چلتے ہوئے دوسروں پر سبقت حاصل نہ کرے۔ چھوٹوں اور بڑوں کے ساتھ یکساں طور پر گرمجوشی سے پیش آئے۔ مغرور اور متکبر افراد سے دوری اختیار کرے۔ اپنے لئے برتری کا قائل نہ ہو، مختصر یہ کہ تکبر کی ہر علامت سے پرہیز کرے اور تواضع کی ہر علامت اور نشانی کو اپنائے۔

رسولؐ اللہ کے حالاتِ زندگی میں ملتا ہے کہ آپ فقراً کے ساتھ زمین پر بیٹھ کر کھانا کھاتے تھے اور فرماتے تھے:

"اِنَّمَا اَنَا عَبْدٌ آكُلُ كَمَا يَأْكُلُ الْعَبْدُ"۔ (المحجة البيضأ، 6:256)

''میں تو ایک بندہ ہوں اور اسی طرح کھانا کھاؤں گا جیسے بندے کھانا کھاتے ہیں''۔

حضرت علی علیہ السلام کے بارے میں ہے کہ آپؑ نے دو قمیصیں خریدیں۔ ایک کی قیمت چار درہم اور دوسری تین درہم کی تھی۔ آپؑ نے چار درہم والی قمیص اپنے غلام قنبر کو دے دی اور تین درہم والی اپنے لئے رکھ لی۔ (بحار الانوار، 76:310)

نہج البلاغہ میں خطبہ 160 میں حضرت علی علیہ السلام رسولؐ اللہ کے بارے میں فرماتے ہیں:

"وَلَقَدْ كَانَ يَأْكُلُ عَلَى الْاَرْضِ وَيَجْلِسُ جَلْسَةَ الْعَبْدِ وَيَخْصِفُ بِيَدِهٖ نَعْلَهٗ، وَيَرْقَعُ بِيَدِهٖ ثَوْبَهٗ وَيَرْكَبُ الْحِمَارَ الْعَارِيَ وَيُرْدِفُ خَلْفَهٗ"۔

''رسولؐ اللہ بغیر فرش کے زمین پر بیٹھتے تھے اور کھانا کھاتے تھے۔ غلاموں کے انداز میں بیٹھتے تھے۔ اپنا جوتا اپنے ہاتھ سے مرمت کرتے تھے۔ اپنا لباس اپنے ہاتھ سے رفو کرتے تھے۔ گدھے کی ننگی پشت پر سواری کرتے تھے اور اپنے پیچھے بھی کسی کو بٹھاتے تھے۔''

البتہ زمانے کے حالات بدل جانے کی وجہ سے اب ان میں سے بعض چیزوں پر عمل کرنا خلافِ معمول ہے، لہٰذا ان پر عمل کرنے کا مشورہ نہیں دیا جا سکتا۔ مقصد یہ ہے کہ ہم رسولؐ اللہ اور آئمہ کے حالاتِ زندگی کا مطالعہ کریں، ان کے عظیم مقام کے باوجود ان کی تواضع کو دیکھیں اور تواضع کا درس حاصل کریں۔

یہ سب باتیں ایک طرف اور دوسری طرف یہ بھی کہ:

چونکہ تکبر کے مختلف اسباب اور عوامل ہیں جن کی تعداد علمائے اخلاق نے، جیسا کہ بیان ہو چکا ہے، سات بیان کی ہے، لہٰذا تکبر کے عملی طریقۂ علاج میں ایک روش یہ بھی ہے کہ ان سات اسباب میں سے ہر ایک کو برطرف کرنے کی عملی جدوجہد کی جائے۔ اس بارے میں علمائے اخلاق نے خوبصورت انداز میں رہنمائی کی ہے۔ مثلاً یہ کہ جو لوگ نسب کی وجہ سے تکبر کرتے ہیں، انہیں اس حقیقت پر توجہ کرنی چاہئے کہ:

1۔ دوسروں کے کمالات پر فخر کرنا عین جہالت ہے۔ اگر کسی کا باپ صاحبِ علم وفضل ہو اور وہ خود علم وفضل سے بے بہرہ ہو تو باپ کے علم وفضل سے اس میں کوئی کمال اور فضیلت پیدا نہیں ہو جاتی۔

2۔ اگر اچھی طرح سے سوچا جائے تو واضح ہوگا کہ نسب کی وجہ سے تکبر کرنے والے کا باپ نطفہ سے اور جدِ اوّل خاک سے پیدا ہوا تھا۔ یہ تو کوئی ایسی چیز نہیں ہیں جن پر فخر کیا جا سکے۔

ایک حدیث میں ہے کہ جناب لقمان نے اپنے بیٹے سے کہا:

"یَابُنَیَّ وَیْلٌ لِمَنْ تَجَبَّرَ وَتَکَبَّرَ، کَیْفَ یَتَعَظَّمُ مَنْ خُلِقَ مِنْ طِیْنٍ، وَاِلٰی طِیْنٍ یَعُوْدُ؟ لَا یَدْرِیْ اِلٰی مَاذَا یَصِیْرُ؟ اِلَی الْجَنَّةِ فَقَدْ فَازَ اَوْ اِلَی النَّارِ فَقَدْ خَسِرَ خُسْرَانًا مُبِیْنًا۔"

''اے بیٹا! ہلاکت ہے اس شخص کے لئے جو تکبر کرتا ہے اور بڑائی کی خواہش کرتا ہے۔ آخر وہ کس بنیاد پر اپنے آپ کو بڑا سمجھتا ہے جبکہ وہ مٹی سے پیدا ہوا ہے اور اسے مٹی میں مل جانا ہے۔ اُسے یہ معلوم نہیں ہے کہ اس کا انجام کیا ہوگا؟ جنت! اگر ایسا ہو تو وہ کامیاب وکامران ہوا اور اگر جہنم میں گیا تو واضح وآشکار خسارہ اُٹھایا''۔

جو لوگ حسن وجمال کی وجہ سے تکبر میں مبتلا ہو جاتے ہیں، انہیں یہ بات مدِ نظر رکھنی چاہئے کہ ایک بیماری، خاص طور پر کوئی جلدی بیماری، ان کے سارے حسن وجمال کو برباد کر دیتی ہے۔ اگر بیماری کی آفت سے بچ جائیں تو بڑھاپے کے گردوغبار سے سارے حسن وجمال کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ سروقامت جوانی کا حسن کمر خمیدہ بڑھاپے کے ہاتھوں مغلوب ہو جاتا ہے اور چہرے کی رعنائی کی جگہ بڑھاپے کی جھریاں لے لیتی ہیں۔ کیا اس قدر تیزی سے زائل ہو جانے والے حسن وجمال پر فخر وتکبر کرنا عقلمندی ہے؟

اگر تکبر کا سبب جسمانی طاقت اور قوت ہو تو انسان کو یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ چھوٹی سی قلبی یا دماغی بیماری فالج کے حملے کا سبب بن جاتی ہے اور طاقت وقوت سے بھرا ہوا بدن مفلوج ہو کر مکمل طور پر بیکار ہو جاتا ہے اور انسان کی یہ حالت ہو جاتی ہے کہ وہ اپنے چہرے سے مکھی تک اُڑانے کے قابل نہیں رہتا۔

جو لوگ دولت وثروت یا اعزّا واقارب کی کثرت کی وجہ سے تکبر میں مبتلا ہو جاتے ہیں، انہیں ان اُمور پر توجہ رکھنی چاہئے کہ یہ ایسی چیزیں ہیں جو انسان کے وجود سے باہر ہیں اور ان پر فخر ومباہات کرنا درست نہیں ہے۔ آخر یہ کوئی معقول بات ہے کہ انسان اپنے گھوڑے، خچر، گاڑی یا گھر وغیرہ پر فخر کرے۔ یہ چیزیں تو اللہ تعالیٰ کے ناپسندیدہ ترین افراد کے ہاتھ میں بھی ہو سکتی ہیں۔ ان

میں سے بہت سی چیزیں ایسی ہیں جنہیں چور آسانی سے چرالے جاسکتے ہیں۔کس قدر حقیر اور بے قدر و قیمت ہے وہ برتری اور شرف جسے چور چرالے جاسکتے ہوں اور اس کے مالک کو اس سے محروم کر سکتے ہوں۔

اس کے علاوہ یہ حقیقت بھی سب پر اچھی طرح واضح ہے کہ مال و دولت کبھی ایک ہاتھ میں نہیں رہتے۔آج اس کے ہاتھ میں ہیں تو کل کسی اور کے ہاتھ میں۔یہی وجہ ہے کہ بڑے بڑے دولت مند فقیر بن جاتے ہیں اور محلوں میں رہنے والے جھونپڑیوں میں رہنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

جو چیز اس قدر ناپائیدار اور کمزور ہے،اس پر اتنے غرور و تکبر کی کیا گنجائش ہوسکتی ہے؟

اگر تکبر و غرور کا سبب علم اور دانش ہو، بدقسمتی سے یہ علم اور اہلِ علم کیلئے سب سے بڑی آفت ہے،اس لئے اس کا علاج بھی خاصا مشکل اور پیچیدہ ہے۔علم ایک ایسی فضیلت ہے جس کی فضیلت کے بارے میں بہت سے آیات و روایات گواہ ہیں۔ عین ممکن ہے کہ یہی باتیں عالم کو تکبر میں مبتلا کر دیں۔ایسے افراد کو چاہئے کہ سورۂ جمعہ میں اہلِ کتاب کا ذکر پڑھ لیں جس میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ عالم بے عمل کی حالت اُس گدھے جیسی ہوتی ہے جس پر کتابیں لادی ہوئی ہوں۔اس کے علاوہ عالم کو یہ بھی سوچنا چاہئے کہ جس عمل کی وجہ سے وہ لوگوں کے ساتھ تکبر سے پیش آتا ہے اور اسے اپنی برتری کا سبب سمجھتا ہے،اس سے زیادہ تو اس کی ذمہ داری سنگین ہے۔

احادیث میں ہے کہ جتنی دیر میں جاہل کے ستر گناہ بخشے جائیں گے،اُتنی دیر میں عالم کے ایک گناہ کا حساب ہوگا۔صاحبِ علم شخص کو معلوم ہونا چاہئے کہ قیامت کے دن عالم کا حساب عام لوگوں کے حساب کی نسبت بہت سخت ہوگا۔کیا ان تمام حقائق کو مدنظر رکھتے ہوئے تکبر کی کوئی گنجائش باقی رہ جاتی ہے۔

اسی طرح اگر اللہ تعالیٰ کی عبادت و اطاعت تکبر کا سبب ہو تو انسان کو یہ بات مدنظر رکھنی چاہئے کہ اللہ تعالیٰ صرف ان عبادات کو قبول فرماتا ہے جو ہر قسم کے تکبر اور خود پسندی سے پاک ہوں۔اس بات میں کوئی شک نہیں کہ جو گناہگار اپنے گناہ پر نادم اور شرمندہ ہوں،وہ ایسے عبادت گزاروں کی نسبت نجات کے زیادہ قریب ہوتے ہیں جو اپنی عبادت پر تکبر کرتے ہیں۔

اصولی طور پر عبادت کی قبولیت کی ایک علامت یہ ہے کہ انسان اپنے آپ کو اور اپنے اعمال کو اللہ کے سامنے حقیر اور بے قدر و قیمت سمجھے،حتیٰ کہ اگر تمام جن و انس کی عبادت کے مساوی و عبادت بھی انجام دے تو اسے اللہ کے خوف سے غافل نہیں ہونا چاہئے۔

(9)۔علاج اور آزمائش:۔

اس سے پہلے ہم یہ نکتہ بیان کر چکے ہیں کہ اخلاقی بیماریاں جسمانی بیماریوں کے ساتھ کافی مشابہت رکھتی ہیں۔اگر ان دونوں کو آپ میں صحیح موازنہ کیا جائے تو بہت سی مشکلات حل ہو جاتی ہیں۔جب کوئی طبیب کسی مریض کی کسی جسمانی بیماری کا علاج

کرتا ہے تو علاج کے اختتام پر ایک بار پھر وہ مریض کو مختلف آزمائشات (ٹیسٹ) کیلئے لیبارٹری میں بھیجتا ہے تا کہ اسے یہ اطمینان حاصل ہو جائے کہ بیماری کا مکمل طور پر قلع قمع ہو چکا ہے۔ اگر ٹیسٹ کی روشنی میں طبیب یہ دیکھے کہ بیماری کے کچھ اثرات اب بھی موجود ہیں تو وہ علاج کو مزید کچھ عرصہ جاری رکھتا ہے تا کہ مریض مکمل طور پر صحت یاب ہو جائے۔

علمائے علم اخلاق نے تکبر کے علاج کیلئے بھی ایسے ہی طریقے اختیار کئے ہیں۔ تکبر کا علاج کرنے کے بعد وہ بھی اپنے مریضوں کا ٹیسٹ لیتے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بیماری مکمل طور پر ختم ہو چکی ہے یا اس کے کچھ اثرات باقی ہیں۔

مرحوم فیض کاشانی نے احیاءالعلوم کی روشنی میں چند دلچسپ ٹیسٹ تجویز کئے ہیں جن میں سے چند یہ ہیں:

1۔ انسان اپنے ساتھیوں کے ساتھ کسی علمی موضوع پر مناظرہ کرے اور دیکھے کہ اگر اس کا مخالف کوئی صحیح بات کہہ رہا ہو تو کیا وہ اس بات پر تیار ہوتا ہے کہ اسے آسانی سے قبول کر لے بلکہ اس کا شکریہ بھی ادا کرے؟ یا نہیں، بلکہ اپنے ساتھی یا شاگرد کی زبان سے نکلی ہوئی حق بات قبول کرنا ابھی تک اس کیلئے سنگین اور دشوار ہے؟ پہلی صورت میں تکبر کا خاتمہ ہو چکا ہے جبکہ دوسری صورت میں اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ تکبر کی جڑیں ابھی تک دل میں باقی ہیں۔

2۔ اپنے دوستوں اور ساتھیوں کے ساتھ کسی محفل میں شریک ہو اور انہیں اپنے اوپر مقدم رکھے۔ خود ان کے پیچھے پیچھے چلے، پھر دیکھے کہ اگر یہ اس پر گراں نہیں گزر رہا تو اس کے معنی یہ ہیں کہ تکبر کا خاتمہ ہو چکا ہے ورنہ تکبر کی جڑیں ابھی تک موجود ہیں۔

لیکن بعض اوقات شیطان یہاں بھی انسان کو دھوکا دے جاتا ہے کہ انسان لوگوں کی نظر میں متواضع بننے کیلئے کسی محفل میں معمولی جگہ پر بیٹھتا ہے اور عام لوگوں میں گھل مل جاتا ہے۔ یہاں اس کے تکبر میں ریاکاری بھی شامل ہو جاتی ہے۔

3۔ اگر کوئی غریب اور مسکین شخص اس کی دعوت کرے اور وہ اس دعوت کو قبول کر لے یا اس کا دوست اس سے چاہے کہ وہ بازار سے اس کیلئے کوئی چیز لے آئے اور وہ اس کیلئے لے آئے۔ اگر وہ ایسے کام کرتے ہوئے اپنے ذہن اور جذبات پر کوئی بوجھ محسوس نہ کرے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ تکبر کی بیماری مکمل طور پر ختم ہو چکی ہے۔ لیکن اگر ایسا کرتے ہوئے وہ کسی قسم کا بوجھ یا دشواری محسوس کرے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ ابھی تک تکبر کی جڑیں اس کے دل میں باقی ہیں اور اسے ابھی مزید علاج کی ضرورت ہے۔

4۔ اپنی روزمرہ ضروریات کی اشیاء خریدنے کیلئے بازار جائے، اگر ایسا کرنا اُس پر دشوار نہ ہو تو تکبر ختم ہو چکا ہے لیکن اگر اس کی کیفیت یہ ہو کہ اس کا جی چاہتا ہو کہ لوگ اس حال میں اُسے دیکھیں اور اسکی تواضع کی تعریف کریں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اس کے تکبر میں ریاکاری کا عنصر بھی شامل ہو چکا ہے۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ سب اُمور ہر معاشرے اور تمام حالات میں یکساں نہیں ہوتے۔ بعض اوقات واقعی ان میں سے بعض کاموں کو انجام دینا بعض افراد کیلئے معیوب ہو سکتا ہے اور اگر وہ ایسا کوئی کام کریں تو اخلاقی لحاظ سے معاشرے پر اس کے منفی اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ ایک روایت میں ہے کہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے اہلِ مدینہ میں سے ایک شخص کو دیکھا کہ وہ

بازار سے کوئی چیز خرید کر گھر لے جارہا تھا، جب امام علیہ السلام کی نظر اس پر پڑی تو شرمندہ ہوگیا۔ آپؑ نے فوراً فرمایا:

''پریشان نہ ہو، تم نے اپنے گھر والوں کیلئے ایک چیز خریدی ہے اور اسے گھر لے جارہے ہو۔ اللہ کی قسم! اگر مدینہ کے لوگ اس کو میرے لئے معیوب نہ سمجھتے تو میں بھی یہ پسند کرتا کہ بازار سے چیزیں خرید کر اپنے گھر لے جاؤں۔''

امام جعفر صادق علیہ السلام کے دور میں حالات یہ تھے، جبکہ حضرت علی علیہ السلام کے دور میں حالات اور تھے، وہ ایسے کام کرتے تھے اور معاشرہ اسے معیوب نہیں سمجھتا تھا۔ ان آزمائشات کا اصل مقصد یہ ہے کہ اس بات کا جائزہ لیا جائے کہ انسان کے اندر تواضع پیدا ہوئی یا ابھی تک وہ تکبر میں مبتلا ہے۔

5۔ انسان سادہ اور کم قیمت کے کپڑے پہن کر دیکھے، اگر اُس سے اس کی طبیعت رنجیدہ ہو تو اس کے معنی یہ ہیں کہ تکبر ابھی تک موجود ہے اور اگر یہ کام اس کی طبیعت پر گراں نہ گزرے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ تکبر کی بیماری رخصت ہو چکی ہے۔ رسولؐ اللہ کی ایک حدیث میں ہے:

"مَنْ اِعْتَقَلَ الْبَعِيْرَ وَلَبِسَ الصُّوفَ فَقَدْ بَرِئَ مِنَ الْكِبْرِ"۔

''جو شخص اپنا اونٹ خود باندھے اور کھردُرا لباس پہنے (اور یہ اس پر گراں نہ گزرے) تو وہ تکبر سے پاک ہے۔ یہ بہت عجیب بات ہے کہ اکثر لوگ جسمانی بیماریوں کے علاج کو تو اہمیت دیتے ہیں اور بار بار طبیب کے پاس جاتے ہیں، مختلف قسم کے ٹیسٹ کرواتے ہیں تاکہ اپنے صحت کے بارے میں مطمئن ہوسکیں لیکن روحانی اور اخلاقی صحت جو اِن کی ابدی سعادت اور نجات کی ضامن ہے، اس سے غفلت برتتے ہیں جبکہ اللہ تعالیٰ نے یہ فرمادیا ہے:

"اِلَّا مَنْ اَتَى اللّٰهَ بِقَلْبٍ سَلِيْمٍ"۔

''قیامت کے دن نجات صرف اُسے نصیب ہوگی جو قلبِ سلیم کے ساتھ اللہ کی بارگاہ میں آئے گا۔''

دوسرا باب

تواضع اور فروتنی

تمہید

یہ بات محتاجِ بیان نہیں ہے کہ تواضع اور فروتنی تکبر کی متضاد اخلاقی خصوصیت ہے اور ان دونوں مباحث کو ایک دوسرے سے الگ کرنا مشکل بلکہ ناممکن ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آیات وروایات میں اور علماءؒ کے اقوال میں یہ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ جڑے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ان میں سے ایک کی تعریف کا لازمہ، لامحالہ دوسرے کی مزمت ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے علم کی تعریف وتمجید کو جہالت کی مذمت اور تنقیص سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔

لیکن اس کے معنی یہ ہرگز نہیں ہیں کہ جو کچھ تکبر اور استکبار کے مباحث میں بیان ہو چکا ہے، ہم اُسی پر اکتفا کرتے ہوئے تواضع کے بارے میں بحث وگفتگو کو نظر انداز کر دیں۔ یہ اس لئے بھی ضروری ہے کہ تکبر اور تواضع کے باہمی تعلق ضدین یعنی دو متضاد چیزوں جیسا ہے۔ بالفاظِ دیگر یہ دونوں وجودی صفات ہیں۔ تکبر بھی ایک ایسی صفت ہے جو بعض انسانوں میں وجود رکھتی ہے اور تواضع بھی ایک ایسی صفت ہے جو بعض انسانوں میں وجود رکھتی ہے۔ ان کا باہمی تعلق وجود اور عدم جیسا نہیں ہے کہ اگر ایک کے بارے میں بات ہو رہی ہو تو لازماً دوسرے کی نفی ہو جائے۔

احادیث میں بھی اس معنی کو بیان کیا گیا ہے۔ حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

"ضَادُّوا الْكِبْرَ بِالتَّوَاضُعِ"۔

''تکبر کا مقابلہ تواضع کے ذریعے کرو جو اس کی ضد ہے۔'' (تصنیف غرر الحکم، حدیث:5148)

اس تمہید کے بعد ہم قرآنی آیات کی روشنی میں اس بحث کا آغاز کرتے ہیں:

1۔ يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا مَنْ يَرْتَدَّ مِنْكُمْ عَنْ دِينِهِ فَسَوْفَ يَأْتِي اللهُ بِقَوْمٍ يُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّونَهُ أَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ أَعِزَّةٍ عَلَى الْكَافِرِينَ۔

''اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو! تم میں سے جو کوئی اپنے دین سے پھر جائے (تو وہ اللہ کو کوئی نقصان نہیں پہنچائے گا) جلد ہی اللہ ایسے لوگوں کو لے آئے گا جن سے وہ محبت کرتا ہے اور وہ بھی اس سے محبت کرتے ہیں جو مؤمنین کے سامنے تواضع اور کفار کے سامنے سخت اور طاقتور ہیں''۔ (مائدہ:54)

2۔ وَعِبَادُ الرَّحْمَنِ الَّذِينَ يَمْشُونَ عَلَى الْأَرْضِ هَوْنًا وَإِذَا خَاطَبَهُمُ الْجَاهِلُونَ قَالُوا سَلَامًا۔

''رحمٰن کے بندے وہ ہیں جو بغیر تکبر کے، آہستگی کے ساتھ زمین پر چلتے ہیں اور جب جاہل ان سے جاہلانہ انداز میں بات کرتے ہیں تو وہ انہیں سلام کر کے انہیں نظر انداز کر دیتے ہیں''۔(الفرقان:63)

3۔ وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ○

''اے رسولؐ! جو مؤمنین تمہاری پیروی کرتے ہیں، ان کے ساتھ تواضع اور مہربانی سے پیش آؤ۔''

تفسیر اور نتیجہ:۔

پہلی آیت میں ان مؤمنین کا ذکر کیا گیا ہے جن پر اللہ تعالیٰ نے فضل و کرم فرمایا ہے۔ یہ اللہ سے محبت کرتے ہیں اور اللہ بھی ان سے محبت کرتا ہے۔ ان کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ وہ مومنین کے سامنے متواضع ہیں اور کافروں کے سامنے طاقتور اور قوی ہیں۔

اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اَعِزَّةٍ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ۔

''اَذِلَّةٍ'' ذلول یا ذلیل کی جمع ہے جس کا مصدر ذُل ہے جس کے معنی نرمی، ملائمت اور جھک جانے کے ہیں جبکہ ''اَعِزَّۃ'' عزیز کی جمع ہے جس کا مصدر عزت ہے جس کے معنی شدت کے ہیں۔

جو جانور مکمل طور پر سدھائے ہوئے ہوں اور اپنے مالک کے اشاروں تک کو سمجھتے ہوں، انہیں ذلول کہا جاتا ہے۔ البتہ اگر یہ کیفیت کسی کے اوپر کسی اور کی طرف سے مسلط کر دی جائے تو اس وقت اس کے معنی منفی ہو جاتے ہیں لیکن بنیادی طور پر اس لفظ کے معنی منفی نہیں ہیں۔

بہر حال یہ آیت تواضع کی اہمیت اور متواضعین کے مقام کی عظمت کو بخوبی واضح کر رہی ہے۔

دوسری آیت میں بھی اللہ تعالیٰ کے خاص بندوں کی برجستہ اور نمایاں اخلاقی صفات کا ذکر کیا گیا ہے۔ سورۂ فرقان کی آیات 64 تا 74 میں ان کی بارہ اخلاقی صفات کا ذکر کیا گیا ہے۔ یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں ہے کہ ان صفات میں سب سے پہلی صفت تواضع ہے۔ اس سے یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ جس طرح تکبر رذائلِ اخلاقی میں سے خطرناک ہے، اسی طرح تواضع اہم ترین اخلاقی فضیلت ہے۔

''رحمٰن کے خاص بندے وہ ہیں جو زمین پر آہستگی اور تواضع کے ساتھ چلتے ہیں''۔

"وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا"

''ھون'' مصدر ہے جس کے معنی نرمی اور تواضع کے ہیں۔ یہاں یہ لفظ اسمِ فاعل کے معنی میں استعمال ہوا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ وہ اس قدر متواضع ہیں کہ گویا عین تواضع ہیں۔ آیت آگے چل کر کہہ رہی ہے:

"وَّاِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا"

یعنی' جب جاہل ان سے جاہلانہ انداز میں بات کرتے ہیں تو وہ سلام کر کے انہیں نظر انداز کر دیتے ہیں۔'

اگلی آیت میں اللہ تعالیٰ کے سامنے ان کے تواضع کی کیفیت بیان ہوئی ہے:

"وَالَّذِيْنَ يَبِيْتُوْنَ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا وَّقِيَامًا"

''یہ راتوں کو اپنے رب کے حضور حالتِ سجدہ و قیام میں ہوتے ہیں''۔

یہ نکتہ قابلِ ذکر ہے کہ ''يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا'' سے صرف یہ مراد نہیں ہے کہ زمین پر چلتے وقت ان کی چال میں تواضع ہوتی ہے بلکہ اس سے مقصود ان کی زندگی کے تمام شعبوں سے تکبر کے چلن کی نفی ہے جو ان کے سادہ ترین کام یعنی چلنے سے ظاہر ہوتی ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان کی اخلاقی خصوصیات کا اظہار اس کی حرکات وسکنات سے ہوتا ہے۔

بلاشبہ عباد الرحمٰن کی پہلی خصوصیت تواضع ہے جو ان کی زندگی کے ہر پہلو پر حاکم ہے۔اسی طرح اگر ہم دیکھتے ہیں کہ سورۂ اسرأ کی آیت 37 میں اللہ تعالیٰ نے رسولؐ اللہ کو حکم دیا کہ:

"وَلَا تَمْشِ فِي الْاَرْضِ مَرَحًا ۚ"

''زمین پر تکبر کے ساتھ نہ چلو''۔

تو اس کے معنی صرف چلنے میں نہیں بلکہ زندگی کے تمام کاموں میں تواضع اختیار کرنے میں ہیں جو اللہ کی بندگی کی نشانی ہے۔

تیسری آیت میں رسولؐ اللہ کو مومنین کے ساتھ تواضع اور محبت کے ساتھ پیش آنے کا حکم دیا گیا ہے:

"وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ"

''خُفِضْ''، ''خَتْم'' کے وزن پر ہے جس کے معنی ''نیچے کرنا'' ہیں۔''جَناح'' پروں کو کہتے ہیں۔ بنابرایں ''پروں کو جھکا لینا'' محبت آمیز تواضع کے اظہار کا کنایہ ہے، جس طرح پرندے اپنے چوزوں سے محبت کا اظہار کرتے وقت اپنے پروں کو پھیلا کر جھکا لیتے ہیں تا کہ وہ حوادث سے اور گم ہونے سے محفوظ رہیں۔ اللہ تعالیٰ رسولؐ اللہ کو حکم دے رہا ہے کہ مومنین کے ساتھ ایسی ہی محبت آمیز تواضع کے ساتھ پیش آئیں۔

اس لطیف اور پُرمعنی تعبیر کے استعمال سے ایک مختصر عبارت میں بہت سے نکات بیان کر دیئے گئے ہیں۔ جب اللہ تعالیٰ رسولؐ اللہ کو مومنین کے ساتھ تواضع کے ساتھ پیش آنے کا حکم دے رہا ہے تو اُمت کے دیگر افراد کیلئے اس حکم کی کتنی اہمیت ہوگی، اس لئے کہ رسولؐ اللہ ساری اُمت کیلئے اُسوۂ عمل ہیں۔

سورۂ حجر، آیت 88 میں بھی اللہ تعالیٰ نے رسولؐ اللہ کو ان الفاظ میں یہ حکم دیا ہے:

"وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِلْمُؤْمِنِيْنَ"

الفاظ کے مختصر فرق کے ساتھ اولاد کو بھی ماں باپ کے ساتھ اسی طرح پیش آنے کا حکم دیا گیا ہے۔ چنانچہ سورۂ اسرا میں ہے:

"وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ"

''اپنے پر رحمت کی وجہ سے ان (والدین) کیلئے جھکا دو (اور ان کے ساتھ احترام، محبت اور تواضع کے ساتھ پیش آؤ)''۔ (بنی اسرائیل:24)

مندرجہ بالا آیات سے یہ بات بخوبی واضح ہوجاتی ہے کہ قرآنِ مجید نے تکبر اور استکبار کی مذمت کے ساتھ ساتھ اس کے نقطۂ مقابل یعنی تواضع اور فروتنی کی بھی مختلف الفاظ میں تعریف وستائش کی ہے۔

تواضع احادیث کی روشنی میں

اہلِ تشیع اور اہلِ سنت کے منابع حدیث میں تواضع کی اہمیت کے بارے میں بہت زیادہ احادیث پائی جاتی ہیں جن میں سے بعض احادیثِ متواضع افراد کی علامات یا دوسرے الفاظ میں تواضع کے ثمرات اور اس کے آداب وحدود کے بارے میں ہیں۔

1۔ ایک حدیث میں ہے کہ رسولؐ اللہ نے فرمایا:

"مَالِي لَا أَرَىٰ عَلَيْكُمْ حَلَاوَةَ الْعِبَادَةِ؟ قَالُوا وَمَا حَلَاوَةُ الْعِبَادَةِ؟ قَالَ التَّوَاضُعُ"۔

''کیا وجہ ہے کہ میں تم میں عبادت کی حلاوت کو نہیں پاتا؟ لوگوں نے پوچھا، یارسولؐ اللہ! عبادت کی حلاوت کیا ہے؟ آپؐ نے فرمایا: تواضع''۔ (میزان الحکمہ 4۔ حدیث 81825۔ المحجۃ البیضاء، 222:6)

ظاہر سی بات ہے کہ عبادت کی روح یہ ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کے حضور تواضع اختیار کرے۔ جو شخص اللہ تعالیٰ کے حضور تواضع کی لذت اور حلاوت چکھ لے، وہ لوگوں کے سامنے بھی متواضع رہے گا۔

2۔ ایک حدیث میں حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

"عَلَيْكَ بِالتَّوَاضُعِ فَإِنَّهُ مِنْ أَعْظَمِ الْعِبَادَةِ"

''تواضع اختیار کرو، اس لئے کہ یہ سب سے بڑی عبادت ہے''۔ (بحار الانوار، 119:72)

3۔ حضرت امام حسن عسکری علیہ السلام فرماتے ہیں:

"التَّوَاضُعُ نِعْمَةٌ لَا يُحْسَدُ عَلَيْهَا"۔

''تواضع ایک ایسی نعمت ہے جس پر کوئی حسد نہیں کرتا''۔ (تحف العقول:363)

عام طور پر ایسا ہوتا ہے کہ انسان کو جو نعمت بھی نصیب ہوتی ہے، اس کی وجہ سے اس کے بہت سے حاسد پیدا ہوجاتے ہیں۔

بعض اوقات یہ حسد اس قدر شدید ہوتا ہے کہ جس شخص کو نعمت میسر ہوتی ہے، اس کی زندگی بھی تنگ ہوجاتی ہے۔لیکن تواضع اس سے مستثنیٰ ہے، یہ ایسی نعمت ہے جس کی وجہ سے کوئی کسی سے حسد نہیں کرتا۔

4۔ اس بحث کو ہم رسولؐ اللہ کی اس حدیث کے ذکر کے ساتھ ختم کرتے ہیں: (مکارم الاخلاق:51)

"یُبَاهِی اللهُ تَعَالٰی الْمَلَائِکَةَ بِخَمْسَةٍ۔ بِالْمُجَاهِدِیْنَ، وَالْفُقَرَاءِ، وَالَّذِیْنَ یَتَوَاضَعُوْنَ لِلّٰهِ تَعَالٰی، وَالْغَنِیِّ الَّذِیْ یُعْطِیالْفُقَرَاءَوَللاٰ یَمُنُّ عَلَیْهِمْ"۔

''اللہ تعالیٰ فرشتوں کے سامنے پانچ قسم کے افراد پر فخر کرتا ہے: مجاہدین (جو اللہ کی راہ میں جہاد کرتے ہیں)، فقراً (جو دنیا کے بدلے اپنا دین نہیں بیچتے)، جو اللہ کی خوشنودی کیلئے تواضع کرتے ہیں، وہ دولت مند جو احسان جتلائے بغیر فقراً کی مدد کرتے ہیں اور وہ جو تنہائی میں اللہ کے خوف سے گریہ کرتے ہیں۔''

تواضع کے مثبت اثرات کے بارے میں بھی معصومینؑ سے متعدد روایات ہم تک پہنچی ہیں:

حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

"ثَمَرَةُ التَّوَاضُعِ الْمَحَبَّةُ وَثَمَرَةُ الْکِبْرِ الْمَسَبَّةُ"۔

''تواضع کا ایک پھل محبت ہے جبکہ تکبر کا پھل لوگوں کی نفرت ہے۔'' (غرر الحکم، 6413، 6414)

ایک اور حدیث میں آپؑ فرماتے ہیں:

"بِخَفْضِ الْجَنَاحِ تَنْتَظِمُ الْاُمُوْرَ"۔

''تواضع اور محبت سے معاملات منظم ہوتے ہیں''۔ (غرر الحکم: 4302)

ظاہر سی بات ہے کہ معاشرے کے نظم وضبط اور معاشرتی اُمور کی انجام دہی باہمی تعاون اور محبت کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ جب لوگوں میں تکبر پایا جائے اور ہر ایک اپنے آپ کو دوسروں سے برتر سمجھ رہا ہو تو تعاون اور محبت کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ افسروں اور حاکم میں سے بھی وہی زیادہ کامیاب ہوتے ہیں جو اپنے ماتحت لوگوں کے ساتھ تکبر کی بجائے تواضع کے ساتھ پیش آتے ہیں۔

رسولؐ اللہ فرماتے ہیں:

"اَلتَّوَاضُعُ لَایَزِیْدُ الْعَبْدَ اِلَّا رِفْعَةً اُتَوَاضَعُوْا یَرْفَعْکُمُ اللهُ۔ (کنز العمال: 5719)

''تواضع سے انسان کی بلندی میں اضافہ ہوتا ہے، تواضع اختیار کرو، اللہ تمہیں سربلند کرے گا۔''

احادیث سے یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ تواضع، قبولیتِ عبادت کی شرط ہے۔ ایک حدیث میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں: (بحار الانوار، 72:121)

"اَلتَّوَاضُعُ اَصْلُ کُلِّ خَیْرٍ نَفِیْسٍ وَمَرْتَبَةٌ رَفِیْعَةٌ۔۔۔۔۔وَمَنْ تَوَاضَعَ لِلّٰهِ شَرَّفَهُ اللهُ عَلٰی

كَثِيْرٍ مِنْ عِبَادِهٖ ..... وَلَيْسَ لِلّٰهِ عَزَّوَجَلَّ عِبَادَةٌ يَقْبَلُهَا وَيَرْضٰهَا اِلَّا وَبَابُهَا التَّوَاضُعُ، وَلَايَعْرِفُ مَافِي مَعْنٰى حَقِيْقَةِ التَّوَاضُعِ اِلاَّ الْمُقَرَّبُوْنَ الْمُسْتَقِلِّيْنَ بِوَحْدَانِيَّتِهٖ، قَالَ اللّٰهُ عَزَّوَجَلَّ وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْناً وَاِذَاخَاطَبَهُمُ الْجَاهِلُوْنَ قَالُوْا سَلاٰمًا"۔

''تواضع ہرعمدہ نیکی اور بلند مرتبے کی بنیاد ہے۔۔۔۔۔۔جوتواضع اختیار کرتا ہے اللہ تعالیٰ اُسے بہت سے لوگوں پر بلندی عطا فرماتا ہے۔اللہ تعالیٰ تواضع ہی کی بدولت کسی عبادت کو پسند اور قبول فرماتا ہے اور تواضع کی حقیقت کو صرف اللہ کے مقرب بندے ہی پاسکتے ہیں جو توحید میں مستقل ہوتے ہیں۔ اس لئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

''رحمن کے بندے زمین پر آہستہ اور تواضع کے ساتھ چلتے ہیں اور جب جاہل ان سے مخاطب ہوتے ہیں تو وہ (باوقار انداز میں) سلام کرکے آگے بڑھ جاتے ہیں۔''

ہم اس بحث کا اختتام حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اس حکمت آمیز ارشاد پر کرتے ہیں:

"بِالتَّوَاضُعِ تَعْمُرُ الْحِكْمَةُ لَا بِالتَّكَبُّرِ، كَذٰلِكَ فِي السَّهْلِ يَنْبُتُ الزَّرْعُ لَا فِي الْجَبَلِ"۔

''حکمت تواضع کی بدولت آباد ہوتی ہے،تکبر سے نہیں،جس طرح کھیتی سنگلاخ چٹانوں میں نہیں بلکہ نرم زمین میں اُگتی ہے''۔(بحارالانوار،62:2)

مختصر یہ کہ تواضع انسان کی علمی اور ثقافتی زندگی پر بھی مثبت اثر ڈالتی ہے اور معاشرتی زندگی پر بھی،اس لئے کہ متواضع انسان معاشرے میں احترام اور محبت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔اسی طرح تواضع انسان اور اللہ تعالیٰ کے تعلق پر بھی مثبت اثر ڈالتی ہے،اس لئے کہ تواضع عبادت کی روح اور اس کی قبولیت کی شرط ہے۔

تواضع کی علامات بھی احادیث میں بیان ہوئی ہیں،امیرالمومنین علیہ السلام فرماتے ہیں:

"ثَلَاثٌ حُنَّ رَأْسُ التَّوَاضُعِ: اَنْ يَبْدَءَ بِالسَّلَامِ مَنْ لَقِيَهُ، وَيَرْضٰى بِالدُّوْنِ مِنْ شَرَفِ الْمَجْلِسِ وَيَكْرَهُ الرِّيَاوَالسُّمْعَةَ"۔ (کنزالعمال،حدیث:8506)

تین چیزیں تواضع کی بنیاد ہیں،ایک یہ کہ انسان ہر ملنے والے کو سلام میں پہل کرے،دوسرے یہ کہ مجلس میں نمایاں جگہ سے کم تر جگہ پر راضی ہو۔تیسرے یہ کہ انسان ریا اور سمعہ کو ناپسند کرے۔

بعض احادیث میں تواضع کی کچھ اور علامات بھی بیان کی گئی ہیں جن میں علمی برتری ثابت کرنے کیلئے بحث کو ترک کرنے

اورلوگوں کی زبان سے تعریف سننے کی خواہش نہ ہونا بھی شامل ہیں۔(اصول کافی 2۔122)

تواضع کی تعریف:

تواضع کا اصلی مادہ ''وضع'' ہے جس کے معنی کسی چیز کو نیچے رکھنے کے ہیں۔ بچے کی پیدائش کو بھی اسی مناسبت سے وضعِ حمل کہا جاتا ہے۔نقصان اور خسارے کیلئے بھی ''وضیعہ'' کہا جاتا ہے۔اخلاقی صفت کی حیثیت اس کے معنی یہ ہیں کہ انسان اپنے آپ کو اپنے معاشرتی اور مرتبہ سے چھوٹا ظاہر کرے۔اس کے برعکس تکبر یہ ہے کہ انسان اپنے آپ کو اپنے معاشرتی مقام سے بڑا ظاہر کرے۔

مرحوم نراقی علم اخلاق پر اپنی معروف کتاب ''معراج السعادت'' میں تواضع کی تعریف میں یوں لکھتے ہیں:

''تواضع سے مراد وہ کسر نفسی ہے جس کی وجہ سے انسان اپنے آپ کو دوسروں سے برتر دیکھنا پسند نہ کرے۔اس کا لازمہ یہ ہے کہ وہ اپنے کردار و گفتار میں ایسا رویہ اختیار کرتا ہے جو دوسروں کی تعظیم اور احترام پر مبنی ہوتا ہے''۔(معراج السعادہ:300)

فارسی اور اُردو میں استعمال ہونے والا لفظ ''فروتنی'' اس مفہوم کی مکمل عکاسی کرتا ہے۔

ایک حدیث میں ہے کہ حضرت امام رضا علیہ السلام سے پوچھا گیا:

"مَاحَدُّالتَّوَاضُعِ الَّذِیْ اِذَافَعَلَهُ الْعَبْدُ کَانَ مُتَوَاضِعًا؟ فَقَالَ: التَّوَاضُعُ دَرَجَاتٌ مِنْهَا اَنْ یَعْرِفَ الْمَرْءُ قَدْرَنَفْسِهِ فَیُنَزِّلَهَابِقَلْبٍ سَلِیْمٍ لَایُحِبُّ اَنْ یَأْتِیَ اِلٰی اَحَدٍاِلَّامِثْلَ مَایُؤْتٰی اِلَیْهِ، اِنْرَأٰی سَیِّئَةً دَرَاَهَابِالْحَسَنَةِ، کَاظِمُ الْغَیْظِ، عَافٍ عَنِ النَّاسِ ، وَاللّٰهُ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ"۔(کافی،2:124)

''تواضع کی وہ حد کیا ہے جسے اختیار کر کے انسان متواضع کہلاتا ہے؟ آپؑ نے فرمایا: تواضع کے مختلف درجات ہیں۔ان میں سے ایک یہ ہے کہ انسان اپنے مقام اور مرتبہ کو پہچانے اور بخوشی اسے تسلیم کرے۔پھر وہ یہ پسند کرتا ہے کہ جس طرح دوسرے اس کا احترام کرتے ہیں، وہ بھی اس کا اسی طرح احترام کرے (اور جن باتوں کو اپنی شان کے خلاف سمجھتا ہے، انہیں دوسروں کی شان کے بھی خلاف سمجھے)۔

اگر ان سے کوئی برائی دیکھے تو اس کا نیکی سے جواب دے، ان کے خلاف اپنا غصہ پی لے۔لوگوں کی غلطیوں سے درگزر کرے اور اللہ ایسے نیک لوگوں کو پسند فرماتا ہے''۔

جو کچھ ان احادیث میں بیان ہوا ہے، درحقیقت وہ تواضع کی علامات ہیں جن کی روشنی میں تواضع کی تعریف بھی بخوبی واضح ہوجاتی ہے۔

تواضع اور انسانی احترام:۔

ان مباحث میں عام طور پر لوگ افراط کی راہ پر چل نکلتے ہیں۔بعض لوگ یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ تواضع کے معنی یہ ہیں کہ انسان اپنے آپ کو دوسروں کے سامنے ذلیل وحقیر کردے اور ایسے اعمال انجام دے جن کی وجہ سے لوگوں کی نظر میں گر جائے اور لوگ اس سے بدگمان اور متنفر ہوجائیں۔بعض صوفیاؑ کے بارے میں یہ بات نقل کی گئی ہے جب کسی علاقے میں اُن کی نیکی کا چرچا پھیل جاتا تھا تو وہ ایسے اعمال کے مرتکب ہوجاتے تھے جن کی وجہ سے ان کی عزت خراب ہوجاتی تھی۔ان کا تصور یہ تھا کہ یہ ریاضت اور تواضع کی ایک قسم ہے۔

اسلام اس بات کی ہرگز اجازت نہیں دیتا کہ تواضع کے نام پر کوئی شخص اپنی تحقیر اور تذلیل کرے اور لوگوں کی نظر میں اپنی عزت ووقار کو داغدار کرے۔تواضع میں یہ نکتہ نہایت اہم ہے کہ انسان اپنے آپ کو ذلیل نہ کرے۔اگر تواضع صحیح طور پر انجام پائے تو اس کے یہ نتائج برآمد نہیں ہوں گے بلکہ معاشرے میں انسان کے مقام ومرتبہ اور عزت ووقار میں اضافہ ہوتا ہے۔اسی حقیقت کو حضرت علیؑ نے ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے:

"بِالتَّوَاضُعِ تَكُونُ الرِّفْعَةُ"

''تواضع سے انسان کو رفعت اور بلندی حاصل ہوتی ہے''۔(فہرست موضوعی غرر الحکم، 405:7)

مرحوم فیض کاشانی ''غایۃ الریاضہ فی خلق التواضع''یعنی''ریاضت میں تواضع کی حد'' کے عنوان کے تحت لکھتے ہیں:

''تمام اخلاقی صفات کی طرح تواضع میں بھی افراط وتفریط واعتدال کی حدیں پائی جاتی ہیں۔اس کی حد افراطِ تکبر ہے،حدِ تفریط ذلت وخواری کو قبول کرنا اور حدِ اعتدال تواضع ہے۔جو چیز فضیلت شمار ہوتی ہے،وہ یہ ہے کہ انسان ذلت میں گرے بغیر،اپنے آپ کو دوسروں کی نسبت چھوٹا ظاہر کرے۔''

اس کے بعد وہ ایک مثال بیان کرتے ہیں:

''جو شخص کوشش کرتا ہے کہ اپنے جیسے افراد یا اپنے ساتھیوں پر برتری حاصل کرے اور ان سے آگے نکل جائے، وہ متکبر ہے۔ جو اپنے آپ کو ان سے پیچھے رکھتا ہے، وہ متواضع ہے۔لیکن اگر ایک پھٹے ہوئے (جوتے وغیرہ) مرمت کرنے والا کسی عالم کے پاس جائے اور وہ عالم اس کے احترام میں کھڑا ہوجائے اور چلتے وقت اس کے جوتے سیدھے کرے،تو یہ تواضع نہیں بلکہ اپنے آپ کو ذلیل کرنا ہے اور یہ قابلِ تعریف نہیں ہے۔مناسب یہ ہے کہ انسان ہر کسی کا اُس کے مقام ومرتبہ کے مطابق حدِ اعتدال میں احترام کرے۔عالم کا اس طرح احترام کرے جو عالم کیلئے مناسب ہے اور دوسروں کا بھی اُن کے مقام ومرتبہ کے مطابق احترام کرے۔''

تیسرا باب

حرص اور قناعت

تمہید:

ہم حضرت امام زین العابدین علیہ السلام کی یہ حدیث بیان کر چکے ہیں جس میں آپؑ نے فرمایا کہ:

''گناہ کا پہلا سبب تکبر ہے جس کی وجہ سے ابلیس نے اللہ کے حکم کی نافرمانی کی اور کافر ہو گیا۔ اس کے بعد گناہ کا دوسرا سبب حرص ہے جس کی وجہ سے آدم وحوا، اللہ کی نافرمانی کے مرتکب ہوئے۔ ان کے بعد گناہ کا سبب حسد تھا جس کی وجہ سے قابیل نے ہابیل کو قتل کر دیا''۔ (سفینۃ البحار، 458:2)

صرف حضرت آدم علیہ السلام کے واقعہ میں ہی نہیں بلکہ تمام انبیاؑ کی تاریخ میں حرص کے منفی نتائج واضح وآشکار نظر آتے ہیں۔ ماضی کی تاریخ اور دورِ حاضر میں مختلف اقوام کے حالات کا مطالعہ ومشاہدہ کریں تو یہ حقیقت بخوبی نظر آتی ہے کہ حرص یعنی ''زیادہ سے زیادہ کی خواہش'' مختلف قسم کے جرائم، خونریز جنگوں، قتل وغارت اور انسانی اقدار کی پامالی کا بنیادی سبب ہے۔

اس کا نقطۂ مقابل قناعت ہے جو امن، عدل، صلح، محبت اور اخوت کا سبب ہے۔

اس کتاب میں فضائل ورذائل اخلاق کی جو ترتیب، قرآن میں انبیاؑ کے حالات وواقعات کی روشنی میں ہم نے اختیار کی ہے، اس کے مطابق ہم نے حرص کو دوسری صفتِ رذیلہ قرار دیا ہے جو حضرت آدم علیہ السلام کے واقعہ اور حضرت شعیب علیہ السلام کی قوم کے حالات میں یہودیوں، مشرکینِ عرب اور زمانۂ رسولؐ کے ضعیف الایمان مسلمانوں میں بھی نظر آتی ہیں۔

اس تمہید کے بعد ہم اس موضوع سے متعلق قرآنی آیات کا جائزہ لیتے ہیں:

1. فَوَسْوَسَ اِلَيْهِ الشَّيْطٰنُ قَالَ يٰۤاٰدَمُ هَلْ اَدُلُّكَ عَلٰى شَجَرَةِ الْخُلْدِ وَمُلْكٍ لَّا يَبْلٰى ﴿۱۲۰﴾ فَاَكَلَا مِنْهَا فَبَدَتْ لَهُمَا سَوْاٰتُهُمَا وَطَفِقَا يَخْصِفٰنِ عَلَيْهِمَا مِنْ وَّرَقِ الْجَنَّةِ ۛ وَعَصٰۤى اٰدَمُ رَبَّهٗ فَغَوٰى ﴿۱۲۱﴾

''پس شیطان نے اسے وسوسہ میں ڈالا اور کہا: اے آدمؑ! کیا میں تمہیں ہمیشہ کی زندگی اور لازوال حکومت کا درخت دکھاؤں؟ پس ان دونوں نے اس میں سے کھایا (اور جنت کے لباس ان کے بدن سے اُتر گئے) اور ان کی شرمگاہیں کھل گئیں اور وہ اپنے آپ کو ڈھانپنے کیلئے درخت کے پتوں کا لباس پہننے لگے اور آدمؑ نے اپنے

رب کی نافرمانی کی اس کے اجر سے محروم ہوگیا''۔(طٰہٰ:120،121)

2۔ وَاِلٰى مَدْيَنَ اَخَاهُمْ شُعَيْبًا ؕ قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ؕ قَدْ جَآءَتْكُمْ بَيِّنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ فَاَوْفُوا الْكَيْلَ وَالْمِيْزَانَ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْيَآءَهُمْ وَلَا تُفْسِدُوْا فِى الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا ؕ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۚ﴿۸۵﴾

''اور مدین کی طرف ہم نے ان کے بھائی شعیبؑ کو بھیجا۔اُس نے کہا: اے میری قوم! اللہ کی عبادت کرو، اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں ہے، تمہارے رب کی طرف سے تمہارے پاس واضح نشانی آ چکی ہے۔لہٰذا تم ناپ تول پورا کیا کرو اور لوگوں کی چیزوں میں کمی نہ کیا کرو اور معاشرے میں اصلاح ہوجانے کے بعد اس میں بگاڑ پیدا نہ کرو، اگر تم مؤمن ہو تو یہی تمہارے لئے بہتر ہے۔''

3۔ اِنَّ هٰذَآ اَخِىْ ۫ لَهٗ تِسْعٌ وَّتِسْعُوْنَ نَعْجَةً وَّلِىَ نَعْجَةٌ وَّاحِدَةٌ ۫ فَقَالَ اَكْفِلْنِيْهَا وَعَزَّنِىْ فِى الْخِطَابِ ﴿۲۳﴾

قَالَ لَقَدْ ظَلَمَكَ بِسُؤَالِ نَعْجَتِكَ اِلٰى نِعَاجِهٖ ؕ وَاِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ الْخُلَطَآءِ لَيَبْغِىْ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَقَلِيْلٌ مَّا هُمْ ؕ وَظَنَّ دَاوٗدُ اَنَّمَا فَتَنّٰهُ فَاسْتَغْفَرَ رَبَّهٗ وَخَرَّ رَاكِعًا وَّاَنَابَ ۔

''یہ میرا بھائی ہے۔اس کے پاس ننانوے بھیڑیں ہیں جبکہ میرے پاس ایک ہے لیکن وہ اصرار کرتا ہے کہ یہ ایک بھی میں اُسے دے دوں اور گفتگو میں وہ مجھ پر غالب آ گیا۔(داؤد نے) جواب دیا: اس نے اپنی بھیڑوں میں اضافے کیلئے تم سے تمہاری بھیڑ مانگ کر تم پر ظلم کیا اور زیادہ تر دوست ایک دوسرے کے خلاف ظلم وزیادتی کرتے ہیں، سوائے ان لوگوں کے جو ایمان لائے اور عملِ صالح کرتے رہے اور وہ بہت کم ہیں اور داؤد نے سمجھا کہ ہم نے اس کا امتحان لیا۔پس اس نے استغفار کی اور سجدہ میں گر گیا اور توبہ کی''۔(ص:23،24)

4۔ وَلَتَجِدَنَّهُمْ اَحْرَصَ النَّاسِ عَلٰى حَيٰوةٍ ۛ وَمِنَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا ۛ يَوَدُّ اَحَدُهُمْ لَوْ يُعَمَّرُ اَلْفَ سَنَةٍ ۚ وَمَا هُوَ بِمُزَحْزِحِهٖ مِنَ الْعَذَابِ اَنْ يُّعَمَّرَ ؕ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِمَا يَعْمَلُوْنَ ﴿۹۶﴾

''اور یقیناً تم انہیں سب لوگوں سے، حتیٰ کہ مشرکین سے بھی بڑھ کر زندگیِ دنیا کا حریص پاؤ گے۔ان میں سے ہر ایک چاہتا ہے کہ کاش اسے ہزار سال زندگی ملے۔حالانکہ اگر اسے یہ زندگی مل جائے تو بھی وہ اسے عذاب سے نہ بچا سکے گی اور اللہ ان کے اعمال کو خوب دیکھ رہا ہے۔''(بقرہ:96)

5۔ اِنَّ الۡاِنۡسَانَ خُلِقَ هَلُوۡعًا ﴿۱۹﴾ اِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ جَزُوۡعًا ﴿۲۰﴾ وَّاِذَا مَسَّهُ الۡخَيۡرُ مَنُوۡعًا ﴿۲۱﴾

''بے شک انسان حریص اور کمزور پیدا کیا گیا ہے، جب کوئی بُرائی اس کو پہنچتی ہے تو بے تاب ہو جاتا ہے اور جب اسے کوئی فائدہ پہنچتا ہے تو اسے دوسروں تک پہنچنے سے مانع ہوتا ہے(اور بخل کرتا ہے)''۔(معارج:19 تا21)

6۔ وَاِذَا رَاَوۡا تِجَارَةً اَوۡ لَهۡوًا انْفَضُّوۡۤا اِلَيۡهَا وَتَرَكُوۡكَ قَآئِمًا ؕ قُلۡ مَا عِنۡدَ اللّٰهِ خَيۡرٌ مِّنَ اللَّهۡوِ وَمِنَ التِّجَارَةِ ؕ وَاللّٰهُ خَيۡرُ الرّٰزِقِيۡنَ ﴿۱۱﴾

''اور جب وہ تجارت یا لہوولعب کو دیکھتے ہیں تو تمہیں کھڑا چھوڑ کر ان کی طرف بھاگ پڑتے ہیں، ان سے کہو جو کچھ اللہ کے پاس ہے وہ لہوولعب اور تجارت سے بہتر ہے اور اللہ بہترین رزق دینے والا ہے''۔(سورہ جمعہ 11۔)

7۔ وَيۡلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةِ ﴿۱﴾ الَّذِىۡ جَمَعَ مَالًا وَّعَدَّدَهٗ ﴿۲﴾ يَحۡسَبُ اَنَّ مَالَهٗۤ اَخۡلَدَهٗ ﴿۳﴾

''ہلاکت ہے ہر عیب جو اور تمسخر کرنے والے کیلئے جو مالِ فراواں جمع کرتا رہتا ہے اور اس کو گنتا رہتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ اُس کا مال و دولت اُسے ہمیشہ زندہ رکھے گا''۔

تفسیر اور نتیجہ:۔

مندرجہ بالا آیات میں سے سب سے پہلی آیت آدم وحوا کے واقعہ کے بارے میں ہے۔قرآنی آیات کی روشنی میں ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آدمؑ وحوا کو جنت میں سکونت دی اور انہیں ایک مخصوص درخت کے نزدیک جانے سے منع کر دیا اور انہیں شیطان کے شر اور اس کے وسوسوں سے خبردار بھی کر دیا۔لیکن آخر کار شیطانی وسوسے اپنا کام دکھا گئے۔آدمؑ نے اللہ تعالیٰ کے حکم کو نظر انداز کر دیا اور سجرۂ ممنوعہ کا پھل کھالیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ جنت کی آرام وآسائش کی زندگی سے نکال دیئے گئے اور مشکلات سے بھرپور دُنیوی زندگی میں گرفتار ہو گئے۔

مذکورہ بالا آیات اسی حقیقت کو اس انداز میں بیان کر رہی ہیں:

''شیطان نے آدم کو ورغلایا اور کہا: اے آدم کیا میں تمہیں ہمیشہ کی زندگی اور لازوال حکومت کا درخت دکھاؤں؟'' (شیطان نے اس درخت کا تعارف ایسے درخت کی حیثیت سے کروایا جس کا پھل کھا لینے کے نتیجہ میں عیش وعشرت کی لازوال زندگی حاصل ہو جاتی ہے)۔آخر کار ان دونوں نے اس کا پھل کھالیا(اور جنت کا لباس ان کے بدن سے اُتر گیا) اور ان کی شرمگاہیں آشکار ہو گئیں اور انہوں نے درختوں کے پتوں کو سی کر لنگیاں بنالیں اور آدمؑ نے اپنے رب کی نافرمانی کی اور اس کے اجر سے

محروم ہوگیا۔"

" فَوَسْوَسَ اِلَيْهِ الشَّيْطٰنُ قَالَ يٰٓاٰدَمُ هَلْ اَدُلُّكَ عَلٰى شَجَرَةِ الْخُلْدِ وَمُلْكٍ لَّا يَبْلٰى ﴿۱۲۰﴾ فَاَكَلَا مِنْهَا فَبَدَتْ لَهُمَا سَوْاٰتُهُمَا وَطَفِقَا يَخْصِفٰنِ عَلَيْهِمَا مِنْ وَّرَقِ الْجَنَّةِ ۛ وَعَصٰٓى اٰدَمُ رَبَّهٗ فَغَوٰى ﴿۱۲۱﴾ "

اس آیت کی روشنی میں یہ بات کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ جس چیز نے آدمؑ کو شیطان کے جال میں پھنسایا، وہ حرص ہی تھی۔

اس سے یہ بات بخوبی واضح ہوجاتی ہے کہ زیادہ سے زیادہ مادی فوائد سمیٹنے کی خواہش اور حرص وطمع نسلِ انسانی کی بربادی کا ایک بڑا عامل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آیت میں تین چیزوں کو کفر کی بنیاد قرار دیا گیا ہے: تکبر جو شیطان کی سرکشی کا سبب بنا، حرص جو آدمؑ کے گناہ کا سبب بنا اور حسد جو قابیل کے ہاتھوں ہابیل کے قتل کا سبب بنا۔

یہ بات صحیح ہے کہ آدم کو شجرۂ ممنوعہ کا پھل کھانے سے منع کرنا، نہی تحریمی نہیں تھا اور اس کی مخالفت گناہِ مطلق نہیں بلکہ ترکِ

اولیٰ تھا[1]۔ بالفاظِ دیگر یہ ایک ایسی ممانعت تھی جس طرح طبیب کسی مریض کو کوئی غذا کھانے سے منع کر دے۔ لیکن بہر حال آدمؑ سے

[1] علماء کے درمیان اس مسئلہ پر اختلاف ہے کہ حضرت آدمؑ نے شجرۂ ممنوعہ کا پھل کھا کر گناہ کیا یا نہیں؟ شیعہ علمأ زیادہ تر یہی عقیدہ رکھتے ہیں کہ یہ گناہ نہیں بلکہ ترکِ اولیٰ تھا۔ لیکن شیعہ علما ٔ کا ایک گروہ اس بات کا قائل ہے کہ حضرت آدمؑ کا یہ فعل گناہ تھا۔ ان دونوں گروہوں کے اختلافِ رائے کی بنیادی وجہ فہمِ قرآن میں ان کا اختلاف نہیں ہے بلکہ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ اوّل الذکر گروہ کا عقیدہ یہ ہے کہ انبیأ ورسل قبل از نبوت ورسالت بھی معصوم ہوتے ہیں، لہٰذا جن آیات واحادیث میں ان کی طرف کسی گناہ کی نسبت دی گئی ہے، ان کی تاویل کر کے وہ گناہ سے ترکِ اولیٰ مراد لیتے ہیں۔ دوسرا گروہ پہلے سے بنائے ہوئے عقائد کی روشنی میں آیات کی تاویل کی بجائے آیات کے واضح اور صریح بیانات کی بنیاد پر یہ کہتا ہے کہ انبیأ ورسل کے قبل از نبوت ورسالت معصوم ہونے پر کوئی قرآنی دلیل موجود نہیں ہے بلکہ وہ حضرت آدمؑ کے واقعہ میں استعمال ہونے والے الفاظ سے استدلال کرتے ہیں کہ حقیقت اس کے برعکس ہے، مثلاً حضرت آدمؑ کو شجرۂ ممنوعہ کا پھل کھانے کی ممانعت ان الفاظ میں کی گئی:

"وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ"۔

''تم دونوں اس درخت کے قریب نہ جانا ورنہ تم ظالمین میں سے ہو جاؤ گے''۔ (بقرہ:35)

اگر قرآن مجید کا غور سے مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جہاں بھی ممانعت کیلئے ''قریب مت جاؤ'' کے الفاظ استعمال کیے ہیں، اس سے مراد عام ممانعت نہیں بلکہ اس کا مقصد ممانعت پر زور دینا اور اس میں تاکید پیدا کرنا ہے، مثلاً ''لاتقربوالزنا''، ''زنا کے قریب نہ جاؤ''۔ اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً ۔ وَسَاءَ سَبِيْلاً ''زنا کے قریب نہ جاؤ، یہ حد سے بڑھا ہوا گناہ اور بہت بُرا راستہ ہے'' (بنی اسرئیل:32)۔ ''لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكٰرٰى''۔ ''جب تم نشے کی حالت میں ہو تو نماز کے قریب نہ جاؤ''۔ (نسأ:43) ''وَلَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْيَتِيْمِ ''یتیم کے مال کے قریب نہ جاؤ'' (بنی اسرائیل:34) ''وَلَا تَقْرَبُوْهُنَّ حَتّٰى يَطْهُرْنَ ''حالتِ حیض میں عورتوں کے قریب نہ جاؤ یہاں تک کہ وہ پاک ہو جائیں'' (بقرہ:222) ممنوعہ کا پھل کھانا حرام اور گناہ نہ ہوتا تو اس کیلئے ''لاتقربا'' کا لفظ استعمال نہ ہوتا۔ اسی طرح ''وَلَا تَقْرَبَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ'' ورنہ تم ظالمین میں سے ہو جاؤ گے کے الفاظ بھی نہی اور ممانعت کی شدت کو ظاہر کرتے ہیں۔ کیا اللہ تعالیٰ یہ نہ کہہ سکتا تھا کہ اس درخت سے نہ کھاؤ ورنہ تم ترکِ اولیٰ کے مرتکب ہو جاؤ گے؟ اسی طرح سورۂ طٰہٰ کی مذکورہ آیت ''وَعَصٰى اٰدَمُ رَبَّهٗ فَغَوٰى''۔ ''آدمؑ نے اپنے رب کی نافرمانی کی اور بہک گیا'' میں ''عَصٰى'' اور غَوٰى'' کے الفاظ قابلِ غور ہیں۔ ''عَصٰى'' معصیت سے فعلِ ماضی ہے جس کے معنیٰ ہیں ''نافرمانی''۔ قرآن شریف ''عَصٰى'' کا لفظ متعدد مرتبہ استعمال ہوا ہے اور ہر جگہ شدید نافرمانی کیلئے آیا ہے جیسے ''فَعَصٰى فِرْعَوْنُ الرَّسُوْلَ'' ''پس فرعون نے رسول کی نافرمانی کی'' (مزمل:16)۔ ''وَتِلْكَ عَادٌ ۭ جَحَدُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ وَعَصَوْا رُسُلَهٗ''۔ ''قومِ عاد نے اپنے رب کی آیات کا انکار کیا اور اس کے رسولوں کی نافرمانی کی''۔ (ھود:59) بنابرایں ''عَصٰى'' کے معنیٰ ترکِ اولیٰ کرنا ہر گز درست نہیں ہے، خاص طور جب اس کے بعد ''فَغَوٰى'' کا لفظ بھی آرہا ہو۔ جب اللہ تعالیٰ نے ابلیس کو بارگاہِ قرب سے دھتکارا تو اُس نے کہا: ''اِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِيْنَ ''میں تیرے خالص بندوں کے سوا ان سب کو ضرور بہکا کر چھوڑوں گا'' (ص:83) آدم کیلئے بھی یہ لفظ استعمال ہوا ''وَعَصٰى اٰدَمُ رَبَّهٗ فَغَوٰى''، ''آدم نے اپنے رب کی نافرمانی کی اور بہک گئے''۔ اب ظاہری بات ہے کہ ''لَا تَقْرَبَا''، "فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ"، "وَعَصٰى" اور "فَغَوٰى" جیسے الفاظ جس ممانعت میں استعمال ہوئے ہوں، انہیں نہی تحریمی نہ ماننا اور اس نہی کی مخالفت کو ''ترکِ اولیٰ'' کا نام دینا زیادتی ہے۔ اگر حضرت آدمؑ کا فعل ''ترکِ اولیٰ'' ہوتا تو اللہ تعالیٰ جو کہ حکیم ہے، اپنی کتابِ حکیم میں ''ترکِ اولیٰ'' پر دلالت کرنے والے الفاظ استعمال کرتا۔ اللہ تعالیٰ کو اپنے رسولوں کو عزت کا ہم سے زیادہ خیال ہے (مترجم)۔

توقع نہیں تھی کہ وہ ترکِ اولیٰ سے مرتکب ہوتے۔لیکن حرص، اگرچہ ہلکی اور کمزور شکل میں، ان کے دل میں موجود تھا جو اس عظیم خطا کا سبب بن گئی۔ یہ ایک ایسی خطا تھی جس کا نتیجہ نسلِ آدمؑ ابھی تک دنیا کی سخت اور دشوار زندگی کی صورت میں بھگت رہی ہے۔ یہ حرص کے بارے میں قرآن کی واضح ترین تنبیہ ہے۔دوسری آیت حضرت شعیبؑ کی قوم کے بارے میں ہے جن کی قوم کو حرص نے اپنے رسول کی ہدایات اور تعلیمات کے قبول کرنے سے روک دیا۔اس آیت میں اللہ تعالیٰ یہ فرماتا ہے:

''ہم نے مدین کی طرف ان کے بھائی شعیب کو بھیجا۔اس نے ان سے کہا: اے میری قوم! اللہ کی عبادت کرو، اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں ہے، تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے واضح نشانی آ چکی ہے۔ بنابرایں، ناپ تول پورا کیا کرو اور لوگوں کے اموال میں کمی نہ کیا کرو اور معاشرے میں اصلاح ہو جانے کے بعد بگاڑ پیدا نہ کرو، اگر تم مومن ہو تو یہی تمہارے لئے بہتر ہے''۔

''وَاِلٰی مَدۡیَنَ اَخَاهُمۡ شُعَیۡبًا ۔قَالَ یٰقَوۡمِ اعۡبُدُوا اللّٰهَ مَا لَکُمۡ مِّنۡ اِلٰهٍ غَیۡرُهٗ ۔قَدۡ جَآءَتۡکُمۡ بَیِّنَةٌ مِّنۡ رَّبِّکُمۡ فَاَوۡفُوا الۡکَیۡلَ وَالۡمِیۡزَانَ وَلَا تَبۡخَسُوا النَّاسَ اَشۡیَآءَهُمۡ وَلَا تُفۡسِدُوۡا فِی الۡاَرۡضِ بَعۡدَ اِصۡلَاحِهَا ۔ذٰلِکُمۡ خَیۡرٌ لَّکُمۡ اِنۡ کُنۡتُمۡ مُّؤۡمِنِیۡنَ ۔''

اس آیت کی روشنی میں حضرت شعیب علیہ السلام کی قوم کا پہلا گناہ شرک اور بت پرستی اور اس کے بعد ناپ تول میں کمی، لوگوں کے حقوق ضائع کرنا اور معاشرے میں بگاڑ اور خرابی پیدا کرنا۔ دنیا کے معاملہ میں ان کا حرص اس قدر زیادہ تھا کہ انہوں نے حضرت شعیبؑ کو صاف صاف کہہ دیا کہ اے شعیبؑ! کیا تمہاری نماز ہمیں حکم دیتی ہے کہ ہم اپنے آباؤ اجداد کے معبودوں کو چھوڑ دیں یا اپنے اموال میں اپنی مرضی سے تصرف نہ کریں؟

قَالُوۡا یٰشُعَیۡبُ اَصَلٰوتُکَ تَاۡمُرُکَ اَنۡ نَّتۡرُکَ مَا یَعۡبُدُ اٰبَآؤُنَاۤ اَوۡ اَنۡ نَّفۡعَلَ فِیۡۤ اَمۡوَالِنَا مَا نَشٰٓؤُا ؕ اِنَّکَ لَاَنۡتَ الۡحَلِیۡمُ الرَّشِیۡدُ ○(ھود: 87)

اس آیت کی روشنی میں یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ناپ تول میں کمی سے حضرت شعیبؑ کی قوم کو کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوتا تھا بلکہ معاشرے میں بگاڑ اور فساد پیدا ہوتا تھا، لوگوں کا ایک دوسرے پر اعتماد کم ہوتا تھا اور ان کے اموال میں کمی ہوتی تھی۔ بنابرایں حرص کا نتیجہ اُلٹا ہوا کرتا ہے۔

تیسری آیت میں حضرت داؤد علیہ السلام کا ایک واقعہ بیان کیا گیا ہے جس میں حرص کا قابلِ نفرت اور کریہہ چہرہ کھل کر سامنے آ جاتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ دو بھائی حضرت داؤدؑ کے پاس مقدمہ لے کر آتے ہیں۔ایک کہتا ہے کہ یہ میرا بھائی ہے۔اس کے پاس ننانوے بھیڑیں ہیں اور میرے پاس ایک بھیڑ ہے مگر یہ مُصر ہے کہ میں اپنی بھیڑ بھی اسے دے دوں اور بحث میں بھی یہ مجھ پر غالب آ گیا ہے:

"اِنَّ هٰذَآ اَخِیْ لَهٗ تِسْعٌ وَّتِسْعُوْنَ نَعْجَةً وَّلِیَ نَعْجَةٌ وَّاحِدَةٌ فَقَالَ اَكْفِلْنِیْهَا وَعَزَّنِیْ فِی الْخِطَابِ"

حضرت داؤد یہ سن کر ناراض ہوئے اور کہا کہ ''تمہارے بھائی نے تم سے بڑا ظالمانہ مطالبہ کیا ہے اور صرف تم ہی نہیں بلکہ اکثر لوگ اپنے دوستوں کے ایسے ہی ظلم کا نشانہ بنتے ہیں۔

آیت کے ذیل میں ہے کہ معاً حضرت داؤد علیہ السلام کو ایسا لگا کہ ہم نے اسے امتحان میں ڈالا ہے۔انہوں نے اپنے رب سے مغفرت طلب کی، سجدہ میں گرے اور توبہ کی۔

یہاں یہ مسئلہ قابلِ غور ہے کہ اس واقعہ میں حضرت داؤد علیہ السلام کی آزمائش کا پہلو کونسا تھا؟ موجودہ تحریف شدہ تورات میں ہے کہ اگرچہ حضرت داؤدؑ کی بہت سی بیویاں تھیں مگر وہ اپنے ایک جرنیل اوریا کی بیوی پر فریفتہ تھے اور چاہتے تھے کہ اوریا اپنی بیوی کو چھوڑ دے اور وہ اس سے شادی کرلیں۔ظاہر سی بات ہے کہ یہ ایک بے بنیاد افسانہ ہے جو اخلاقی لحاظ سے ایک عام انسان کی شان کے بھی خلاف ہے، کجا یہ کہ ایک نبی کے بارے میں اس کا تصور کیا جائے۔

مسلمان مفسرین میں اس واقعہ کے بارے میں یہ مشہور ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام کی آزمائش ان کے اندازِ عدالت میں تھی کہ اُنہوں نے دوسرے فریق کا مؤقف سنے بغیر یہ کہہ دیا تھا کہ ''تمہارے بھائی نے تم سے بڑا ظالمانہ مطالبہ کیا ہے''۔اگرچہ حضرت داؤدؑ کا فیصلہ صحیح تھا مگر اللہ تعالیٰ کو ان کا یہ ترکِ اولیٰ پسند نہ آیا۔اُس نے مؤاخذہ کیا اور انہوں نے بھی اپنی خطا سے، جو اگرچہ ترکِ اولیٰ تھی، توبہ کرلی۔

اس داستان سے یہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ جب حرص انسان پر غالب آجائے تو وہ اپنے کمزور بھائی پر بھی اس حد تک ظلم کر جاتا ہے جس کی ہر باضمیر انسان مذمت کرتا ہے۔

چوتھی آیت میں دُنیوی زندگی کے بارے میں یہودیوں کی حریصانہ ذہنیت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔اللہ تعالیٰ اس آیت میں فرماتا ہے:

''تم انہیں سب لوگوں، حتیٰ کہ مشرکوں سے بھی زیادہ دنیا کی زندگی کا حریص پاؤ گے۔''

ولتجدنهم احرص الناس علیٰ حیوٰة ومن الذین اشرکوا

یعنی ان کی حالت یہ ہے کہ مال و دولت جمع کرنے میں، دنیا پر قبضہ کرنے میں ہر چیز پر اپنی اجارہ داری قائم کرنے میں وہ مشرکین سے بھی بڑھ کر حریص ہیں۔حالانکہ مشرکین کسی آسمانی اور الٰہی دین کے پابند نہیں ہیں جبکہ یہودی جس آسمانی دین کے پیروکار ہونے کے مدعی ہیں وہ حرص سے معنی کرتا اور ان کی یہ حالت ہے کہ بے دین افراد سے بھی بڑھ کر حریص ہیں۔ان کے حرص کی شدت ان الفاظ میں بیان کی گئی ہے کہ ان میں سے ہر ایک یہ چاہتا ہے کہ وہ ہزار سال اس دنیا میں زندہ رہے، خواہ زیادہ مال و دولت جمع کرنے کی غرض سے یا اپنے ان مظالم اور گناہوں کی سزا سے بچنے کیلئے جو انہوں نے دولت جمع کرنے کیلئے کئے، وہ لمبی عمر کے

آرزومند نظر آتے ہیں۔

اگر غور سے دیکھا جائے تو دور حاضر کے یہودیوں میں یہ صفت رذیلہ گزشتہ نسلوں کے مقابلہ میں بہت زیادہ پائی جاتی ہے۔ وہ اپنی دولت میں اضافہ کیلئے ہر قسم کا جرم کرنے کیلئے تیار ہیں۔ اس مقصد کے حصول کیلئے بڑی بڑی خونی جنگیں چھیڑنا، فتنہ وفساد کی آگ کو ہوا دینا، پڑوسی ملک کے درمیان جنگ کی آگ بھڑکانا، غرض اپنا اسلحہ بیچنے کیلئے اپنی دولت میں اضافہ کرنے کیلئے منشیات بیچنا، جھوٹا پروپیگنڈہ کرنا، غرضیکہ کسی بھی جرم کا ارتکاب ان کیلئے مشکل نہیں ہے۔ اگر کوئی شخص حرص کے تباہ کن نتائج کا صحیح معنوں میں جائزہ لینا چاہتا ہو تو یہودیوں کے قومی کردار کا مطالعہ کرے۔

اس آیت میں لفظ ''حیوٰۃ'' استعمال ہوا ہے جو اسم نکرہ ہے اور اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ ان کی نظر میں جو چیز اہمیت رکھتی ہے، وہ صرف زندگی ہے خواہ انسانی زندگی ہو یا حیوانی یا درندوں جیسی زندگی اس سے انہیں کوئی غرض نہیں ہے۔

بعض مفسرین کا خیال ہے کہ یہ آیت صرف یہودیوں کی نفسیات کی عکاسی نہیں کر رہی بلکہ سب لوگوں کو خبردار کر رہی ہے کہ حرص اور دنیا پرستی کے نتائج کے بارے میں غور وفکر کریں، ایسا یہ ہو کہ وہ بھی انہی گردابوں میں پھنس جائیں جن میں یہودی پھنسے ہوئے ہیں۔

قرآن شریف میں ہے کہ یہودیوں نے بہت سے انبیاء کو قتل کیا۔ ان کے اس فعل کی واحد وجہ یہ تھی کہ وہ انبیاء کو اپنے ناجائز مفادات کے حصول کی راہ میں رکاوٹ سمجھتے تھے۔ کتاب اللہ کی آیات میں انہوں نے جو تحریفات کیں ان کی بھی یہی وجہ تھی۔

پانچویں آیت میں کلی طور پر انسان کے حریص اور کم ہمت ہونے کا ذکر ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

''اَنَّ الْاِنْسَانَ خُلِقَ هَلُوْعاً ۔ اِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ جَزُوْعًا ۔ وَّاِذَا مَسَّهُ الْخَيْرُ مَنُوْعًا''۔

انسان حریص اور کم طاقت پیدا کیا گیا ہے۔ جب اسے کوئی برائی پہنچتی ہے تو بے تابی کرتا ہے اور جب اسے کوئی بھلائی پہنچتی ہے تو بخل کرتا ہے دوسروں تک فائدہ پہنچنے سے روکتا ہے۔

مفسرین نے ''هَلُوْع'' کے متعدد معنی بیان کیے ہیں جو ایک دوسرے کے قریب یا باہم لازم وملزوم ہیں۔ لسان العرف میں اس کے معنی حرص، جزع، بے صبری اور شدید ترین جزع بیان کیے گئے ہیں۔

التحقیق، مؤلف کا نظریہ ہے کہ اس لفظ کے بنیادی معنی نعمتوں اور لذتوں سے لطف اندوز ہونے کے ہیں جبکہ جزع، حرص اور بے صبری اس کے آثار ونتائج ہیں۔

ان بیانات سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ لفظ ''هَلُوْع'' تین منفی اخلاقی صفات کی طرف اشارہ کرتا ہے جو حرص، بے تابی اور بخل ہیں۔

''هَلُوْع'' کی جو تشریح بعد والی دو آیات میں بیان ہوئی ہے، وہ اس لفظ کے معنی کو اچھی طرح واضح کر دیتی ہے اور یہ تینوں مفاہیم بھی اس میں آجاتے ہیں، اس لئے کہ جزوع، جزع سے اسم مبالغہ ہے جس کے معنی ہیں بہت زیادہ بے تابی یا بے صبری کرنے

والا اور ممنوع، منع سے اسم مبالغہ ہے جس کے معنی ہیں بہت زیادہ بخل اور حرص سے کام لینے والا۔

بہر حال مندرجہ بالا آیات حریص، بخیل اور جزوع افراد کی مذمت کر رہی ہیں۔ ہم اس طرح بھی کہہ سکتے ہیں کہ حرص، بخل کا سبب اور بنیاد ہے، اس لئے کہ حریص کی خواہش ہوتی ہے کہ ہر چیز اپنے لئے جمع کرے۔ اسی طرح بعض اوقات حرص، جزع اور بے صبری کا سبب بن جاتی ہے۔ ایسا اُس وقت ہوتا ہے جب حریص کسی چیز کو کھو دیتا ہے۔

یہ آیت کہہ رہی ہے کہ انسان ان صفات کے ساتھ پیدا ہوا ہے۔ یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے انسان کو سعادت اور کمال کیلئے پیدا کیا ہے تو پھر اس بات کے کیا معنی ہوئے کہ اُس نے انسان کو ان نقائص کے ساتھ پیدا کیا جو انسان کی سعادت اور کمال کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہیں!

اس سوال کے جواب میں بعض علماء نے کہا ہے کہ یہ صفات ان افراد کی ہیں جو ایمان سے محروم ہیں۔ اگر انسان کو ایمان کی دولت نصیب ہو جائے تو وہ صبر و حوصلہ و سخاوت کا منبع اور سرچشمہ بن جاتا ہے۔ لیکن جب انسان ایمان سے محروم ہوتا ہے تو چھوٹی چھوٹی مشکلات کے سامنے صبر و حوصلہ ہار جاتا ہے۔ اس لئے کہ اُس کے پاس کوئی قابلِ اعتماد سہارا نہیں ہوتا جس پر بھروسہ کر کے وہ مشکلات کا مقابلہ کرے۔ اسی طرح ایسا انسان حریص اور بخیل بھی ہو جاتا ہے کیونکہ اسے اللہ سے کوئی اُمید نہیں ہوتی جس کے ہاتھ میں غیب کے خزانوں کی چابیاں ہیں اور تمام نعمتوں اور برکتوں کے ذخیرے اس کے ہاتھ میں ہیں۔

اس نقطہ نظر کی تصدیق بعد والی آیات سے ہوتی ہے جن میں باایمان نمازیوں کو ان صفات کے حامل انسانوں سے مستثنیٰ کیا گیا ہے۔

یہ احتمال بھی موجود ہے کہ مندرجہ بالا آیت دیگر بہت سی آیات کی طرح، جن میں انسان کو ظلوم اور جہول (احزاب:72)، یؤس و کفور (ہود:9) اور حصولِ نعمت کے وقت سرکشی کرنے والا (علق:6) کہا گیا ہے، دو پہلو رکھتی ہوں، جس کے معنی یہ ہیں کہ جب انسان کمال کی طرف حرکت کرتا ہے تو اعلیٰ علیین کے مقام پر پہنچ جاتا ہے اور جب پستی و انحطاط کا شکار ہوتا ہے تو اسفل السافلین کے مقام پر جا گرتا ہے۔

تفسیر المیزان میں علامہ طباطبائی نے ایک اور نقطہ نظر پیش کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

''هَلوع'' ہونا انسان کی ذاتی خصوصیات میں سے ہے اور حبِ ذات کی ایک شاخ ہے۔ بنیادی طور پر یہ رذائل اخلاقی میں سے نہیں ہے، اس لئے کہ حُبِ ذات جو اِن صفات کا سرچشمہ ہے، واحد ذریعہ ہے جو انسان کو کمال اور سعادت کی طرف قدم اُٹھانے پر مائل کرتا ہے۔ یہ صفات اس وقت مذموم ہوتی ہیں جب انسان صحیح تدبیر کے ساتھ ان کو صحیح سمت میں بروئے کار نہ لائے۔ درحقیقت یہ صفت بھی انسان کی دیگر صفات کی طرح سے ہے جو حدِ اعتدال پر ہوں تو فضیلت ہوتی ہیں اور اگر افراط و تفریط کی طرف نکل جائیں تو رذیلت بن جاتی ہیں۔

بہر حال یہ آیات اس بات کی نشاندہی کرتی ہیں کہ قرآنِ مجید انسان کو ایمان، نماز، دعا اور انفاق کی طرف دعوت دیتا ہے

تا کہ اسے حرص، بخل اور جزع جیسی آلودگیوں سے پاک کردے۔''

چھٹی آیت میں رسول اللہ ﷺ کے دور کے ایک واقعہ کی طرف اشارہ ہے۔ ایک سال قحط اور خشک سالی کی وجہ سے مدینہ میں غذائی اجناس کی کمی اور مہنگائی ہوگئی۔ شام سے ایک قافلہ غذائی اجناس لے کر مدینہ میں داخل ہوا۔ اس قافلہ نے مدینہ میں داخل ہوتے ہی اس دور کے طریقہ کے مطابق ڈھول باجے بجا کر اپنی آمد کا اعلان کیا۔ اس وقت رسول اللہ ﷺ مسجد نبوی میں جمعہ کا خطبہ ارشاد فرما رہے تھے۔ ڈھول باجے کی آواز سنتے ہی نومسلموں کا ایک گروہ رسول اللہ ﷺ کے خطبہ کے دوران ہی اُٹھا اور بازار کی طرف بھاگا، حالانکہ وہ نماز پڑھ کر بھی بازار جا کر خریداری کر سکتے تھے۔

بارہ مردوں اور ایک خاتون کے سوا سب مسجد سے چلے گئے۔ اس موقع پر یہ آیات نازل ہوئیں جن میں ان حریص مسلمانوں کی سخت مذمت کی گئی جو مالِ دنیا کی محبت میں رسول اللہ ﷺ کو حالتِ خطبہ میں چھوڑ کر بازار کی طرف بھاگ گئے تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے اس حرکت پر تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا کہ اگر یہ مختصر جماعت بھی، جو مسجد میں رہ گئی تھی، وہی حرکت کرتی تو آسمان سے ان سب پر پتھروں کی بارش ہوتی۔ (تفسیر مجمع البیان و دیگر تفاسیر)

جس لہجے میں آیت نے ان لوگوں کی مذمت کی، اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ انہوں نے کسی حقیقی ضرورت کی تکمیل کے جذبہ کے تحت یہ حرکت نہیں کی تھی بلکہ بعض ڈھول باجے اور موج میلہ دیکھنے کی غرض سے اور بعض تجارت کی غرض سے مسجد سے بھاگے تھے۔

قرآن شریف اور اس واقعہ کے بارے میں اس طرح تبصرہ فرماتا ہے:

''جب انہوں نے تجارت اور لہو ولعب کو دیکھا تو تیزی سے اس کی طرف بھاگے اور آپ کو (خطبہ کی حالت میں) کھڑا چھوڑ دیا''۔

"وَإِذَا رَأَوْا تِجَارَةً أَوْ لَهْوًا انْفَضُّوا إِلَيْهَا وَتَرَكُوكَ قَائِمًا ط"

اس کے بعد اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

''ان سے کہو کہ جو کچھ اللہ کے پاس ہے، وہ لہو ولعب اور تجارت سے بہتر ہے اور اللہ بہترین رزق دینے والا ہے''۔

"قَائِمًا ط قُلْ مَا عِنْدَ اللهِ خَيْرٌ مِّنَ اللَّهْوِ وَمِنَ التِّجَارَةِ ط وَاللهُ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ"۔

ممکن ہے یہ حرکت کرنے والوں میں سے بعض لوگ واقعی ضرورت مند ہوں اور انہوں نے ضرورت کے تحت ایسا کیا ہو (اگرچہ نماز کے بعد بھی ان کے پاس اپنی اس ضرورت کی تکمیل کیلئے کافی وقت تھا) لیکن آیت کے لب ولہجہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ حریص لوگوں کا ایک ٹولہ تھا جو اس نیت سے مسجد سے نکلا تھا تا کہ غذائی اجناس کو خرید کر بعد میں مہنگے داموں بیچ سکیں جبکہ ایک ٹولہ

صرف تماشا دیکھنے کیلئے مسجد سے نکل آیا تھا۔ یوں یہ دونوں گروہ رسول اللہ ﷺ کی اقتدا میں نمازِ جمعہ کی سعادت سے محروم ہو گئے۔

ساتویں اور آخری آیت میں ان لوگوں کا ذکر ہے جو دوسروں کے عیب تلاش کرتے ہیں اور ان کا مذاق اُڑاتے ہیں، جو مال و دولت کی وجہ سے فخر و تکبر کرتے ہیں اور تنگ دست مؤمنین کا مذاق اُڑاتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہیں:

''ہلاکت ہے ہر عیب جوئی کرنے والے، مذاق کرنے والے کے لئے، جو مال جمع کر کے گنتا رہتا ہے، وہ سمجھتا ہے کہ اُس کا مال اسے ہمیشہ کی زندگی دے دے گا''۔

''وَيْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةٍ ۝ الَّذِي جَمَعَ مَالًا وَعَدَّدَهُ ۝ يَحْسَبُ أَنَّ مَالَهُ أَخْلَدَهُ ۝''

اس آیت میں ''عَدَّدَہٗ'' کا لفظ، جو جہاں اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ دنیا پرست افراد اپنی دولت کو گن گن کر جمع کرتے ہیں، وہاں ان کے حرص کی شدت کی بھی نشاندہی کرتا ہے کہ جس قدر ان کے مال و دولت میں اضافہ ہوتا جاتا ہے، وہ اس میں مزید اضافے کے خواہش مند ہوتے ہیں اور اسی وجہ سے بار بار اسے گنتے رہتے ہیں۔

''الَّذِي جَمَعَ مَالًا وَعَدَّدَهُ'' (جس نے مال جمع کیا اور گن گن کر رکھا)، درحقیقت ان کے ''ھمز'' اور ''لمز'' یعنی عیب جوئی طعنہ زنی کی علت اور سبب کی حیثیت رکھتا ہے۔ یعنی مال و دولت کی کثرت کے نشے میں وہ اس قدر مست و مغرور ہو گئے ہیں کہ غریب اہلِ ایمان کا مذاق اُڑاتے ہیں اور ان کی تذلیل و تحقیر کرتے ہیں اور اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ نہ صرف ان کی دولت ہمیشہ رہنے والی ہے بلکہ ان کو بھی ہمیشہ زندہ رکھے گی۔

دنیا پرستوں کے حالات کا مطالعہ کرنے سے ہمارا ایسے حقائق سے سامنا ہوتا ہے جو عقل کو حیرت زدہ کر دیتے ہیں۔ ان میں سے بعض افراد کو ہم جانتے ہیں جو ظاہری اور مادی علم میں بھی خاصے ترقی یافتہ تھے مگر ان کا پیسہ جمع کرنے کے سوا کوئی مقصد نہیں تھا۔ جب ان سے پوچھا جاتا ہے کہ اس دولت کا کیا کرو گے جبکہ تم نے شادی بھی نہیں کی اور نہ کبھی سیر و تفریح کیلئے کسی سفر پر جاتے ہو۔۔۔۔۔۔؟ تو ان کا جواب ہوتا تھا کہ ہم اسی بات پر مطمئن اور خوش ہیں کہ ہماری دولت کی گنتی میں ایک زیرو کا اضافہ ہو جائے۔

مندرجہ بالا آیات اور ان کی تفسیر سے یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ قرآن مجید کی نظر میں حرص، دنیا پرستی اور مادی دولت و نعمت پر فریفتگی بہت خطرناک، مذموم اور باعثِ شر و فساد ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ خودسازی اور معنوی و اخلاقی ارتقاء و تکامل کی راہ میں پیش آنے والی بڑی رکاوٹوں میں سے ایک رکاوٹ ہے۔

حرص اور دنیا پرستی احادیث کی روشنی میں

حرص اور اس کے ہم معنی الفاظ احادیث میں بکثرت استعمال ہوئے ہیں اور ان کے منفی نتائج کا وسیع پیمانے پر ذکر کیا گیا ہے۔ نمونہ کے طور پر ذیل میں چند احادیث نقل کی جاتی ہیں:

1۔ ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علیؑ کو مخاطب کر کے فرمایا:

"اِعْلَمْ یَاعَلِیُّ! اَنَّ الْجُبْنَ وَالْبُخْلَ وَالْحِرْصَ غَرِیْزَۃٌ وَاحِدَۃٌ یَجْمَعُھَاسُوْءُ الظَّنِّ"۔(میزان الحکمہ، 1:588)

''اے علیؑ! جان لو کہ بزدلی، بخل اور حرص ایک ہی چیز ہیں جن کو (اللہ پر) بدگمانی کہا جاسکتا ہے''۔

2۔ اسی بات کو امیرالمومنینؑ نے جناب مالک اشتر کے نام اپنے عہد نامہ میں اس طرح بیان فرمایا کہ بخیل، بزدل اور حریص انسان سے مشورہ نہ کرنا۔ پھر آپؑ فرماتے ہیں: (نہج البلاغہ: مکتوب:53)

"اِنَّ الْبُخْلَ وَالْجُبْنَ وَالْحِرْصَ غَرَائِزُ شَتّٰی یَجْمَعُھَاسُوْءُ الظَّنِّ بِاللّٰہِ"۔

''بخل، بزدلی اور حرص مختلف خصوصیات ہیں جن کو اللہ کے بارے میں بدگمانی میں جمع کیا جاسکتا ہے''۔

جو شخص اللہ تعالیٰ، اس کی قدرت اور اس کے وعدوں کی صداقت پر ایمان اور ان اُمور کے بارے میں اللہ تعالیٰ کے بارے میں حسنِ ظن رکھتا ہے، وہ کبھی بخل، بزدلی اور حرص میں مبتلا نہیں ہوتا۔ جس شخص کا عقیدہ توحید کامل ہو اور وہ اللہ کی صفات اور اسمائے حسنیٰ پر ایمان رکھتا ہو، وہ ان تین صفاتِ رذیلہ سے، جو درحقیقت ایک صفتِ رذیلہ یعنی اللہ کے بارے میں بدگمانی کا ظہور ہیں، پاک ہوجاتا ہے۔

3۔ حرص انسان کو ایک مستقل روگ میں مبتلا کر دیتا ہے، چنانچہ حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

"اَلْحِرْصُ مَطِیَّۃُ التَّعَبِ"۔

''حرص رنج وزحمت کی سواری ہے''۔ (غررالحکم، حدیث:820)

4۔ ایک اور حدیث میں آپؑ فرماتے ہیں:

"اَلْحِرْصُ عَنَاءُ الْمُؤَبَّدِ"۔

''حرص ابدی رنج وزحمت کا سامان ہے''۔ (غررالحکم، حدیث:982)

اگر ہم حریص افراد کی زندگی کا جائزہ لیں اور ان کی پُردرد ورنج زندگی کا جائزہ لیں تو ہمیں نظر آئے گا کہ وہ صبح وشام بھاگ دوڑ کرتے ہیں تاکہ مال ودولت جمع کریں لیکن ان اموال سے کوئی لطف ولذت حاصل نہیں کرتے۔ ان کی یہ حالت دیکھ کر مندرجہ بالا احادیث کی سچائی کھل کر سامنے آجاتی ہے۔

بقول شیخ سعدی:

گفت چشم تنگ دنیا دولت را
یا قناعت پرکند یا خاک گور

''اس نے کہا کہ دنیا سے محبت کرنے والے کی تنگ آنکھ کو، یا قناعت پُر کرسکتی ہے یا قبر کی مٹی''۔

5۔ حریص انسان کبھی سیر نہیں ہوتا، لہٰذا ہمیشہ دولت جمع کرنے میں لگا رہتا ہے، یہاں تک کہ خود بھی اس سے فائدہ نہیں اُٹھاتا۔ حضرت علی علیہ السلام ایک اور حدیث میں فرماتے ہیں:

"اَلْحَرِیْصُ فَقِیْرٌ وَلَوْ مَلَکَ الدُّنْیَا بِحَذَافِیْرِھَا"۔

''حریص فقیر ہوتا ہے، خواہ ساری دنیا کی دولت کا مالک بن جائے''۔ (غرر الحکم، حدیث: 1753)

6۔ صرف وہی لوگ حقیقی تونگری اور غنا سے بہرہ مند ہوسکتے ہیں جو اسیر حرص نہ ہوں جیسا کہ امیر المومنین علیہ السلام فرماتے ہیں:

"اَغْنَی الْغِنٰی مَنْ لَمْ یَکُنْ لِلْحِرْصِ اَسِیْراً"۔

''سب سے بڑا تونگر اور غنی وہ ہے جو حرص کا اسیر نہ ہو''۔ (اصول کافی، 316:2)

7۔ حرص آخر کار انسان کو تباہ کر دیتا ہے۔ یہ تباہی بعض اوقات صرف روحانی ہی نہیں بلکہ مادی بھی ہوتی ہے۔ ایک حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں: (اصول کافی، 316:2)

"اِنَّ الدِّیْنَارَ وَالدِّرْھَمَ اَھْلَکَا مَنْ کَانَ قَبْلَکُمْ وَھُمَا مُھْلِکَاکُمْ"۔

''درہم و دینار نے تم سے پہلے لوگوں کو ہلاک کر دیا اور تم کو بھی ہلاک کر دیں گے''۔

8۔ حریص آدمی روز بروز حرص کے تانے بانے میں پھنستا چلا جاتا ہے اور اس سے نجات حاصل کرنا اس کے لئے مشکل سے مشکل تر ہوتا جاتا ہے۔ اس بات کو حضرت امام محمد باقر علیہ السلام نے ایک حدیث میں اس طرح بیان فرمایا ہے:

"مَثَلُ الْحَرِیْصِ عَلَی الدُّنْیَا مَثَلُ دُوْدَةِ الْقَزِّ، کُلَّمَا ازْدَادَتْ مِنَ الْقَزِّ عَلٰی نَفْسِھَا لَفًّا کَانَ اَبْعَدَ لَھَا مِنَ الْخُرُوْجِ! حَتّٰی تَمُوْتَ غَمًّا"۔

''حریص انسان کی مثال ریشم کے کیڑے کی مانند ہے، جس قدر وہ اپنے گرد ریشم کا تار بنتا چلا جاتا ہے، اس کے اندر پھنستا جاتا ہے اور آخر کار اسی کے اندر مر جاتا ہے''۔ (غرر الحکم، حدیث: 1550)

9۔ حرص انسان کی شخصیت کو تباہ کر دیتا ہے اور معاشرے میں اس کی عزت خاک میں ملا دیتا ہے۔ حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

"اَلْحِرْصُ یَنْقُصُ قَدْرَ الرَّجُلِ، فَلَا یَزِیْدُ فِیْ رِزْقِہٖ"۔ (غرر الحکم)

''حرص انسان کی عزت کو گھٹا دیتا ہے لیکن اس سے اس کے رزق میں اضافہ نہیں ہوتا''۔

10۔ حرص اُن برائیوں میں سے ہے جو بہت سی برائیوں کی جڑ بن جاتی ہیں۔ان میں سے ایک یہ ہے کہ حریص آدمی حلال وحرام کو نظر انداز کر دیتا ہے۔لوگوں کے حقوق کا احترام نہیں کرتا اور مختلف قسم کے ظلم وزیاتیوں کا مرتکب ہوتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ مالک اشتر کے نام اپنے فرمان میں حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

''لَاتُدْخِلَنَّ فِي مَشْوَرَتِكَ حَرِيصاً يُزَيِّنُ لَكَ الشَّرَهَ بِالْجَوْرِ!''

''حریص انسان کو ہرگز اپنے مشورے میں داخل نہ کرنا کیونکہ وہ ظلم کے رجحان کو تمہاری نظر میں خوش نما بنا دے گا۔''(نہج البلاغہ:53)

مختصر یہ کہ حرص کے نتائج بہت خطرناک اور نقصان دہ ہیں اور وہ انسان کو خدا سے دور کر دیتی ہے،معاشرے میں اس کی عزت کو خاک میں ملا دیتی ہے۔حرص کی وجہ سے وہ اور بھی گناہوں میں گرجاتا ہے اور روز بروز سعادت سے دور ہوتا جاتا ہے۔انسان ایک ذلیل وحقیر غلام کی طرح اس کے ہاتھ میں گرفتار ہو جاتا ہے۔ایک جملہ میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ حرص کے نتیجہ میں انسان کا دین بھی تباہ ہو جاتا ہے اور دنیا بھی۔

حرص کی تعریف

حرص کے معنی اجمالی طور پر سب پر واضح ہیں لیکن اگر اس کے معنی ومفہوم کے بارے میں غور وفکر کیا جائے تو نئے نکات ہم پر منکشف ہوتے ہیں۔

راغب اصفہانی اپنی کتاب مفردات میں کہتے ہیں کہ حرص کسی چیز کے بارے میں شدید رجحان اور کشش کو کہتے ہیں اور اصل میں یہ کپڑا دھوتے وقت اسے کسی چیز سے کوٹنے کو کہتے ہیں۔

امیر المومنینؑ نہایت خوبصورت جملے میں حرص کی تعریف ان الفاظ میں فرماتے ہیں:

''هُوَ طَلَبُ الْقَلِيلِ بِإِضَاعَةِ الْكَثِيرِ''

''حرص یہ ہے کہ انسان زیادہ چیز کو ضائع کر کے تھوڑی حاصل کرے۔''(سفینۃ البحار،حرص)

علمائے اخلاق نے حرص کو قوہ شہویہ سے تعلق رکھنے والے رذائلِ اخلاقی میں شمار کیا ہے اور اس کی تعریف میں کہا ہے کہ:

''حرص ایک ایسی نفسانی کیفیت کا نام ہے جو انسان کو ضرورت سے زیادہ وسائلِ زندگی جمع کرنے پر مائل کرتی ہے۔یہ حُب دنیا کا ایک شعبہ اور ہلاک کر دینے والی صفت ہے جو انسان کو راہِ حق سے گمراہ کر دیتی ہے۔حرص ایک ایسا صحرا ہے جس کا کوئی کنارہ نہیں ہے۔انسان اس میں جس قدر چلتا جائے،اس سے نکل نہیں پاتا۔

حریص کی حالت مریض استسقاء جیسی ہوتی ہے کہ وہ جس قدر پانی پیتا جائے، اس کی پیاس بجھنے میں نہیں آتی۔

حریص عقل و منطق سے محروم ہوجاتا ہے۔ اگر اُسے کہا جائے کہ تمہاری عمر اسی (80) سال ہوچکی ہے، اب پیچھے کتنی عمر باقی بچی ہے، پھر اس حرص و دنیا طلبی کا مقصد؟ اس سوال کا کوئی جواب نہ دے سکنے کے باوجود وہ اپنی حرص سے باز نہیں آتا بلکہ بعض اوقات تو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ انسان کی حرص میں بھی اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی ایک مشہور حدیث ہے: (بحارالانوار، 22:70)

"عُشِيْبُ بْنُ آدِمَ وَيَشُبُّ فِيهِ خَصْلَتَانِ: اَلْحِرْصُ وَطُوْلُ الْاَمَلِ"۔

''انسان بوڑھا ہوجاتا ہے لیکن اس کے اندر دو خصلتیں جوان ہوجاتی ہیں: حرص اور طویل آرزوئیں''۔

انفرادی اور معاشرتی زندگی پر حرص کے اثرات

آیات و روایات کی روشنی میں جو تفصیلی بحث اب تک ہم کر چکے ہیں، اس کی روشنی میں حرص کے منفی اثرات بخوبی واضح ہو جاتے ہیں اور ان کا مطالعہ ہمیں دیگر تشریحات و تفاسیر کے مطالعہ سے بے نیاز کر دیتا ہے۔

ہم ان منفی اثرات کو فہرست اور اس طرح بیان کر سکتے ہیں:

1۔ حرص انسان کو ابدی رنج و غم میں مبتلا کر دیتا ہے۔

2۔ حریص کبھی سیر نہیں ہوتا، حتیٰ کہ اگر اسے ساری دنیا کی دولت حاصل ہوجائے، وہ پھر بھی فقیر رہتا ہے۔

3۔ حریص فقیروں کی طرح زندگی گزارتا ہے اور فقیروں کی طرح مرتا ہے۔ مگر قیامت کے دن حساب دولت مندوں کی طرح دے گا۔

4۔ حرص انسان کو ہلاک کر دیتی ہے، اس لئے کہ حُبِ دنیا کی وجہ سے وہ اپنے اردگرد کے خطرات کو دیکھنے کی صلاحیت کھو دیتا ہے اور جلد بازی سے آگے بڑھنے کی کوشش اسے ہلاک کر دیتی ہے۔

5۔ حریص آدمی کی مشکلات اور پریشانیاں روز بروز بڑھتی چلی جاتی ہیں اور آخر کار نجات کا راستہ اس پر بند ہوجاتا ہے۔

6۔ حرص انسان کی آبرو کو گھٹا دیتی ہے اور لوگوں کی نظر میں اس کے مقام کو کم کر دیتی ہے، اس لئے کہ حریص انسان اپنی خواہشات کی تکمیل کرتے ہوئے معاشرتی اقدار کو نظر انداز کر دیتا ہے اور ایسے قیدی کی مانند ہوجاتا ہے جس کی گردن میں زنجیر ڈال کر کبھی اِدھر کھینچا جاتا ہے اور کبھی اُدھر۔

7۔ حرص انسان کو مختلف قسم کے گناہوں میں مبتلا کر دیتی ہے۔ حرص کی وجہ سے انسان جھوٹ، خیانت، ظلم اور غصب کا مرتکب ہوتا ہے، اس لئے کہ اگر وہ حلال و حرام کی پابندی کرے تو اپنے مقاصد حاصل نہیں کرتا۔

8۔ حرص انسان کو اللہ سے دور کر دیتی ہے اور اللہ کے بندوں کی نظر میں حقیر کر دیتی ہے۔ اسے اطمینان اور سکون سے محروم

کر دیتی ہے اور اس کی زندگی کو غم واندوہ کا مرقع بنا دیتی ہے۔

9۔ حریص وہ مال و دولت جمع کرتا ہے جسے حاصل کرنے کی زحمت وہ اُٹھاتا ہے اور اس کے بارے میں جوابدہ بھی وہ خود ہوتا ہے جبکہ اس سے فائدہ دوسرے اُٹھاتے ہیں۔

10۔ حرص اللہ تعالیٰ کے بارے میں بدگمانی اور اس پر اعتماد اور بھروسہ نہ ہونے کا نتیجہ ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ یہ بدگمانی اور عدم اعتماد اور بھی بڑھتا چلا جاتا ہے۔

باطن کی بے نیازی

یہ نکتہ قابلِ غور ہے کہ حریص غنا اور بے نیازی کو باہر کی دنیا میں تلاش کرتا ہے جبکہ حقیقت یہ ہے کہ انسان کو یہ دولت اپنے اندر تلاش کرنی چاہئے۔ کسی عالم سے پوچھا گیا کہ غنا اور بے نیازی کی حقیقت کیا ہے؟ اُس نے جواب دیا کہ تمہاری آرزوئیں چھوٹی ہوں اور جو کچھ اللہ نے تمہیں دیا ہے، اُس پر راضی رہو۔

ایک حدیث جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بھی مروی ہے اور حضرت علی علیہ السلام سے بھی، اس حقیقت کو ان الفاظ میں بیان کرتی ہے:

"خَيْرُ الْغِنٰى غِنَى النَّفْسِ"۔

یعنی "بہترین بے نیازی روح کی بے نیازی ہے"۔ (غرر الحکم، حدیث: 4949، امالی صدوق: 394)

رسول اللہ سے مروی ایک اور حدیث میں ہے:

"اَلْغِنٰى فِي الْقَلْبِ، وَالْفَقْرُ فِي الْقَلْبِ"۔ (بحار الانوار، 68:69)

"بے نیازی بھی انسان کے دل کے اندر ہوتی ہے اور فقر بھی انسان کے دل کے اندر ہوتا ہے"۔

بلاشبہ جس شخص کی روح حرص کی وجہ سے بھوکی ہو، اگر اُسے ساری دنیا کی دولت دے دی جائے، پھر بھی وہ بھوکا اور فقیر رہتا ہے۔ اگر روح غنی اور سیراب ہو تو ساری دنیا بھی اس سے چھین لی جائے تو وہ بے نیاز اور غنی رہتا ہے۔

پسندیدہ اور ناپسندیدہ حرص

لفظ "حرص" سے عام طور پر منفی معنی ذہن میں منعکس ہوتے ہیں۔ جب بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے، اس سے ذہن مال و دولت، مقام و مرتبہ اور دیگر مادی و شہوانی حرص کی طرف جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عام طور پر یہ لفظ انہی معنوں میں استعمال ہوتا ہے اور یہ معنی مذموم اور ناپسندیدہ ہیں۔

لیکن بعض اوقات یہ لفظ ایسے معنی کے بارے میں بولا جاتا ہے جو پسندیدہ ہیں اور رذائلِ اخلاقی سے نہیں بلکہ فضائلِ اخلاقی سے تعلق رکھتے ہیں، مثلاً قرآن شریف میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ لوگوں کو ہدایت دینے اور انہیں گمراہی سے نکالنے میں حریص تھے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

"لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيْصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ۔"

''بے شک تمہاری طرف تم ہی میں سے ایک رسول آیا ہے۔ تمہاری سختیاں اس پر گراں گزرتی ہیں، وہ تمہاری ہدایت کے معاملہ میں حریص اور مؤمنین پر رؤف ورحیم ہے''۔

ایک اور مقام پر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

"اِنْ تَحْرِصْ عَلٰى هُدٰىهُمْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ مَنْ يُّضِلُّ وَمَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ"

''(اے رسولؐ!) تم جس قدر بھی ان کی ہدایت کے بارے میں حریص ہو جاؤ (اس کا کوئی فائدہ نہیں ہے کیونکہ) جن کو اللہ نے (ان کے بُرے اعمال وکردار کی وجہ سے) گمراہ کر دیا ہے، وہ انہیں ہدایت نہیں دیتا اور ان کے کوئی مددگار نہیں ہوں گے''۔

قرآن مجید کی دیگر آیات مثلاً سورۂ یوسف:103 اور سورۂ نسأ:129 بھی اس کی مثالیں دیکھی جاسکتی ہیں۔ البتہ قرآن مجید میں یہ لفظ منفی معنوں میں بھی استعمال ہوا ہے۔ احادیث میں بھی بہت زیادہ مقامات پر یہ لفظ مثبت معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ خطبہ ہمام میں امیر المومنین علیہ السلام متقین کی صفات بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں: (نہج البلاغہ، خطبہ:193)

"فَمِنْ عَلَامَةِ اَحَدِهِمْ اَنَّكَ تَرٰى لَهٗ قُوَّةً فِيْ دِيْنٍ وَحِرْصاً فِيْ عِلْمٍ۔"

''ان کی صفات میں سے ہے کہ تم ان کو دین کے معاملہ میں قوی اور علم کے معاملہ میں حریص دیکھو گے''۔

متعدد احادیث میں آیا ہے کہ مؤمن فقہ میں، جہاد اور تقویٰ وغیرہ میں حریص ہوتا ہے۔ (بحار الانوار، 64:271، 294)

ہم اس بحث کو حضرت امام محمد باقر علیہ السلام کی اس حدیث پر ختم کرتے ہیں:

"لَاحِرْصَ كَالْمُنَافِسَةِ فِي الدَّرَجَاتِ"۔ (میزان الحکمہ، 1:589)

''قربِ الٰہی کے درجات کے حصول کیلئے مقابلہ کرنے جیسی کوئی حرص نہیں ہے''۔

بنابرایں حرص کا مفہوم بہت وسیع ہے جس کے معنی کسی شے کو حاصل کرنے کی غیر معمولی اور شدید خواہش کے ہیں۔ اگر وہ خیر وسعادت کی راہ میں ہو تو ممدوح اور پسندیدہ ہوگی اور اگر دنیا پرستی کی راہ میں ہوگی تو مذموم اور ناپسندیدہ ہوگی۔

حرص کا علاج

ہمیں یہ بات اچھی طرح معلوم ہے کہ جب ہم کسی جسمانی بیماری کا علاج کرتے ہیں تو سب سے پہلے بیماری کی وجوہات کو تلاش کرتے ہیں، اس لئے کہ بیماری کی وجوہات ختم کئے بغیر ہم بیماری کا علاج نہیں کر سکتے۔ مسکن دواؤں کے ذریعے وقتی طور پر بیماری کی علامات کو دبایا جاسکتا ہے مگر کچھ عرصہ گزرنے کے بعد وہ پھر سر اُٹھا لیتی ہیں۔

اخلاقی بیماریوں کا بھی یہی حال ہے۔ لہٰذا ان کا علاج کرنے سے قبل ضروری ہے کہ ان کے اسباب، عوامل کو تلاش کیا جائے اور اس کے بعد ان کی مکمل طور پر بیخ کنی کی جائے۔

گزشتہ صفحات میں ہم احادیث کی روشنی میں یہ جان چکے ہیں کہ حرص کی وجہ اللہ تعالیٰ کے بارے میں بدگمانی اور اس پر اعتماد اور بھروسہ نہ ہونا ہے جس کی وجہ سے توحیدِ افعالی کی بنیادیں متزلزل ہو جاتی ہیں۔

جو شخص اللہ تعالیٰ کو قادر و رازق سمجھتا ہو کہ ہر خیر و سعادت کی چابی اس کے ہاتھ میں ہے:

"تَشَآءُ ط بِيَدِكَ الْخَيْرُ ط اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ○" (آلِ عمران: 26)

ایسا شخص کبھی دنیوی مال و متاع جمع کرنے میں حرص سے کام نہیں لے گا۔ جو شخص اللہ تعالیٰ کے وعدوں پر پختہ ایمان رکھتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کا مطلب اچھی طرح سمجھتا ہے کہ:

"مَا عِنْدَكُمْ يَنْفَدُ وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ بَاقٍ ط"

''جو کچھ تمہارے پاس ہے، فنا ہو جانے والا ہے اور جو اللہ کے پاس ہے وہ باقی رہنے والا ہے''۔ (نحل: 96)

ایسا شخص نہ صرف یہ کہ مال جمع کرنے میں حریص نہیں ہوتا بلکہ اللہ کی راہ میں مال خرچ کرنے میں حریص ہو جاتا ہے۔

جب توحید پر، خاص طور پر توحیدِ افعالی پر انسان کا ایمان کمزور ہو جاتا ہے تو بہت سی اخلاقی برائیاں یعنی رذائلِ اخلاقی اس پر حملہ آور ہو جاتی ہیں جن میں سے حرص سب سے زیادہ خطرناک ہے۔ لہٰذا ایمان کو مضبوط کر کے اس بیماری کا مقابلہ کرنا چاہئے۔

حرص کی ایک اور وجہ اس کے اثرات و نتائج کے بارے میں جہالت ہے۔ اگر انسان کو علم ہو کہ حرص کے نتیجہ میں اُس کی زندگی کا سارا سکون برباد ہو جائے گا اور یہ کہ حرص انسان کو ابدی رنج و زحمت میں مبتلا کر دیتا ہے، حرص کی وجہ سے معاشرے میں اُس کی عزت تباہ ہو جاتی ہے۔ حرص کی وجہ سے انسان مال و دولت کی فراوانی کے باوجود فقیروں جیسی زندگی گزارتا ہے۔ دنیا میں مال جمع کرنے کی تکالیف وہ اُٹھاتا ہے، آخرت میں اس کا حساب وہ دیتا ہے لیکن اس مال سے لطف اندوز دوسرے ہوتے ہیں۔ اگر انسان حرص کے ان اثرات و نتائج کو مدِ نظر رکھے تو کبھی حرص میں مبتلا نہ ہو۔

مرحوم فیض کاشانی اپنی معروف کتاب ''المحجۃ البیضا'' میں فرماتے ہیں کہ حرص کی دو تین اجزأ پر مشتمل ہے جن کا مجموعہ پانچ ہو جاتا ہے:

1۔ زندگی میں اعتدال اور میانہ روی: اگر کسی کی زندگی کے اخراجات زیادہ ہو جائیں تو قناعت اسے سیر نہیں کرتی۔ بنابرایں اخراجات میں اعتدال رکھنا حرص کا دشمن ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مروی ایک حدیث میں ہے:

"مَنِ اقْتَصَدَ اَغْنَاهُ اللهُ، وَمَنْ بَذَّرَ اَفْقَرَهُ اللهُ"۔

''جو شخص میانہ روی اختیار کرتا ہے، اللہ اُسے غنی کر دیتا ہے اور جو اسراف وتبذیر کا مرتکب ہوتا ہے، اللہ اُسے فقیر بنا دیتا ہے''۔(میزان الحکمہ، 2557:3)

2۔ جب انسان کے پاس زندگی گزارنے کیلئے کافی مقدار میں مال موجود ہو تو وہ مستقبل کے بارے میں فکرمند نہ ہو، اس لئے کہ بہت سے حریص صرف مستقبل میں مالی مشکلات سے بچنے کیلئے حرص میں گرفتار ہو جاتے ہیں۔ حالانکہ وقت آنے پر مناسب تدبیر اختیار کرنے سے مستقبل کے مسائل بھی اپنے وقت پر حل ہو جاتے ہیں۔ قرآن مجید اسی کے بارے میں فرماتا ہے:

"اَلشَّيْطٰنُ يَعِدُكُمُ الْفَقْرَ وَيَاْمُرُكُمْ بِالْفَحْشَآءِ ۚ"

''شیطان تم کو فقر سے ڈراتا ہے اور بُرے کاموں کا حکم دیتا ہے''۔(بقرہ:268)

3۔ انسان قناعت اور اس سے حاصل ہونے والی عزت کے بارے میں غور وفکر کرے اور حرص وطمع کے نتیجہ میں حاصل ہونے والی ذلت کے بارے میں غور کرے، اس سے اسے حرص سے دور اور قناعت کے قریب ہونے میں مدد ملے گی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"عِزُّ الْمُؤْمِنِ اِسْتِغْنَاهُ عَنِ النَّاسِ"۔

''مومن کی عزت اس میں ہے کہ وہ لوگوں سے بے نیاز رہے''۔(شرح فارسی غرر الحکم، 338:5)

4۔ انسان گزشتہ نسلوں، خصوصاً یہودیوں اور دیگر حریص اقوام وقبائل کی زندگی کا مطالعہ کرے اور ان کے حالات کا انبیأ واولیأ اللہ کے حالات سے موازنہ کرے۔ پھر اپنی عقل کو قاضی بنا کر اس سے فیصلہ مانگے کہ وہ انبیأ واولیأ کے ساتھ رہنا چاہتا ہے یا اہل حرص ودنیا پرستی کے ساتھ۔ جن لوگوں نے عزت وآبرو سے زندگی بسر کی اور عزت وآبرو سے اس دنیا سے گئے، اپنی پاکیزہ روح اور اعمالِ صالحہ کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے حضور حاضر ہوئے، انسان اُن کے ساتھ شامل ہونا چاہتا ہے یا اُن لوگوں کے ساتھ جو دنیا میں ذلت اور رسوائی سے جیئے اور اسی حال پر مر گئے!

5۔ انسان بہت زیادہ مال ودولت کے خطرات اور دنیا وآخرت میں اس سے ہونے والے ممکنہ نقصانات کے بارے میں سوچے۔ اسی طرح قناعت سے حاصل ہونے والے سکون واطمینان اور آخرت میں اس کے اچھے انجام کے بارے میں سوچے، دنیوی حالات میں ہمیشہ اپنے سے کم تر لوگوں پر نظر رکھے، اگر اپنے سے اوپر کے طبقات پر نظر کرے گا تو شیطان اسے ضرور اُکسائے

گا کہ دیکھو! یہ کس طرح ناز ونعمت میں عیش وعشرت کی زندگی گزار رہے ہیں، تم کیوں ایسی زندگی کیلئے دوڑ دھوپ نہیں کرتے؟ تم نے خواہ مخواہ اپنے اوپر خوفِ خدا کا شکنجہ کسا ہوا ہے؟ کیا یہ لوگ خوفِ خدا نہیں رکھتے؟ کیا تم ان سے زیادہ دیندار ہو؟

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جلیل القدر صحابی حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ غفاری کہتے ہیں:

"اَوْصَانِیْ خَلِیْلِیْ اَنْ اَنْظُرَ اِلٰی مَنْ هُوَ دُوْنِیْ، لَا اِلٰی مَنْ هُوَ فَوْقِیْ"۔

''میرے خلیل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجھے نصیحت کی کہ میں اپنے سے کم تر لوگوں پر نظر رکھوں، اپنے سے برتر پر نہیں''۔

(المحجۃ البیضاء، 54:6)

ایک غلط فہمی کا ازالہ

مندرجہ بالا آیات وحدیث کی روشنی میں ممکن ہے کہ کسی کے ذہن میں یہ خیال پیدا ہو کہ دین اسلام لوگوں کی مادی ترقی کو پسند نہیں کرتا، اسی لئے اپنے پیروکاروں کو دنیا سے بیزاری کا درس دیتا ہے۔ یہ خیال صرف اور صرف ایک بہت بڑی غلط فہمی ہے۔ اسلام حرص، دنیا پرستی اور تمام انسانی واخلاقی اقدار کی پابندی کرتے ہوئے مادی لحاظ سے خوشحال زندگی گزارنے کے ہرگز خلاف نہیں ہے۔

اس کی مزید وضاحت اس طرح کی جاسکتی ہے کہ مادی وسائل درحقیقت مقاصد کے حصول کا ذریعہ ہیں۔ اگر انسانی اقدار اور اخلاقی نشوونما کے حصول کیلئے مادی وسائل فراہم کیے جائیں تو اسلام کی نظر میں یہ قابلِ تعریف پسندیدہ عمل ہے۔ لیکن اگر صرف ذاتی عیش پرستی اور ہوس رانی کیلئے انہیں حاصل کیا جائے، یا یہ خود ہی زندگی کا مقصد بن جائیں اور انسان کو زندگی کے حقیقی مقصد سے بیگانہ کردیں تو اس صورت میں یہ قابلِ مذمت اور ناپسندیدہ ہیں۔

مال ودولت کی حیثیت بھی جدید صنعتی وسائل کی طرح ہے جن کو مثبت اور تعمیری انداز سے بھی استعمال کیا جاسکتا ہے اور منفی اور تخریبی انداز سے۔ ہوائی جہاز تیز رفتار سفر کا ذریعہ بھی ہوسکتا ہے اور بمباری کے ذریعہ وسیع پیمانہ پر انسانوں کی بے رحمانہ ہلاکت کا ذریعہ بھی ہوسکتا ہے۔

لہٰذا یہ ہرگز صحیح نہیں ہے کہ حرص ودنیا پرستی کے مذموم ہونے کا بہانہ بنا کر انسان مثبت اور تعمیری اقتصادی سرگرمیوں سے کنارہ کش ہوجائے، جیسا کہ بہت سے سست اور کاہل افراد حرص اور دنیا پرستی سے دوری کی آڑ لے کر اپنی نااہلی اور نقائص کی پردہ پوشی کی کوشش کرتے ہیں۔

چوتھا باب

حُبِّ دنیا

تمہید:۔

''حرص'' جس کے دردناک انجام کا ذکر ہم گزشتہ صفحات میں کر چکے ہیں، اس کے بنیادی اسباب میں سے ایک سبب حُبِ دنیا ہے۔ جب حُبِ دنیا کی آگ کے شعلے انسان کے دل میں بھڑکتے ہیں تو وہ مادی نعمتوں اور لذتوں کی طرف کھنچتا چلا جاتا ہے۔ ایسا انسان دوسرے عاشقوں کی طرح عقل وفکر سے فارغ ہوکر اپنے مقصد کے حصول کیلئے شب وروز ہاتھ پاؤں مارتا ہے اور گندگی وآلودگی کے اس دلدل میں دھنستا چلا جاتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن شریف حرص کی بیخ کنی کیلئے ''دنیا پرستی'' کو نشانہ بناتا ہے اور مختلف بیانات اور تعبیرات کے ذریعے مادی نعمتوں اور لذتوں کی قدر وقیمت کو انسان کی نظر میں کم کرتا ہے تاکہ دنیا کے عاشقانِ بیقرار عقل وشعور کی راہ اپنائیں اور حریصانہ انداز میں تمام انسانی واخلاقی اقدار کو پیروں تلے روندتے ہوئے حصولِ دنیا کی تگ ودو میں نہ لگے رہیں۔

اس مختصر تمہید کے بعد ہم قرآن مجید کی طرف رجوع کرتے ہیں اور قرآن مجید کی انتہائی نپی تلی عبارات کی روشنی میں اس مسئلہ کا مطالعہ کرتے ہیں۔

1۔ قرآن شریف میں مختلف مقامات پر دنیا کو بازیچہ اطفال اور سہو ولہو کا سبب قرار دیا گیا ہے اور فرمایا گیا ہے:

"وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا لَعِبٌ وَّلَهْوٌ ط"

''اور دنیوی زندگی لہو ولعب کے سوا کچھ نہیں ہے''۔ (انعام:32)

ایک اور مقام پر اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

"اِعْلَمُوْٓا اَنَّمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَّلَهْوٌ وَّزِيْنَةٌ وَّتَفَاخُرٌۢ بَيْنَكُمْ وَتَكَاثُرٌ فِي الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِ ط"

''جان لو کہ دنیوی زندگی لہو ولعب، زینت، باہمی تفاخر اور مال واولاد میں کثرت طلبی کا نام ہے''۔

ان آیات میں دنیا پرستوں کو ایک ایسے بچے سے تشبیہ دی گئی ہے کہ جو کھیل اور تفریح میں غرق اور ہر بات سے بے خبر رہے، حتیٰ کہ وہ خطرات جو ان کے انتہائی قریب ہیں، ان سے بھی غافل ہوتے ہیں۔

بعض مفسرین نے انسانی زندگی کو (5 سال سے 40 سال تک) پانچ ادوار میں تقسیم کیا ہے اور ہر مرحلہ کو آٹھ سالوں پر

محیط قرار دیا ہے۔ پہلے آٹھ سال کھیل کود میں گزر جاتے ہیں۔ آٹھ سال لہوولعب میں گزر جاتے ہیں۔ آٹھ سال جوانی اور اس کی رعنائیوں کی نذر ہوجاتے ہیں، آٹھ سال فخر وغرور کی حالت میں گزر جاتے ہیں۔ اس کے بعد آٹھ سال مال واولاد کی کثرت کی طلب میں بسر ہوجاتے ہیں اور اس طرح انسان کی شخصیت پختہ ہوجاتی ہے جو ممکن ہے کہ عمر بھر تبدیل نہ ہو۔ اس طرح دنیا پرستوں کو معنوی زندگی اور معنوی اقدار کے بارے میں سوچنے کی بھی فرصت نہیں ملتی۔

2۔ بعض آیات میں دنیوی زندگی کو اسبابِ فریب کا نام دیا گیا ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

"وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ○"

''اور دنیوی زندگی دھوکے اور فریب کی متاع کے سوا کچھ نہیں ہے''۔ (آل عمران:185)

ایک مقام پر اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

"فَلَا تَغُرَّنَّكُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا ۪ وَلَا يَغُرَّنَّكُمْ بِاللّٰهِ الْغَرُوْرُ○"

''ایسا نہ ہو کہ دنیوی زندگی تمہیں فریب دے دے اور نہ ہی شیطانِ فریب کار تمہیں اللہ کے بارے میں مبتلا کر دے''۔ (لقمان:33)

ان الفاظ وتعبیرات سے یہ بات بخوبی واضح ہوجاتی ہے کہ دنیا کا فریب کارانہ زرق وبرق انسان کے معنوی ارتقا کی راہ میں ایک اہم رکاوٹ ہے، جب تک انسان اس رکاوٹ کو عبور نہ کرلے، وہ معنوی لحاظ سے کوئی مقام اور مرتبہ نہیں پاسکتا ہے۔

دُنیوی زندگی ایک سراب کی مانند ہے جو مادی تعلقات کے پتے ہوئے صحرا میں انسان کو اپنی طرف کھینچتا ہے۔ جب انسان اپنی پیاس بجھانے کیلئے اس کے قریب پہنچتا ہے تو اسے معلوم ہوتا ہے کہ وہاں پانی نام کی کوئی چیز نہیں ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ پانی کی تلاش میں سرابوں کا تعاقب کرنے کے نتیجہ میں انسان مزید تھکتا چلا جاتا ہے اور آخر کار ہلاک ہوجاتا ہے۔

ایسے بہت سے لوگ موجود ہیں جو سالہا سال طلبِ دنیا دوڑتے رہے لیکن جب وہ اپنی اس منزل کو پالیتے ہیں تو یہ کہہ کر اعترافِ شکست کرتے ہیں کہ انہیں ان کی اصل منزل یعنی اطمینان قلب نہیں ملا بلکہ شہد کے ساتھ موم اور پھول کے ساتھ کانٹا ملا۔ اس طرح انہیں اطمینان وسکون کی جگہ ان کی پریشانی واضطراب میں اضافہ ہوا۔

3۔ اسی طرح قرآن شریف کی بعض آیات میں اس حقیقت کو بے نقاب کیا گیا ہے کہ دنیا کی محبت انسان کو آخرت سے غافل کردیتی ہے۔ یعنی ان کی ساری توجہات دنیا پر مرکوز ہوجاتی ہیں اور ان کی ساری دوڑ دھوپ کا مقصد صرف دنیا رہ جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

"يَعْلَمُوْنَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۖ وَهُمْ عَنِ الْاٰخِرَةِ هُمْ غٰفِلُوْنَ○"

''وہ دنیوی زندگی کے ظاہر کو ہی جانتے ہیں اور آخرت سے غافل ہیں''۔ (روم:7)

ان لوگوں نے دنیوی زندگی کی حقیقت کو بھی نہیں پہچانا، بجائے اس کے کہ وہ اسے آخرت کی کھیتی سمجھتے ، اعلیٰ انسانی اقدار ومراتب تک پہنچنے کا راستہ سمجھتے ،فضائلِ اخلاقی کے حصول کے مشن کے میدان سمجھتے ،انہوں نے اسے اپنا مقصود ومطلوب بلکہ معبود بنالیا۔ظاہر سی بات ہے کہ ایسے لوگ آخرت سے غافل ہی ہوجاتے ہیں۔

ایک اور مقام پر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

"اَرَضِيْتُمْ بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا مِنَ الْاٰخِرَةِ ۚ فَمَا مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا قَلِيْلٌ○"

''کیا تم آخرت کی بجائے دنیوی زندگی پر راضی ہوگئے ہو؟ دنیوی زندگی کا مال واسباب تو آخرت کے مقابلہ میں بہت کم ہے''۔(توبہ:38)

بے شک کم ظرف اور ہوس ران افراد کی نظروں میں یہ چھوٹی سی دنیا بڑی دکھائی دینے لگتی ہے کہ وہ اُخروی زندگی کو، جو کہ الطاف وعنایاتِ الٰہی سے بھرپور ہے،فراموش کردیتے ہیں۔

4۔ بعض آیات میں دنیا کو عَرَض کہا گیا ہے جس کے معنی ہیں عارضی اور زوال پذیر۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

"تَبْتَغُوْنَ عَرَضَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۡ فَعِنْدَ اللّٰهِ مَغَانِمُ كَثِيْرَةٌ ط"

''تم دنیا کا فانی اور زوال پذیر سرمایہ چاہتے ہو جبکہ اللہ کے پاس بہت زیادہ غنائم ہیں''۔(نسأ:94)

ایک اور مقام پر اللہ تعالیٰ اصحابِ رسول اللہ ﷺ کو مخاطب کر کے کہتا ہے:

"تُرِيْدُوْنَ عَرَضَ الدُّنْيَا ۖ وَاللّٰهُ يُرِيْدُ الْاٰخِرَةَ ط"

''تم دنیا کی ناپائیدار دولت کے طالب ہو جبکہ اللہ تمہارے لئے آخرت چاہتا ہے''۔(انفال:67)

اسی طرح اور بہت سی آیات میں یہ بات واضح طور پر نظر آتی ہے کہ مسلمانوں اور غیر مسلموں میں سے کچھ لوگ دنیا کی فانی اور زوال پذیر دولت کے حصول کی خاطر حرص اور طمع میں مبتلا ہوجاتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اعلیٰ انسانی صفات اور اللہ تعالیٰ کے قرب کے حصول میں ناکام ہوجاتے ہیں۔ بلاشبہ حقیقی اور پائیدار نعمت وہی ہے جو اللہ کے پاس ہے۔اس کے سوا جو کچھ ہے،سب فانی اور عارضی ہے۔

یہ تعبیرات سب دنیا پرستوں کیلئے خطرے کی گھنٹی ہیں کہ خبردار! اپنے عظیم انسانی سرمائے کو زوال پذیر متاعِ دنیا پر قربان نہ کردینا۔

5۔ بعض آیات میں دنیوی نعمتوں کو ''زِيْنَةَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا'' (کہف:28،46) کہا گیا ہے اس سے ملتی جلتی تعبیرات بعض دوسری آیات میں بھی استعمال ہوئی ہیں جیسا کہ:

"مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَزِيْنَتَهَا نُوَفِّ اِلَيْهِمْ اَعْمَالَهُمْ فِيْهَا وَهُمْ فِيْهَا لَا يُبْخَسُوْنَ⑮"

''جو شخص دنیوی زندگی اور اس کی زینت کا طالب ہو تو ہم اس کے اعمال کا پورا پورا بدلہ اسے دنیا میں دے دیتے ہیں اور اس میں سے کچھ بھی کم نہیں کیا جاتا (لیکن آخرت میں ان کا کوئی اجر نہیں ہوگا)''۔(ھود:15)

ایک اور مقام پر ازواجِ رسولؐ سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

"يَٰٓأَيُّهَا النَّبِيُّ قُل لِّأَزْوَاجِكَ إِن كُنتُنَّ تُرِدْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَزِينَتَهَا فَتَعَالَيْنَ أُمَتِّعْكُنَّ وَأُسَرِّحْكُنَّ سَرَاحًا جَمِيلًا○"

''اے رسولؐ! اپنی بیویوں سے کہو کہ اگر تم دنیوی زندگی اور اس کی زینت کی خواہش مند ہو تو آؤ میں تمہیں متاعِ دنیا سے بہرہ مند کر دیتا ہوں اور تمہیں بطور احسن رخصت کر دیتا ہوں۔''(احزاب:28)

ان تعبیرات سے یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ یہ دنیوی زرق و برق فقط دنیوی زندگی کی زینت ہے۔اس کے زینت ہونے کے سامنے بھی سوالیہ نشان کھڑا ہو جاتا ہے۔ جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اس زینت کو بیان کرنے کیلئے ''زُیِّنَ'' کا لفظ استعمال کیا گیا ہے،جس کے معنی ہیں ''زینت دی گئی'' جو اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ یہ کوئی حقیقی نہیں بلکہ خیالی زینت ہے،مثلاً سورۂ بقرہ: 212 میں ہے:

"زُيِّنَ لِلَّذِينَ كَفَرُوا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا"۔

''دنیوی زندگی کو کافروں کیلئے مزین کر دیا گیا''۔

سورۂ آلِ عمران: 14 میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

"زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ النِّسَآءِ وَالْبَنِينَ وَالْقَنَاطِيرِ الْمُقَنطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ"۔

''لوگوں کیلئے عورتوں،اولاد اور سونے چاندی کے ذخیروں کو زینت دے دی گئی''۔

ان آیات سے یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ ان چیزوں کا زینت ہونا بھی حقیقت نہیں بلکہ ایک خیالی چیز ہے۔

یہاں ایک اہم سوال اُبھرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان اُمور کو کیوں زینت دی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اس کا مقصد انسانوں کی آزمائش اور تربیت ہے،اس لئے کہ جب انسان ان دلکش چیزوں کو،جو عام طور پر گناہ سے آلودہ ہوتی ہیں،اللہ کی خاطر ترک کرتا ہے تو اس کے اندر تقویٰ اور ایمان کا شجر بارآور ہونے لگتا ہے ورنہ غیر دلکش چیزوں کا ترک کرنا تو کوئی کمال اور فخر نہیں ہے۔

زیادہ بہتر الفاظ میں ہم اس طرح کہہ سکتے ہیں کہ انسان کے اندر کی سرکش حیوانی خواہشات ان مادی اور گناہ آلودہ اُمور کو اس کی نظر میں زینت دیتی ہیں۔ بنابرایں ان چیزوں کا دلکش اور جاذب ہونا ہمارے اندر کی دنیا سے تعلق رکھتا ہے۔اگر اس زینت کو اللہ کی طرف نسبت دی گئی ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ان خواہشات کے اندر یہ اثر اور رجحان اللہ تعالیٰ نے رکھا ہے۔اگر بعض آیات میں

اسے شیطان کی طرف نسبت دی گئی ہے جیسا کہ:

"وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ"۔

''شیطان نے ان کے اعمال کو پُرکشش بنا دیا''۔(نمل:24)

تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک لحاظ سے یہ تزئین اللہ کا کام ہے، اس لئے کہ ہر چیز کا اثر اس کا دیا ہوا ہے۔ دوسرے لحاظ سے یہ ہماری خواہشاتِ نفسانی کا کام ہے اور تیسرے لحاظ سے یہ شیطان کا کام ہے۔

بہرحال مندرجہ بالا آیات سے یہ بات بخوبی واضح ہوجاتی ہے کہ حُبِ دنیا حد سے بڑھ جائے تو انسان کو اللہ سے دور کردیتی ہے۔

دُنیا پرستی احادیث کی روشنی میں

احادیث میں، خاص طور پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ارشادات میں اور نہج البلاغہ میں دنیا پرستی کی وسیع پیمانے پر مذمت کی گئی ہے۔

1۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پوچھا گیا کہ دنیا کو دنیا کیوں کہا جاتا ہے؟ آپؐ نے فرمایا:

"لِاَنَّ الدُّنْيَا دَنِيَّةٌ خُلِقَتْ مِنْ دُونِ الْآخِرَةِ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔"

''اس لئے کہ دنیا پست ہے اور آخرت سے پہلے پیدا کی گئی ہے''۔(بحارالانوار، 356:54)

2۔ نیز آنحضرتؐ سے ہی ایک حدیث میں ہے:

"اَكْبَرُ الْكَبَائِرِ حُبُّ الدُّنْيَا"۔

''حُبِ دنیا سب سے بڑا گناہ ہے''۔(کنزالعمال، 184:3)

3۔ امیرالمومنین علیہ السلام فرماتے ہیں:

"حُبُّ الدُّنَارَأْسُ الْفِتَنِ وَاَصْلُ القِمِحَنِ"۔

''حب دنیا ہر فتنے آغاز اور ہر سختی کا اصل سبب ہے''۔(غررالحکم، حکمت:4870)

4۔ امیرالمومنین علیہ السلام سے ہی منقول ہے:

"اِنَّالدُّنْيَا لَمُفْسِدَةُ الدِّيْنِ وَمُسْلِبَةُ الْيَقِيْنِ"۔(غرر الحکم، حکمت:3518)

''دنیا انسان کے دین کو تباہ کردیتی ہے اور اس کے سرمایۂ یقین کو چھین لیتی ہے''۔

5۔ ایک حدیث میں امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

"اَنَّ اَوَّلَ مَاعُصِیَ اللّٰہُ بِہٖ سِتٌّ: حُبُّ الدُّنْیَا وَحُبُّ الرِّئَاسَۃِ وَحُبُّ الطَّعَامِ وَحُبُّ النِّسَاءِ وَحُبُّ النَّوْمِ وَحُبُّ الرَّاحَۃِ"

''سب سے پہلے جن چیزوں کے ذریعے اللہ کی نافرمانی کی گئی، وہ چھ ہیں: حبِ دنیا، حُبِ ریاست، حب طعام، حبِ زنان، حُبِ راحت''۔ (بحارانوار، 60:70)

غالباً یہ چھ چیزیں یا ان میں سے بعض شیطان کی سرکشی، آدم کی نافرمانی اور قابیل کے گناہ میں کارفرما نظر آتی ہیں۔ شاید اسی وجہ سے انہیں گناہ کے اوّلین اسباب کہا گیا۔

6۔ ایک اور حدیث میں ہے کہ حضرت امام زین العابدین علیہ السلام سے پوچھا گیا کہ اللہ کے ہاں سب سے افضل عمل کونسا ہے؟ آپؑ نے فرمایا:

"مَامِنْ عَمَلٍ بَعْدَ مَعْرِفَۃِ اللّٰہِ جَلَّ وَعَزَّ وَمَعْرِفَۃِ رَسُوْلِہٖ اَفْضَلُ مِنْ بُغْضِ الدُّنْیَا وَاِنَّ لِذٰلِكَ لَشُعَباً کَثِیْرَۃً وَلِلْمَعَاصِیْ شُعَبًا"۔ (اصول کافی، 130:2)

''اللہ اور اس کے رسولؐ کی معرفت کے بعد سب سے افضل عمل یہ ہے کہ انسان دنیا کو ناپسندیدہ قرار دے۔ اس کے بھی بہت سے شعبے ہیں جس طرح گناہوں کے مختلف شعبے ہوتے ہیں''۔

اس کے بعد امام علیہ السلام نے سلسلۂ کلام کو آگے بڑھایا اور فرمایا کہ شیطان کی نافرمانی کا سبب اس کا تکبر تھا، آدم کی نافرمانی کا سبب حرص اور قابیل کے ہابیل کو قتل کرنے کا سبب حسد تھا۔ پھر آپؑ نے فرمایا:

"فَشَعَّبَ مِنْ ذٰلِكَ حُبُّ النِّسَاءِ وَحُبُّ الدُّنْنَا وَحُبُ الرِّئَاسَۃِ وَحُبُّ الرَّاحَۃِ وَحُبُّ الْکَلَامِ وَحُبُّ الْعُلُوِّ وَالثَّرْوَۃِ، فَصِرْنَ سَبْعُ خِصَالٍ، فَاجْتَمَعْنَ کُلُّھُنَّ فِیْ (حُبُّ الدُّنْیَا) فَقَالَ الْاَنْبِیَاءُ وَالْعُلَمَاءُ بَعْدَ مَعْرِفَۃِ ذٰلِكَ"۔

''پس اس سے حُبِ دنیا، حُب زبانحب ریاست، حُبِ راحت، حُبِ کلام، حُبِ مقام و دولت جیسی برائیاں نکلیں، پس یہ سات خصلتیں ہیں جو ساری کی ساری ''حُبِ دنیا'' میں اکٹھی ہو جاتی ہیں۔ اسی لئے انبیاؑ نے کہا کہ دنیا کی محبت ہر بُرائی کا سر ہے''۔

اس کے بعد امام علیہ السلام فرماتے ہیں:

"وَالدُّنْیَا دُنْیَا ئَانِ: دُنْیَا بَلَاغٍ وَدُنْیَا مَلْعُوْنَۃ"۔

''دنیا کی دو اقسام ہیں: ایک وہ دنیا جس سے تمہاری ضروریات پوری ہو رہی ہوں اور دوسری ملعون ہے جو تمہیں

اللہ سے دور کر دیتی ہے۔''

7۔ ایک اور حدیث میں حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

"اُرْفُضِ الدُّنْیَا فَاِنَّ حُبَّ الدُّنْیَا یُعْمِیْ وَیُصِمُّ وَیُبْکِمُ وَعُبْکِمُ وَیُذِلُّ الرِّقَابَ"۔

''دنیا کو ترک کر دو کیونکہ اس کی محبت انسان کو اندھا، بہرہ اور گونگا بنا دیتی ہے اور انسان کو ذلیل کر دیتی ہے''۔(اصول کافی:136:2)

ظاہری سی بات ہے کہ جب کسی چیز کی محبت انسان پر چھا جاتی ہے اور اسے واضح ترین حقائق سے غافل کر دیتی ہے تو وہ آنکھوں کے باوجود اندھا، کانوں کے باوجود بہرہ اور زبان کے باوجود گونگا ہوتا ہے۔ وہ اپنی پسندیدہ چیز کے حصول کیلئے ذلت تک برداشت کر لیتا ہے۔

8۔ ایک اور حدیث میں دنیا پرستی کے منفی اثرات کو بیان کرتے ہوئے حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

"حُبُّ الدُّنْیَا یُفْسِدُ الْعَقْلَ، وَیُصِمُّ الْقَلْبَ عَنْ سُمَاعِ الْحِکْمَةِ وَیُوجِبُ اَلِیْمَ الْعِقَابِ"۔

''حُب دنیا عقل کو بگاڑ دیتی ہے، دل کو حکمت کی باتیں سننے سے بہرا کر دیتی ہے اور دردناک عذاب کا باعث ہوتی ہے''۔(غرر الحکم، شرح فارسی، 397:3)

9۔ ایک اور حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دنیا پرستی کے خطرناک نتائج کو اس طرح بیان فرماتے ہیں:

"اِنَّ الدُّنْیَا مُشْغِلَةٌ لِلْقُلُوْبِ وَالْاَبْدَانِ"۔

''دنیا پرستی انسان کی عقل اور جسم دونوں کو مشغول کر لیتی ہے''۔(بحار الانوار، 81:74)

10۔ ایک اور حدیث میں رسولؐ اللہ کی ایک اور پُرمعنی حدیث کے ساتھ ختم کرتے ہیں، آپؐ نے فرمایا:

"اِنَّهُ مَا سَکَنَ حُبُّ الدُّنْیَا قَلْبَ عَبْدٍ اِلَّا اِلْتَاطَ بِثَلَاثٍ: شُغْلٍ لَا یَنْفَدُ عَنَاؤُهُ، وَفَقْرٍ لَا یُدْرَکُ غِنَاؤُهُ، وَاَمَلٍ لَا یَنَالُ مُنْتَهَاهُ"۔

''جب دنیا کی محبت کسی کے دل میں بسیرا کر لیتی ہے تو اسے تین چیزوں سے آلودہ کر دیتی ہے: ایسی مشغولیت جس کی تھکاوٹ کی کوئی حد نہیں ہوتی، ایسا فقر جس کے بعد بے نیازی نصیب نہیں ہوتی اور ایسی آرزو، جس کی کوئی انتہا نہیں ہوتی''۔(بحار الانوار، 188:74)

مطلوب دُنیا اور مذمُوم دُنیا

ہم ان مباحث میں بار بار یہ نکتہ بیان کر چکے ہیں کہ حُبِ دنیا جس کی مذمت کی گئی ہے، وہ درحقیقت دنیا پرستی ہے۔ جہاں تک دنیوی نعمتوں سے لطف اندوز ہونے کا تعلق ہے، خاص طور پر معنوی اور روحانی مقاصد کے حصول کیلئے، تو یہ نہ صرف یہ کہ حُب دنیا نہیں بلکہ حُب آخرت ہے۔ بالفاظِ دیگر بہت سے معنوی مقاصد مادی وسائل کے بغیر حاصل نہیں کئے جا سکتے۔ بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ ان اُمور میں مادی وسائل مقدمۂ واجب کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اگر انسان انہیں مقدمہ واجب کی نیت سے حاصل کرے تو نہ صرف اس میں کوئی حرج نہیں ہے بلکہ اس پر اجر و ثواب بھی ملتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید کی متعدد آیات میں دنیوی نعمتوں کا مثبت الفاظ میں ذکر کیا گیا ہے۔

1۔ آیۂ وصیت میں مالِ دنیا کو ''خیر'' کا نام دیا گیا ہے:

"كُتِبَ عَلَيْكُمْ اِذَا حَضَرَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ اِنْ تَرَكَ خَيْرَا ۖ الْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ بِالْمَعْرُوْفِ ۚ"

''تمہارے اوپر فرض کر دیا گیا ہے کہ جب تم میں سے کسی کی موت قریب آ جائے تو اگر وہ خیر (مال و دولت) چھوڑ کر جا رہا ہو تو والدین اور قریبی رشتہ داروں کیلئے اچھی وصیت کر جائے''۔ (بقرہ:180)

2۔ ایک اور مقام پر مالِ دنیا کو ''برکات آسمان و زمین'' کہا گیا ہے جو متقین کو نصیب ہوتی ہیں:

"وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْقُرٰٓى اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَرَكٰتٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ"۔

''اور اگر شہروں اور بستیوں کے رہنے والے ایمان لے آئیں اور تقویٰ اختیار کر لیں تو ہم آسمان و زمین کی برکتیں ان پر کھول دیں گے''۔

3۔ ایک اور مقام پر اللہ تعالیٰ نے مالِ دنیا کو اللہ کا فضل قرار دیا ہے:

"فَاِذَا قُضِيَتِ الصَّلٰوةُ فَانْتَشِرُوْا فِي الْاَرْضِ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ"۔

''جب نمازِ جمعہ تمام ہو جائے تو زمین میں پھیل جاؤ اور اللہ کا فضل تلاش کرو''۔ (جمعہ:10)

4۔ ایک اور مقام پر مال و دولت میں اضافہ کو توبہ کا انعام قرار دیا گیا ہے، حضرت نوحؑ کے واقعہ میں ہے:

"يُّرْسِلِ السَّمَآءَ عَلَيْكُمْ مِّدْرَارًا ۙ وَّيُمْدِدْكُمْ بِاَمْوَالٍ وَّبَنِيْنَ وَيَجْعَلْ لَّكُمْ جَنّٰتٍ وَّيَجْعَلْ لَّكُمْ اَنْهٰرًا ○"

''میں نے مشرکوں سے کہا کہ تم اپنے رب کی بارگاہ میں توبہ کرو کیونکہ وہ بڑا بخشنے والا ہے تا کہ وہ تم پر آسمان سے پے در پے بارش بھیجے اور تمہارے مال واولاد میں اضافہ کرے اور سرسبز باغ اور نہریں تمہیں عطا کرے''۔(نوح:12،11)

ایک اور مقام پر اللہ تعالیٰ مال کو زندگی کے استحکام کا ذریعہ قرار دے کر حکم دے رہا ہے کہ اپنا مال نادان اور نااہل لوگوں کے ہاتھ نہ دو۔

"وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَآءَ اَمْوَالَكُمُ الَّتِيْ جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ قِيٰمًا"۔

''اور اپنے اموال کو جنہیں اللہ نے تمہاری زندگی کے استحکام کا ذریعہ قرار دیا ہے، نااہلوں کے ہاتھ میں نہ دو''۔(نسأ:5)

بعض آیات میں دُنیا کی مادی نعمتوں کو طیبات کہا گیا ہے:

"قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ ط"

''اے رسولؐ اللہ! ان سے کہو کس نے اللہ کی زینت کو اور اس پاکیزہ رزق کو، جو اُس نے اپنے بندوں کیلئے اُگایا ہے، حرام کیا ہے''۔(اعراف:32)

ایک اور مقام پر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

"وَاذْكُرُوْٓا اِذْ اَنْتُمْ قَلِيْلٌ مُّسْتَضْعَفُوْنَ فِي الْاَرْضِ تَخَافُوْنَ اَنْ يَّتَخَطَّفَكُمُ النَّاسُ فَاٰوٰىكُمْ وَاَيَّدَكُمْ بِنَصْرِهٖ وَرَزَقَكُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ"۔

''اور یاد کرو جب تم زمین پر تھوڑے اور کمزور تھے اور اس بات سے خائف تھے کہ لوگ تمہیں مٹا نہ دیں، تو اُس نے تمہیں پناہ دی اور اپنی نصرت سے تمہاری تائید کی اور تمہیں پاکیزہ چیزوں میں سے رزق عطا کیا تا کہ تم شکر کرو''۔(انفال:26)

قرآن شریف میں استعمال ہونے والی ان پُرمعنی تعبیرات سے بخوبی واضح ہوجاتا ہے کہ معقول حدود میں رہتے ہوئے مادی نعمتیں نہ صرف یہ کہ ناپسندیدہ نہیں ہیں بلکہ پاک و پاکیزہ ہیں اور انسان کی پاکیزگی کا ذریعہ بھی ہیں۔

بعض آیات سے تو یہاں تک ظاہر ہوتا ہے کہ مادی وسائل نہ صرف یہ کہ اللہ تعالیٰ کا فضل ہیں بلکہ انسان کو اللہ کے صالح بندوں کے زمرے میں داخل کرنے کا سبب بھی بن سکتے ہیں۔

"وَمِنْهُمْ مَّنْ عٰهَدَ اللّٰهَ لَئِنْ اٰتٰىنَا مِنْ فَضْلِهٖ لَنَصَّدَّقَنَّ وَلَنَكُوْنَنَّ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ○"

''اوران میں سے بعض ایسے ہیں جنہوں نے اللہ کے ساتھ عہد کیا ہے کہ اگر اللہ اپنے فضل سے ہمیں رزق عطا کرے تو ہم ضرور صدقہ دیں گے اور صالحین میں سے ہوجائیں گے۔''

یہ آیت ثعلبہ بن حاطب انصاری کے بارے میں نازل ہوئی جس نے رسول اللہ ﷺ سے درخواست کی تھی کہ میرے لئے دُعا فرمائیں کہ اللہ مجھے کثرتِ مال سے نوازے تاکہ میں اس کے ذریعے محتاجوں کی مدد کروں اور صالحین میں سے ہوجاؤں۔

رسول اللہ ﷺ اُس کی حالت کو جانتے تھے۔ لہٰذا آپ ﷺ نے اس کیلئے دُعا نہ کی لیکن جب اُس نے بہت اصرار کیا تو آپؐ نے اُس کیلئے دُعا فرمائی۔

اس آیت سے یہ بات بخوبی واضح ہوجاتی ہے کہ مادی وسائل انسان کی سعادت وخوش بختی اور زمرۂ صالحین میں شامل ہونے کا ذریعہ ہوسکتے ہیں۔

مندرجہ بالا آیات سے یہ حقیقت کھل کر آشکار ہوجاتی ہے کہ دُنیا کی مادی نعمتیں ذاتی طور پر مذموم اور قابل نفرت نہیں ہیں بلکہ ان کے اچھا یا بُرا ہونے کا دارومدار ان کے استعمال پر ہے۔ اگر ان کو صحیح طریقے سے استعمال میں لایا جائے تو یہ حسین وجمیل اور محبوب ومطلوب شکل وصورت کی حامل ہوتی ہیں ورنہ قابل مذمت ونفرت ہوتی ہیں۔

اس بات کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ ''وسائل الشیعہ'' میں ایک پورا باب ہے جس کا عنوان ہے: ''آخرت کیلئے دُنیا سے مدد حاصل کرنے کا استحباب''۔ یہ بات وسائل الشیعہ کے بارہویں جلد میں صفحہ نمبر 16 تا 18 پر مشتمل ہے۔ اس باب میں گیارہ احادیث ہیں جو سب کی سب اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ مادی وسائل کو ابدی فلاح وسعادت کے حصول کیلئے بروئے کار لایا جاسکتا ہے۔ ان میں سے ایک حدیث رسول اللہ ﷺ سے مروی ہے:

"غِنًا يَحْجُزُكَ عَنِ الظُّلْمِ خَيْرٌ مِّنْ فَقْرٍ يَحْمِلُكَ عَلَى الْإِثْمِ"۔

''وہ استغنا جو تجھے ظلم سے باز رکھے، اس فقر سے بہتر ہے جو تجھے گناہ پر مائل کرے۔''

ایک اور حدیث میں ہے کہ امام جعفر صادق علیہ السلام کے حضور میں ایک شخص نے حسرت سے کہا:

''اللہ کی قسم! ہم تو طالبِ دُنیا ہیں اور چاہتے ہیں کہ ہمارے پاس بہت سا مال ودولت ہو''۔

امام نے پوچھا: تم اس مال سے کیا کرنا چاہتے ہو؟''

اس نے جواب دیا:

"أَعُوْدُ بِهَا عَلَى نَفْسِيْ وَعِيَالِيْ، وَأَصِلُ بِهَا، وَأَتَصَدَّقُ بِهَا، وَأَحُجُّ وَأَعْتَمِرُ"

''میں چاہتا ہوں کہ اس کے ذریعے اپنی اور اپنے خاندان کی زندگی بہتر بناؤں، اس کے ذریعے صلہ رحمی کروں، صدقہ دوں اور حج وعمرہ ادا کروں''۔

امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا: ''یہ طلبِ دُنیا نہیں، یہ طلبِ آخرت ہے''۔

ہم اس بحث کو حضرت علی علیہ السلام کے اس ارشاد پر ختم کرتے ہیں جو نہج البلاغہ کے خطبہ 209 میں درج ہے۔ حضرت علی علیہ السلام اپنے کچھ اصحاب کے ساتھ علاؑ بن زیاد حارثی کی عیادت کیلئے تشریف لے گئے۔ وہ بصرہ کی مشہور شخصیت اور حضرت علیؑ کے ساتھیوں میں سے تھے۔ جب اُس کے گھر پہنچے اور اُس کے وسیع و عریض گھر کو دیکھا تو آپؑ نے اُس سے کہا:

''مَا كُنْتَ تَصْنَعُ بِسِعَةِ هٰذِهِ الدَّارِ فِي الدُّنْيَا وَاَنْتَ اِلَيْهَا فِي الْآخِرَةِ كُنْتَ اَحْوَجُ''۔

''تمہیں اس وسیع و عریض گھر کی اس دُنیا میں کیا ضرورت ہے؟ آخرت میں تم دُنیا کی نسبت اس کے زیادہ محتاج ہو''۔

پھر آپؑ نے فرمایا:

'وَبَلٰى اِنْ شِئْتَ بَلَغْتَ بِهَا الْآخِرَةَ تُقْرِيَ فِيْهَا الضَّيْفَ، وَتَصِلُ فِيْهَا الرَّحِمَ وَتُطْلِعُ مِنْهَا الْحُقُوْقَ مَطَالِعَهَا، فَاِذَا اَنْتَ قَدْ بَلَغْتَ بِهَا الْآخِرَةَ'

''ہاں! اگر تم چاہو تو اس وسیع گھر کے ذریعے آخرت حاصل کر سکتے ہو۔ وہ اس طرح کہ اس گھر میں مہمانوں کی تواضع کرو، صلہ رحمی کرو، اس کے واجب حقوق ادا کرو۔ اس طرح اس وسیع گھر کے ذریعے تم آخرت حاصل کر سکتے ہو۔''

نتیجہ یہ کہ اگر مادی وسائل کے حصول کا مقصد آخرت کو حاصل کرنا، ضرورت مندوں کی مدد کرنا، معاشرے میں عدل وانصاف قائم کرنا ہو تو اس سے بہتر اور کوئی چیز نہیں ہو سکتی۔ لیکن اگر مال کو جمع کرنے کا محرک حرص وطمع ہو اور انسان حصولِ مال میں، اس کے خرچ کرنے میں حلال وحرام کا پابند نہ ہو تو پھر اس سے بدتر کوئی چیز نہیں ہے۔ بلاشبہ دُنیا پرست افراد اسی ذریعے سے اپنے اندر بہت سی صفاتِ رذیلہ بھی پیدا کر لیتے ہیں۔

محمد بن اسماعیل بن بزیغ حضرت امام رضا علیہ السلام کے ایک صحابی ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ میں نے امامؑ سے سنا:

''لَا يَجْتَمِعُ الْمَالُ اِلَّا بِخِصَالٍ خَمْسٍ شَدِيْدٍ وَاَمَلٍ طَوِيْلٍ وَ حِرْصٍ غَالِبٍ وَقَطِيْعَةِ الرَّحِمِ وَاِيْثَارِ الدُّنْيَا عَلَى الْآخِرَةِ''۔

''مالِ دنیا صرف ان خصوصیات کی وجہ سے جمع ہو سکتا ہے: شدید بخل، طولانی آرزوئیں، طاقتور اور غالب حرص، قطع رحمی اور دُنیا کو آخرت پر ترجیح دینا''۔ (وسائل الشیعہ، 19:12)

پانچواں باب

حسد

تمہید:۔

ایک اور اخلاقی برائی جس نے پوری انسانی تاریخ میں انسان کی فردی اور معاشرتی زندگی پر منفی اثرات مرتب کئے ہیں، حسد ہے۔حسد کے معنی یہ ہیں کہ انسان دُوسروں کے پاس اللہ کی نعمتیں دیکھ کر جلے اور ان نعمتوں کے زوال کی خواہش کے ساتھ ساتھ اس خواہش کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش کرے۔

حسد انسان کی روح کی فضا کو تاریک اس کی زندگی کی فضا کو ظلماتی اور معاشرے کی فضا کو بدامنی اور بے سکونی سے بھر دیتا ہے۔حاسد کو دُنیا میں آرام نصیب ہوتا ہے نہ آخرت میں چین ملتا ہے۔ چونکہ اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ محسود کو اس نعمت سے محروم کردے جو اس کے پاس ہے۔لہٰذا وہ انواع واقسام کے جرائم کا مرتکب ہوتا ہے۔ وہ جھوٹ بولتا ہے، غیبت کرتا ہے، مختلف قسم کے ظالمانہ ہتھکنڈے اختیار کرتا ہے، یہاں تک کہ جب اس کا نفسیاتی بحران شدت اختیار کر لیتا ہے تو وہ قتل وخونریزی سے بھی دریغ نہیں کرتا۔

درحقیقت ہم کہہ سکتے ہیں کہ حسد تمام برائیوں کی اصل جڑ اور شیطان کا بہت خطرناک جال ہے۔اس جال میں پھنس کر ابتدائے آفرینش میں آدمؑ کے بیٹے قابیل نے اپنے بھائی ہابیل کو قتل کر دیا۔اسی وجہ سے حسد کو احادیث میں کفر کی تین بنیادوں میں شمار کیا گیا ہے: تکبر۔حرص۔حسد

حاسد انسان درحقیقت اللہ تعالیٰ کی حکمت پر اعتراض کرتا ہے۔اس لئے اسے کفرِ خفی کی ایک قسم کہا جاتا ہے۔حسد کے بالمقابل ''خیرخواہی'' ہے۔اس کے معنی یہ ہیں کہ انسان دوسروں کو حاصل ہونے والی نعمتوں سے لطف اندوز ہو، اس نعمت کی حفاظت کی کوشش کرے۔اپنی سعادت کو دُوسروں کی سعادت میں مضمر سمجھے اور دُوسروں کے فائدے کو اپنا فائدہ سمجھے۔

اس تمہید کے بعد ہم قرآنی آیات کی روشنی میں اس مسئلہ کا جائزہ لیتے ہیں۔

1۔ ''وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ ابْنَيْ اٰدَمَ بِالْحَقِّ ۘ اِذْ قَرَّبَا قُرْبَانًا فَتُقُبِّلَ مِنْ اَحَدِهِمَا وَلَمْ يُتَقَبَّلْ مِنَ الْاٰخَرِ ؕ قَالَ لَاَقْتُلَنَّكَ ؕ قَالَ اِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللّٰهُ مِنَ الْمُتَّقِيْنَ ○ لَئِنْۢ بَسَطْتَّ اِلَيَّ يَدَكَ لِتَقْتُلَنِيْ مَآ اَنَا بِبَاسِطٍ يَّدِيَ اِلَيْكَ لِاَقْتُلَكَ ۚ اِنِّيْٓ اَخَافُ اللّٰهَ رَبَّ الْعٰلَمِيْنَ ○ اِنِّيْٓ اُرِيْدُ اَنْ تَبُوْٓاَ بِاِثْمِيْ وَاِثْمِكَ فَتَكُوْنَ مِنْ اَصْحٰبِ النَّارِ ۚ وَذٰلِكَ جَزٰٓؤُا الظّٰلِمِيْنَ ○ فَطَوَّعَتْ لَهٗ نَفْسُهٗ

قَتْلَ اَخِيْهِ فَقَتَلَهٗ فَاَصْبَحَ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ○"

''اورآدمؑ کے دوبیٹوں کا قصہ انہیں سناؤ، جب ان دونوں نے اللہ کے حضور قربانی پیش کی۔ایک کی قربانی قبول ہوگئی اوردوسرے کی قربانی قبول نہ ہوئی۔(جس کی قربانی قبول نہ ہوئی،اُس نے اپنے بھائی سے) کہا: میں تجھے قتل کر کے چھوڑوں گا۔اُس نے کہا: میرا کیا گناہ ہے؟ اللہ تو صرف متقین کے اعمال قبول کرتا ہے۔اگر تو میرے قتل کیلئے ہاتھ بڑھائے گا تو میں تجھے قتل کرنے کیلئے ہرگز ہاتھ نہیں بڑھاؤں گا، اس لئے کہ میں اللہ سے ڈرتا ہوں جو عالمین کا رب ہے۔اس کے نفس نے اس کیلئے اپنے بھائی کے قتل کو آسان بنادیا۔اس نے اُسے قتل کردیا اور خاسرین میں سے ہوگیا''۔(مائدہ:27تا30)

2۔ "اِذْ قَالَ يُوْسُفُ لِاَبِيْهِ يٰٓاَبَتِ اِنِّيْ رَاَيْتُ اَحَدَ عَشَرَ كَوْكَبًا وَّالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ رَاَيْتُهُمْ لِيْ سٰجِدِيْنَ○ قَالَ يٰبُنَيَّ لَا تَقْصُصْ رُءْيَاكَ عَلٰٓى اِخْوَتِكَ فَيَكِيْدُوْا لَكَ كَيْدًا ؕ اِنَّ الشَّيْطٰنَ لِلْاِنْسَانِ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ○"

''جب یوسف نے اپنے باپ سے کہا کہ میں نے خواب دیکھا ہے کہ گیارہ ستارے،سورج اور چاند مجھے سجدہ کر رہے ہیں۔باپ نے کہا: بیٹا! اپنا خواب اپنے بھائیوں سے بیان نہ کرنا، وہ تیرے خلاف کوئی منصوبہ نہ بنالیں، اس لئے کہ شیطان انسان کا کھلم کھلا دُشمن ہے۔''(یوسف:4تا5)

3۔ "اَمْ يَحْسُدُوْنَ النَّاسَ عَلٰى مَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ۚ فَقَدْ اٰتَيْنَآ اٰلَ اِبْرٰهِيْمَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَاٰتَيْنٰهُمْ مُّلْكًا عَظِيْمًا○"

''آیا یہ لوگ اس لئے لوگوں (رسولؐ اور آلِ رسولؐ) سے حسد کرتے ہیں کہ اللہ نے اپنے فضل سے انہیں نوازا ہے۔ہم نے آلِ فرعون کو کتاب اور حکمت دی اور ان کو ملکِ عظیم دیا''۔(نسأ:54)

4۔ "وَدَّ كَثِيْرٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَوْ يَرُدُّوْنَكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ اِيْمَانِكُمْ كُفَّارًا ۚ حَسَدًا مِّنْ عِنْدِ اَنْفُسِهِمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْحَقُّ ۚ فَاعْفُوْا وَاصْفَحُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ○"

''بہت سے اہل کتاب اس حسد کی وجہ سے، جو اُن کے دلوں میں پایا جاتا ہے، یہ چاہتے ہیں کہ تمہارے ایمان لانے کے بعد تمہیں کفر کی طرف پلٹا دیں، حالانکہ حق ان پر واضح ہو چکا ہے۔پس تم عفو و درگزر سے کام لو، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر بڑی قدرت رکھتا ہے۔''۔(بقرہ:109)

5۔ "وَمِنْ شَرِّ حَاسِدٍ اِذَا حَسَدَ"

''اور حاسد کے شر سے، جب وہ حسد کرے۔''

6۔ "وَالَّذِيْنَ جَآءُوْ مِنْۢ بَعْدِهِمْ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِاِخْوَانِنَا الَّذِيْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِيْمَانِ وَلَا تَجْعَلْ فِيْ قُلُوْبِنَا غِلًّا لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا رَبَّنَآ اِنَّكَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ۝"

''اسی طرح ان کے بعد آنے والے یہ دُعا کرتے ہیں کہ اے ہمارے رب! ہمیں اور ہمارے بھائیوں کو، جو ہم سے پہلے ایمان لائے، بخش دے اور ہمارے دِلوں میں ان لوگوں کے خلاف نفرت پیدا نہ کر جو ایمان لائے۔ اے ہمارے رب! تو بے شک رؤف ورحیم ہے''۔(حشر:10)

7۔ "وَنَزَعْنَا مَا فِيْ صُدُوْرِهِمْ مِّنْ غِلٍّ اِخْوَانًا عَلٰى سُرُرٍ مُّتَقٰبِلِيْنَ ۝"

''اور ہم نے ان کے دلوں میں سے ہر قسم کا غِل (حسد، کینہ اور دُشمنی) نکال دیا اور وہ سب بھائی بھائی بن کر ایک دوسرے کے سامنے تختوں پر بیٹھے ہوں گے''۔(حجر:47)

تفسیر اور نتیجہ:

پہلی آیت میں حضرت آدمؑ کے بیٹوں کا واقعہ بیان کیا گیا ہے جن میں سے ایک دوسرے کے ساتھ حسد کیا اور آخر کار اُسے قتل کر دیا۔ یہ روئے زمین پر ہونے والا پہلا انسانی قتل تھا جو دوسرے مجرموں کیلئے ایک نمونہ بن گیا۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ''اے رسولؐ! ان کو آدمؑ کے بیٹوں کا واقعہ ٹھیک ٹھیک سنا دو۔ جب ان دونوں نے اللہ کی بارگاہ میں قربانی پیش کی۔ ایک کی قربانی قبول ہوگئی اور دوسرے کی قبول نہیں ہوئی۔ (جس کی قربانی قبول ہوگئی، اُس نے دوسرے سے) کہا: اللہ کی قسم! میں تجھے ضرور قتل کر کے چھوڑوں گا۔ اُس نے جواب دیا: (اگر تیرا عمل قبول نہیں ہوا تو اس میں میرا کوئی قصور نہیں ہے) اللہ تو صرف متقین کے اعمال قبول کرتا ہے''۔(مائدہ:27)

" وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ ابْنَيْ اٰدَمَ بِالْحَقِّ ۘ اِذْ قَرَّبَا قُرْبَانًا فَتُقُبِّلَ مِنْ اَحَدِهِمَا وَلَمْ يُتَقَبَّلْ مِنَ الْاٰخَرِ ۭ قَالَ لَاَقْتُلَنَّكَ ۭ قَالَ اِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللّٰهُ مِنَ الْمُتَّقِيْنَ ۝"

یعنی میں نے تیرے لئے کوئی مشکل ایجاد نہیں کی کہ تو میری جان کے درپے ہو گیا ہے۔ تیرا مسئلہ تیرے اندر ہے۔ تیرا عمل خالص نہیں تھا اور اس میں تقویٰ موجود نہیں تھا۔ لہٰذا اللہ نے اسے قبول نہیں کیا۔ وہ پاک ہے اور صرف پاک اعمال قبول کرتا ہے۔

پھر اس نے کہا: ''اگر تو مجھے قتل کرنے کیلئے ہاتھ بڑھائے گا تو میں تجھے قتل کرنے کیلئے ہاتھ نہیں بڑھاؤں گا، اس لئے کہ میں اللہ سے ڈرتا ہوں جو عالمین کا رب ہے''۔

"لَئِنۡۢ بَسَطۡتَّ اِلَیَّ یَدَكَ لِتَقۡتُلَنِیۡ مَاۤ اَنَا بِبَاسِطٍ یَّدِیَ اِلَیۡكَ لِاَقۡتُلَكَ ۚ اِنِّیۡۤ اَخَافُ اللّٰهَ رَبَّ الۡعٰلَمِیۡنَ○"(مائدہ:28)

آخر کار حسد اور کینہ کی آگ اس دل میں اس طرح شعلہ ور ہوئی کہ اُس نے ان کے رشتہ اخوت کو جلا کر خاکستر کر دیا۔ خون قابیل کی آنکھوں پر اُتر آیا۔

قرآن مجید فرماتا ہے کہ اس کے نفسِ سرکش نے اسے اپنے بھائی کو قتل کرنے پر آمادہ کر لیا۔ اُس نے اُسے قتل کر دیا اور خسارہ اُٹھانے والوں میں سے ہو گیا۔

"فَطَوَّعَتۡ لَهٗ نَفۡسُهٗ قَتۡلَ اَخِیۡهِ فَقَتَلَهٗ فَاَصۡبَحَ مِنَ الۡخٰسِرِیۡنَ○"(مائدہ:30)

بلا شبہ وہ نقصان اور خسارے میں مبتلا ہو گیا۔ ہابیل جیسے نیک سیرت بھائی سے بھی محروم ہو گیا اور سکون و اطمینان سے بھی ہاتھ دھو بیٹھا، اس لئے کہ اگر قاتل کا ضمیر ذرا بھی زندہ ہو تو وہ اُسے ہمیشہ مبتلائے عذاب رکھتا ہے اور آخرت میں بھی قاتل کو تباہی کے سوا کچھ نصیب نہیں ہوتا۔

بعض روایات میں ہے کہ اُس نے اپنے بھائی کو سوتے ہوئے قتل کیا۔ اس سے اس کے جرم کی شدت میں اور بھی اضافہ ہو جاتا ہے۔ یہاں سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ جب حسد کی آگ بھڑکتی ہے تو وہ ہر چیز کو جلا کر راکھ کر دیتی ہے۔

لیکن بہت جلد وہ اپنے کئے پر پشیمان ہو گیا۔ ایک گہرا غم واندوہ اُس کے دل و دماغ پر چھا گیا۔ جب بھی اُس کی نظر اپنے بھائی کی خون آلود لاش پر پڑتی تو ایک عجیب سا وحشت و اضطراب اس کے وجود پر چھا جاتا۔ وہ اپنے بھائی کی لاش اُٹھائے پھرتا تھا اور اُسے یہ معلوم نہ تھا کہ اپنے بھائی کی لاش کو کہاں لے جائے تا کہ اپنے جرم کے نشان کو بھی چھپا سکے اور اس ہولناک منظر سے بھی نجات حاصل کر سکے۔

اُس کے اس عظیم گناہ کے باوجود اس موقع پر اللہ تعالیٰ کا لطف اس پر ظاہر ہوا۔

''اللہ نے ایک کوا بھیجا جس نے زمین کھودنا شروع کر دی تا کہ اُسے دکھائے کہ اپنے بھائی کی لاش کس طرح چھپائے۔ جب اُس نے کوے سے یہ سبق سیکھا تو کہنے لگا کہ ہائے افسوس! کیا میں اس کوے جیسا بھی نہیں تھا کہ اپنے بھائی کی لاش کو ہی دفن کر لیتا۔ آخر کار وہ اپنے کئے پر نادم اور پشیمان ہو گیا۔''

"فَبَعَثَ اللّٰهُ غُرَابًا یَّبۡحَثُ فِی الۡاَرۡضِ لِیُرِیَهٗ كَیۡفَ یُوَارِیۡ سَوۡءَةَ اَخِیۡهِ ؕ قَالَ یٰوَیۡلَتٰۤی اَعَجَزۡتُ اَنۡ اَكُوۡنَ مِثۡلَ هٰذَا الۡغُرَابِ فَاُوَارِیَ سَوۡءَةَ اَخِیۡ ۚ فَاَصۡبَحَ مِنَ النّٰدِمِیۡنَ○ۛ"(مائدہ:31)

بعض روایات میں ہے کہ قابیل کے سامنے دو کوے ظاہر ہوئے جو ایک دُوسرے سے لڑ رہے تھے۔ ان میں سے ایک نے

دوسرے کو مار ڈالا۔ پھر اپنے پنجے سے زمین کھودی اور اُسے دفن کر دیا (نور الثقلین، 1:616)

بعض روایات میں ہے کہ وہ کوا کسی مردہ کوے کو لے آیا اور دفن کر دیا۔ بعض روایات میں ہے کہ اُس نے کوے کو اپنا کھانا زمین میں چھپاتے ہوئے دیکھا اور اس طرح مردے کو دفن کرنا سیکھا۔

وہ پشیمان تو ہوا لیکن اُس کی پشیمانی وہ پشیمانی نہ تھی جو اُسے توبہ پر مائل کرتی۔ اس طرح پشیمان ہونے کے باوجود گناہ کا بوجھ اُس کی گردن پر باقی رہا۔

یہاں دو سوال سامنے آتے ہیں: ایک یہ کہ آدمؑ کے بیٹوں نے جو قربانی اللہ کی بارگاہ میں پیش کی، وہ کیا تھی؟ اور اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ ہابیل کی قربانی قبول ہوگئی اور قابیل کی قربانی رد ہوگئی؟

قرآن مجید میں ان دونوں سوالوں کے جواب کے بارے میں کچھ نہیں کہا گیا[1] اور اس معاملہ کو مبہم رکھا گیا

اس بارے میں منقول احادیث بھی از لحاظِ سند و متن مختلف ہیں۔ عقل و منطق اور قرائن سے ہم آہنگ امام جعفر صادق علیہ السلام کی ایک حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدمؑ کو حکم دیا کہ ہابیل کو اپنا وصی مقرر کریں اور اسے اسمِ اعظم کی تعلیم دیں۔ قابیل چونکہ بڑا تھا، وہ اس بات پر مشتعل ہوگیا کہ یہ میرا حق ہے۔ آدمؑ نے ان دونوں کو حکم دیا کہ اللہ کی بارگاہ میں قربانی پیش کریں۔

(ایک روایت کے مطابق ہابیل جانور پالتا تھا۔ اُس نے ایک موٹا تازہ جانور قربانی کیلئے پیش کیا۔ قابیل کاشتکار تھا، اس نے اپنی زرعی پیداوار میں سے بدترین حصہ قربانی کیلئے پیش کیا۔ دونوں نے اپنی قربانی ایک پہاڑ پر رکھ دی۔ آسمان سے ایک بجلی چمکی اور ہابیل کی قربانی کو جلا دیا جو قربانی کی قبولیت کی علامت تھی۔ قابیل کی قربانی اپنی جگہ پر پڑی رہی۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے آدمؑ کی وصایت کیلئے ہابیل کی صلاحیت کی تائید کر دی) اس سے قابیل کے دل میں حسد کی آگ بھڑک اُٹھی اور اُس نے اپنے بھائی کو قتل کر دیا (نور الثقلین: 1:610)

بہرحال اس بُری حالت سے نکلنے کیلئے قابیل کے سامنے صرف دو راستے تھے۔ ایک تو یہ کہ اللہ کی بارگاہ میں توبہ کرتا اور اپنے عمل میں اخلاص پیدا کر کے اپنی معنوی کمی کی تلافی کرتا۔ (اس کو علمِ اخلاق میں غبطہ یا رشک کا نام دیا گیا ہے جو کہ ایک پسندیدہ چیز ہے) لیکن قابیل نے دُوسرے راستے کا انتخاب کیا۔ اُس نے کوشش کی کہ اپنے بھائی کو اس نعمت سے محروم کر دے جو اُسے حاصل تھی۔ یہ بدترین راستہ تھا جو اُس نے منتخب کیا۔ اسی طرح اُس نے اپنے بھائی کا خون بہا کر اپنے حسد کی آگ بجھائی۔

اگر تکبر نے ابلیس کو ہمیشہ کیلئے اللہ کی بارگاہ سے دُور کر دیا اور حرص نے آدمؑ کو جنت سے نکال دیا تو حسد اس بات کا سبب بنا کہ قابیل اپنے بھائی کو قتل کر کے ہمیشہ کیلئے ملعون بن گیا۔ اب روئے زمین پر جتنے بھی قتل ہوتے ہیں، قتل کا آغاز گر ہونے کی حیثیت سے قابیل ہر قتل میں شریکِ جرم ہوتا ہے۔

---

[1] پہلے سوال کے بارے میں قرآن مجید خاموش ہے لیکن دُوسرے سوال کا جواب واضح طور پر قرآن مجید میں موجود ہے: ''مِنْ اَحَدِهِمَا وَلَمْ يُتَقَبَّلْ مِنَ الْاٰخَرِ''۔ ''ان میں سے ایک کی قربانی قبول ہوگئی اور دُوسرے کی قبول نہیں ہوئی''۔

انسانی تاریخ بہت سے دردناک المیوں سے بھری پڑی ہے جن کی بنیادی وجہ صرف حسد تھی۔

آیات کے دوسرے گروہ میں حسد کی ایک اور کریہہ شکل اپنے تباہ کن اثرات کے ساتھ ہمارے سامنے آتی ہے۔ ان آیات کا تعلق حضرت یوسف علیہ السلام کے واقعہ سے ہے۔

حضرت یوسفؑ ظاہری حسن کے علاوہ سیرت وکردار کے حسن سے بھی مالا مال تھے۔ اسی وجہ سے وہ اپنے والد حضرت یعقوبؑ کے منظورِ نظر بن گئے اور اسی چیز نے اُنؑ کے بڑے بھائیوں کے دل میں اُن کے خلاف حسد پیدا کر دیا۔ یہ مسئلہ اس وقت شدت اختیار کر گیا جب حضرت یوسفؑ نے اپنے والد سے کہا:

''ابا جان! میں نے خواب میں دیکھا کہ گیارہ ستارے، سورج اور چاند مجھے سجدہ کر رہے ہیں''۔

اِذْ قَالَ يُوْسُفُ لِاَبِيْهِ يٰٓاَبَتِ اِنِّيْ رَاَيْتُ اَحَدَ عَشَرَ كَوْكَبًا وَّالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ رَاَيْتُهُمْ لِيْ سٰجِدِيْنَ۝

حضرت یعقوبؑ جانتے تھے کہ یہ خواب کوئی بچگانہ خواب نہیں ہے بلکہ یوسفؑ کے روشن مستقبل کی بشارت ہے۔ لہٰذا انہوں نے حضرت یوسفؑ سے کہا کہ اپنا خواب اپنے بھائیوں کو نہ بتانا، ایسا نہ ہو کہ وہ تمہارے خلاف کوئی منصوبہ بنالیں، اس لئے کہ شیطان انسان کا کھلم کھلا دشمن ہے۔

"قَالَ يٰبُنَيَّ لَا تَقْصُصْ رُءْيَاكَ عَلٰٓى اِخْوَتِكَ فَيَكِيْدُوْا لَكَ كَيْدًا ۭ اِنَّ الشَّيْطٰنَ لِلْاِنْسَانِ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ۝"

یہ معلوم نہیں ہے کہ برادرانِ یوسفؑ کو اس خواب کا پتا چلا یا نہیں؟ اگر انہیں اس کا پتا چلا ہو تو یہ اُن کے حسد میں اضافے کا باعث ہوا ہوگا۔ لیکن ان کے والد بہر حال جانتے تھے کہ اگر اس غیر معمولی خواب کا پتا چل گیا تو وہ ضرور یوسفؑ کو نقصان پہنچانے کی کوشش کریں گے۔ لہٰذا انہوں نے تاکید کے ساتھ حضرت یوسفؑ کو منع کر دیا کہ اس خواب کا اپنے بھائیوں سے ذکر نہ کریں۔

بعض روایات میں ہے کہ حضرت یعقوبؑ نے فرطِ حسرت سے یوسفؑ کا یہ خواب اپنی بیوی کو بتا دیا۔ ان کا خیال تھا کہ ان کی بیوی اس راز کو فاش نہیں کرے گی۔ لیکن یہ راز فاش ہوگا ہی اور حضرت یوسف کے بھائیوں کو اس کا علم ہو گیا۔

ایک اور روایت میں ہے کہ حضرت یوسفؑ خود اس راز کی حفاظت نہ کر سکے اور اپنا خواب اپنے بھائیوں کو بتا دیا (تفسیر برہان، 2433:2۔ تفسیر ابوالفتوح رازی، 341:6)

قرآن مجید برادرانِ یوسفؑ کے جذبات کو اس طرح بیان کرتا ہے:

"اِذْ قَالُوْا لَيُوْسُفُ وَاَخُوْهُ اَحَبُّ اِلٰٓى اَبِيْنَا مِنَّا وَنَحْنُ عُصْبَةٌ ۭ اِنَّ اَبَانَا لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنِۨ۝" (یوسف:8)

''یوسف اور اُس کا بھائی (بنیامین) ہم سے زیادہ ہمارے باپ کی نظر میں محبوب ہیں، حالانکہ ہم طاقتور ہیں (اور مشکلات میں اپنے باپ کی مدد کرتے ہیں) یقیناً ہمارا باپ کھلی گمراہی میں ہے''۔

اس طرح برادرانِ یوسفؑ نے اپنے باپ کی گمراہی کا فیصلہ سنا کر یوسفؑ کو اپنے اور اپنے باپ کے درمیان سے ہٹانے کا خطرناک منصوبہ بنالیا۔ انہوں نے ایک شیطانی سازش تیار کی جس کے مطابق طے پایا کہ یوسفؑ کو قتل کر دیا جائے یا کہیں اور دُور دراز کسی صحرا میں پھینک دیا جائے تا کہ باپ کی توجہ ہماری طرف ہوجائے۔ اس کے بعد گناہ سے توبہ کر کے نیک بن جاؤ۔

"اقْتُلُوْا يُوْسُفَ اَوِ اطْرَحُوْهُ اَرْضًا يَّخْلُ لَكُمْ وَجْهُ اَبِيْكُمْ وَتَكُوْنُوْا مِنْۢ بَعْدِهٖ قَوْمًا صٰلِحِيْنَ○"(یوسف:9)

انہوں نے حضرت یوسفؑ کو قتل تو نہیں کیا لیکن حضرت یوسفؑ کو دُور دراز کے کسی صحرا میں پھینک دیا۔ اس سے حضرت یعقوبؑ کو اس قدر دُکھ ہوا کہ کثرتِ گریہ سے اُن کی بینائی زائل ہوگئی۔ لیکن حضرت یوسفؑ کا اس طرح دُور پھینک دیا جانا مصر پر ان کی حکومت کا پہلا قدم ثابت ہوا اور برادرانِ یوسفؑ اپنے والد کی نظرِ عنایت بھی حاصل نہ کر سکے۔

حسد کی موجیں اس قدر خطرناک ہوتی ہیں کہ بھائی کو بھائی کے قتل پر آمادہ کر دیتی ہیں اور دُوسرے بہت سے گناہوں کا بھی سبب بنتی ہیں جن میں سے ایک جھوٹ ہے جو برادرانِ یوسفؑ نے اپنے گناہ کو چھپانے کیلئے اپنے اُس باپ سے بولا جو اللہ کا نبی تھا۔ اس طرح وہ نبی کی توہین کے بھی مرتکب ہوئے۔

تیسری آیت میں یہودیوں کا ذکر ہے۔ ہم یہ بات جانتے ہیں کہ یہودیوں کی ایک بڑی تعداد اپنی کتب میں رسولؐ اللہ کی نشانیوں کا مطالعہ کر کے شام اور فلسطین کے علاقوں سے ہجرت کر کے مدینہ میں آبسی تھی اور حضورؐ کے ظہورِ پرنور کا انتظار کرنے لگی۔

لیکن رسولؐ اللہ کی بعثت کے بعد ان میں سے اکثر اپنے اُس باطنی عہد پر قائم نہ رہے اور نہ صرف حضورؐ کی حمایت میں کھڑے نہ ہوئے بلکہ آپؐ کے مخالفین کی صف میں جا کھڑے ہوئے۔ ان کے اس طرزِ عمل کا بنیادی سبب حسد تھا۔ جس کی وجہ سے وہ اپنے مادی مفادات کو خطرت میں محسوس کر رہے تھے۔

قرآن شریف اس حقیقت کا ذکر اس طرح کرتا ہے:

"اَمْ يَحْسُدُوْنَ النَّاسَ عَلٰى مَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ۚ فَقَدْ اٰتَيْنَآ اٰلَ اِبْرٰهِيْمَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَاٰتَيْنٰهُمْ مُّلْكًا عَظِيْمًا○"

''کیا یہ اس لئے لوگوں (رسول اللہ ﷺ اور آلِ رسولؐ) سے حسد کرتے ہیں کہ اللہ نے اپنے فضل سے انہیں عطا کیا ہے؟ حالانکہ ہم نے آلِ ابراہیمؑ کو کتاب وحکمت اور عظیم حکومت دی''۔ (نسأ:54)

ایک روز ہم نے آلِ ابراہیمؑ کو، جن میں سے یہودی تعلق رکھتے ہیں، نبوت، حکمت اور حکومت عطا کی اور اب ہماری مشیت

کا فیصلہ یہ ہوا کہ یہ نعمت محمدؐ وآلِ محمدؐ کو عطا کریں۔ یہ سب کچھ ہماری حکمت اور مصلحت کی بنیاد پر تھا۔ کیا یہودی اس بات کو پسند کرتے تھے کہ جب یہ نعمت اُن کے پاس تھی تو کوئی اُن سے حسد کرتا؟ پس اب ان کے دل میں کیوں حسد کی آگ بھڑکنے لگی ہے؟

چوتھی آیت میں بھی اہلِ کتاب کا ذکر کیا گیا ہے۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آیت کے پیشِ نظر یہودی ہیں۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

''بہت سے اہل کتاب یہ چاہتے ہیں کہ تمہارے ایمان لے آنے کے بعد تمہیں دوبارہ کفر کی حالت میں لوٹا دیں۔ وہ اس لئے ایسا چاہتے ہیں کہ ان کے اندر حسد پایا جاتا ہے، حالانکہ حق ان کیلئے واضح ہو چکا ہے۔ مگر تم انہیں نظر انداز کرو، یہاں تک کہ اللہ اپنا حکم بھیج دے۔ اللہ ہر چیز پر قادر ہے''۔

"وَدَّ كَثِيْرٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَوْ يَرُدُّوْنَكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ اِيْمَانِكُمْ كُفَّارًا ۚ حَسَدًا مِّنْ عِنْدِ اَنْفُسِهِمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْحَقُّ ۚ فَاعْفُوْا وَاصْفَحُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ○" (بقرہ:109)

حسد کے نتیجہ میں انسان اس قدر انحطاط میں گر جاتا ہے کہ نہ صرف مادی اُمور میں، جو عام طور پر انسانوں کے درمیان کشمکش اور ٹکراؤ کا باعث ہوتے ہیں، بلکہ معنوی اُمور میں بھی دُوسرے سے حسد کرنے لگتا ہے، حالانکہ یہ ایسے اُمور ہیں جن میں کشمکش اور ٹکراؤ کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی اور ہر کوئی انہیں حاصل کر سکتا ہے۔ بعض اوقات انسان حقیقت کو جانتے بوجھتے ہوئے حق کو پامال کر کے سعادت کا دروازہ اپنے اُوپر بند کر دیتا ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ وہ دُوسروں کو بھی اس سعادت سے محروم کر دینے کا خواہش مند ہوتا ہے جو واقعی بری عجیب بات ہے۔

بہت سے مفسرین کا نظریہ یہ ہے: ''حَسَداً مِنْ عِنْدِ اَنْفُسِهِم'' اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ ان کے اس رویے کا اصل سبب وہ حسد ہے جو اِن کے رگ و پے میں بس چکا ہے۔ اس کا جہل و نادانی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس لئے آگے چل کر آیت میں یہ بات واضح کر دی گئی ہے کہ:

"مِّنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْحَقُّ"۔

یعنی حق کے ان پر واضح و آشکار ہو جانے کے بعد انہوں نے یہ رویہ اختیار کیا۔

لیکن قرآن شریف مسلمانوں کو یہ حکم دے رہا ہے کہ ان حاسدوں کو ان کے حال پر چھوڑ دیں۔ (اس لئے کہ ان کے حسد کی آگ ہی ان کی بہترین سزا ہے)۔ لیکن یہ نہ سمجھ لیں کہ عفو و درگزر کی یہ پالیسی ہمیشہ جاری رہے گی اور ان کو یہ آزادی ہمیشہ میسر رہے گی کہ اللہ کے بندوں کیلئے جو مشکلات ان کا جی چاہے، پیدا کرتے رہیں۔ ایک وقت آنے والا ہے کہ یا تو یہ ہلاک ہو کر اُخروی عذاب میں گرفتار ہو چکے ہوں گے یا اسی دُنیا میں لشکرِ حق کے ہاتھوں کچلے جائیں گے۔

بہرحال یہ آیت نومسلم افراد کو یہ نصیحت کررہی ہے کہ یہودیوں اور دُوسرے بدخواہوں کے پیدا کردہ وسوسوں اور شکوک وشبہات کو کوئی اہمیت نہ دیں، اس لئے کہ وہ جو کچھ کررہے ہیں، حسد کی بنیاد پر کررہے ہیں اور مسلمانوں کو ایمان اور تقویٰ کے زیرسایہ دیکھ کر انہیں تکلیف ہوتی ہے۔

پانچویں آیت سورۂ فلق کی آیت ہے۔ اس میں بھی حاسدوں کے حسد کا ذکر ہے اور رسولؐ اللہ کو حکم دیا گیا ہے کہ ان کے شر سے محفوظ رہنے کیلئے اللہ کی پناہ طلب کریں۔

اس سورۃ کے آغاز میں رسولؐ اللہ کو حکم دیا گیا ہے:

"قُلۡ اَعُوۡذُ بِرَبِّ الۡفَلَقِ ۙ"

''کہو میں صبح کی سفیدی کے رب کی پناہ میں آتا ہوں''۔

پھر اس چیز کے شر سے، جو اُس نے پیدا کی۔ پھر رات کی تاریکی اور گرہوں میں پھونک مارنے والی شیطانی طاقتوں کے شر سے پناہ مانگنے کے بعد آخر میں حاسد کے شر سے پناہ مانگنے کا ذکر کیا گیا ہے:

"وَمِنۡ شَرِّ حَاسِدٍ اِذَا حَسَدَ"

''اور میں حاسد کے شر سے اللہ کی پناہ میں آتا ہوں، جب وہ حسد کرے۔''

یہاں سے یہ بات بخوبی واضح ہوجاتی ہے کہ دُنیا میں رونما ہونے والے فساد اور تباہی کا بیشتر حصہ حاسدوں کے حسد کی وجہ سے ظہور پذیر ہوتا ہے۔ اس سورۃ کے آغاز میں اللہ تعالیٰ کا ذکر ''بِرَبِّ الۡفَلَقِ'' کے الفاظ سے ہوا ہے جس کے معنی ہیں ''صبح کی روشنی کا رب''۔ یہ الفاظ اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ دُنیا میں رونما ہونے والی تمام خرابیوں کا اصل سبب جہل وکفر وعناد کی تاریکیاں ہیں۔ اگر ان تاریکیوں کی جگہ علم، ایمان اور خیرخواہی کی روشنی لے لے تو ان شیطانی طاقتوں کی تدبیریں بے اثر ہوجائیں جو تاریکی کی آڑ میں نقصان پہنچانے کی کوشش کرتی ہیں۔

چھٹی آیت میں انصار کی مدح وستائش کے بعد ان کے بعد آنے والے گروہ کی تعریف کی گئی ہے جنہیں اصطلاحاً تابعین کہا جاتا ہے۔ اس گروہ کی تعریف میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

"وَالَّذِيۡنَ جَآءُوۡ مِنۡۢ بَعۡدِهِمۡ يَقُوۡلُوۡنَ رَبَّنَا اغۡفِرۡ لَنَا وَلِاِخۡوَانِنَا الَّذِيۡنَ سَبَقُوۡنَا بِالۡاِيۡمَانِ وَلَا تَجۡعَلۡ فِىۡ قُلُوۡبِنَا غِلًّا لِّلَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا رَبَّنَاۤ اِنَّكَ رَءُوۡفٌ رَّحِيۡمٌ ۧ"

''اور وہ لوگ جو ان کے بعد آئے، وہ دُعا کرتے ہیں کہ اے ہمارے رب! تو ہمیں اور ہمارے ان بھائیوں کو بخش دے جو ہم سے پہلے ایمان لائے اور ہمارے دلوں میں ان لوگوں کے خلاف کینہ پیدا نہ کر جو ایمان لائے۔ بے شک تو رؤف ورحیم ہے''۔ (حشر:10)

اس آیت میں ہم دیکھتے ہیں کہ یہ باایمان افراد اپنے اور اپنے سے پہلے ایمان لانے والے اپنے برادرانِ ایمان کیلئے مغفرت کی دُعا مانگنے کے بعد اللہ تعالیٰ سے یہ دُعا مانگتے ہیں کہ ان کے دل میں کسی صاحب ایمان کے خلاف کینہ وحسد پیدا نہ ہو، اس لئے کہ وہ اس بات کو جانتے ہیں کہ جب تک یہ برائیاں دل سے مکمل طور پر زائل نہ ہوجائیں، محبت، اخوت اور اتحاد کے رشتے مضبوط نہیں ہوسکتے اور نہ ہی مسلم معاشرے کو کامیابی وترقی مل سکتی ہے۔

اس آیت میں لفظ ''غِلَ'' استعمال ہوا ہے جو ''غِلّ'' سے مشتق ہے۔ راغب اصفہانی اپنی معروف کتاب ''مفردات'' میں کہتے ہیں کہ ''غِل'' اصل میں اُس چیز کو کہتے ہیں جو چپکے سے اور بتدریج نفوذ کرتی ہے۔ بہتے ہوئے پانی کو بھی اسی لئے غَلَل، کہا جاتا ہے کہ وہ بتدریج اور آہستہ آہستہ درختوں کی جڑوں کے اندر اثر کرتا ہے۔

اس کے بعد خیانت کو اس لئے غلول کہا گیا کہ یہ بھی آہستہ آہستہ اور بتدریج اثر کرتی ہے۔ کینہ اور حسد بھی چونکہ آہستہ آہستہ اور بتدریج دل میں داخل ہوتے ہیں، اس لئے انہیں ''غِلّ'' کہا گیا ہے۔

ساتویں اور آخری آیت میں اہلِ بہشت کی صفات کا ذکر کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

"وَنَزَعْنَا مَا فِيْ صُدُوْرِهِمْ مِّنْ غِلٍّ اِخْوَانًا عَلٰى سُرُرٍ مُّتَقٰبِلِيْنَ○"

''ہم ان کے دلوں میں سے ہر قسم کا غِل (کینہ وحسد) دُور کردیں گے اور وہ بھائی بھائی بن کر تختوں پر ایک دُوسرے کے آمنے سامنے بیٹھے ہوں گے''۔ (حجر: 47)

بلاشبہ اہلِ جنت ہر قسم کے حسد، کینہ اور عداوت سے پاک ہوں گے، اس لئے کہ یہ اہلِ جہنم کی صفات ہیں۔ ان کے درمیان محبت وصلح وصفا جیسے جذبات اس لئے حکم فرما ہوں گے کہ اللہ تعالیٰ کے لطف وکرم سے یہ ناپسندیدہ چیزیں ان کے دلوں سے زائل ہوچکی ہوں گی۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر دُنیا میں کینہ، حسد اور عداوت جیسی بُری صفات انسانوں کے دل سے نکل جائیں تو دُنیا بھی جنت کی طرح ہوجائے جہاں سب لوگ امن وامان اور محبت اخوت کے ساتھ باہم زندگی بسر کریں گے۔

نتیجہ:۔

مندرجہ بالا آیات کی روشنی میں انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی پر حسد کے تباہ کن اثرات اور قرآن کی زبان سے حسد کی شدید مذمت کھل کر سامنے آجاتی ہے۔ حسد کی وجہ سے بھائی بھائی کو قتل کردیتا ہے۔ حسد انسان کو مشاہدۂ حق سے باز رکھتا ہے۔ حسد کی وجہ سے معاشرے کی فضا تاریک ہوجاتی ہے۔ حسد محبت کے رشتوں کو پارہ پارہ کردیتا ہے۔ جو لوگ حسد میں مبتلا ہوتے ہیں، حسد کی آگ دُنیا میں ہی ان کی زندگی کو جہنم بنادیتی ہے۔

حسد، احادیث کی روشنی میں

احادیث میں بھی حسد کی شدید مذمت کی گئی ہے۔ہم اس طرح بھی کہہ سکتے ہیں کہ جس شدت کے ساتھ احادیث میں حسد کی مذمت کی گئی ہے، شاید ہی کسی اور برائی کی اس طرح مذمت کی گئی ہو۔ہم یہاں نمونہ کے طور پر چند احادیث بیان کرتے ہیں:

1. رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

"اَلْحَسَدُ یَأْکُلُ الْحَسَنَاتِ کَمَا تَأْکُلُ النَّارُ الْحَطَبَ"۔

''حسد نیکیوں کو اس طرح کھا جاتا ہے جیسے آگ لکڑی کو''۔(المحجۃ البیضا،325:5)

یہ حدیث اس بات کو بخوبی بیان کرتی ہے کہ حسد کی آگ انسان کی سعادت کے سارے سرمائے کو، جو اُس نے ساری زندگی میں کمایا ہو، جلا کر خاکستر کرسکتا ہے۔

2۔ "اِنَّ الْحَسَدَ یَأْکُلُ الْاِیْمَانَ کَمَا تَأْکُلُ النَّارُ الْحَطَبَ"۔

''حسد ایمان کو اس طرح کھا جاتا ہے جیسے آگ لکڑی کو کھا جاتی ہے'' (اصولِ کافی،306:2)

بلاشبہ حسد کی آگ صرف نیک اعمال کو ہی نہیں بلکہ سرمایہ ایمان کو بھی جلا کر خاکستر کر دیتی ہے۔

3۔ ایک حدیث میں امیر المومنین علیہ السلام فرماتے ہیں:

"اَلْحَسَدُ شَرُّ الْاَمْرَاضِ"۔

''اس حدیث کی رو سے کوئی اخلاقی بیماری حسد سے زیادہ بری نہیں ہے (غرر الحکم، فارسی شرح،91:1)

4۔ نیز امیر المومنینؑ فرماتے ہیں:

"رَأْسُ الرَّذَائِلِ الْحَسَدُ"۔

''حسد تمام اخلاقی رذائل کی جڑ ہے''۔(غرر الحکم فارسی شرح،91:1)

5۔ ایک اور حدیث میں امیر المومنینؑ حسد کے آغاز اور انجام کے بارے میں فرماتے ہیں:

"لِلّٰہِ دَرُّ الْحَسَدِ مَا اَعْدَلَہُ بَدَءَ بِصَاحِبِہِ فَقَتَلَہُ"۔

''شاباش ہے حسد کو، یہ کس قدر عادل ہے، پہلے انسان کو دولت مند بناتا ہے، پھر قتل کر دیتا ہے۔''(بحار الانوار، 241:70۔شرح نہج البلاغہ ابن ابی الحدید،316:1)

6۔ امیر المومنینؑ سے مروی ایک اور حدیث ہے:

"ثَمَرَةُ الْحَسَدِ شَقَاءُ الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ"۔

''حسد کا ثمر دُنیا اور آخرت کی بدبختی ہے''۔(غرر الحکم)

7۔ ایک حدیث میں امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

"آفَةُ الدِّيْنِ الْحَسَدُ وَالْعُجْبُ وَالْفَخْرُ"۔

تین چیزیں دین کیلئے آفت ہیں: حسد۔خود پسندی اور فخر''۔(الحجۃ البیضا،327:5)

8۔ ایک اور حدیث میں امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے ساتھ مناجات کر رہے تھے تو اُنؑ کی نظر ایک شخص پر پڑی جو عرشِ الٰہی کے زیر سایہ کھڑا تھا۔حضرت موسیٰ علیہ السلام نے پوچھا: یا اللہ! یہ کون ہے جس پر تیرے عرش نے سایہ کیا ہوا ہے؟

اللہ تعالی نے جواب میں فرمایا:(بحار الانوار،275:70)

"يَامُوْسٰى هٰذَا مِمَّنْ لَمْ يَحْسُدُ النَّاسَ عَلٰى مَا آتَاهُمُ اللهُ مِنْ فَضْلِهٖ"۔

''اے موسیٰ! جو کچھ اللہ نے اپنے فضل سے لوگوں کو عطا کیا، اس نے اس پر کبھی حسد نہیں کیا''۔

9۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منقول ایک حدیث میں ہے:

"سِتَّةٌ يَدْخُلُوْنَ النَّارَ قَبْلَ الْحِسَابِ بِسِتَّةٍ"۔

''چھ قسم کے لوگ چھ برائیوں کی وجہ سے، قبل از حساب جہنم میں داخل ہوں گے''۔

لوگوں نے پوچھا: یا رسول اللہؐ! وہ کون لوگ ہیں؟

آپؐ نے فرمایا:

"قَالَ: اَلْاُمَرَاءُ بِالْجَوْرِ، وَالْعَرَبُ بِالْعَصَبِيَّةِ، وَالدَّهَاقِيْنُ بِالتَّكَبُّرِ، وَالتُّجَّارُ بِالْخِيَانَةِ، وَاَهْلُ الرُّسْتَاقِ بِالْجَهَالَةِ، وَالْعُلَمَاءُ بِالْحَسَدِ"۔

''حکمران ان اپنے ظلم کی وجہ سے، عرب اپنے تعصب کی وجہ سے، وڈیرے اپنے تکبر کی وجہ سے، تاجر خیانت کی وجہ سے، دیہاتی جہالت کی وجہ سے اور علماء حسد کی وجہ ہے''۔(الحجۃ البیضا،327:5)

گویا حسد علماء کیلئے سب سے بڑی مصیبت اور بلا ہے۔

ہم اس بحث کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اس حدیث پر ختم کرتے ہیں:

"اِنَّهٗ سَيُصِيْبُ اُمَّتِيْ دَاءُ الْاُمَمِ! قَالُوْا: وَمَا دَاءُ الْاُمَمِ؟ قَالَ: اَلْاَشَرُ وَالْبَطَرُ وَالتَّكَاثُرُ وَ

التَّنَافُسُ فِي الدُّنْيَا، وَالتَّبَادُدُوَالتَّحَاسُدُحَتّٰى يَكُوْنَالْبَغْعُ، ثُمَّ يَكُوْنُ الْهَرْجُ!"(المحجة البيضا، 326:5)

''بہت جلد تمام اُمتوں کو لگنے والی بیماری میری اُمت کو بھی لگنے والی ہے۔لوگوں نے پوچھا: یارسولؐ اللہ! وہ کیا بیماری ہے؟ آپؐ نے فرمایا: ہوس رانی، عیاشی، کثرت طلبی، دُنیا پرستی میں مقابلہ، ایک دوسرے کے خلاف حسد، یہاں تک کہ وہ ظلم کا باعث بن جائے گا۔ پھر اس کے بعد بدامنی میں مبتلا ہو جائیں گے''۔

چند اہم مسائل:۔

قرآن وحدیث کی روشنی میں حسد اور اس کے تباہ کن نتائج کا جائزہ لینے کے بعد اس موضوع کے چند دیگر پہلوؤں کا جائزہ لیتے ہیں تا کہ بحث ہر لحاظ سے مکمل ہو جائے۔ وہ پہلو یہ ہیں:

1۔ حسد کے معنی

2۔ حسد کے محرکات

3۔ حسد کی علامات

4۔ انفرادی اور معاشرتی سطح پر حسد کے اثرات

5۔ حسد کے علاج کے طریقے

1۔ حسد کے معنی اور حسد و رشک میں فرق:۔ [1]

علم اخلاق کے علمائے بزرگ نے حسد کی تعریف اس طرح کی ہے:

''حسد دُوسروں کے پاس موجود کسی نعمت کے زوال کی آرزو کو کہتے ہیں، خواہ وہ نعمت حاسد کو ملے یا نہ ملے''۔

بنابرایں حسد ایک تخریبی اور وِیرانگر عمل ہے جس کا مقصد دوسروں کے پاس موجود اُن نعمتوں کو تباہ کرنا ہے جو اللہ تعالیٰ نے انہیں دے رکھی ہیں۔ حسد کی بدترین صورت یہ ہے کہ انسان دوسروں کے پاس موجود اللہ کی نعمتوں کو زائل کرنے کی صرف آرزو ہی نہ کرے بلکہ اس کیلئے عملی کوشش بھی کرے۔ یہ حسد حاسد کے باطن میں چھپی ہوئی خباثت کی بدترین صورت کی عکاسی کرتا ہے۔

اس سے کم تر درجہ کا حسد یہ ہے کہ حاسد انسان محسود سے کسی نعمت کو سلب کر کے خود حاصل کرنا چاہے۔ اگرچہ یہ بھی صفاتِ

---

[1] حسد عربی زبان کا لفظ ہے جس کیلئے فارسی میں رشک کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ اُردو میں لفظِ رشک جن معنوں میں استعمال ہوتا ہے، عربی میں اس کیلئے ''غِبْطَہ'' کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ فارسی میں بھی یہی لفظ استعمال ہوتا ہے۔

رذیلہ میں سے ہے لیکن اس کی برائی کا درجہ مذکورہ بالا صورت کی نسبت کم تر ہے۔

اس سے بھی کم تر درجہ کا حسد یہ ہے کہ انسان دُوسرے کے پاس موجود نعمت کے زائل ہونے کی صرف آرزو دل میں رکھتا ہے اور اس سلسلہ میں نہ کسی سے کوئی بات کرتا ہو اور نہ ہی کوئی عملی قدم اُٹھاتا ہو۔

یہ کیفیت اگر انسان کے اندر غیر ارادی اور غیر اختیاری طور پر پیدا ہو اس میں کوئی گناہ نہیں ہے۔ (کہا جاتا ہے کہ اکثر لوگوں میں یہ غیر اختیاری طور پر پیدا ہو جاتی ہے)۔ لیکن اگر ارادی اور اختیاری طور پر پیدا ہو تو بلاشبہ یہ رذائلِ اخلاقی میں سے ہے۔ لیکن اس کے بارے

علمِ اخلاق میں یہ بحث موجود ہے کہ آیا یہ گناہ ہے یا نہیں؟ اس سوال کی وجہ بھی یہ مسئلہ ہے کہ آیا کسی انسان کے اندر کسی ایسی بُری صفت کا پیدا ہونا، جس کی بنیاد پر کوئی برا عمل انجام نہ پائے، حرام ہے یا صرف ایک اخلاقی انحطاط ہے!

حسد کے مقابل غبطہ ہے جسے اُردو میں رشک کہتے ہیں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ انسان یہ آرزو کرے کہ جو نعمت کسی اور کو حاصل ہے، ویسی ہی نعمت یا اُس سے بہتر نعمت اُسے بھی حاصل ہو جائے۔ ایسا شخص کسی دُوسرے سے زوالِ نعمت کا آرزومند نہیں ہوتا۔

لیکن بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ غبطہ یعنی رشک بھی ایک قسم کا حسد ہے اور وہ اس بات کی تائید میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ایک حدیث بھی پیش کرتے ہیں (لسان العرب اور التحقیق فی کلمات القرآن الکریم)۔

لیکن یہ نقطہ نظر اس صورت میں صحیح ہوگا جب حسد کے معنی کو وسعت دے دی جائے اور اپنی نعمتوں اور دُوسروں کی نعمتوں کے درمیان موازنہ کرنے کو بھی حسد کے زمرے میں داخل کر دیا جائے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو یہ صرف ایک لفظی اختلاف رہ جاتا ہے اور حسد کے معروف معنی وہی ہیں جو اُوپر بیان ہو چکے ہیں۔

بہرحال حسد ایک قابلِ مذمت صفت ہے جبکہ رشک یا غبطہ نہ صرف یہ کہ قابلِ مذمت نہیں ہے بلکہ پسندیدہ بھی ہے کیونکہ یہ ترقی اور پیشرفت کا محرک ہوتا ہے۔

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام ایک حدیث میں فرماتے ہیں:

"اِنَّ الْمُؤْمِنَ یَغْبُطُ وَلَا یَحْسُدُ، وَالْمُنَافِقُ یَحْسُدُ وَلَا یَغْبُطُ"۔

"مؤمن رشک کرتا ہے، حسد نہیں کرتا اور منافق حسد کرتا ہے، رشک نہیں کرتا" (اصولِ کافی، 2:307)

2۔ حسد کے محرکات:۔

یہ ایک واضح سی بات ہے کہ ایک بُری صفت کئی دوسری برائیوں کا سرچشمہ اور سبب بنتی ہے۔ اسی اصول کے مطابق حسد سے بھی کئی بُری صفات جنم لیتی ہیں اور حسد بھی بعض دُوسری بری صفات سے جنم لیتا ہے۔

علمائے علم اخلاق نے حسد کے بہت سے عوامل اور محرکات بیان کئے ہیں جن میں سے ایک عداوت اور کینہ ہے جس کی بنیاد پر کوئی شخص اپنے دُشمن کے پاس موجود کسی نعمت کے زوال کی آرزو کرتا ہے۔

حسد کا ایک اور محرک تکبر ہے۔ جب کوئی متکبر انسان کسی دُوسرے کے پاس کوئی نعمت دیکھتا ہے تو اس کے زوال کی آرزو کرتا ہے کیونکہ وہ سمجھتا ہے کہ اگر یہ نعمت اس شخص کے پاس رہی تو خود اُس کی بڑائی خطرے میں پڑ جائے گی۔

حسد کا ایک اور محرک حُبِ ریاست ہے۔ اس بیماری میں مبتلا انسان آرزو کرتا ہے کہ دُوسرے لوگ نعمتوں سے محروم ہو جائیں تا کہ ان پر حکومت کر سکے، اس لئے کہ اگر یہ مال و دولت اور طاقت وغیرہ میں دُوسروں سے برتر نہ ہو تو اس کی حکومت اور اقتدار کی بنیادیں کمزور ہو جائیں گی۔

حسد کا چوتھا محرک اپنے مقاصد تک نہ پہنچنے کا خوف ہوتا ہے۔ یہ اس صورت میں ہوتا ہے جب انسان اپنی جہالت کی وجہ سے یہ سمجھنا شروع کر دے کہ اللہ کی نعمتیں محدود ہیں۔ اگر کوئی نعمت کسی اور کو مل گئی تو اِس کے اُس نعمت تک پہنچنے کے امکانات معدوم ہو جائیں گے۔

پانچواں سبب احساسِ کمتری اور احساسِ حقارت ہے۔ جو لوگ اپنے آپ کو کسی مقام اور مرتبہ یا کسی نعمت کے قابل نہیں سمجھتے، وہ اپنے آپ کو حقیر سمجھنے کی نفسیاتی بیماری میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور یہ آرزو کرنے لگتے ہیں کہ دُوسرے بھی کسی مقام و مرتبہ کو حاصل نہ کر سکیں تا کہ وہ بھی اِس جیسے ہو جائیں۔

حسد کا چھٹا محرک بخل اور خباثتِ نفس ہے۔ بخیل انسان نہ صرف یہ کہ اپنے پاس موجود اللہ کی نعمتوں سے دُوسروں کو فائدہ نہیں پہنچانا چاہتا بلکہ وہ یہ بھی خواہش کرتا ہے کہ دُوسروں کو اللہ کی نعمتیں حاصل نہ ہوں۔

درحقیقت یہ کسی انسان کی تنگ نظری اور کمینگی ہوتی ہے جو انسان کو حسد پر مائل کرتی ہے۔ بعض اوقات مندرجہ بالا چھ کے چھ محرکات کسی شخص میں یکجا ہو جاتے ہیں اور بعض اوقات ان میں سے چند کسی میں جمع ہوتے ہیں۔ اسی نسبت سے کسی میں کم اور کسی میں زیادہ حسد پایا جاتا ہے۔

لیکن ان سب سے بڑھ کر حسد کی بنیادی وجہ عقیدے کی خرابی ہوتی ہے۔ جو شخص اللہ تعالیٰ کی قدرت، اُس کے لطف وعنایت، حکمت وتدبیر اور عدالت پر ایمان رکھتا ہو، وہ کس طرح حسد میں مبتلا ہو سکتا ہے!

حاسد انسان درحقیقت زبانِ حال سے اللہ تعالیٰ پر اعتراض کر رہا ہوتا ہے کہ تو نے فلاں شخص کو فلاں نعمت کیوں دی ہے؟ تو نے یہ نعمت مجھے کیوں نہیں دی؟ اس طرح یہ شخص اللہ تعالیٰ کی حکمت اور عدالت پر اعتراض کر رہا ہوتا ہے۔ حاسد انسان زبانِ حال سے کہہ رہا ہوتا ہے کہ اگر اللہ نے کوئی نعمت کسی اور کو دے دی تو مجھے ایسی نعمت نہ دے سکے گا (العیاذ باللہ)۔ لہٰذا بہتر ہے کہ یہ نعمت اُس سے سلب ہو جائے اور مجھے مل جائے۔

اس لحاظ سے دیکھا جائے تو حاسد افراد کا توحیدِ افعالی اور اللہ تعالیٰ کی حکمت اور قدرت پر ایمان متزلزل نظر آتا ہے، اس

لئے کہ جوانسان ان حقائق پر ایمان رکھتا ہے، وہ اس بات کا یقین رکھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نعمتوں کی تقسیم کسی حساب کتاب پر اور کسی حکمت کی بنیاد پر ہوتی ہے۔ اُسے یہ بھی یقین ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس بات پر قادر ہے کہ مجھے دُوسروں سے زیادہ اور بہتر نعمتیں عطا فرمائے۔

اسی لئے حضرت زکریا علیہ السلام سے ایک حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

"اَلْحَاسِدُ وَّلِنِعْمَتِیْ مُتَسَخِّطٌ لِقَضَائِیْ غَیْرَرَاضٍ لِقِسْمَتِیَ الَّتِیْ قَسَمْتُ بَیْنَ عِبَادِیْ"۔ (المحجة البیضاء 5:326)

''حاسد میری نعمت کا دُشمن، میرے فیصلے پر غضبناک اور میری تقسیم پر ناراض ہوتا ہے''۔

اس سے ملتی جلتی ایک حدیث میں رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے فرمایا:

"لَاتَحْسُدَنَّ النَّاسَ عَلٰی مَآاٰتَیْنٰھُمْ مِنْ فَضْلِیْ وَلَاتَمُدَّنَّ عَیْنَیْكَ اِلٰی ذٰلِكَ وَلَاتَتَّبِعْهُ نَفْسَكَ فَاِنَّ الْحَاسِدَ سَاخِطٌ لِنِعَمِیْ ضَادٌّ لِقَسْمِیَ الَّذِیْ قَسَمْتُ بَیْنَ عِبَادِیْ وَمَنْ یَّكُ كَذٰلِكَ فَلَسْتُ مِنْهُ وَلَیْسَ مِنِّیْ"۔

''اے موسیٰؑ، خبردار! جو کچھ میں نے لوگوں کو اپنے فضل سے عطا کیا ہے، اس پر حسد نہ کرنا اور للچائی ہوئی نظروں سے ان کی طرف نہ دیکھنا اور اپنے نفس کو اس کے پیچھے نہ چلانا، اس لئے کہ حاسد میری نعمت کا دُشمن اور میری تقسیم کا مخالف ہوتا ہے اور جو کوئی ایسا ہو، اس کا مجھ سے میرا اُس سے کوئی تعلق نہیں ہے''۔ (اصولِ کافی 2:307)

مختصر یہ کہ حاسد کے ایمان کی بنیادیں پختہ نہیں ہوتی ہیں ورنہ اُسے معلوم ہوتا کہ حسد، توحید سے انحراف کی ایک قسم ہے۔

اس سلسلہ میں ایک عرب شاعر کا کہنا ہے:

الاوقل لمن کان لی حاسداً
اتدری علی من اسأت الادب
اسات علی اللہ فی فعلہ
اذاانت لم ترض لی ماوھب

''حاسد سے کہو کہ کیا تمہیں معلوم ہے کہ تم کس کی بارگاہ میں بے ادبی کر رہے ہو؟ تمہاری بے ادبی اور گستاخی

اللہ اور اُس کے کاموں کے بارے میں ہے، جب تک تم مجھ پر اُس کی عطا اور بخشش پر راضی نہ ہو جاؤ''۔

3۔ حسد کی علامات:۔

دیگر صفاتِ رذیلہ کی مانند حسد بھی بعض اوقات پوشیدہ اور بعض اوقات آشکار ہوتا ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ ہم اس کی اُن علامات کو پہچانیں جن کا ماہرین علم اخلاق یا ماہرین نفسیات نے ذکر کیا ہے یا جنہیں ہم اپنے تجربات کی بنیاد پر جانتے ہیں۔ اس طرح ہم اس قابل ہو سکیں گے کہ اس بیماری کے وجود میں آتے ہی اسے پہچان کر اس کا خاتمہ کرنے کی کوشش کریں، اس سے قبل کہ یہ بیماری ہمارے وجود میں پختہ ہو جائے۔

حسد کی جو علامات بیان کی گئی ہیں، ان میں سے بعض چیدہ چیدہ علامات یہ ہیں:

1۔ جب حاسد کسی کے بارے میں سنتا ہے کہ اُسے کوئی نعمت ملی ہے تو وہ غمگین ہو جاتا ہے، خواہ اُس کے آثار ظاہر نہ کرے۔

2۔ بعض اوقات اس حسد سے آگے بڑھ کر غیبت اور عیب جوئی میں مصروف ہو جاتا ہے۔

3۔ بعض اوقات مزید آگے بڑھ کر دُشمنی و عداوت پر کمر بستہ ہو جاتا ہے۔

4۔ بعض اوقات وہ محسود کے بارے میں بے اعتنائی اور لاتعلقی کا اظہار کرنے پر قناعت کرتا ہے۔ کوشش کرتا ہے کہ اُسے نہ دیکھے اُس کے بارے میں کوئی بات نہ سنے۔ اگر کبھی کوئی شخص اس بارے میں بات کرے تو حاسد کوشش کرتا ہے کہ موضوع بدل کر اُسے کسی اور بات میں لگا یا جائے اور اگر کبھی وہ اس کے بارے میں اظہار نظر کرنے پر مجبور ہو جائے تو کوشش کرتا ہے کہ اس کی نمایاں اور ممتاز صفات کے بارے میں خاموش رہے۔ ان اُمور میں سے ہر ایک حسد کی علامت ہو سکتا ہے۔

اہلِ بیتِ عصمت کی احادیث میں بھی اس بارے میں واضح بیانات پائے جاتے ہیں، مثلاً امیر المومنینؑ حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

يَكْفِيْكَ مِنَ الْحَاسِدِ اَنَّهُ يَغْتَمُّ فِيْ وَقْتِ سُرُوْرِكَ''۔

''حاسد کو پہچاننے کیلئے یہی کافی ہے کہ جب تو خوش ہو، وہ غمگین ہوتا ہے''۔ (سفینۃ البحار: حسد)

اس کے برعکس جب انسان کو غم یا نقصان پہنچتا ہے تو حاسد کو خوشی ہوتی ہے۔ سورۂ توبہ، آیت: 50 میں منافقین کے بارے میں ہے:

''اِنْ تُصِبْكَ حَسَنَةٌ تَسُؤْهُمْ ۚ وَاِنْ تُصِبْكَ مُصِيْبَةٌ يَّقُوْلُوْا قَدْ اَخَذْنَآ اَمْرَنَا مِنْ قَبْلُ وَيَتَوَلَّوْا وَّهُمْ فَرِحُوْنَ○''(توبہ:50)

''جب کبھی تمہیں کامیابی نصیب ہوتی ہے تو اُنہیں برا لگتا ہے اور جب کبھی تمہیں کوئی مصیبت پیش آتی ہے تو وہ

کہتے ہیں کہ ہم نے تو پہلے سے اپنا انتظام کر رکھا تھا اور وہ خوش خوش واپس چلے جاتے ہیں''۔

دیگر بھی متعدد آیات میں حسد کرنے والے کافروں کے اسی طرح عمل کا ذکر پایا جاتا ہے۔جن میں سے ایک آیت آغازِ بحث میں بیان ہو چکی ہے کہ کفار، اللہ سے ملنے والی نعمتوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے حسد کرتے تھے۔

احادیث میں بھی یہ بات بکثرت بیان کی گئی ہے کہ حاسد محسود کی نعمت کے زائل ہونے پر خوش ہوتا ہے اور اُس کی کامیابیوں پر ناخوش ہوتا ہے۔ایک حدیث میں امیر المومنینؑ حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

"اَلْحَاسِدُ یَفْرَحُ بِالشُّرُوْرِ وَیَغْتَمُّ بِالسُّرُوْرِ"۔

''حاسد شر اور برائی سے خوش اور خوشی سے غمگین ہوتا ہے''۔(غرر الحکم:1474)

4۔حسد کے منفی اثرات:۔

انفرادی اور معاشرتی زندگی پر حسد کے بہت سے منفی اثرات مرتب ہوتے ہیں۔شاید ہی کسی اور بری صفت کے اتنے منفی اثرات رونما ہوتے ہوں جتنے حسد کے ہوتے ہیں۔ان میں سے اہم اور قابلِ ذکر یہ ہیں:

1۔ حاسد ہمیشہ اپنے ہی حسد کی آگ میں جلتا رہتا ہے جس کے نتیجہ میں وہ جسمانی اور نفسیاتی بیماریوں میں مبتلا ہو جاتا ہے۔جس قدر دوسروں کی کامیابیوں میں اضافہ ہوتا ہے، اُسی قدر حاسد کے غم واندوہ میں اضافہ ہوتا جاتا ہے، یہاں تک کہ اُس کی نیندیں بھی اڑ جاتی ہیں اور وہ بیمار اور کمزور ہوتا جاتا ہے۔حالانکہ اگر وہ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی نعمتوں پر توجہ رکھے اور ان پر شاکر رہے تو وہ بھی خوشحال اور اطمینان وسکون سے بھرپور زندگی گزار سکتا ہے۔

متعدد احادیث میں بھی اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ایک حدیث میں امیر المومنین حضرت علیؑ فرماتے ہیں:۔

"اَسْوَءُ النَّاسِ عَیْشاً اَلْحَسُوْد"۔

''سب سے بری زندگی حاسد کی زندگی ہوتی ہے۔''(تصنیف غرر الحکم:300)

ایک اور حدیث میں بھی امیر المومنین علیہ السلام سے منقول ہے:

"لَارَاحَةَ لِحَسُوْد"۔

''حاسد کو کوئی آرام میسر نہیں ہوتا۔''(بحار الانوار، 256:70)

ایک اور حدیث میں آپؑ فرماتے ہیں:

"اَلْحَسَدُ شَرُّ الْاَمْرَاض"۔

''حسد بدترین بیماری ہے''۔(شرح غرر الحکم:331)

ایک اور حدیث میں ہے:

"اَلْعُجْبُ لِغَفْلَةِ الْحُسَّادِ عَنْ سَلَامَةِ الْاَحْسَادِ"۔

''حاسد پر تعجب ہے کہ وہ اپنی صحت وسلامتی سے غافل ہوتا ہے''۔(بحارالانوار،256:70)

ہم اس بحث کو حضرت علی علیہ السلام کی ایک حدیث پر ختم کرتے ہیں، اگرچہ اس سلسلہ میں احادیث بہت زیادہ ہیں:

"اَلْحَسَدُ لَا یَجْلِبُ اِلَّا مَضَرَّةً وَّغَیْظًا، یُوْهِنُ قَلْبَكَ وَیَمْرَضُ جِسْمَكَ"۔

''حسد انسان کے اندر صرف ضرر اور غضب ہی پیدا کرتا ہے، دل کو کمزور اور جسم کو بیمار کر دیتا ہے''۔(بحارالانوار،256:70)

2۔ حسد کے معنوی نقصانات مادی اور جسمانی نقصانات سے کہیں زیادہ ہیں، اس لئے کہ حسد انسان کے ایمان کی بنیادیں ہلا دیتا ہے اور اسے اللہ تعالیٰ کے عدل وحکمت کے بارے میں بدگمان کر دیتا ہے، اس لئے کہ دل کی گہرائی سے اصل میں حاسد اللہ تعالیٰ کی تقسیمِ نعمت پر معترض ہوتا ہے۔

امیر المومنین علیہ السلام سے مروی ایک مشہور حدیث میں آیا ہے:(تصنیف غرر الحکم:300)

"لَا تُحَاسِدُوْا فَاِنَّ الْحَسَدَ یَاْكُلُ الْاِیْمَانَ كَمَا تَاْكُلُ النَّارُ الْحَطَبَ"۔

''ایک دوسرے سے حسد نہ کرو، حسد ایمان کو اس طرح کھا جاتا ہے جیسے آگ لکڑی کو کھا جاتی ہے۔''

ایک حدیث میں امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

"آفَةُ الدِّیْنِ الْحَسَدُ وَالْعُجْبُ وَالْفَخْرُ"۔

''دین کی آفت حسد، خود پسندی اور فخر ہیں''۔(اصول کافی،307:2)

ایک اور حدیث میں امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

"اِنَّ الْمُؤْمِنَ یَغْبِطُ وَلَا یَحْسُدُ، وَالْمُنَافِقُ یَحْسُدُ وَلَا یَغْبِطُ"۔

''مومن رشک کرتا ہے، حسد نہیں کرتا اور منافق حسد کرتا ہے، رشک نہیں کرتا''(اصولِ کافی،307:2)

اس حدیث سے یہ بات بخوبی واضح ہوجاتی ہے کہ حسد ایمان کی رُوح سے بالکل سازگار نہیں ہے اور منافقت کی رُوح کے ساتھ ہم آہنگ ہے۔

گزشتہ بحث میں ہم یہ حدیثِ قدسی بیان کر چکے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ حسد سے پرہیز کرو کیونکہ حاسد میری نعمت کا دُشمن اور میری تقسیم کا مخالف ہوتا ہے۔

3۔ حسد کا ایک اور نقصان یہ ہے کہ حسد ایک ایسا ضخیم حجاب بن جاتا ہے جو انسان کو حقائق کی معرفت سے محروم

کر دیتا ہے، اس لئے کہ حاسد محسود کی مثبت خصوصیات کو دیکھ ہی نہیں سکتا، خواہ وہ اس کا اُستاد، مربی اور بزرگ ہی کیوں نہ ہو بلکہ اس کی نظریں ہمیشہ اس کے منفی پہلوؤں، کمزوریوں اور خامیوں کی تلاش میں مصروف رہتی ہیں۔ بعض اوقات تو وہ اس منفی رویے میں اس حد تک آگے بڑھ جاتا ہے کہ محسود کی خوبیاں بھی اسے خامیاں نظر آنے لگتی ہیں۔ اس حقیقت کو حضرت علی علیہ السلام نے ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے:

"اَلْحَسَدُ حَبْسُ الرُّوْحِ"۔

''حسد رُوح کا زندان ہے''۔ (شرح غرر الحکم: حکمت: 371)

4۔ حسد کا ایک اور نقصان یہ ہے کہ حاسد اپنے دوستوں سے محروم ہو جاتا ہے، اس لئے کہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ انسان پر اللہ تعالیٰ کی کوئی ایسی رحمت ہوتی ہے جو دُوسروں پر نہیں ہوتی۔ اگر انسان کے اندر حسد کی بیماری پائی جاتی ہو تو وہ ہر اس شخص سے حسد کرنے لگتا ہے جس کے پاس کوئی ایسی نعمت ہو جو اس کے پاس نہیں ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ لوگ اس سے دُور ہونے لگتے ہیں اور اس کے اور دوسرے کے درمیان پائے جانے والے محبت کے رشتے ٹوٹ جاتے ہیں۔

اس حقیقت کی تائید بھی امیر المومنین علیہ السلام کے اس فرمان سے ہوتی ہے:

"اَلْحَسُوْدُ لَا خُلَّةَ لَهُ"۔

''حاسد کا کوئی دوست نہیں ہوتا''۔ (شرح غرر الحکم: حکمت: 371)

5۔ حسد کے منفی اثرات میں سے ایک یہ ہے کہ یہ انسان کو ترقی کرنے اور بلند مقامات کے حصول سے روک دیتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ حسد انسان کو لوگوں سے الگ تھلگ کر دیتا ہے اور جو شخص معاشرے میں تنہا اور الگ تھلگ ہو، وہ کبھی بلند مرتبہ حاصل نہیں کر سکتا۔ اس بات کی تصدیق بھی حضرت علی علیہ السلام کے اس ارشاد سے ہوتی ہے:

"اَلْحَسُوْدُ لَا يَسُوْدُ"

''حاسد کبھی سیادت اور سرداری حاصل نہیں کر سکتا''۔ (غرر الحکم: 1017)

6۔ حسد کا سب سے منفی اثر یہ ہے کہ اس کی وجہ

سے انسان مزید بہت سے گناہوں میں ملوث ہو جاتا ہے۔ وہ دُوسروں کو نعمت سے محروم کرنے کیلئے مختلف قسم کے گناہوں، مثلاً ظلم، جھوٹ، غیبت، تہمت، چغلخوری وغیرہ جیسے گناہوں کا مرتکب ہوتا ہے۔ وہ اپنے پست مقصد کے حصول کیلئے ہر جائز و ناجائز ہتھکنڈہ استعمال کرتا ہے تا کہ اپنے محسود کو نقصان پہنچا سکے۔

اس بات کی تصدیق حضرت علی علیہ السلام کی اس حدیث سے ہوتی ہے:

"اَلْحَسُوْدُ كَثِيْرُ الْحَسَرَاتِ، وَمُتَضَاعَفُ السَّيِّئَاتِ"۔ (تصنیف الغرر: 301۔ شرح

غرر الحکم: 1520)

7۔ حسد کا ایک برا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ حاسد محسود کو کوئی نقصان پہنچانے سے قبل اپنے آپ کو نقصان پہنچاتا ہے۔ وہ انواع واقسام کی رُوحانی اور جسمانی تکالیف میں مبتلا ہو جاتا ہے اور اپنے آپ کو دُنیا وعقبیٰ کے عذاب کا مستحق بنالیتا ہے۔ اس سلسلہ میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کی یہ حدیث قابلِ ذکر ہے۔

"اَلْحَاسِدُ مُضِرٌّ بِنَفْسِهٖ قَبْلَ اَنْ يَضُرَّ بِالْمَحْسُوْدِ، كَاِبْلِيْسَ اُوْرِثَ بِحَسَدِهٖ بِنَفْسِهٖ اللَّعْنَةُ، وَلِاٰدَمَ الْاِجْتِبَاءُ وَالْهُدٰى"۔

''حاسد محسود سے قبل اپنے آپ کو نقصان پہنچاتا ہے، جس طرح ابلیس نے حسد کی وجہ سے اپنے آپ کو ملعون بنادیا جبکہ آدمؑ کی برگزیدگی نے ہدایت کا راستہ کھول دیا''۔ (بحار الانوار، 255:70)

5۔ حسد کے درجات:۔

علمائے علمِ اخلاق نے حسد کے مختلف درجات کا ذکر کیا ہے جن میں سے دو درجات مکمل طور پر نمایاں اور ممتاز ہیں:

1۔ وہ حسد جو انسان کے دل اور رُوح کی گہرائی میں پنہاں ہوتے ہیں اور انسان آسانی سے اس پر قابو رکھتا ہے تاکہ اس کے اثرات انسان کے قول وفعل میں ظاہر نہ ہوں۔

2۔ انسان کے اندر حسد کی حالت ایسی ہو کہ وہ اس پر قابو نہ رکھ سکتا ہو اور اس کے اثرات اس کے قول وفعل سے ظاہر ہوں۔

بعض روایات میں ہے کہ سب یا اکثر لوگوں سے باطن میں حسد موجود ہوتا ہے لیکن جب تک اس کے اثرات قول وفعل میں ظاہر نہ ہوں، ان کا گناہ نہیں لکھا جاتا۔ اس بارے میں جناب رسولِ اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ایک حدیث منقول ہے:

"ثَلَاثٌ لَا يَنْجُوْ مِنْهُنَّ اَحَدٌ: اَلظَّنُّ، وَالطِّيَرَةُ، وَالْحَسَدُ، وَسَاُحَدِّثُكُمْ بِالْمَخْرَجِ مِنْ ذٰلِكَ، اِذَا ظَنَنْتَ فَلَا تُحَقِّقْ، وَاِذَا تَطَيَّرْتَ فَامْضِ، وَاِذَا حَسَدْتَ فَلَا تَبْغِ"۔

''تین چیزیں ایسی ہیں جن سے کوئی نجات حاصل نہیں کرسکتا: بدگمانی، وہم اور حسد۔ میں تمہیں ان سے نجات کی راہ بتاتا ہوں۔ جب تم کسی کے بارے میں بدگمانی کا شکار ہو جاؤ تو اس کو جامۂ عمل پہنانے کی کوشش نہ کرو۔ جب کبھی وہم میں گرفتار ہو جاؤ تو اس کی طرف توجہ نہ کرو اور اپنی راہ پر چلتے جاؤ اور جب حسد میں مبتلا ہو جاؤ تو ظلم نہ کرو''۔ (المحجۃ البیضاء، 325:5)

ایک اور حدیث میں ہے

"قَلَّ مِنْ يَنْجُوْ مِنْهُنَّ"۔

''بہت کم لوگ ان سے نجات پا سکتے ہیں''۔(المحجۃ البیضا،5:325)

اس تعبیر سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ یہ کوئی عمومی اور ہمہ گیر حکم نہیں ہے اور اس کا اطلاق انبیاؑ و اولیاؑ پر نہیں ہوتا، اس لئے کہ اگر ان کا باطن حسد سے پاک نہ ہوتا تو وہ ان اعلیٰ مقامات پر فائز نہ ہو سکتے۔ بنابرایں جس حدیث میں یہ کہا گیا ہے کہ ''کوئی شخص حسد سے محفوظ نہیں رہ سکتا، حتیٰ کہ انبیاؑ'' کے معنی یہ ہیں کہ کوئی شخص ایسا نہیں جو حاسدوں کے حسد کا نشانہ نہ ہو، حتیٰ کہ انبیاؑ کے بھی حاسد ہوتے ہیں۔

بہرحال اس بات میں کوئی شک نہیں کہ حسد اخلاقی رذائل میں سے ہے، خواہ عملی طور پر ظاہر ہو یا نہ ہو۔ بحث صرف اس میں ہے کہ اگر وہ عملی شکل اختیار نہ کرے تو گناہ ہے یا نہیں؟ بظاہر ایسی صورت میں اس کے گناہ ہونے پر کوئی دلیل نہیں ہے۔ اگرچہ اس بات میں کوئی شک نہیں ہے کہ وہ بہرحال ایک بری صفت ہے۔

علامہ نراقی معراج السعادۃ میں فرماتے ہیں:

''اگر حسد انسان کو برے اعمال پر مائل کرے اور وہ غیبت و بدگوئی کا مرتکب ہوجائے تو یقیناً اس نے گناہ کا ارتکاب کیا ہے۔ لیکن اگر وہ زبان پر قابو رکھے اور اپنے قول و فعل سے حسد کو ظاہر نہ ہونے دے لیکن باطن میں محسود کی نعمت کے زوال کا آرزومند ہو اور اُسے نقصان پہنچانے کا خواہش مند ہو اور اس بات کو برا بھی نہ جانتا ہو تو اس صورت میں بھی وہ گناہگار رہوتا ہے''۔(معراج السعادۃ:429)

لیکن بظاہر دُوسری قسم کے حسد کے حرام ہونے پر کوئی دلیل نہیں ہے۔

اس طرح حسد کا عدم ظہور بھی دو اقسام میں تقسیم ہوجاتا ہے: ایک وہ جس پر حاسد کو افسوس ہوتا ہے اور وہ اسے برا محسوس کرتا ہے اور ایک وہ جس پر اُسے کوئی افسوس نہیں ہوتا اور اُسے برا نہیں لگتا اور وہ اس حالت کو تبدیل کرنے کی کوشش بھی نہیں کرتا۔ بعید نہیں کہ یہ حالت گناہ کے زمرے میں شمار ہوتی ہو لیکن اس کے گناہ ہونے پر کوئی پختہ دلیل موجود نہیں ہے۔

6۔ حسد کا علاج:۔

گزشتہ مباحث میں یہ بات واضح ہوچکی ہے کہ حسد ایک خطرناک بیماری ہے۔ اگر اس کا علاج نہ کیا جائے تو یہ انسان کے دین اور دُنیا دونوں کو تباہ کر دیتی ہے۔

دیگر اخلاقی رذائل کے علاج کی طرح حسد کا علاج بھی دو طریقوں سے کیا جاسکتا ہے:

1۔ علمی طریقہ 2۔ عملی طریقہ

علمی طریقہ میں حاسد کیلئے ضروری ہے کہ وہ دو باتوں پر توجہ کرے: رُوح اور جسم پر حسد کے تباہ کن اثرات اور حسد کی

پیدائش کے محرکات۔

جس طرح ہیروئین کے نشے میں مبتلا شخص کیلئے ضروری ہے کہ وہ اس نشے میں مبتلا افراد کے انجام پر غور کرے اور دیکھے کہ کس طرح اس نشے نے اُن کی جسمانی صحت کو تباہ و برباد کر دیا۔ ان کے بیوی بچے اور معاشرے میں ان کی عزت اور حیثیت کو نقصان پہنچا، کس طرح وہ جوانی میں موت کے منہ میں چلے گئے، کسی نے اُن کی موت پر دکھ اور غم محسوس نہیں کیا بلکہ شکر کیا کہ اس کی موت سے خاندان کو ایک مصیبت سے نجات ملی۔ اسی طرح حاسد کو چاہئے کہ وہ اس بات پر غور کرے کہ حسد ایک ایسی بیماری ہے جو جلد ہی اس کے جسم کو بھی بیمار کر دے گی اور اس کی روح کو کھوکھلا کر دے گی۔ اس کے آرام و سکون کو غارت کر دے گی اور غم واندوہ کی ایک مستقل چادر اس کے دل پر اُوڑھا دے گی۔ ان سب سے بدتر یہ کہ حسد اسے اللہ کی بارگاہ میں قابلِ نفرت بنا دے گا، اُس کا انجام ابلیس اور قابیل کے انجام کی مانند ہوگا اور اتنی بھاری قیمت ادا کر کے بھی وہ محسود کو اُس نعمت سے محروم نہیں کر سکے گا جس پر وہ اُس سے حسد کر رہا ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر کوئی شخص بار بار ان احادیث کا مطالعہ کرے جن میں حسد کے نقصانات کو بیان کیا گیا ہے تو یقیناً اس بیماری کے علاج میں مثبت اور مؤثر پیشرفت ہو سکتی ہے۔

حاسد کو ان خطوط پر بھی سوچنا چاہئے کہ اگر منشیات کا استعمال روح اور جسم کی صحت و سلامتی پر برے اثرات ڈالتا ہے اور قبل از وقت موت کا سبب بنتا ہے، اسی طرح وہ بھی حسد کی وجہ سے نہ صرف رُوحانی اور جسمانی صحت سے محروم ہو جائے گا بلکہ اس کی آخرت بھی تباہ و برباد ہو جائے گی، اس لئے کہ درحقیقت وہ اللہ کی حکمت اور اس کی تقسیم پر اعتراض کر کے کفر و شرک کے گڑھوں میں گر رہا ہے۔

دوسری طرف سے وہ حسد کے عوامل و محرکات کے بارے میں غور و فکر کرے اور ایک ایک کر کے ان عوامل و محرکات کی بیخ کنی کی کوشش کرے۔ اگر برے دوستوں کی صحبت کی وجہ سے وہ اس بیماری میں مبتلا ہوا ہے تو فوراً ایسے دوستوں سے قطع تعلق کر لے۔ اگر بخل اور تنگ نظری کی وجہ سے اس بیماری میں مبتلا ہوا ہے تو ان کا علاج کرے۔ اگر ایمان کی کمزوری اور توحید افعالی کی وجہ سے اس گرداب میں گرفتار ہوا ہے تو اپنے ایمان کی مضبوطی اور معرفتِ توحید میں اضافے کی کوشش کرے۔ اگر احساسِ کمتری کی وجہ سے حسد میں مبتلا ہوا ہے تو اپنی ذات، اپنی استعداد اور صلاحیتوں کا نئے سرے سے مثبت انداز میں جائزہ لے کر اپنی خود اعتمادی کو بحال کرے اور اللہ پر توکل کرتے ہوئے ترقی و پیش رفت کی راہ پر قدم بڑھائے اور حسد کو اپنے آپ سے دُور کرے۔

بہتر یہ ہے کہ حاسد ان تمام امور کا خلاصہ خصوصاً احادیثِ معصومینؑ کو ایک کاغذ پر لکھے اور دن میں چند بار تنہائی میں اسے بلند آواز سے پڑھ کر اپنے آپ کو سنائے۔ ایسا کرنے سے چند ہی دنوں میں اس کے مثبت اثرات ظاہر ہونے لگیں گے۔ اس کا رُوح اور جسم بتدریج حسد کی گرفت سے آزاد ہوتے جائیں گے اور سلامتی و سعادت کی روشنی اس کے قلب و ذہن کو منور کرنے لگے گی۔

حاسد کو یہ نکتہ خاص طور پر نظر رکھنا چاہئے کہ اگر وہ اپنے وقت اور صلاحیتوں کو محسود کی نعمت کے زوال کی بجائے اپنی ترقی اور

پیشرفت کیلئے استعمال کرے تو وہ کافی حدتک ترقی اور پیشرفت کرسکتا ہے۔ بالفاظِ دیگر حاسد کو چاہئے کہ وہ حسد کے محرکات کو رشک کے محرکات میں تبدیل کرنے کی کوشش کرے اور تخریبی قوت کو تعمیری قوت میں تبدیل کرے۔

یہ بات حضرت علی علیہ السلام نے ایک حدیث میں اس طرح بیان فرمائی ہے:

"اِحْتَرِسُوْا مِنْ سُوْرَةِ الْجُمَدِ وَالْحِقْدِ وَالْغَضَبِ وَالْحَسَدِ وَاَعِدُّوْا لِكُلِّ شَیْءٍ مِنْ ذٰلِكَ عِدَّةً تُجَاهِدُوْنَ بِهَا مِنَ الْفِكْرِ فِی الْعَاقِبَةِ وَمَنْعِ الرَّذِیْلَةِ وَطَلَبِ الْفَضِیْلَةِ"۔

''اپنے آپ کو بخل، کینہ، غضب اور حسد کی شدت سے بچاؤ اور ان میں سے ہر ایک کا مقابلہ کرنے کیلئے وسیلہ تیار کرو جیسے فکر عاقبت، رذائل کو روکنا اور فضائل کی خواہش کرنا''۔ (تصنیف غرر الحکم: 300)

عملی طریقہ یہ ہے کہ کوئی بھی عمل بار بار انجام دینے سے پختہ عادت میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ اگر حاسد محسود کی شخصیت اور حیثیت کو نقصان پہنچانے کی کوشش کرنے کی بجائے اپنی حیثیت اور ساکھ کو بہتر بنانے کی کوشش کرے، محسود کی غیبت اور بدگوئی کرنے کی بجائے اُس کی خوبیوں کی تعریف کرے، اُسے نقصان پہنچانے کی کوشش کرنے کی بجائے اُس کی مدد کرنے کی کوشش کرے، نہ صرف خود اُس کا خیر خواہ ہو بلکہ دُوسروں کو بھی اُس کی خیر خواہی کی تلقین کرے تو آہستہ آہستہ حسد اُس کے اندر سے ختم ہو جائے گا اور خیر خواہی اس کی جگہ لے لے گی اور اُس کا باطن پاکیزگی اور نورانیت سے بھر جائے گا۔

اسی طرح حسد کی ضد کی مشق کرنا حسد کی بیماری کا علاج کرنے کا ایک موثر طریقہ ہے۔ ایک حدیث میں رسولؐ اللہ فرماتے ہیں:

"اِذَا حَسَدْتَ فَلَا تَبْغِ"۔

''جب تم حسد کرو تو حسد پر عمل نہ کرو اور محسود پر کوئی ظلم نہ کرو''۔ (تحف العقول: 50)

ایک اور حدیث میں امیر المومنین علیہ السلام سے منقول ہے:

"اِنَّ الْمُؤْمِنَ لَا یَسْتَعْمِلُ حَسَدَهُ"۔

''مومن اپنے حسد پر عمل نہیں کرتا''۔ (بحار الانوار، 323:55)

حسد کے علاج میں جو چیز سب سے زیادہ موثر ہے، وہ یہ ہے کہ انسان اللہ کی رضا پر راضی رہے اور اپنی زندگی پر قناعت کرے۔ اس حقیقت کو امیر المومنین علیہ السلام ایک حدیث میں اس طرح بیان فرماتے ہیں:

"مَنْ رَضِیَ بِحَالِهٖ لَمْ یَعْتَوِرْهُ الْحَسَدُ"۔

''جو اپنی حالت پر راضی ہو، کبھی حسد میں مبتلا نہیں ہوتا''۔ (تصنیف غرر الحکم: 300)

7۔ نُصح وخیر خواہی:۔

حسد کی ضد نصح اور خیر خواہی ہے۔اس کے معنی یہ ہیں کہ انسان نہ صرف دوسروں کی نعمت کے زوال کا آرزومند نہ ہو بلکہ اس نعمت کی بقا اور اس میں اضافے کا خواہاں ہو۔ بالفاظِ دیگر جو خیر وخوبی اپنے لئے پسند کرتا ہے، دُوسروں کیلئے بھی پسند کرے۔ یہ اُن پسندیدہ صفات میں سے ہے جن پر قرآن واحادیث میں بہت تاکید کی گئی ہے۔

تمام انبیاؑ اپنی قوم کے ناصح اور خیر خواہ تھے۔قرآن شریف میں حضرت نوحؑ کا جذبۂ خیر خواہی اس طرح بیان کیا گیا ہے:

"اُبَلِّغُكُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّيْ وَاَنْصَحُ لَكُمْ وَاَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ"۔

''میں اپنے رب کے پیغام تم تک پہنچاتا ہوں۔ میں تمہارا خیر خواہ ہوں اور اللہ کی طرف سے اُن چیزوں کا علم رکھتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔''(اعراف:62)

اس آیت میں تبلیغِ رسالت کے بعد اُمت کی نصیحت اور خیر خواہی کا ذکر کیا گیا ہے جو حسد، بخل اور خیانت کی ضد ہے۔الفاظ کے مختصر فرق کے ساتھ یہی بات حضرت ہودؑ کے بارے میں قرآن مجید میں بیان ہوئی ہے:

"اُبَلِّغُكُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّيْ وَاَنَا لَكُمْ نَاصِحٌ اَمِيْنٌ ○"

''میں اپنے رب کے پیغامات تم تک پہنچاتا ہوں اور تمہارے لئے ایک امین خیر خواہ ہوں''۔(ایضاً:68)

یہی بات حضرت صالح علیہ السلام اور حضرت شعیب علیہ السلام کے بارے میں بھی کہی گئی ہے۔

ظاہر سی بات ہے کہ صرف یہ چار رسول ہی اپنی اپنی قوم کے خیر خواہ نہ تھے بلکہ یہ خصوصیت تمام انبیاؑ اور معصومینؑ میں پائی جاتی تھی۔اس کے سچے پیروکاروں کو بھی اس صفت سے مزین ہونا چاہئے اور حاسد وبخیل نہیں ہونا چاہئے۔

رسولؐ اللہ نے ایک انصاری کے جنتی ہونے کی بشارت دی۔لوگوں کو اس کے بارے میں تجسس ہوا اور اس کے حالات کی تحقیق کرنے لگے تو معلوم ہوا کہ وہ کوئی غیر معمولی نیکیاں اور عبادات انجام نہیں دیتا تھا۔رات کو جلد سو جاتا تھا اور پھر صبح کی نماز کیلئے بیدار ہوتا تھا۔آخر کار انہوں نے خود اس سے پوچھ لیا کہ تمہارے اندر کونسی خاص بات ہے کہ رسولؐ اللہ نے تمہارے بارے میں یہ بشارت دی۔

اس نے جواب دیا:

"مَا هُوَ اِلَّا مَا تَرَوْنَ غَيْرَ اِنِّيْ لَا اَجِدُ عَلٰى اَحَدٍ مِّنَ الْمُسْلِمِيْنَ فِيْ نَفْسِيْ غِشًّا وَّلَا حَسَدًا عَلٰى خَيْرٍ اَعْطَاهُ اللّٰهُ اِيَّاهُ"۔(المحجة البیضاء،5:325)

''میرا حال تو وہی ہے جو تم دیکھ چکے ہو۔ہاں! یہ بات ضرور ہے کہ اللہ نے کسی مسلمان کو کوئی خیر اور بھلائی عطا کی

ہوتواس پر میرے دل میں کوئی کدورت اور حسد پیدانہیں ہوتا (بلکہ میں سب کا خیرخواہ ہوں اوراُن کی نعمتوں پر خوش ہوں)''۔

ایک اورحدیث میں ہے کہ رسولؐ اللہ نے فرمایا:

"اِنَّ اَعْظَمَ النَّاسِ مَنْزِلَةً عِنْدَاللهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ اَمْشَاهُمْ فِيْ اَرْضِهِ بِالنَّصِيْحَةِ لِخَلْقِهٖ"۔(اصولِ کافی:28)

''قیامت کے دن اللہ کے ہاں سب سے بلند مقام اُس شخص کا ہوگا جس نے روئے زمین پر اللہ کی مخلوق کی خیرخواہی میں سب سے زیادہ تگ ودو کی ہوگی''۔

ایک اورحدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خیرخواہی کے معیار کواس طرح بیان فرمایا ہے:

لَيَنْصَحُ الرَّجُلُ مِنْكُمْ اَخَاهُ كَنَصِيْحَتِهٖ لِنَفْسِهٖ"۔(اصول کافی:28:)

''تم میں سے ہرایک کواپنے برادرمومن کا اُتناہی خیرخواہ ہونا چاہئے جتناوہ اپنا خیرخواہ ہوتا ہے''۔

اُردواورفارسی میں نصیحت اورنصح کے الفاظ کسی کونصیحت کرنے کے معنوں میں استعمال ہوتے ہیں۔لیکن عربی میں ان الفاظ کے معنی بہت وسیع ہیں۔

راغب اصفہانی اپنی مشہورکتاب ''المفردات'' میں لکھتے ہیں کہ نصح اورنصیحت ہراُس قول یافعل کوکہتے ہیں جس میں دُوسروں کا فائدہ اورمصلحت پنہاں ہواور یہ لفظ اصل میں خلوص اوراخلاص کے ہم معنی ہے۔اسی لئے خالص شہدکوناصح کہاجاتا ہے۔درزی کے کام کوبھی اسی لئے نصح کہاجاتا ہے کہ وہ لباس کی اصلاح کرتا ہے۔چونکہ خیرخواہ انسان دوسروں کے اُمورکی اصلاح کیلئے خلوص واخلاص کے ساتھ کوشاں ہوتا ہے،اس لئے اُس کے عمل کیلئے نصح اورنصیحت کے الفاظ استعمال کئے جاتے ہیں۔بنیادی طور پر ہرخالص اور صاف چیزکوخواہ وہ عمل ہو یاقول،مادی اُمورسے متعلق ہو یامعنوی اُمورسے متعلق،اس پرنصح کے لفظ کا اطلاق ہوتا ہے۔

لہٰذا جب اخلاقی مباحث میں نصیحت کا ذکرآیا ہےتو اس کے معنی ہرقسم کے حسد،بخل،کینہ اورخیانت کوترک کرنے کے ہوتے ہیں۔

چھٹا باب

غرور وخود بینی

تمہید:۔

اخلاقی رذائل میں سے غرور ایک ایسی صفت ہے جو نہ صرف علمائے اخلاق کی نظر میں بلکہ عوام کی نظر میں بھی ناپسندیدہ ہے۔ اس صفتِ رذیلہ کے نتیجہ میں انسان اپنے آپ سے بیگانہ اور اپنے بارے میں جہالت کا شکار ہو جاتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ وہ دُوسروں کے بارے میں بھی جاہل اور بے خبر ہو جاتا ہے اور اپنی فروی اور معاشرتی حیثیت کے بارے میں بھی لاعلمی اور بے خبری میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

غرور انسان کو اللہ تعالیٰ سے دور اور شیطان کے نزدیک کر دیتا ہے۔ حقائق کو اس کی نظر میں معکوس کر دیتا ہے جس کی وجہ سے وہ شدید مادی اور معنوی نقصان اُٹھاتا ہے۔

مغرور افراد معاشرے میں ہمیشہ ناپسندیدہ ہوتے ہیں اور اپنی لامحدود توقعات کی وجہ سے معاشرے میں الگ تھلگ ہو جاتے ہیں۔ غرور اور بھی بہت سی بری صفات، مثلاً احساسِ برتری، تکبر، خود پسندی، دُوسروں کے بارے میں کینہ وحسد اور ان کی تحقیر کا باعث بنتا ہے۔

یہ بات بالکل واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ سے ابلیس کے دھتکارے جانے کی بنیادی وجہ غرور تھا۔ ماضی میں جن اُمتوں کی دعوت قبول کرنے کا انکار کیا، اس کی وجہ بھی یہی صفتِ رذیلہ تھی۔

فرعون اور نمرود جیسے افراد غرور کی وجہ سے اللہ سے دُور ہوئے اور ایسی ذِلت اور بدبختی میں مبتلا ہوئے جو سب کیلئے درسِ عبرت ہو گئی۔

بعض اوقات کوئی شخص غرور میں گرفتار ہو جاتا ہے اور بعض اوقات کوئی قوم اور نسل اس بری صفت کا شکار ہو جاتی ہے۔ دُوسری قسم بلاشک وشبہ بہت خطرناک ہے، اس لئے کہ اس کی وجہ سے بعض اوقات پورا ملک یا پوری دُنیا جنگ کی لپیٹ میں آجاتی ہے۔ پہلی اور دُوسری عالمی جنگ کے اسباب میں سے ایک اہم سبب جرمنوں کا نسلی غرور تھا۔

اس تمہید کے بعد ہم لغت اور علمائے اخلاق کی تشریحات کی روشنی میں ''غرور'' کے مفہوم کا جائزہ لیں گے اور اس کے بعد اس موضوع کا قرآن وحدیث کی روشنی میں مطالعہ کریں گے۔

1۔غرور کا مفہوم:۔

یہ لفظ عربی زبان اور قرآن وحدیث میں وسیع پیمانے پر استعمال ہوا ہے۔فارسی اور اُردو میں بھی یہ لفظ تقریباً انہی معنوں یا ان کے لوازم کے بارے میں استعمال ہوتا ہے۔

راغب اصفہانی اپنی مشہور کتاب ''المفردات'' میں غرور (غین پر زبر کے ساتھ) کے معنی بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اس سے مراد ہر وہ چیز ہے جو انسان کو فریب دے اور غفلت میں مبتلا کر دے، خواہ وہ چیز مال اور مقام ہو یا شہوت اور شیطان۔

صحاح اللغہ میں غرور کے معنی یہ بیان کئے گئے ہیں کہ اس سے مراد وہ تمام چیزیں جو انسان کو غافل کر دیتی ہیں یا اُسے دھوکا دیتی ہیں (خواہ مال و دولت، مقام و مرتبہ ہوں یا علم و دانش)۔

مجمع البحرین میں کہا گیا ہے کہ غرور سے مراد ہر وہ چیز ہے جس کا ظاہر خوبصورت اور دلکش اور باطن ناپسندیدہ، مجہول اور تاریک ہو۔

التحقیق فی کلمات القرآن الکریم میں اس لفظ پر بحث کرتے ہوئے اہل لغت کے نظریات کو بیان کرنے کے بعد کہا گیا ہے کہ ''اس لفظ کے بنیادی معنی وہ غفلت ہے جو کسی اور چیز کی تاثیر کے سبب انسان میں پیدا ہوتی ہے۔جہل، دھوکا، فریب، نقصان اور شکست وغیرہ اس کے لوازم یعنی لازمی نتائج ہیں۔''

المحجۃ البیضاء فی تھذیب الاحیاء میں، جو کہ علم اخلاق کی بہترین کتاب شمار ہوتی ہے اور امام غزالی کی احیاء العلوم کی تہذیب و تکمیل ہے، غرور کے معنی اس طرح بیان ہوئے ہیں۔

> ''غرور ان چیزوں پر خوش ہونے کا نام ہے جو انسان کی ہوائے نفس اور طبیعتِ انسانی کے ساتھ ہم آہنگ ہوں۔ اس کی وجہ انسان کی غلط فہمی یا شیطان کا فریب ہوتا ہے۔جو شخص بھی یہ سمجھتا ہو کہ وہ ایک اچھا انسان ہے (اور اس میں کوئی خامی نہیں ہے) خواہ مادی لحاظ سے ہو یا معنوی لحاظ سے، اور اس کا نظریہ کسی بے بنیاد خیال پر قائم ہو تو ایسا شخص حقیقت ایک برا آدمی ہے۔اکثر لوگ اپنے آپ کو اچھا آدمی سمجھتے ہیں، حالانکہ وہ غلط فہمی میں مبتلا ہوتے ہیں۔لہٰذا وہ برے لوگ شمار ہوں گے، اگرچہ اُن کی شکل اور شدت مختلف ہو''۔(293:6)

تفسیر نمونہ میں اس لفظ کے معنی اس طرح بیان کئے گئے ہیں کہ غرور اسم مبالغہ ہے جس کے معنی ہیں بہت زیادہ دھوکا دینے والا۔شیطان کو اس لئے مغرور کہا جاتا ہے کہ وہ اپنے وسوسوں کی مدد سے انسان کو دھوکا دیتا ہے اور غفلت میں مبتلا کر دیتا ہے۔درحقیقت شیطان غرور کا ایک مصداق ہے ورنہ ہر وہ انسان، کتاب، مقام و مرتبہ، وسوسہ یا کوئی بھی چیز، جو انسان کو گمراہ کرے، غرور کے وسیع مفہوم میں داخل ہے۔

غرور قرآن مجید کی روشنی میں

اگرچہ قرآن مجید میں یہ لفظ متعدد مقامات پر استعمال ہوا ہے لیکن بعض آیات میں اگرچہ یہ لفظ استعمال نہیں ہوا لیکن اس لفظ کا مفہوم مکمل طور پر ان آیات میں بیان ہوا ہے۔ مندرجہ ذیل آیات میں غور کریں:

1۔ "قَالَ مَا مَنَعَكَ اَلَّا تَسْجُدَ اِذْ اَمَرْتُكَ ؕ قَالَ اَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ ۚ خَلَقْتَنِيْ مِنْ نَّارٍ وَّخَلَقْتَهٗ مِنْ طِيْنٍ ○"

"شیطان نے کہا: میں اس سے بہتر ہوں، تو نے مجھے آگ سے پیدا کیا اور اسے مٹی سے پیدا کیا" (اعراف:12)

2۔ "فَقَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ مَا نَرٰىكَ اِلَّا بَشَرًا مِّثْلَنَا وَمَا نَرٰىكَ اتَّبَعَكَ اِلَّا الَّذِيْنَ هُمْ اَرَاذِلُنَا بَادِيَ الرَّاْيِ ۚ وَمَا نَرٰى لَكُمْ عَلَيْنَا مِنْ فَضْلٍ بَلْ نَظُنُّكُمْ كٰذِبِيْنَ ﴿۲۷﴾ قَالَ يٰقَوْمِ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كُنْتُ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّيْ وَاٰتٰنِيْ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِهٖ فَعُمِّيَتْ عَلَيْكُمْ ؕ اَنُلْزِمُكُمُوْهَا وَاَنْتُمْ لَهَا كٰرِهُوْنَ ○ وَيٰقَوْمِ لَاۤ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مَالًا ؕ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ وَمَاۤ اَنَا بِطَارِدِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ؕ اِنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ وَلٰكِنِّيْۤ اَرٰىكُمْ قَوْمًا تَجْهَلُوْنَ ○ وَيٰقَوْمِ مَنْ يَّنْصُرُنِيْ مِنَ اللّٰهِ اِنْ طَرَدْتُّهُمْ ؕ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ○ وَلَاۤ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِيْ خَزَآئِنُ اللّٰهِ وَلَاۤ اَعْلَمُ الْغَيْبَ وَلَاۤ اَقُوْلُ اِنِّيْ مَلَكٌ وَّلَاۤ اَقُوْلُ لِلَّذِيْنَ تَزْدَرِيْۤ اَعْيُنُكُمْ لَنْ يُّؤْتِيَهُمُ اللّٰهُ خَيْرًا ؕ اَللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا فِيْۤ اَنْفُسِهِمْ ۖ اِنِّيْۤ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِيْنَ ○ قَالُوْا يٰنُوْحُ قَدْ جٰدَلْتَنَا فَاَكْثَرْتَ جِدَالَنَا فَاْتِنَا بِمَا تَعِدُنَاۤ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ○"

"قوم نوحؑ کے کافر سرکردہ افراد نے کہا: ہم تمہیں اپنے جیسا بشر سمجھتے ہیں، جن لوگوں نے تمہاری پیروی کی ہے، وہ ہماری نظر میں پست اور سادہ لوح افراد ہیں اور ہم نہیں سمجھتے کہ تمہیں ہم پر کوئی برتری حاصل ہے۔ بلکہ ہم تو سمجھتے ہیں کہ تم جھوٹے ہو۔۔۔ اُنہوں نے مزید کہا: اے نوحؑ! تم نے ہم سے بہت بحث کر لی، جس عذاب سے تم ہمیں ڈراتے ہو، اُسے لے ہی آؤ، اگر تم سچے ہو"۔ (ھود: 27 تا 32)

3۔ "قَالُوْا يٰشُعَيْبُ مَا نَفْقَهُ كَثِيْرًا مِّمَّا تَقُوْلُ وَاِنَّا لَنَرٰىكَ فِيْنَا ضَعِيْفًا ۚ وَلَوْلَا رَهْطُكَ لَرَجَمْنٰكَ ۫ وَمَاۤ اَنْتَ عَلَيْنَا بِعَزِيْزٍ ○"

''انہوں نے کہا: اے شعیب! تمہاری اکثر باتیں ہماری سمجھ میں نہیں آتی ہیں اور ہم تمہیں اپنے درمیان کمزور پاتے ہیں، اگر تمہارا قبیلہ نہ ہوتا تو ہم تمہیں سنگسار کر دیتے اور ہمارے مقابلے میں تمہاری کوئی قوت نہیں ہے''۔(ھود:91)

4۔ ''وَنَادٰى فِرْعَوْنُ فِيْ قَوْمِهٖ قَالَ يٰقَوْمِ اَلَيْسَ لِيْ مُلْكُ مِصْرَ وَهٰذِهِ الْاَنْهٰرُ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِيْ ۚ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ۝ اَمْ اَنَا خَيْرٌ مِّنْ هٰذَا الَّذِيْ هُوَ مَهِيْنٌ ۙ وَّلَا يَكَادُ يُبِيْنُ ۝''

''فرعون نے اپنی قوم میں منادی کرائی اور کہا: اے میری قوم! کیا ملکِ مصر میرا نہیں؟ اور کہا یہ نہریں میرے حکم سے نہیں چل رہی ہیں؟ کیا تم دیکھتے نہیں کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ میں اس شخص سے بہتر ہوں جو ایک پسماندہ خاندان سے تعلق رکھتا ہے اور ٹھیک طرح سے بات بھی نہیں کرسکتا؟''(زخرف۔51۔52)

5۔ ''ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ ۠ وَغَرَّهُمْ فِيْ دِيْنِهِمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ۝''

''ان (یہود) کے اس طرزِ عمل کی وجہ یہ ہے کہ وہ کہتے تھے کہ ہم چند دن سے زیادہ جہنم میں نہیں رہیں گے۔ ان کی افترا پردازیوں نے ان کے دین کے معاملے میں ان کو فریب میں مبتلا کر دیا''۔(آلِ عمران:24)

6۔ ''فَعَقَرُوا النَّاقَةَ وَعَتَوْا عَنْ اَمْرِ رَبِّهِمْ وَقَالُوْا يٰصٰلِحُ ائْتِنَا بِمَا تَعِدُنَآ اِنْ كُنْتَ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ''

''انہوں نے اونٹنی کی کونچیں کاٹ ڈالیں اور اپنے رب کے حکم کی نافرمانی کی اور بولے: اے صالح! اگر تم واقعی رسول ہو تو لے آؤ وہ عذاب جس سے تم ہمیں ڈراتے رہتے ہو''۔(اعراف:77)

7۔ ''يُنَادُوْنَهُمْ اَلَمْ نَكُنْ مَّعَكُمْ ۭ قَالُوْا بَلٰى وَلٰكِنَّكُمْ فَتَنْتُمْ اَنْفُسَكُمْ وَتَرَبَّصْتُمْ وَارْتَبْتُمْ وَغَرَّتْكُمُ الْاَمَانِيُّ حَتّٰى جَاۗءَ اَمْرُ اللّٰهِ وَغَرَّكُمْ بِاللّٰهِ الْغَرُوْرُ ۝''

''وہ (جہنمی) ان (اہلِ جنت) سے کہیں گے: کیا ہم تمہارے ساتھ نہیں ہوتے تھے؟ وہ جواب دیں گے: ہاں۔ لیکن تم نے اپنے آپ کو ہلاک کر دیا۔ تم (رسول کی موت کے) منتظر رہتے تھے اور ہر چیز میں شک کرتے تھے اور تمہاری آرزوؤں نے تمہیں دھوکا دیا، یہاں تک کہ اللہ کا حکم آ گیا اور شیطانِ فریب کار نے تمہیں اللہ کے بارے میں دھوکا دیا''۔(حدید:14)

8۔ ''هُمُ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ لَا تُنْفِقُوْا عَلٰي مَنْ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ حَتّٰى يَنْفَضُّوْا ۭ وَلِلّٰهِ خَزَاۗىِٕنُ

السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلٰكِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَا يَفْقَهُوْنَ○ يَقُوْلُوْنَ لَئِنْ رَّجَعْنَآ اِلَى الْمَدِيْنَةِ لَيُخْرِجَنَّ الْاَعَزُّ مِنْهَا الْاَذَلَّ ؕ وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ وَلٰكِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ○"

''یہ (منافق) وہی لوگ ہیں جو کہتے ہیں کہ جولوگ رسولؐ اللہ کے قریب ہیں، اُن کو زکوٰۃ نہ دوتا کہ وہ ان کے پاس سے پراگندہ ہوجائیں، حالانکہ آسمانوں اور زمین کے سارے خزانے اللہ کے ہیں لیکن منافق اس بات کو نہیں سمجھتے''۔(منافقون:7تا8)

9۔ "فَاَمَّا الْاِنْسَانُ اِذَا مَا ابْتَلٰىهُ رَبُّهٗ فَاَكْرَمَهٗ وَنَعَّمَهٗ ۙ فَيَقُوْلُ رَبِّيْٓ اَكْرَمَنِ○"

''جب انسان کا رب اُسے انعام واکرام کے ذریعے آزماتا ہے تو وہ کہتا ہے: میرے رب نے مجھے بڑی عزت بخشی''۔(فجر:15)

10۔ "اَمْ يَقُوْلُوْنَ نَحْنُ جَمِيْعٌ مُّنْتَصِرٌ○ سَيُهْزَمُ الْجَمْعُ وَيُوَلُّوْنَ الدُّبُرَ○"

''کیا وہ یہ کہتے ہیں کہ ہم ایک غالب گروہ ہیں؟ یہ گروہ شکست سے دوچار ہوگا اور یہ پشت دِکھا کر بھاگیں گے''۔(القمر:44تا45)

11۔ "وَذَرِ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا دِيْنَهُمْ لَعِبًا وَّلَهْوًا وَّغَرَّتْهُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا"

''جن لوگوں نے اپنے دین کو بازیچہ بنالیا اور دُنیوی زندگی نے اُنہیں دھوکا دیا، اُنہیں اُن کے حال پر چھوڑ دو''۔(انعام:70)

12۔ "اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ فَلَا تَغُرَّنَّكُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا ۪ وَلَا يَغُرَّنَّكُمْ بِاللّٰهِ الْغَرُوْرُ○"

''اے لوگو! یقیناً اللہ کا وعدہ حق ہے، لہٰذا دُنیا کی زندگی کا دھوکا نہ کھانا اور ایسا نہ ہو کہ شیطان تمہیں اللہ کے بارے میں فریب دے جائے''۔(لقمان:33)

تفسیر اور نتیجہ:۔

جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے کہ غرور کی چنگاریاں سب سے پہلے انسان کی تخلیق کے موقع پر شیطان کے چہرے پر دیکھی گئیں اور جیسا کہ مذکورہ بالا آیات میں سے پہلی آیت میں ہے کہ جب اللہ نے اُس سے پوچھا کہ

''جب میں نے تجھے آدم کو سجدہ کرنے کا حکم دیا تو پھر کس چیز نے تجھے سجدہ کرنے سے روکا؟ اُس نے جواب دیا:

میں اس سے بہتر ہوں۔تو نے مجھے آگ سے پیدا کیا اور اسے مٹی سے پیدا کیا''۔

"قَالَ مَا مَنَعَكَ اَلَّا تَسْجُدَ اِذْ اَمَرْتُكَ ؕ قَالَ اَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ ۚ خَلَقْتَنِيْ مِنْ نَّارٍ وَّخَلَقْتَهٗ مِنْ طِيْنٍ○"(اعراف:12)

غرور اور خود پسندی کے حجاب نے اس کی بصیرت کو اس طرح ڈھانپ لیا کہ وہ اس بات کو بھی نہ جان سکا کہ اس کی سعادت اللہ کے حکم کی اطاعت میں ہے۔نتیجہ یہ ہوا کہ وہ مصیبت کے گڑھے میں اس طرح گر پڑا کہ ہمیشہ کیلئے مردود اور ملعون ہوگیا۔بنابرایں ہم یہ بات کہہ سکتے ہیں کہ جس طرح دُنیا پھر کے متکبرین ومستکبرین کا گرو ابلیس ہے،اسی طرح وہ دُنیا بھر کے مغروروں کا بھی گرو ہے، اس لئے کہ استکبار اور غرور لازم وملزوم ہیں۔

غرور کی وجہ سے ابلیس یہ نہ جان سکا کہ خاک آگ سے برتر اور توبہ،اصرار بر گناہ سے افضل ہے۔لہٰذا اُس نے گمراہی کی پگڈنڈی پر قدم رکھا اور اب تک اسی گمراہی میں سرگرداں ہے۔

دُوسری آیت میں پہلے اُولوالعزم نبی حضرت نوح علیہ السلام کا واقعہ مذکور ہوا ہے جو اس بات کی بخوبی نشاندہی کرتا ہے کہ اُن کی قوم کی گمراہی اور سرکشی کی بنیادی وجہ اُن کا غرور تھا۔اس آیت میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

''اس کی قوم کے سرکردہ کافروں نے کہا:تم تو ہم جیسے انسان ہو،جن لوگوں نے تمہاری پیروی کی ہے، وہ بھی معاشرے کے پست اور سادہ لوح افراد ہیں۔ہمیں تو نظر نہیں آتا کہ تمہیں ہم پر کوئی برتری حاصل ہے بلکہ تم لوگ تو جھوٹے معلوم ہوتے ہو''۔

"فَقَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ مَا نَرٰىكَ اِلَّا بَشَرًا مِّثْلَنَا وَمَا نَرٰىكَ اتَّبَعَكَ اِلَّا الَّذِيْنَ هُمْ اَرَاذِلُنَا بَادِيَ الرَّاْيِ ۚ وَمَا نَرٰى لَكُمْ عَلَيْنَا مِنْ فَضْلٍ بَلْ نَظُنُّكُمْ كٰذِبِيْنَ○"(ھود:27)

چند آیات کے بعد مزید نخوت وتکبر کا مظاہرہ کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں:

''اے نوحؑ!تم نے ہم سے بہت بحث کر لی،اگر تم سچے ہو تو جس عذاب سے تم ہمیں ڈراتے ہو،اُسے لے آؤ''۔

قَالُوْا يٰنُوْحُ قَدْ جٰدَلْتَنَا فَاَكْثَرْتَ جِدَالَنَا فَاْتِنَا بِمَا تَعِدُنَآ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ○(ھود:32)

عام طور پر ایسا ہوتا ہے کہ از رُوئے عقل انسان امکانی خطرے اور ضرر سے بچنے کی کوشش کرتا ہے۔لیکن اس مغرور قوم کی حالت یہ ہو چکی تھی کہ حضرت نوحؑ کے معجزات میں اُن کی حقانیت کے آثار دیکھ چکے تھے۔اللہ کی طرف سے عذاب کا امکان بھی بہت قوی تھا،اس کے باوجود نہ صرف بے رُخی اور بے اعتنائی کر رہے تھے بلکہ حضرت نوحؑ کو چیلنج دے رہے تھے کہ اگر سچے

ہوتو عذاب لا کر دِکھاؤ۔

جوغرور شیطان کیلئے حجاب بن گیا تھا،قومِ نوحؑ کیلئے بھی حجاب بن گیااور آخرکار وہ عذابِ خدا میں گرفتار ہو گئے اوران کا نام ونشان مٹ گیا۔تاریخ کے ہر دَور میں مغرور افراد واقوام کا یہی انجام ہوا۔

تیسری آیت میں حضرت شعیبؑ کی قوم کا ذکر ہے۔یہ قوم حضرت نوحؑ کی قوم کے بعد آئی اور اپنے غرور وخود بینی کی وجہ سے یہ قوم بھی قومِ نوحؑ کے انجام سے دوچار ہوگئی۔قرآن شریف فرماتا ہے۔

''انہوں نے شعیبؑ سے کہا کہ تمہاری زیادہ تر باتیں ہماری سمجھ میں نہیں آتی ہیں،تم ہمارے درمیان کمزور ہو ۔تمہارے قبیلے کا لحاظ نہ ہوتا تو ہم تمہیں سنگسار کر چکے ہوتے۔ہمارے سامنے تمہاری کوئی طاقت نہیں ہے''۔

"قَالُوْا يٰشُعَيْبُ مَا نَفْقَهُ كَثِيْرًا مِّمَّا تَقُوْلُ وَاِنَّا لَنَرٰىكَ فِيْنَا ضَعِيْفًا ۚ وَلَوْلَا رَهْطُكَ لَرَجَمْنٰكَ ۡ وَمَآ اَنْتَ عَلَيْنَا بِعَزِيْزٍ ○"(ھود:91)

حقیقت یہ ہے کہ حضرت شعیبؑ کے منطقی دلائل اور معجزات الٰہی کا ان کے پاس کوئی جواب نہ تھا لیکن ان کا غرور انہیں حق کو تسلیم کرنے کی اجازت بھی نہیں دیتا تھا۔آخرکار ایک آسمانی کڑک نے پلک جھپکنے کی دیر میں ان کو جلا کر راکھ کر دیا۔

چوتھی آیت فرعون کے بارے میں ہے اور اس میں بھی اسی صفتِ رذیلہ کا ایک کریہہ منظر پیش کیا گیا ہے۔فرعون کے غرور اور نخوت نے اس دماغ میں اس قدر ہوا بھر دی تھی کہ وہ نہ صرف یہ کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے واضح دلائل سے بے اعتنائی کر رہا تھا بلکہ بچگانہ باتوں سے اپنی سرکشی کی تاویلیں کر رہا تھا۔قرآن مجید کہتا ہے:

''فرعون نے اپنی قوم کے درمیان منادی کرائی اور کہا: کیا میں ملکِ مصر کا مالک نہیں ہوں؟ کیا یہ نہریں میرے حکم سے جاری نہیں ہیں؟ کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ میں اس شخص سے بہت برتر ہوں جو ایک پست معاشرتی حیثیت رکھتا ہے اور صحیح طرح سے بات بھی نہیں کر سکتا؟''

"وَنَادٰى فِرْعَوْنُ فِيْ قَوْمِهٖ قَالَ يٰقَوْمِ اَلَيْسَ لِيْ مُلْكُ مِصْرَ وَهٰذِهِ الْاَنْهٰرُ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِيْ ۚ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ۝
اَمْ اَنَا خَيْرٌ مِّنْ هٰذَا الَّذِيْ هُوَ مَهِيْنٌ ۙ وَّلَا يَكَادُ يُبِيْنُ ○"(زخرف:51تا52)

اپنے بیہودہ طرزِ استدلال کو آگے بڑھاتے ہوئے وہ کہتا ہے کہ اگر موسیٰ علیہ السلام اپنے دعویٰ میں سچا ہے تو اس کے ہاتھ میں سونے کے کنگن کیوں نہیں ہیں؟اس کے ساتھ فرشتے کیوں نہیں آئے؟

فرعون اور نمرود جیسے افراد اپنی نخوت اور اپنے غرور کی وجہ سے اپنی باتوں کے بیہودہ پن پر بھی توجہ نہیں دیتے تھے۔وہ ایسی احمقانہ باتیں کرتے ہیں کہ ان کے قریبی عزیز اور ساتھی بھی دل میں اُن پر ہنستے ہیں۔ظاہری بات ہے کہ یہ حالت معارفِ الٰہیہ اور

حقائق کی شناخت کی راہ میں بہت بڑی رُکاوٹ ہوتی ہے۔

یہ نکتہ بھی قابلِ ذکر ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زبان کی لکنت ان کے بچپن میں تھی۔ مبعوث ہونے کے بعد اللہ نے ان کی زبان کی لکنت دُور کردی تھی لیکن فرعون موجودہ صورت حال کی طرف توجہ کرنے کی بجائے ماضی کی بات پر بضد رہا اور ان کی زبان کی لکنت کا طعنہ دیتا رہا۔

پانچویں آیت میں یہودیوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ قوم بھی اپنے غرور کی وجہ سے اپنے آپ کو غیر منطقی اور غیر معقول امتیازی حیثیت کا مالک سمجھتی تھی۔ ان کا یہی طرزِ فکر ان کی گمراہی وسرکشی کا بنیادی سبب تھا۔ اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں فرماتا ہے:

''آیاتِ الٰہی سے یہودیوں کی رُوگردانی کی) وجہ یہ ہے کہ وہ کہتے تھے کہ ہم چند دن سے زیادہ دوزخ میں نہیں رہیں گے (چونکہ ہم ایک برتر قوم ہیں، ہمارے سنگین جرائم کے باجود ہمیں کم سزا ملے گی) ان کا یہی افترا تھا جس نے دین کے معاملہ میں انہیں مغرور بنادیا تھا''۔

"ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ ۖ وَغَرَّهُمْ فِيْ دِيْنِهِمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ"(آلِ عمران:24)

بنی اسرائیل کی تاریخ گواہ ہے کہ وہ گناہگار ترین اور سرکش ترین قوم تھی جس کی ایک بڑی وجہ اُن کا غرور تھا۔ بدقسمتی سے اب یہودیوں کا ایک گروہ جو صیہونی کہلاتا ہے، ایسے غرور کے نشے میں مست ہے۔ یہ لوگ ہر روز نت نئے جرائم کا ارتکاب کرتے ہیں اور اپنی تاریخ کے صفحات میں مزید سیاہ ابواب کا اضافہ کرتے چلے جاتے ہیں۔ وہ ہر چیز کو اپنا حق سمجھتے ہیں اور دُوسروں کیلئے کسی قسم کے حق کے قائل نہیں ہیں۔ وہ اپنے آپ کو برتر قوم اور دُوسروں کو حقیر سمجھتے ہیں۔

چھٹی آیت حضرت صالح علیہ السلام کی قوم کے بارے میں ہے۔ وہ بھی غرور کے نشے میں مست تھے کہ اپنے رسول سے کہتے تھے کہ اگر تم سچے ہو تو عذاب لاکر دِکھاؤ۔ انہوں نے اپنی آنکھوں سے معجزہ دیکھا مگر اس کی مخالفت پر اس قدر جری ہوگئے کہ قرآن مجید فرماتا ہے:

''انہوں نے (معجزہ کے طور پر پہاڑ سے برآمد ہونے والی) اُونٹنی کی کونچیں کاٹ ڈالیں اور اپنے رب کے حکم کے خلاف سرکشی کی اور کہنے لگے: اے صالح! اگر تم رسول ہو تو لاؤ وہ عذاب جس سے تم ہمیں ڈراتے رہتے ہو''۔

"فَعَقَرُوا النَّاقَةَ وَعَتَوْا عَنْ اَمْرِ رَبِّهِمْ وَقَالُوْا يٰصٰلِحُ ائْتِنَا بِمَا تَعِدُنَآ اِنْ كُنْتَ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ○"(اعراف:77)

اس کے بعد قرآن مجید فرماتا ہے کہ ایک وحشت ناک زلزلے نے اُنہیں آن پکڑا اور وہ اپنے گھروں میں بے جان جسم بن کر رہ گئے۔ اس طرح ایک مغرور اور اللہ سے غافل قوم اپنے منطقی انجام سے دوچار ہوگئی۔

ساتویں آیت اہلِ جہنم کے بارے میں ہے جو میدانِ محشر میں تاریکیوں میں ہوں گے جبکہ اہلِ ایمان اپنے ایمان کی روشنی میں تیزی سے آگے بڑھ رہے ہوں گے۔ ایسے میں یہ منافق اہلِ جہنم اُن سے کہیں گے: کیا ہم تمہارے ساتھ نہیں ہوتے تھے؟ وہ جواب دیں گے: ہاں! لیکن تم نے اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈال دیا۔ تم (رسول کی موت کے) منتظر تھے، تم ہر چیز میں شک کرتے تھے، تمہاری آرزوؤں نے تمہیں دھوکا دیا، یہاں تک کہ اللہ کا حکم آ گیا اور شیطان نے تمہیں اللہ کے بارے میں فریب میں مبتلا کر دیا۔

"يُنَادُوْنَهُمْ اَلَمْ نَكُنْ مَّعَكُمْ ؕ قَالُوْا بَلٰى وَلٰكِنَّكُمْ فَتَنْتُمْ اَنْفُسَكُمْ وَتَرَبَّصْتُمْ وَارْتَبْتُمْ وَغَرَّتْكُمُ الْاَمَانِيُّ حَتّٰى جَآءَ اَمْرُ اللّٰهِ وَغَرَّكُمْ بِاللّٰهِ الْغَرُوْرُ○"(الحدید:14)۔

اگلی آیت میں واضح طور پر کہا گیا: کہ ان سے کہا جائے گا کہ آج تمہارے پاس کوئی جائے فرار نہیں ہے اور تمہارا ٹھکانہ جہنم ہے"۔

اس آیت میں یہ بات بخوبی واضح ہوجاتی ہے۔ ان منافق دوزخیوں کی نمایاں خصوصیات میں سے ایک یہ ہے کہ وہ غرور میں مبتلا اور طویل آرزوؤں میں جکڑے ہوئے تھے۔

آٹھویں آیت میں دُنیا میں اہلِ ایمان کے بارے میں منافقین کے غرور کی تصویر پیش کر رہی ہے۔ یہ اپنی دولت کی وجہ سے نادار مومنین کی تحقیر کرتے تھے۔ قرآن شریف فرماتا ہے:

"یہ وہ لوگ ہیں جو کہتے ہیں کہ ان لوگوں کو زکوٰۃ نہ دو جو رسول اللہ ﷺ کے پاس ہیں تاکہ وہ ان کے پاس سے بکھر جائیں، حالانکہ آسمانوں اور زمین کے خزانے اللہ کے ہیں مگر منافق یہ بات نہیں سمجھتے"۔

"هُمُ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ لَا تُنْفِقُوْا عَلٰى مَنْ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ حَتّٰى يَنْفَضُّوْا ؕ وَلِلّٰهِ خَزَآئِنُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلٰكِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَا يَفْقَهُوْنَ○"(منافقون:7)

اس کے بعد وہ اپنے غرور اور نخوت میں مزید آگے بڑھ کر یہ کہتے ہیں کہ جب ہم جنگ سے مدینہ واپس جائیں گے تو معززین، ذلیلوں کو وہاں سے باہر نکال دیں گے، حالانکہ عزت تو ہے ہی اللہ کیلئے اور اُس کے رسول اللہ ﷺ کیلئے لیکن منافق یہ بات نہیں جانتے۔

"يَقُوْلُوْنَ لَئِنْ رَّجَعْنَاۤ اِلَى الْمَدِيْنَةِ لَيُخْرِجَنَّ الْاَعَزُّ مِنْهَا الْاَذَلَّ ؕ وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ وَلٰكِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ○"(منافقون:8)

اگر یہ منافق مغرور نہ ہوتے تو اس طرح اپنی عزت اور دولت کے بل بوتے پر مومنین کو حقیر نہ سمجھتے اور کفر و نفاق کی وادیوں میں نہ بھٹکتے پھرتے۔

نویں آیت میں انسان، یا بالفاظِ دیگر غیر تربیت یافتہ انسانوں کی کم ظرفی اور پستی کا ذکر کیا گیا ہے جو نعمت اور عزت پر مغرور

ہوتے ہیں اور سرکشی کرتے ہیں۔اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

''جب اللہ انسان کو انعام واکرام سے آزماتا ہے تو وہ (مغرور ہو کر) کہتا ہے: اللہ نے مجھے عزت بخشی''۔(فجر:15)

"فَاَمَّا الْاِنْسَانُ اِذَا مَا ابْتَلٰىهُ رَبُّهٗ فَاَكْرَمَهٗ وَنَعَّمَهٗ ۙ فَيَقُوْلُ رَبِّيْٓ اَكْرَمَنِ○"

اگر انسان یہ بات شکر گزاروں کے طور پر کہے تو اُس کی طبیعت میں تواضع پیدا ہوجائے۔وہ یتیموں اور ناداروں کی مدد کرے لیکن اگلی آیات کے لہجے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا یہ کہنا غرور اور نخوت کی وجہ ہے،اسی لیے تو نہ صرف یہ کہ اس کا مثبت اور مطلوبہ اثر ظاہر نہیں ہوتا بلکہ سرکشی اور طغیان گری کا سبب بنتا ہے۔

دسویں آیت میں مکہ کے خود پرست وخود پسند مشرکین کا ذکر ہے۔اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

''وہ کہتے ہیں کہ ہم ایک متحد اور غالب گروہ ہیں''۔

"اَمْ يَقُوْلُوْنَ نَحْنُ جَمِيْعٌ مُّنْتَصِرٌ○"(قمر:44)

اللہ ان مغرور اور سبک سر لوگوں کو خبردار کرتے ہوئے کہتا ہے:

''جلد ہی یہ گروہ شکست کھائے گا اور پشتِ دِکھا کر بھاگ جائے گا''۔

"سَيُهْزَمُ الْجَمْعُ وَيُوَلُّوْنَ الدُّبُرَ○"(قمر:45)

ان تمام مثالوں میں ہم دیکھتے ہیں کہ غرور اور خود بینی، بدبختی اور ناکامی کا ایک اہم سبب ہے۔قرآن ایک معجزانہ پیشین گوئی کرتے ہوئے فرماتا ہے کہ جلد ہی یہ مغرور گروہ شکست اور ذِلت سے دوچار ہونے والا ہے۔

گیارہویں آیت میں مشرکین کا ذکر ہے جنہوں نے دین کو اور اللہ کے بنائے ہوئے زندگی کے نظامِ برحق کو بازیچہ بنالیا، جنہیں دنیوی مال ودولت نے مغرور کردیا اور یہی چیز اُن کے کفر وعناد کا سبب بنی۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:''جن لوگوں نے اپنے (فطری) دین کو لہو ولعب بنالیا اور دُنیا کی زندگی نے انہیں فریب میں مبتلا کردیا،انہیں اُن کے حال پر چھوڑ دو''۔

"وَذَرِ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا دِيْنَهُمْ لَعِبًا وَّلَهْوًا وَّغَرَّتْهُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا"(انعام:70)

یہ آیت اس بات کی پختہ دلیل ہے کہ یہ لوگ ہدایت کے قابل نہیں ہیں،اس لئے کہ غرور نے انہیں اس قدر مست کردیا ہے اور مادی زندگی کی چکاچوند نے انہیں اس قدر فریب دیا ہے کہ وہ نہ صرف یہ کہ حق کے سامنے جھکنے کیلئے تیار نہیں ہیں بلکہ اس کا مذاق اُڑاتے ہیں۔اس سے ان کے اس المیے کی نشاندہی ہوتی ہے جس میں وہ اپنے غرور کی وجہ سے گرفتار ہوئے۔

اس آیت میں دِيْنَهُمْ کے الفاظ اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ اللہ کا دین فطری ہے جو سب انسانوں،حتیٰ کہ مشرکوں کی

سرشت میں بھی موجود ہے۔اس کے ایک معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ مال و دولت کے غرور نے ان کو اس حد تک پہنچا دیا ہے کہ اُنہوں نے اپنے دین یعنی بت پرستی کو بھی بازیچہ بنالیا اور اس کی بھی پابندی نہیں کرتے۔ یہ احتمال بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ دین سے مراد یہاں دینِ اسلام ہو جو اللہ تعالیٰ نے ان کی سعادت اور نجات کیلئے بھیجا۔

بارہویں آیت میں تمام انسانوں کو خبردار کیا جا رہا ہے کہ دُنیا کے زرق و برق کا دھوکا نہ کھائیں اور اس پر مغرور نہ ہوں اور شیطان کے دامِ فریب میں مبتلا نہ ہوں۔اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

''اے لوگو!۔۔۔۔۔۔۔اللہ کا وعدہ حق ہے۔خبردار! دُنیوی زندگی کا دھوکا نہ کھانا اور ایسا نہ ہو کہ شیطان تمہیں اللہ کے بارے میں دھوکا دے جائے''۔

"يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمْ وَاخْشَوْا يَوْمًا لَّا يَجْزِيْ وَالِدٌ عَنْ وَّلَدِهٖ ۡ وَلَا مَوْلُوْدٌ هُوَ جَازٍ عَنْ وَّالِدِهٖ شَيْـًٔا ۭ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ فَلَا تَغُرَّنَّكُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا ۪ وَلَا يَغُرَّنَّكُمْ بِاللّٰهِ الْغَرُوْرُ○"(لقمان:33)

یہاں یہ نکتہ قابل توجہ ہے کہ اس آیت میں دو چیزوں کو غرور اور فریب خوردگی کی وجہ بتایا گیا ہے۔ایک دُنیوی زندگی اور دُوسرا شیطان۔اس سے یہ بات بخوبی واضح ہوتی ہے کہ غرور و فریب میں مبتلا ہونے کیلئے ضروری نہیں ہے کہ انسان کے پاس پُرتعیش زندگی کے اسباب کی فراوانی ہو بلکہ ممکن ہے کہ انسان کے پاس کچھ بھی مال و زرِ دُنیا نہ ہو اور اس کے باوجود شیطان اُسے کچھ بے بنیاد خیالات کے ذریعے حقیقت کے بارے میں، خاص طور پر اللہ تعالیٰ کے بارے میں غرور میں مبتلا کر دے اور وہ حق کے مقابلے میں سرکشی پر اُتر آئے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ دُنیا کی رنگینی اور زرق و برق شیطان کا ایک خطرناک دام ہے لیکن بعض اوقات انسان کے بے اساس خیالات بھی شیطان کے اثر و رسوخ کی راہیں کھول دیتے ہیں اور انسان ان پر خوش اور مطمئن ہو جاتا ہے۔

نتیجہ:۔

مندرجہ بالا آیات اور ان کی تشریح و تفسیر سے یہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ غرور و نخوت ایک ایسا ناسور ہے جس نے آفرینشِ آدم سے لے کر آج تک تاریخ کے تمام ادوار میں انسان کی گمراہی اور کفر و نفاق میں اہم اور بنیادی کردار ادا کیا ہے۔ان آیات میں غور و فکر سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ یہ صفتِ رذیلہ لوگوں کی بھاری اکثریت کی گمراہی کا باعث بنتی رہی ہے۔اس صفتِ رذیلہ کی برائی کے اظہار کیلئے اور کوئی دلیل موجود نہ بھی ہو تو یہ آیات ہی اس حقیقت کو ثابت کرنے کیلئے کافی ہیں۔

غرور کی مذمت احادیث میں

اس بری خصلت کی مذمت احادیث میں بھی وسیع پیمانے پر پائی جاتی ہے۔

1. حضرت علی علیہ السلام ایک حدیث میں فرماتے ہیں:

"سُكْرُ الْغَفْلَةِ وَالْغُرُوْرِ اَبْعَدُ اِفَاقَةٍ مِنْ سُكْرِ الْخُمُوْرِ"۔

''غفلت کا نشہ شراب کے نشے سے بھی زیادہ طولانی ہوتا ہے''۔(غرر الحکم)

2۔ ایک اور حدیث میں آپؑ فرماتے ہیں:

"جِمَاعُ الشَّرِّ فِي الْاِغْتِرَارِ بِالْمَهَلِ وَالْاِتِّكَالِ عَلَى الْعَمَلِ"۔(غرر الحکم)

''تمام برائیوں کا مرکزِ اجتماع یہ ہے کہ انسان مہلت کا دھوکا کھا جائے اور اپنے عمل پر بھروسہ کرنے لگے''۔

انسان تھوڑا سا ناچیز عملِ خیر انجام دیتا ہے اور اس کی وجہ سے اپنی نجات کو یقینی سمجھ بیٹھتا ہے اور قید و شرطِ آزادی کو اپنا حق سمجھنے لگتا ہے، یا یہ کہ گناہوں کے باوجود اللہ کی عطا کردہ مہلت کی وجہ سے دھوکہ کھا جاتا ہے۔

3۔ ایک اور حدیث میں حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

"لَا يُلْقَى الْعَاقِلُ مَغْرُوْرًا"۔

''عاقل کبھی مغرور نظر نہیں آئے گا''۔(غرر الحکم)

4۔ آپؑ ہی سے منقول ایک اور حدیث میں ہے کہ غرور انسان کو خیالات کے ہجوم میں گرفتار کر دیتا ہے اور اس کی نجات کے راستے بند کر دیتا ہے۔

"مَنْ غَرَّهُ السَّرَابُ تَقَطَّعُ بِهِ الْاَسْبَابُ"۔

''جس شخص کو سراب دھوکا دے دے، اُس کی نجات کے اسباب منقطع ہو جاتے ہیں''۔(غرر الحکم)

5۔ ایک اور حدیث میں آپؑ فرماتے ہیں:

"زَرَعُوا الْفُجُوْرَ وَسَقَوْهُ الْغُرُوْرَ وَحَصَدُوا الثُّبُوْرَ"۔ (نہج البلاغہ: خطبہ 2)

''انہوں نے فجور کی فصل بوئی، غرور کے پانی سے اس کی آبیاری کی اور ہلاکت کی فصل کاٹی''۔

6۔ آپؑ ہی سے مروی ایک اور حدیث میں ہے:

بَيْنَكُمْ وَبَيْنَ الْمَوْعِظَةِ حِجَابٌ مِّنَ الْغِرَّةِ۔

''تمہارے اور نصیحت کے درمیان غرور کا حجاب ہے''۔(نہج البلاغہ،کلماتِ قصار:282)

اس حدیث سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ غرور انسان کو نصیحت سے ہمکنار نہیں ہونے دیتا۔

7۔ ایک اور مختصر مگر پُرمعنی حدیث میں حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

''طُوْبٰی لِمَنْ لَّمْ تَقْتُلْهُ قَاتِلَاتِ الْغُرُوْرِ''۔

''خوش نصیب ہے وہ شخص جو غرور کے قاتلانہ حملوں کے ہاتھوں قتل نہ ہوا''۔(غررالحکم:5973)

اگرچہ غرور کی مذمت میں احادیث کی تعداد بہت زیادہ ہے مگر اس کے نقصانات اور ہلاکت آفرینی کا اندازہ کرنے کیلئے یہ احادیث کافی ہیں۔

2۔غرور کے اسباب:۔

علم اخلاق کے بعض علماء کا کہنا ہے کہ غرور اُن صفات رذیلہ میں سے ہے جن میں ہر قسم کے لوگ کسی نہ کسی صورت میں مبتلا ہیں،اگرچہ اس کے اسباب اور درجات یکساں نہیں ہیں۔

غرور خود بینی کے اسباب بہت زیادہ ہیں اور مغروروں کی بھی کئی اقسام ہیں:

کچھ لوگ علم ودانش میں کسی مقام پر پہنچ کر غرور اور خود بینی کے شکار ہوجاتے ہیں۔انہیں اپنے افکار ونظریات کے سوا کچھ نظر نہیں آتا اور دُوسروں کے افکار ونظریات کو وہ کوئی اہمیت دینے کیلئے تیار نہیں ہوتے۔کبھی تو وہ اپنے آپ کو مقربانِ الٰہی اور اہلِ نجات میں سے سمجھنا شروع کردیتے ہیں۔کوئی ان کے افکار پر ذرا سی تنقید کردے تو ناراض ہوجاتے ہیں اور یہ توقع رکھتے ہیں کہ سب ان کا احترام کریں اور ان کی باتوں کو بلا چون وچرا قبول کریں۔

بعض اوقات بعض کم ظرف افراد چند ایک کتابیں پڑھ کر اس طرح غرور وخود پسندی کے گدھے پر سوار ہوجاتے ہیں کہ وہ سمجھنے لگتے ہیں کہ ہر مسئلے کی چابی ان کے ہاتھ آگئی ہے،اسلئے کہ انہوں نے صرفِ میر پڑھی ہوئی ہے۔

یہ غرور کی بدترین صورت ہے جو کسی عالم کی علمی شخصیت کو بھی تباہ کردیتی ہے اور معاشرے میں اُس کی عزت کو بھی برباد کردیتی ہے۔

ایک حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

''يَابْنَ مَسعُوْد! لَا تَغْتَرَّنَّ بِاللّٰهِ وَلَا تَغْتَرَّنَّ بِصَلَاحِكَ وَعِلْمِكَ وَعَمَلِكَ وَبِرِّكَ وَعِبَادَتِكَ''۔

''اے ابنِ مسعود! اللہ کے (کرم) کے بارے میں مغرور نہ ہو،اپنے صالح ہونے پر،اپنے علم،عمل،نیکی اور عبادت پر مغرور نہ ہو''۔(مکارم الاخلاق،2:350)

اس حدیث میں اعمالِ صالح، اللہ کی راہ میں انفاق اور عبادات کو بھی غرور کے امکانی اسباب میں شمار کیا گیا ہے۔

معاشرے میں ایسے کم ظرف افراد بھی دیکھنے میں آتے ہیں جو چند عبادات یا نیک اعمال کو انجام دینے کی وجہ سے اس طرح غرور اور خود پسندی میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ وہ اپنے آپ کو اہلِ سعادت ونجات اور دُوسروں کو ذلیل وحقیر سمجھنے لگ جاتے ہیں اور یہی چیز ان کی ہلاکت کا سبب بن جاتی ہے۔

غرور کا ایک اور سبب یہ ہے کہ انسان اللہ کے لطف وکرم اور مغفرت پر مغرور ہو جائے۔ بہت سے ایسے افراد موجود ہیں جو بے دھڑک گناہ کرتے ہیں اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ ایسا کیوں کرتے ہو تو جواب دیتے ہیں کہ اللہ بڑا غفور ورحیم ہے، وہ اس سے بالاتر ہے کہ ہم جیسے چھوٹے چھوٹے بندوں کے گناہوں کا حساب رکھے اور پھر انہیں سزا دے۔ اگر ہم گناہ نہ کریں تو اللہ کے عفو وکرم کس کام آئیں گے؟

اس قسم کی گمراہی پر مبنی اور غیر منطقی باتیں نہیں گناہ کرنے میں جری بنا دیتی ہیں جس کا نتیجہ ان کی ہلاکت اور بربادی کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔

انسان کے اس قسم کے رویوں کے پیشِ نظر اللہ تعالیٰ انسان کو سرزنش کرتے ہوئے یہ سوال کرتا ہے:

يَاأَيُّهَا الْإِنْسَانُ مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِيمِ ۝

''اے انسان! کس چیز نے تجھے تیرے ربِ کریم کے بارے میں فریب وغرور میں مبتلا کر دیا ہے؟''

اس آیت کی تفسیر میں امیر المومنین حضرت علیؑ فرماتے ہیں:

"يَاأَيُّهَا الْإِنْسَانُ مَا جَرَّأَكَ عَلَى ذَنْبِكَ؟ وَمَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ؟ وَمَا أَنَّكَ بِهَلَكَةِ نَفْسِكَ؟"(نہج البلاغہ، خطبہ:223)

''اے انسان! کس چیز نے گناہ میں تیری جرأت میں اضافہ کر دیا ہے؟ کس چیز نے تجھے تیرے رب کے بارے میں دھوکا دیا ہے اور کس چیز نے تجھے اپنی ہلاکت کا مشتاق بنا دیا ہے؟''

جو شخص گناہ کر کے اس پر اتراتا ہے، اور جو شخص گناہ کر کے شرمندہ وپشیمان ہوتا ہے، ان دونوں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ پہلا غرور کی سواری پر سوار ہے جبکہ دوسرا اللہ کے لطف وکرم کا اُمیدوار ہے۔

جہل اور نادانی بھی غرور کے اسباب میں سے ایک اہم سبب ہے۔ جس طرح بعض اوقات علم غرور کا سبب بن جاتا ہے، اسی طرح بعض اوقات جہلا کا جہل بھی ان کیلئے باعثِ غرور ہو جاتا ہے۔ ایک حدیث میں حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

"مَنْ جَهِلَ اَغَرَّ بِنَفْسِهٖ وَكَانَ يَوْمُهٗ شَرًّا مِنْ اَمْسِهٖ"۔

''جو جاہل ہوتا ہے، اپنے بارے میں مغرور ہو جاتا ہے اور اس کا ہر روز گزرے ہوئے دن سے بدتر

ہوتا ہے"۔(غرر الحکم:8744)

اسی طرح دُنیوی مقام ومرتبہ، مال ودولت، جوانی اور حسن وجمال بھی غرور کا سبب بن جاتے ہیں۔

کم ظرف افراد کو جب ان نعمتوں میں سے کوئی نعمت ملتی ہے تو وہ آپے سے باہر ہوجاتے ہیں اور ہر بات بھول جاتے ہیں کہ یہ سب عارضی اور ناپائیدار چیزیں ہیں جو جلد ہی زوال پذیر ہوجائیں گی۔ یہ غفلت اور فراموشی، خود بینی اور غرور کا سبب بن جاتی ہے جس کے نتیجہ میں وہ خدا سے دُور اور شیطان کے قریب ہوجاتے ہیں اور انواع واقسام کے گناہوں کے مرتکب ہونے لگتے ہیں۔

امیر المومنین علیہ السلام فرماتے ہیں:

"اَلدُّنْیَا حُلُمٌ وَالْاِغْتِرَارُ بِهَا نَدَمٌ"۔

"دنیا ایک بے حقیقت خواب ہے اور اس کا دھوکا کھانا موجبِ ندامت ہے"۔(غرر الحکم:1384)

ایک اور حدیث میں آپؑ فرماتے ہیں:

"لَاتَغُرَّنَّكَ الْعَاجِلَةُ بِزُوْرِ الْمَلَاهِیْ، فَاِنَّ اللَّهْوَ یَنْقَطِعُ، وَیُلْزِمَكَ مَا اکْتَسَبْتَ مِنَ الْمَاْثِمِ"۔

"خبردار! دُنیا کے لہو ولعب کا دھوکا نہ کھانا، اس لئے کہ لہو ولعب ختم ہوجاتے ہیں اور ان کا گناہ تمہاری گردن پر رہ جاتا ہے"۔(غرر الحکم:10363)

حیرت انگیز بات یہ ہے کہ لوگ مال ودولت اور حکومت واقتدار کے زوال کو اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں لیکن جب یہ چیزیں ان کے ہاتھ میں آتی ہیں تو ان کی آنکھوں پر پٹی بندھ جاتی ہے اور وہ سمجھنے لگتے ہیں کہ ان نعمتوں کو کبھی زوال نہیں آئے گا۔

غرور کے اسباب بہت زیادہ ہیں اور مختلف اقسام کے ہیں۔ ان سے نجات کا راستہ صرف یہ ہے کہ انسان تقویٰ اختیار کرے، اپنے آپ کو اللہ کے سپرد کردے اور اس حقیقت کی طرف توجہ رکھے کہ وہ تمام نعمتیں جو غرور وخود پسندی میں مبتلا کردیتی ہیں، وہ جلد ہی فنا ہوجانے والی ہیں۔

3۔غرور کی نشانیاں:۔

غرور کی نشانیاں اور علامات بہت زیادہ ہیں جن کو دیکھتے ہی یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ جس شخص میں یہ علامات موجود ہیں، وہ غرور میں مبتلا ہے۔ لوگوں سے بے رُخی برتنا، حلال وحرام کی طرف توجہ نہ کرنا، بڑوں کی عزت واحترام کو مدنظر نہ رکھنا، دوستوں اور عزیزوں سے محبت کو ترک کرنا، غفلت میں اَٹے ہوئے قہقہے لگانا، صالحین اور نیکوکاروں کو حقارت کی نظر سے دیکھنا، اکڑ کر چلنا، چلتے ہوئے پاؤں کو زمین پر مارنا، شانے لہرا لہرا کر چلنا اور اس طرح کی دیگر علامات جو انسان کی چال ڈھال سے ظاہر ہوتی ہیں، یہ سب

غرور اور خود پسندی کی علامات ہیں۔

بعض اوقات غرور پوشیدہ حالت میں ہوتا ہے اور آسانی سے نظر نہیں آتا۔ البتہ اگر اس کی علامات کی غور سے جستجو کی جائے تو وہ نظر آجاتا ہے، مثلاً بعض افراد کچھ عرصہ کسی اُستاد کے پاس درس حاصل کرتے ہیں اور پھر درس چھوڑ کر اپنے آپ کو اس سے بے نیاز سمجھنے لگتے ہیں، یا بعض اوقات بعض لوگ غیر معمولی حد تک مردم بیزار ہو جاتے ہیں۔ ممکن ہے یہ افراد یہ بہانے کرتے ہوں کہ ہم غیبت اور گناہ سے آلودہ ہونے سے بچنے کیلئے لوگوں سے الگ تھلگ ہوتے ہیں لیکن اگر غور کیا جائے تو اس کا اصل عامل غرور اور احساسِ برتری ہوتا ہے کیونکہ یہ لوگ اپنے آپ کو پاک اور مومن جبکہ دُوسروں کو ناقص اور گناہگار سمجھتے ہیں۔

صرف غرور ہی نہیں بلکہ دیگر رذائلِ اخلاقی بھی بعض اوقات پوشیدہ حالت میں ہوتے ہیں اور بظاہر فضائل کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ صرف علم اخلاق کے ماہر اُستاد ہی ایسی صورت میں ان کا کھوج لگا سکتے ہیں۔

4۔ فرد اور معاشرے پر غرور کے اثرات:۔

صفاتِ رذیلہ میں سے شاید ہی کوئی ایسی صفت ہو جس کے اثرات غرور کے اثرات سے زیادہ نقصان دہ اور مہلک ہوں۔ غرور کے آثار و نتائج انسان کی ساری زندگی پر اثر انداز ہوتے ہیں اور اس کی دُنیا اور آخرت دونوں کو تباہ کر دیتے ہیں۔ غرور کے تباہ کن اثرات میں سے چند ایک کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے۔

1۔ غرور انسان کے عقل و فہم اور ایک ضخیم پردہ ڈال دیتا ہے جس کی وجہ سے وہ ادراکِ حقائق کی صلاحیت کو کھو دیتا ہے اور انسان حقائق کو ان کی اصل صورت میں نہیں دیکھ سکتا ہے۔ ایسا انسان معاشرتی واقعات کو بھی صحیح طور پر نہیں سمجھ سکتا اور نہ ہی ان کے بارے میں صحیح رویہ اپنا سکتا ہے۔

گزشتہ مبحث میں ہم امیر المومنین علیہ السلام کا یہ فرمان پڑھ چکے ہیں کہ غرور کا نشہ شراب کے نشے سے بھی زیادہ برا ہے۔ درحقیقت یہ نشہ ہی غرور کا حجاب ہے۔

2۔ غرور زندگی میں شکست اور پسماندگی کا سبب ہے۔ ایک مغرور فوج آسانی سے میدانِ جنگ میں شکست کھا جاتی ہے۔ مغرور سیاست دان بہت جلد سیاست کے میدان میں مار کھا جاتا ہے۔ مغرور طالب علم امتحان میں ناکام ہو جاتا ہے۔ مغرور کھلاڑی آسانی سے مقابلہ ہار جاتا ہے اور ایک مغرور مسلمان اللہ کے قہر و غضب میں گرفتار ہو جاتا ہے۔ احادیث میں ''قاتلات الغرور'' یعنی ''غرور کے قاتلانہ حملوں'' سے مراد شاید یہی ہو۔

3۔ غرور انسان کی راہ میں رکاوٹیں پیدا کر دیتا ہے بلکہ اس کے انحطاط اور زوال کی راہیں ہموار کر دیتا ہے، اس لئے کہ جب انسان مغرور ہوتا ہے تو اسے اپنے نقائص اور خامیاں نظر نہیں آتی ہیں۔ جو انسان اپنے نقص سے غافل ہو، وہ نقص کو دُور کرنے کی کوشش کیونکر کر سکتا ہے۔ لہذا ایسا شخص ہمیشہ اپنے نقائص کے ساتھ رہتا ہے اور سعادتِ کمال حاصل نہیں کر سکتا۔

ہم امیر المومنین علیہ السلام کا یہ فرمان پڑھ چکے ہیں کہ جو مغرور ہوتا ہے، وہ جاہل ہوا ہے اور اس کا آج اس کے گزرے ہوئے دن سے بدتر ہوتا ہے۔ اس حدیث میں درحقیقت اسی اہم نکتے کی طرف توجہ دلائی گئی۔

4۔ غرور انسان کے اعمال کی تباہی کا سبب بنتا ہے اسلئے کہ مغرور انسان اپنے اعمال کو احتیاط سے انجام نہیں دیتا جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کے کاموں کا خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہیں ہوتا۔ ممکن ہے ایک مغرور سرجن اپنے مریض کو موت کے منہ میں دھکیل دے یا اُسے ہمیشہ کیلئے اپاہج بنادے۔ ایک مغرور ڈرائیور تباہ کن ٹریفک حادثات کا شکار ہوسکتا ہے۔ اسی طرح ایک مغرور مسلمان اپنے اعمال کو ریا و خود پسندی سے آلودہ کر کے برباد کر دیتا ہے۔

اس بات کو امیر المومنین علیہ السلام نے اس طرح بیان فرمایا ہے:

"غَرُوْرُ الْاَمَلِ یُفْسِدُ الْعَمَلَ"۔

''آرزوؤں کے نتیجہ میں پیدا ہونے والا غرور عمل کو تباہ کر دیتا ہے''۔ (غرر الحکم: 6390)

5۔ غرور انسان کو مستقبل کے بارے میں بے فکر اور فکرِ عاقبت سے آزاد کر دیتا ہے۔ امیر المومنین علیہ السلام کا یہ ارشاد اسی حقیقت کو بیان کر رہا ہے:

"لَمْ یُفَکِّرْ فِیْ عَوَاقِبِ الْاُمُوْرِ مَنْ وَثِقَ بِزُوْرِ الْغُرُوْرِ"۔

''جو شخص غرور میں مبتلا ہوجائے، وہ انجام کار سے غافل ہوجاتا ہے''۔ (غرر الحکم: 7566)

6۔ غرور عام طور پر ندامت اور پشیمانی کا سبب ہوتا ہے، اس لئے کہ مغرور انسان اپنے اور دُوسروں کے بارے میں صحیح رائے قائم نہیں کرسکتا اور اپنے ذاتی اور معاشرتی معاملات میں غلطیوں کا مرتکب ہوتا ہے جس کی وجہ سے اُسے پشیمانی اور ندامت اُٹھانا پڑتی ہے۔ اس بات کو امیر المومنین علیہ السلام نے اس طرح بیان فرمایا ہے:

''دنیا ایک بے حقیقت خواب ہے جس پر مغرور ہونا پشیمانی کا موجب ہوتا ہے''۔ (غرر الحکم: 1384)

7۔ غرور کے نقصانات کو ایک جملے میں اس طرح بیان کیا جاسکتا ہے کہ مغرور انسان دُنیا اور آخرت دونوں میں محروم رہتا ہے۔

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

"اَلْمَغْرُوْرُ فِی الدُّنْیَا مِسْکِیْنٌ فِی الْآخِرَةِ مَغْبُوْنٌ لِاَنَّهُ بَاعَ الْاَفْضَلَ بِالْاَدْنٰی"۔

''مغرور انسان دُنیا میں مسکین اور آخرت میں گھاٹے میں ہوتا ہے، اس لئے کہ اس نے اعلیٰ جنس کم قیمت پر فروخت کردی ہوتی ہے''۔ (میزان الحکمہ، 3:2237)

5۔غرور کا علاج:۔

چونکہ عام طور پر غرور کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں اپنی قدر ومنزلت سے آگاہ نہیں ہوتا،لہٰذا اس بیماری کے علاج کا پہلا قدم اپنی ذات کے بارے میں آگہی ، اللہ کی معرفت اور دُوسرے انسانوں کی صلاحیتوں کے بارے میں آگاہی حاصل کرنا ہے۔

اگر انسان اپنے ماضی پر نظر ڈالے، جب وہ ایک کمزور سا نومولود بچہ تھا اور پھر اپنے مستقبل کے بارے میں غور کرے، جب وہ بوڑھا اور ناتواں ہوجائے گا، اگر وہ اپنے مال ودولت ، مقام ومرتبہ اور حسن وجمال کے عارضی اور فانی ہونے کے بارے میں غور کرے تو کبھی غرور کا شکار نہ ہو۔

انسان اپنے علم پر کیوں مغرور ہو جبکہ اُس کی حالت یہ ہے کہ اگر اُس کے دماغ پر کوئی چوٹ لگ جائے تو ہوسکتا ہے کہ وہ اپنے سارے علم ،حتیٰ کہ اپنے نام تک کو بھول جائے۔

انسان کو اپنے مال پر بھی غرور نہیں کرنا چاہئے کیونکہ بازار کے ایک معمولی اُتار چڑھاؤ سے، یا کسی اور حادثے کی وجہ سے نہ صرف یہ کہ اپنی ساری دولت سے محروم ہوسکتا ہے بلکہ ممکن ہے کہ بھاری قرض تلے بھی دب جائے

انسان کس طرح اپنے اقتدار پر مغرور ہوسکتا ہے، حالانکہ عین ممکن ہے کہ کل وہ محروم اقتدار ہوکر زندان کی سلاخوں کے پیچھے ہو۔

بہرحال جو چیز انسان کو غرور کے نشے سے نجات دے سکتی ہے، وہ یہ ہے کہ وہ اپنے بارے میں ،دُنیا کے حالات کے بارے میں، مادی نعمتوں کے زوال وفنا کے بارے میں خوب آگاہی حاصل کرے۔

قرآن مجید مغروروں کو دعوتِ فکر دیتا ہے:

"اَوَلَمۡ یَسِیۡرُوۡا فِی الۡاَرۡضِ فَیَنۡظُرُوۡا کَیۡفَ کَانَ عَاقِبَۃُ الَّذِیۡنَ مِنۡ قَبۡلِہِمۡ ؕ کَانُوۡۤا اَشَدَّ مِنۡہُمۡ قُوَّۃً وَّاَثَارُوا الۡاَرۡضَ وَعَمَرُوۡہَاۤ اَکۡثَرَ مِمَّا عَمَرُوۡہَا وَجَآءَتۡہُمۡ رُسُلُہُمۡ بِالۡبَیِّنٰتِ ؕ فَمَا کَانَ اللّٰہُ لِیَظۡلِمَہُمۡ وَلٰکِنۡ کَانُوۡۤا اَنۡفُسَہُمۡ یَظۡلِمُوۡنَ﴿۹﴾"

''کیا انہوں نے زمین میں سیر کرکے یہ نہیں دیکھا کہ ان سے پہلے لوگوں کا کیا انجام ہوا؟ حالانکہ وہ ان سے زیادہ طاقتور تھے، انہوں نے زمین میں خوب ہل چلائے اور اسے آباد کیا اور ان کے رسول روشن نشانیوں کے ساتھ ان کے پاس آئے ،(مگر انہوں نے کفر کی راہ اختیار کی)اللہ نے ان پر کوئی ظلم نہیں کیا، وہ خود ہی اپنے اوپر ظلم کرتے رہے''۔(روم:9)

اگر انسان اپنے جسم، رُوح اور وسائل کی طرف توجہ کرے اور یہ دیکھے یہ کہ سب کس قدر کمزور اور آسیب پذیر(

Vulnerable) ہیں اور یہ کہ کس طرح چھوٹے چھوٹے حوادث انسان کی زندگی کو درہم برہم کر دیتے ہیں تو وہ کبھی غرور کا شکار نہ ہو۔ امیر المومنین علیہ السلام فرماتے ہیں:

"مِسْكِيْنُ بْنُ آدَمَ مَكْتُوْمُ الْاَجَلِ، مَكْنُوْنُ الْعِلَلِ، مَحْفُوْظُ الْعَمَلِ، تُؤْلِمُهُ الْبَقَّلَةُ الشَّرِقَةُ وَتُنْتِنُهُ الْعَرْقَةُ"۔

''انسان کس قدر بیچارہ ہے، اس کی موت پوشیدہ ہے، اس کی بیماری کے اسباب مخفی ہیں، جو عمل کرتا ہے، وہ محفوظ کر لیا جاتا ہے، ایک مچھر اس کا آرام غارت کر دیتا ہے، ایک لقمہ گلے میں پھنس جائے تو ہلاک ہو جاتا ہے اور ذرا سا پسینہ اسے بدبودار کر دیتا ہے''۔ (نہج البلاغہ، کلماتِ قصار: 419)

سلطان محمود غزنوی کے مشہور وزیر ایاز کے بارے میں بیان کیا جاتا ہے کہ اس کا ایک مخصوص کمرہ تھا جہاں وہ ہر روز جا کر دروازہ بند کر لیتا تھا اور تھوڑی دیر کے بعد باہر آجایا کرتا تھا۔ لوگوں کو اس کے اس رویے پر حیرت ہوتی تھی کہ آخر اس کمرے میں کیا راز پوشیدہ ہے! تحقیق کے بعد معلوم ہوا کہ ایاز نے اپنی چوپانی کے دَور کا لباس اس کمرے میں رکھا ہوا تھا اور ہر روز وہاں جا کر اُسے دیکھتا اور اپنے آپ سے کہتا:

''اے ایاز! تو ایک گڈریا تھا۔ اللہ نے تجھے وزارت کے رُتبے پر پہنچا دیا ہے۔ تو مغرور نہ ہونا، اس بات سے ڈر کہ اگر یہ مقام و مرتبہ تجھ سے چھن گیا تو تو ماضی کی نسبت زیادہ کمزور ہو جائے گا۔''

اگر سارے اربابِ اقتدار اپنے لئے ایسے اسبابِ عبرت تیار رکھیں تو کبھی غرور میں مبتلا نہ ہوں لیکن افسوس کہ ہر کوئی ایاز نہیں ہو سکتا۔

ساتواں باب

طُولِ اَمل (لمبی آرزوئیں)

تمہید:۔

طولِ اَمل یعنی لمبی آرزوئیں اہم ترین اخلاقی رذائل میں سے ہے جو انسان کو انواع واقسام کے گناہوں میں مبتلا کر دیتی ہے۔ انسان کو اللہ سے دُور اور شیطان کے قریب کر دیتی ہے اور انسان کی آخرت کو تباہ کر دیتی ہے۔ البتہ ''آرزو'' اور اُمید'' بنیادی طور پر مذموم اور ناپسندیدہ نہیں ہیں بلکہ انسانی زندگی کو متحرک اور فعال رکھنے کیلئے ان کا وجود بہت ضروری ہے۔ اس کے بغیر مادی اور معنوی ترقی وپیشرفت ہرگز ممکن نہیں ہے۔

اگر ماں کے دل میں اُمید اور آرزو نہ ہو تو وہ کبھی بچے کو دودھ نہیں پلائے گی اور اس کی پرورش میں انواع واقسام کی سختیاں اور تکالیف برداشت نہیں کرے گی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک مشہور حدیث میں ہے:

"اَلْاَمَلُ رَحْمَةٌ لِاُمَّتِیْ وَلَوْلَاالْاَ مَلُ مَارَ ضِعَتْ وَالِدَةٌ وَلَدَهَا وَلَاغَرَسَ غَارِسٌ شَجَرَهَا"۔ (بحار الانوار، 173:74)

''اُمید اور آرزو میری اُمت کیلئے رحمت ہے۔ اگر اُمید اور آرزو نہ ہوتی تو کوئی ماں اپنے بچے کو دُودھ نہ پلاتی اور نہ ہی کوئی باغبان کوئی درخت کاشت کرتا''۔

اگر کسی کو یقین ہو جائے کہ آج اس کی زندگی کا آخری دن ہے، یا مستقبل قریب میں اس کی موت واقع ہو جائے گی تو وہ کسی کام کو ہاتھ نہیں لگائے اور اس کی زندگی کی گاڑی رُک جائے گی۔ شاید موت کے پنہاں ہونے میں بھی یہی حکمت ہو کہ انسان کے دل میں اُمید اور آرزو کا چراغ روشن رہے اور وہ زندگی کی گاڑی کو چلانے کی دوڑ دُھوپ کرتا رہے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کسی جگہ بیٹھے ہوئے تھے۔ انہوں نے ایک بوڑھے کو دیکھا جو بیلچے کی مدد سے زمین کھود رہا تھا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے دُعا کی کہ یا اللہ! اس کی اُمید کو چھین لے۔ اچانک اُس بوڑھے نے بیلچہ پھینکا اور زمین پر لیٹ کر سو گیا۔ تھوڑی دیر بعد حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے دُعا کی کہ یا اللہ! اس کی اُمید اسے واپس لوٹا دے۔ وہ بوڑھا اچانک اُٹھا، بیلچہ اُٹھایا اور کام میں مصروف ہو گیا۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام اس کے پاس گئے اور اس سے پوچھا کہ میں نے تمہیں دو مختلف حالتوں میں دیکھا۔ ایک بار تم نے

بیلچہ پھینکا اور لیٹ گئے، پھر تم اچانک اُٹھے اور بیلچہ لے کر کام میں مشغول ہو گئے۔ یہ کیا ماجرا تھا؟

بوڑھے نے جواب دیا کہ پہلے میرے ذہن میں خیال آیا کہ بوڑھا ہوں اور میرے پاؤں قبر میں لٹک رہے ہیں۔ مجھے کیا ضرورت ہے کہ اتنی زحمت اور تکلیف برداشت کروں! یہ سوچ کر میں نے بیلچہ پھنکا اور لیٹ گیا۔ لیکن تھوڑی دیر بعد میرے ذہن میں خیال آیا کہ ہوسکتا ہے کہ میں مزید چند سال زندہ رہوں، میرے جیسے کئی افراد تھے جو مزید کئی برس تک جیتے رہے، انسان جب تک زندہ ہوتا ہے، اسے عزت کی زندگی گزارنے کیلئے کچھ نہ کچھ کرتے رہنا چاہئے۔ یہ سوچ کر میں نے بیلچہ اُٹھایا اور پھر کام میں مصروف ہوگیا۔ (بحارالانوار، 329:14)

یہی وجہ ہے کہ زندگی میں ترقی اور پیشرفت کیلئے افراد واقوام کے دل میں اُمید کی کرن روشن رہنی چاہئے لیکن یہی اُمید، جو بارش کے حیات بخش قطروں کی مانند ہوتی ہے، اگر حد سے بڑھ جائے تو ایک ایسا تباہ کن سیلاب بن جاتی ہے جو انسان کو دُنیا پرستی اور ظلم وجرائم کی دلدل میں غرق کر دیتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ''طویل اَمل'' کو انسان کے دو خطرناک ترین دُشمنوں میں سے ایک قرار دیا ہے:

"خِصْلَتَانِ اِتِّبَاعُ الْهَوٰى وَطُوْلُ الْاَمَلِ، فَاَمَّا اتِّبَاعُ الْهَوٰى فَاِنَّهُ يَعْدِلُ عَنِ الْحَقِّ، اَمَّا طُوْلُ الْاَمَلِ فَاِنَّهُ يُحِبُّ الدُّنْيَا"۔ (المحجة البيضأ، 245:8)

''خوفناک ترین چیزیں جن سے تمہارے بارے میں ڈرتا ہوں، دو چیزیں ہیں: اتباعِ ہوا یعنی خواہشات کی پیروی اور طولِ اَمل یعنی لمبی آرزوئیں۔ خواہشات کی پیروی راہِ حق سے منحرف کر دیتی ہے اور لمبی آرزوئیں دُنیا کی محبت پیدا کر دیتی ہیں''۔

نہج البلاغہ، خطبہ 42 میں بھی اسی سے ملتی جلتی حدیث امیر المومنین علیہ السلام نے بیان فرمائی ہے۔

اس تمہید کے بعد ہم اس موضوع کے بارے میں قرآنی آیات کی روشنی میں غور وفکر کرتے ہیں۔

1۔ "وَاذْكُرُوْٓا اِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَآءَ مِنْۢ بَعْدِ عَادٍ وَّبَوَّاَكُمْ فِي الْاَرْضِ تَتَّخِذُوْنَ مِنْ سُهُوْلِهَا قُصُوْرًا وَّتَنْحِتُوْنَ الْجِبَالَ بُيُوْتًا ۚ فَاذْكُرُوْٓا اٰلَآءَ اللّٰهِ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ○"

''اور یاد کرو جب اللہ نے تمہیں قومِ عاد کا جانشین بنایا اور تمہیں زمین میں ٹھکانہ دیا۔ تم نے ہواؤں میں محل بنائے اور پہاڑوں کو تراش کر گھر بنائے۔ پس اللہ کی نعمتوں کو یاد کرو اور زمین میں فساد برپا کرنے کی کوشش نہ کرو''۔ (اعراف:74)

2۔ "اَتَبْنُوْنَ بِكُلِّ رِيْعٍ اٰيَةً تَعْبَثُوْنَ○وَتَتَّخِذُوْنَ مَصَانِعَ لَعَلَّكُمْ تَخْلُدُوْنَ"۔

''کیاتم ہر اُونچی جگہ پر ہواوہوس کی نشانیاں تعمیر کرتے ہو؟ مضبوط اور خوبصورت محل اور قلعے بناتے ہو کہ شاید ہمیشہ دُنیامیں رہ سکو؟''(شعرأ:128تا129)

3۔ "یُنَادُوْنَهُمْ اَلَمْ نَكُنْ مَّعَكُمْ ؕ قَالُوْا بَلٰى وَلٰكِنَّكُمْ فَتَنْتُمْ اَنْفُسَكُمْ وَتَرَبَّصْتُمْ وَارْتَبْتُمْ وَغَرَّتْكُمُ الْاَمَانِیُّ حَتّٰى جَآءَ اَمْرُ اللّٰهِ وَغَرَّكُمْ بِاللّٰهِ الْغَرُوْرُ○"

''(منافق) انہیں آواز دے کر کہیں گے: کیاہم دُنیا میں تمہارے ساتھ نہیں تھے؟ وہ جواب دیں گے: ہاں! لیکن تم نے اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالا۔تم (رسول کی موت) کا انتظار کرتے تھے، ہر چیز میں شک کرتے تھے، لمبی آرزوؤں نے تمہیں دھوکا دیا، یہاں تک کہ اللہ کا حکم آ گیا اور فریب کار شیطان نے تمہیں اللہ کے بارے میں فریب دیا۔''(حدید:14)

4۔ "اَلَمْ یَاْنِ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ لِذِكْرِ اللّٰهِ وَمَا نَزَلَ مِنَ الْحَقِّ ۙ وَلَا یَكُوْنُوْا كَالَّذِیْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلُ فَطَالَ عَلَیْهِمُ الْاَمَدُ فَقَسَتْ قُلُوْبُهُمْ ؕ وَكَثِیْرٌ مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ○"

''کیاابھی اہلِ ایمان کیلئے وہ وقت نہیں آیا کہ ان کے دل اللہ کے ذکر کیلئے اور اُس وحی کیلئے جو اللہ نے نازل کی ہے، نرم ہو جائیں؟ اور وہ ان لوگوں کی طرح سے نہ ہو جائیں جنہیں تم سے پہلے کتاب دی گئی، پھر ان پر ایک طویل عرصہ گزر گیا اور ان کے دل سخت ہو گئے اور ان میں سے اکثر فاسق ہیں''۔(حدید:16)

5۔ ذَرْهُمْ یَاْكُلُوْا وَیَتَمَتَّعُوْا وَیُلْهِهِمُ الْاَمَلُ فَسَوْفَ یَعْلَمُوْنَ"۔(حجر۔3)

''انہیں ان کے حال پر چھوڑ دو، کھائیں پئیں اور ان کی آرزوئیں انہیں غافل کر دیں، جلد ہی ان کو معلوم ہو جائے گا''۔

6۔ "اَمْ لِلْاِنْسَانِ مَا تَمَنّٰى○ فَلِلّٰهِ الْاٰخِرَةُ وَالْاُوْلٰى○"

''کیاانسان اپنی تمناؤں کو پالیتا ہے؟ حالانکہ دُنیااور آخرت دونوں اللہ کے ہیں''(نجم۔24۔25)

7۔ "وَیْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةِ○ الَّذِیْ جَمَعَ مَالًا وَّعَدَّدَهٗ○ یَحْسَبُ اَنَّ مَالَهٗۤ اَخْلَدَهٗ"

'ہلاکت ہے ہر عیب جوئی اور طعنہ زنی کرنے والے کیلئے، جو مال جمع کرتا ہے اور گن گن کر رکھتا ہے، وہ سمجھتا ہے کہ اس کا مال اسے ہمیشہ زندہ رکھے گا''۔(ھمزہ۔1تا3)

8۔ "اِنَّ الَّذِیْنَ ارْتَدُّوْا عَلٰۤى اَدْبَارِهِمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا تَبَیَّنَ لَهُمُ الْهُدَى ۙ الشَّیْطٰنُ سَوَّلَ لَهُمْ ؕ

وَاَمْلٰی لَهُمْ"۔

''جولوگ ہدایت کے واضح ہوجانے کے بعدحق سے پلٹ گئے، شیطان نے اُن کے برے اعمال کوان کیلئے خوشنما بنادیااورانہیں لمبی آرزوؤں سے دھوکادیا''۔(محمد۔25)

تفسیراورنتیجہ

طولِ اَمل کے اسباب:۔

مذکورہ بالا آیات میں سے پہلی دوآیات قومِ عادوقوم ثمود کے بارے میں ہیں۔ان دونوں اقوام نے زراعت اورصنعت میں بہت ترقی کی تھی جس کی وجہ سے دُنیا میں اس قدرمشغول ہوگئے کہ لمبی لمبی آرزوؤں نے انہیں اپنا اسیر بنالیا۔وہ اس قدرتکبر،غرور اورنخوت کا شکارہوگئے کہ انہوں نے حضرت ہودؑاورحضرت صالحؑ کی دعوت کی طرف نہ صرف یہ کہ توجہ نہیں کی بلکہ ان کے مقابلہ پراُتر آئے۔

پہلی آیت میں قرآن مجیدحضرت صالح علیہ السلام کی بات کونقل کرتا ہے جواُنہوں نے اپنی قوم سے کہی تھی:''یادکروجب قومِ عاداپنی سرکشی کی وجہ سے ہلاک ہوگئی اوراللہ نے تمہیں ان کا جانشین بنادیااورزمین میں تمہیں ٹھکانہ دیا،تم صحراؤں میں محل بناتے ہواور پہاڑوں کوتراش کراپنے گھر بناتے ہو۔اللہ کی نعمتوں کا ذکرکرواورزمین میں فسادکی کوشش نہ کرو''۔

"وَاذْكُرُوْٓا اِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَآءَ مِنْۢ بَعْدِ عَادٍ وَّبَوَّاَكُمْ فِي الْاَرْضِ تَتَّخِذُوْنَ مِنْ سُهُوْلِهَا قُصُوْرًا وَّتَنْحِتُوْنَ الْجِبَالَ بُيُوْتًا ۚ فَاذْكُرُوْٓا اٰلَاۗءَ اللّٰهِ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ○

"(اعراف:74)

دُوسری آیت قومِ ثمود کے بارے میں ہے۔ان کے رسول حضرت ہودؑ نے ان سے کہا:''کیاتم ہراونچی جگہ پراپنی ہواوہوس کی نشانیاں بناتے ہو؟خوبصورت اورمضبوط قلعے بناتے ہوکہ گویاتم نے ہمیشہ دُنیامیں رہناہے''(شعرأ:128تا129)

"اَتَبْنُوْنَ بِكُلِّ رِيْعٍ اٰيَةً تَعْبَثُوْنَ○ وَتَتَّخِذُوْنَ مَصَانِعَ لَعَلَّكُمْ تَخْلُدُوْنَ○"

حضرت ہودؑ انہیں سمجھانے کی کوشش کررہے ہیں کہ تمہاری گمراہی کی بنیادی وجہ تمہاری ہوس رانی اور لمبی آرزوئیں ہیں جنہوں نے تمہیں اللہ سے غافل اوردُنیا کی رونقوں میں غرق کردیا۔

قومِ عاداورقوم ثمود اس قصور میں مبتلاتھیں کہ جومضبوط عمارتیں اور قلعے انہوں نے پہاڑوں کوکھودکر بنائے ہوئے تھے،وہ انہیں ہرقسم کی آفات وحوادث سے محفوظ رکھیں گےاوروہ لمبےعرصہ تک عیش وعشرت کے ساتھ زندگی بسرکریں گے۔

قومِ ثمود کے بارے میں یہ بات ایک اور مقام پر اس طرح بیان کی گئی ہے کہ حضرت صالح علیہ السلام ان سے کہتے ہیں:

"اَتُتْرَكُوْنَ فِيْ مَا هٰهُنَآ اٰمِنِيْنَ○ فِيْ جَنّٰتٍ وَّعُيُوْنٍ○وَّزُرُوْعٍ وَّنَخْلٍ طَلْعُهَا هَضِيْمٌ○وَتَنْحِتُوْنَ مِنَ الْجِبَالِ بُيُوْتًا فٰرِهِيْنَ۔"(شعرأ:146تا149)

''کیا تم خیال کرتے ہو کہ ہمیشہ یہاں امن وامان میں رہو گے؟ باغوں اور نہروں میں، کھیتوں اور میٹھے پھل والے نخلستانوں میں، اور تم پہاڑوں میں سے گھر تراشتے ہو اور ان میں عیش وعشرت میں غفلت کی زندگی گزارتے ہو''۔

ظاہری بات ہے کہ طولِ اَمل کے نتیجہ میں غرور وغفلت میں مبتلا ہوجانا صرف قومِ عاد وثمود تک محدود نہ تھا لیکن قرآن مجید کی روشنی میں یہ اخلاقی برائی دو اقوام میں بہت سی نمایاں تھی۔

تیسری آیت میں میدانِ محشر میں مومنین اور منافقین کی گفتگو کا ذکر ہے۔ قیامت کے دن منافق میدانِ محشر میں ظلمت اور تاریکی میں ہوں گے جبکہ مومنین اپنے ایمان اور عملِ صالح کے نور میں جنت کی طرف رواں دواں ہونگے۔ منافق اُن سے کہیں گے کہ ٹھہرو! ہمارا انتظار کرو تا کہ ہم بھی تمہارے نور کی روشنی میں چل سکیں۔ لیکن ان دونوں کے درمیان ایک دیوار حائل ہوجائے گی۔ اس وقت منافق کہیں گے:

"اَلَمْ نَكُنْ مَّعَكُمْ ط"

''کیا ہم دُنیا میں ایک ساتھ نہیں تھے؟''

مومنین انہیں جواب دیں گے: ہاں! ہم اکٹھے تھے لیکن تم نے اپنے آپ کو فتنہ وفریب میں مبتلا کیا، تم مسلمانوں کیلئے برے حادثات اور برے دنوں کے منتظر رہتے تھے۔ اسلام، قیامت اور دعوتِ رسول کے بارے میں مسلسل شک کرتے تھے، لمبی آرزوؤں نے تمہیں غرور میں مبتلا کر دیا، یہاں تک کہ اللہ کی طرف سے تمہاری موت کا حکم آ گیا۔

".....قَالُوْا بَلٰى وَلٰكِنَّكُمْ فَتَنْتُمْ اَنْفُسَكُمْ وَتَرَبَّصْتُمْ وَارْتَبْتُمْ وَغَرَّتْكُمُ الْاَمَانِيُّ حَتّٰى جَآءَ اَمْرُ اللّٰهِ"۔

اس طرح اس آیت کی روشنی میں منافقین کی بدبختی اور ہلاکت کا سبب چار چیزیں ہیں جن میں سے چوتھی طولِ امل یعنی لمبی آرزوئیں ہیں۔

اس آیت میں ''اَمَانِيُّ'' کا لفظ استعمال ہوا ہے جو ''امنیہ'' کی جمع ہے۔ اس سے مراد غیر حقیقی خیالات اور بے بنیاد آرزوئیں ہیں۔

تفسیر الصادقین اور تفسیر قرطبی میں اس آیت کے ذیل میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ایک حدیث مروی ہے جس کا مضمون یہ ہے کہ آنحضرتؐ نے اصحاب کو نصیحت کرتے ہوئے زمین پر چند متوازی خطوط کھینچے۔ پھر ایک عمودی خط ان سب کے اُوپر کھینچ دیا اور

اصحاب سے پوچھا: کیاتم جانتے ہوکہ یہ خطوط کیا معنی رکھتے ہیں؟انہوں نے جواب دیا: یارسول اللہ ﷺ! آپ بیان فرمائیے۔ آپؐ نے فرمایا:''یہ خطوط انسان کی لمبی آرزوئیں ہیں،جن کی کوئی حدنہیں ہے،جبکہ عمودی خط موت ہے جو اِن سب کا خاتمہ کردیتی ہے۔''(تفسیر قرطبی،4617:9)

یہی بات ایک اور روایت میں ابنِ مسعود سے اس طرح نقل ہوئی ہے کہ رسول اللہؐ نے ایک مربع چوکور بنائی، پھر اس کے درمیان ایک خط کھینچا اور اسے چوکور کے باہر تک لے گئے۔ پھر اس خط کے دونوں طرف چھوٹے خطوط کھینچے۔اس کے بعد آپؐ نے فرمایا کہ جو خط اس چوکور کے اندر ہے، وہ انسان ہے اور یہ مربع شکل کی چوکور اس کی موت ہے جس نے اسے گھیرا ہوا ہے۔ چوکور سے نکلا ہوا خطِ دراز آرزوؤں کی نشاندہی کرتا ہے اور اس کی دونوں طرف چھوٹے چھوٹے خطوط حوادث وآفات ہیں۔اگر بالفرض اجل کا تیر خطا ہوجائے تو حوادث اُسے ہلاک کر دیتے ہیں اور اگر حوادث سے محفوظ رہے تو اجل اس کا خاتمہ کر دیتی ہے۔(تفسیر قرطبی، 4617:9)

چوتھی آیت میں مومنین کو ایک بالواسطہ مخاطب قرار دے کر انہیں خبردار کیا جارہا ہے کہ اپنی حالت پر کڑی نظر رکھیں، ایسا نہ ہو کہ طولِ امل میں گرفتار ہوکر وہ بھی اسی انجام سے دوچار ہوجائیں جس سے گزشتہ اقوام دوچار ہوئیں۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:''کیا اہلِ ایمان کیلئے ابھی وہ وقت نہیں آیا کہ ان کے دل اللہ کے ذکر کیلئے اور جو کچھ اللہ نے نازل کیا ہے، اس کیلئے نرم ہوجائیں اور وہ ان لوگوں کی طرح نہ ہوجائیں جن کو ان سے پہلے کتاب دی گئی، پھر ان پر ایک طویل مدت گزر گئی اور ان کے دل سخت ہوگئے اور ان میں سے اکثر فاسق ہیں۔''

"اَلَمْ یَاْنِ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ لِذِكْرِ اللّٰهِ وَمَا نَزَلَ مِنَ الْحَقِّ ۙ وَلَا یَكُوْنُوْا كَالَّذِیْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلُ فَطَالَ عَلَیْهِمُ الْاَمَدُ فَقَسَتْ قُلُوْبُهُمْ ؕ وَكَثِیْرٌ مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ○"(حدید۔16)

اس آیت کی رو سے اللہ کا ذکر اور حق کی طرف توجہ دل کی نرمی کا سبب بنتے ہیں۔اللہ کے ذکر اور حق کی طرف توجہ سے لمبی آرزوؤں کا خاتمہ ہوجاتا ہے اور انسان اپنی ذمہ داریوں اور فرائض کی طرف متوجہ ہوجاتا ہے، اس کا دل نورانی اور اس کی سوچ حقیقت پسندانہ ہوجاتی ہے اور دُنیا کی ناپائیداری اور کھوکھلے پن کو دیکھنے لگتا ہے۔

دلی کزنور معنی نیست روشن
مخوانش دل کہ آن سنگ است وآھن
دلی کزگرد غفلت زنگ دار
از آن دل سنگ وآھن ننگ دارد

''جو دل معرفت کے نور سے روشن نہیں ہے، اسے دل نہ کہو، وہ پتھر اور لوہا ہے۔ جو دل غفلت کے گرد و غبار سے زنگ آلود ہے، اُس سے پتھر اور لوہے کو بھی شرم آتی ہے''۔

پانچویں آیت میں رسول اللہ ﷺ کو مخاطب کر کے کہا جا رہا ہے: ''ان (کفار و مشرکین) کو ان کے حال پر چھوڑ دو، یہ کھائیں، پییں اور مادی نعمتوں سے لطف اندوز ہوں اور ان کی آرزوئیں انہیں غافل کر دیں لیکن جلد ہی ان کو معلوم ہوگا (کہ انہوں نے کتنی بڑی غلطی کی ہے)''۔

''ذَرْهُمْ يَأْكُلُوا وَيَتَمَتَّعُوا وَيُلْهِهِمُ الْأَمَلُ فَسَوْفَ يَعْلَمُونَ○''(حجر:3)

درحقیقت ان لوگوں کا حال حیوان جیسا ہے جو گھاس اور چارے کے سوا کسی چیز کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ ان میں اور حیوان میں فرق یہ ہے کہ یہ لمبی آرزوؤں کے فریب میں مبتلا ہیں جس نے انہیں حیوان سے بھی پست تر کر دیا ہے اور یہ اس قابل بھی نہیں رہے کہ اپنے انجام کے بارے میں سوچ سکیں یا موت کے آنے سے پہلے راہِ ہدایت کی طرف واپس آ سکیں۔

یہاں انسان کی زندگی اور اس کے وجود پر طولانی آرزوؤں کی منفی تاثیر کو بخوبی واضح کیا گیا ہے اور اس بات کی نشاندہی کی گئی ہے کہ یہ طویل آرزوئیں کس حد تک انسان کو مصروف کر کے اللہ سے غافل کر دیتی ہیں۔

''ذَرْهُمْ ''یعنی ''انہیں چھوڑ دو'' سے یہ بات مکمل طور پر آشکار ہو جاتی ہے کہ ان لوگوں کی ہدایت کی کوئی اُمید نہیں ہے، ورنہ رسول اللہ ﷺ کو ہرگز یہ حکم نہ دیا جاتا کہ انہیں چھوڑ دیں۔

ظاہر سی بات ہے کہ ایسے لوگوں کی ہدایت کی اُمید کس طرح ہو سکتی ہے جن کی زندگی کا اصل مقصد ہی حیوانوں کی طرف کھانا پینا ہو، جن کی آرزوئیں اور تمنائیں انہیں اجازت نہیں دیتیں کہ زندگی کے اختتام کے بارے میں سوچیں، اُس رب کے بارے میں غور و فکر کریں جس نے یہ ساری نعمتیں انہیں عطا کی ہیں اور نہ ہی وہ اس نکتہ پر کوئی سوچ بچار کرتے ہیں کہ ان کی تخلیق کا مقصد کیا ہے۔

چھٹی آیت میں اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ یہ لمبی آرزوئیں جنہیں انسان عملی جامہ بھی نہیں پہنا سکتا، اس طرح انسان کو جکڑ لیتی ہیں کہ وہ اپنی زندگی کی اصل راہ اور حقیقی مقصد سے دُور ہو جاتا ہے۔ آیت استفہامیہ انداز میں کہہ رہی ہے:

''اَمْ لِلْاِنْسَانِ مَا تَمَنّٰی''(نجم:24)

''کیا انسان کیلئے ممکن ہے کہ اُس چیز کو پائے جس کی وہ تمنا کرتا ہے؟''

اس استفہام کو اصطلاح میں استفہام انکاری کہا جاتا ہے۔ یہاں اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ کس طرح ممکن ہے کہ انسان کی تمنا پوری ہو جائے جبکہ اس کی عمر مختصر اور آرزوئیں اتنی دراز ہوتی ہیں کہ اگر اسے سو بار عمر دی جائے تو وہ بھی اُن آرزوؤں کے حصول کیلئے تھوڑی ہو۔ اگر کبھی اُس کی آرزوؤں کی تکمیل ہو جائے تو اس کی جگہ ایک نئی آرزو جنم لے لیتی ہے اور اُسے اپنی راہ پر چلانے لگتی ہے۔

اگرچہ یہ آیت اُن آیات کے سیاق میں ہے جن میں اس کا ذکر کیا گیا ہے کہ مشرکین اپنے بتوں کی شفاعت کے آرزو

مند تھے۔قرآن یہ کہہ رہا ہے کہ ان کی یہ آرزو ہرگز پوری نہ ہوگی۔لیکن یہ آیت وسیع اور عمومی مفہوم بھی رکھتی ہے۔اسے اسی مفہوم میں محدود کرنا صحیح نہیں ہے۔

ساتویں آیت میں ان اہلِ دُنیا کا ذکر ہے جو صرف اور صرف آرزوہائے دراز کی تکمیل کیلئے ہلکان ہورہے ہوتے ہیں۔یہ آیت فرماتی ہے:

''ہلاکت ہے ہرعیب جوئی اور طعنہ زنی کرنے والے کیلئے، جو مال اکٹھا کرتا ہے اور اس کو گنتا رہتا ہے اور یہ گمان کرتا ہے کہ اُس کا مال اُس کی ہمیشہ زندہ رکھے گا''۔

"وَيْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةٍ ۝ الَّذِي جَمَعَ مَالًا وَعَدَّدَهُ ۝ يَحْسَبُ أَنَّ مَالَهُ أَخْلَدَهُ ۝ "
(همزہ۔1تا3)

درحقیقت یہ تین آیات ایک دوسرے کے ساتھ علت ومعلول جیسا تعلق رکھتی ہیں، اس لئے کہ خود پسند اور مغرور انسان دوسروں کا مذاق اُڑاتا ہے کہ اُس نے جائز اور ناجائز ذرائع سے دولت اکٹھی کر رکھی ہوتی ہے۔یہ دولت وہ اس لئے جمع کرتا ہے کہ وہ سمجھتا ہے کہ اس مال ودولت کی وجہ سے اسے ہمیشہ کی زندگی مل جائے گی۔اس کی یہ آرزوئے دراز اس میں غرور وخود پسندی پیدا کردیتی ہے جس کی وجہ سے وہ دوسروں کی عیب جوئی اور اُن پر طعنہ زنی کرتا ہے۔

اس آیت سے بآسانی یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ لمبی آرزوئیں انسان کو اس حد تک غافل کرسکتی ہیں کہ وہ موت کو مکمل طور پر بھول جاتا ہے۔یہی چیز اُس کے غرور، سرکشی اور دیگر گناہوں کا سبب بن جاتی ہے۔

آٹھویں اور آخری آیت میں اُن لوگوں کا ذکر ہے جنہوں نے حق کو پہچانا اور پھر اُس سے رُوگردانی کی۔اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:''جن لوگوں نے حق کے واضح ہوجانے کے بعد اس کی طرف پشت کی، درحقیقت شیطان نے ان کے برے اعمال کو ان کی نظر میں خوشنما دِکھایا اور لمبی آرزوؤں کے ذریعے انہیں فریب دیا''۔

"إِنَّ الَّذِينَ ارْتَدُّوا عَلَىٰ أَدْبَارِهِم مِّن بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْهُدَى ۙ الشَّيْطَانُ سَوَّلَ لَهُمْ ۖ وَأَمْلَىٰ لَهُمْ ۝"(محمد:25)

''اَمْلٰی لَھُمْ'' کے معنی ہیں:''ان کیلئے ایسی لمبی آرزوئیں پیدا کردیں جنہوں نے انہیں اپنی طرف متوجہ اور مشغول کرلیا''

یہ آیت اس حقیقت پر روشنی ڈال رہی ہے کہ یہ کس طرح ممکن ہے کہ انسان حق کو پہچانے اور پھر اُسے نظرانداز کردے اور اپنی نجات کا راستہ بند کرلے۔کیا کسی عقل مند انسان سے ایسے طرزِعمل کی توقع کی جاسکتی ہے؟ جب شیطانی آرائش گری انسان کا احاطہ کرلے اور برائیاں اُسے اچھے اعمال کی شکل میں نظر آنے لگیں تو پھر حق کو واضح طور پر دیکھنے کے باوجود اس سے روگردانی کرنا بعید

نہیں ہوتا۔

یہاں سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ لمبی آرزوئیں انسان کیلئے کیسی کیسی بلائیں اور مصیبتیں لے کر آتی ہیں، یہاں تک کہ عقل مند انسان کو عقل وخرد سے بیگانہ کردیتی ہے۔

ان آیات سے یہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ لمبی آرزوئیں انسان کی سعادت کی خطرناک ترین دشمن ہیں جو نہ صرف افراد بلکہ اقوام کو بھی بدبختی وہلاکت کے منہ میں دھکیل دیتی ہیں۔

طُولِ اَمل احادیث کی روشنی میں

چونکہ آرزوئے دراز انسان کی اخلاقی اور معنوی زندگی، بلکہ مادی زندگی پر بھی مخرب اثرات مرتب کرتی ہے، لہٰذا احادیث میں بھی مختلف اسالیب میں انکی مذمت کی گئی ہے اور اس بیماری کی منطقی وجوہات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

1۔ ایک حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

اَرْبَعَةٌ مِنَ الشَّقَاۗ جُمُوْدُ الْعَيْنِ وَقَسَاوَةُ الْقَلْبِ وَطُوْلُ الْاَمَلِ وَالْحِرْصِ عَلَى الدُّنْيَا۔

''چار چیزیں شقاوت اور بدبختی میں سے ہیں:

1۔ آنکھ کا جامد ہونا (رونا نہ آنا) 2۔ سنگ دِلی۔ 3۔ لمبی آرزوئیں۔ 4۔ دُنیا کے بارے میں حرص'' (تفسیر قرطبی، 3618:5۔ بحارالانوار، 164:70)

2۔ ایک حدیث میں امیرالمومنین علیہ السلام فرماتے ہیں:

''مَنْ اَطَالَ اَمَلَهُ اَمَلَهُ سَاَ عَمَلُهُ''۔

''جس کی آرزو دراز ہوگی، اُس کا عمل برا ہوگا'' (بحارالانوار 163:70)

یہ حدیث ان الفاظ میں بھی ملتی ہے:

اطول الناس املا اسوئھم عملا

جس کی آرزو سب سے دراز ہوگی اس کا عمل سب سے برا ہوگا۔ (تصنیف غررالحکم۔ 312)

3۔ نہج البلاغہ، خطبہ 14 میں امیرالمومنین علیہ السلام فرماتے ہیں:

''اِنَّمَا هَلَكَ مَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ بِطُوْلِ اَمَالِهِمْ وَتَغْيِّبِ اٰجَالِهِمْ حَتّٰى نَزَلَ بِهِمُ الْمَوْعُوْدُ الَّذِيْ تُرَدُّ عَنْهُ الْمَعْذِرَةُ وَتَرْفَعُ عَنْهُ التَّوْبَةُ''۔

''تم سے پہلے جو قومیں ہلاک ہوئیں، اُن کی ہلاکت کا واحد سبب یہ تھا کہ اُن کی لمبی آرزوؤں کی وجہ سے موت اُن کی نظر سے اوجھل ہوگئی، یہاں تک کہ جس عذاب کا ان سے وعدہ کیا گیا تھا، وہ آ گیا جس کے آنے پر معذرت رد ہوجاتی ہے اور توبہ کا دروازہ بند ہوجاتا ہے''۔

4۔ ایک حدیث میں فاطمہؑ بنت الحسینؑ اپنے والد بزرگوار حضرت امام حسینؑ سے اور وہ اپنے نانا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کرتی ہیں۔

"اِنَّ صَلَاحَ اَوَّلِ هٰذِهِ الْاُمَّةِ بِالزُّهْدِ وَالْيَقِيْنِ وَهَلَاكَ آخِرِهَا بِالشُّحِّ (بِالشَّكِّ) وَالْاَمَلِ"۔

''اس امت کے پہلے لوگوں کی صلاح زہد اور یقین کی بدولت تھی جبکہ آنے والوں کی ہلاکت بخل اور لمبی آرزوؤں کی وجہ سے ہوگی''۔(بحارالانوار، 164:70)

ظاہر ہے کہ ایمان اور یقین محکم اور دُنیوی زیب وزینت کا نتیجہ یہ تھا کہ دورِ اول کے مسلمان میدانِ جہاد میں صرف اللہ پر نظر رکھ کر صرف اس کی خوشنودی کے حصول کیلئے شمشیر زنی کرتے تھے۔ یہی میدانِ جہاد میں ان کی ثابت قدمی اور ان کی فتح کا بنیادی سبب تھا۔ لیکن جب زہد کی جگہ حبِ دُنیا نے لے لی اور ایمان ویقین کی جگہ شک براجمان ہوگیا تو پسپائی اور ذِلت اُن کا مقدر بن گئی۔ اُمتِ مسلمہ کی عظمتِ رفتہ کی بحالی کیلئے اب بھی زُہد اور یقین کی بحالی کے سوا کوئی راستہ باقی نہیں ہے۔

5۔ امیرالمومنین علیہ السلام کی ایک اور حدیث ہے:

"اَلْاَمَلُ سُلْطَانُ الشَّيَاطِيْنِ عَلٰى قُلُوْبِ الْغَافِلِيْنَ"۔

''لمبی آرزوئیں غافلوں کے دِلوں پر شیطان کی حکومت ہوتی ہیں''۔(تصنیف غررالحکم:312)

6۔ ایک اور حدیث میں امیرالمومنین علیہ السلام فرماتے ہیں:

"شَرُّ النَّاسِ الطَّوِيْلُ الْاَمَلِ السَّيِّئُ الْعَمَلِ"۔

''بدترین انسان وہ ہے جس کی آرزوئیں دراز اور عمل برا ہو''۔(تصنیف غررالحکم:312)

آپؑ ہی سے مروی ایک اور حدیث ہے:

"اِنَّ الْمَرْءَ يُشْرِفُ عَلٰى اَمَلِهٖ فَيَقْطَعُهٗ حُضُوْرُ اَجَلِهٖ. فَسُبْحَانَ اللّٰهِ لَا اَمَلٌ يُدْرَكُ وَلَا مُؤَمَّلٌ يُتْرَكُ"۔

''انسان ہمیشہ اپنی آرزوؤں کی تکمیل میں مصروف رہتا ہے، یہاں تک کہ موت اُس کی آرزو کو منقطع کر دیتی ہے، سبحان اللہ! نہ آرزو ملی اور نہ آرزومند کو چھوڑا گیا''۔(تصنیف غررالحکم:313)

7۔ امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام سے منقول ایک اور حدیث میں آتا ہے:

"اَشْرَفُ الْغِنٰی تَرْكُ الْمُنٰی" (نہج البلاغہ، کلماتِ قصار: 211و34)

''افضل ترین بے نیازی یہ ہے کہ انسان آرزوؤں کو ترک کر دے''۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان اپنی دراز آرزوؤں کی وجہ سے ہمیشہ اپنے آپ کو محتاج اور ضرورت مند سمجھتا ہے، ہر جگہ اور ہر کسی کے سامنے دستِ سوال دراز کرتا ہے اور اُن چیزوں کیلئے اپنی عزتِ نفس کو خاک میں ملا دیتا ہے جو اُسے کبھی نہیں ملتی ہیں۔

8۔ حضرت علی علیہ السلام ایک اور حدیث میں فرماتے ہیں:

"كَذِبَ مَنِ ادَّعَى الْاِيْمَانَ وَهُوَ مَشْغُوْفٌ مِنَ الدُّنْيَا بِخِدَعِ الْاَمَانِيِّ وَزُوْرِ الْمَلَاهِيِّ"۔

''جھوٹا ہے وہ شخص جو ایمان کا دعویٰ کرتا ہے اور پھر آرزوؤں کے فریب اور لغو باتوں اور کاموں کی وجہ سے دُنیا میں کھویا رہتا ہے''۔ (تصنیف غرر الحکم: 312)

ظاہر سی بات ہے کہ طلبِ آرزو کے دیوانے ہر چیز کو بھول کر اپنی آرزو کی تکمیل میں لگ جاتے ہیں جس سے ان کے ایمان میں دراڑیں پڑنا شروع ہو جاتی ہیں۔

9۔ امیر المومنین حضرت علی ابن ابی طالب کے ایک مختصر اور جامع فرمان میں ہے:

"اَلْاَمَانِيُّ تُعْمِي عُيُوْنَ الْبَصَائِرِ"۔

''آرزوئیں انسان کی چشمِ بصیرت کو اندھا کر دیتی ہیں''۔

10۔ ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صحابہ سے پوچھا: کیا تم سب جنت میں جانا چاہتے ہو؟ سب نے عرض کیا: جی ہاں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

قَصِّرُوْا مِنَ الْاَمَلِ وَاجْعَلُوْا آجَالَكُمْ بَيْنَ اَبْصَارِكُمْ وَاسْتَحْيُوْا مِنَ اللهِ حَقَّ الْحَيَاءِ"۔

''اپنی آرزو کو مختصر رکھو اور موت کو ہمیشہ سامنے رکھو اور اللہ کی نافرمانی سے شرم کرو جس طرح شرم کرنے کا حق ہے''۔ (المحجۃ البیضاء، 8:246)

11۔ حضرت علی علیہ السلام کی ایک پُرمعنی حدیث ہے:

"اِنَّ الْاَمَلَ يُذْهِبُ الْعَقْلَ، وَيُكَذِّبُ الْوَعْدَ، وَيَحِثُّ عَلَى الْغَفْلَةِ وَيُوْرِثُ الْحَسْرَةَ"۔ (میزان الحکمہ، 1:103)

''لمبی آرزوئیں عقل کو زائل کر دیتی ہیں، جھوٹے وعدے کرتی ہیں، غفلت پر مائل کرتی ہیں اور ان کا انجام

حسرت وندامت ہوتا ہے"۔

12۔ اس بحث کو ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اس حدیث پر ختم کرتے ہیں:

ایک دن آپؐ نے تین لکڑیاں لیں۔ ایک کو زمین میں گاڑا، دوسری کو اس سے کچھ فاصلہ پر گاڑ دیا اور تیسری کو ذرا زیادہ فاصلے پر گاڑ دیا۔ پھر صحابہ سے پوچھا: کیا تمہیں معلوم ہے کہ یہ کیا ہے؟ انہوں نے عرض کی: اللہ اور اُس کا رسولؐ بہتر جانتے ہیں۔ آپؐ نے فرمایا:

"هٰذا الْاِنْسَانُ! وَهٰذَا الْاَجَلُ! وَهٰذَا الْاَمَلُ يَتَعَاطَاهُ ابْنُ آدَمَ وَيَخْتَلِجُهُ الْاَجَلُ دُوْنَ الْاَمَلُ"۔ (میزان الحکمہ، 104:1)

"یہ (پہلی لکڑی) انسان ہے اور یہ (دوسری لکڑی) اُس کی موت ہے اور یہ (تیسری لکڑی) اُس کی آرزو ہے۔ اس سے پہلے کہ انسان اپنی آرزو تک پہنچے، اُس کی موت اُس کا گریبان پکڑ لیتی ہے"۔

ان احادیث سے، جو گلستانِ احادیث سے حاصل کیا ہوا ایک چھوٹا سا گلدستہ ہیں، یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ طولِ اَمل ایک ایسی صفتِ رذیلہ ہے جو انسان کی سعادت کی سب سے بڑی دُشمن اور قربِ خدا کی راہ میں سب سے بڑی رُکاوٹ ہے۔

طولِ امل کے نتائج:۔

لمبی آرزوئیں، جو بعض اوقات نہ ختم ہونے والی آرزو بھی بن جاتی ہیں، انسان کی مادی اور معنوی زندگی پر انتہائی خطرناک اثرات مرتب کرتی ہیں جن میں سے بعض کا ذکر مذکورہ بالا آیات واحادیث میں آچکا ہے۔ لمبی آرزوؤں کے خطرناک نتائج کو فہرست وار اس طرح سے بیان کیا جاسکتا ہے:

بہت سے گناہوں کا سبب:۔

لمبی آرزوؤں کا بدترین منفی نتیجہ یہ ہے کہ اس کی وجہ سے انسان مختلف قسم کے گناہوں کا مرتکب ہونے لگتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عام طور پر ایسی آرزوؤں کو شریعت کے دائرے میں رہتے ہوئے عملی جامہ پہنانا ممکن نہیں ہوتا۔ لہٰذا اس بیماری میں مبتلا افراد حلال وحرام سے آنکھیں بند کرکے، دوسروں کے حقوق کو غصب کرکے، یتیموں کے اموال پر قبضہ کرکے، ذخیرہ اندوزی، ناجائز منافع خوری، چور بازاری اور رشوت جیسے ذرائع سے اپنی دولت کو بڑھانے میں لگے رہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ حدیث میں آیا ہے:

"مَنْ طَالَ اَمَلُهُ سَاءَ عَمَلُهُ"۔

"جس کی آرزو لمبی ہوگی، اُس کا عمل برا ہوگا"۔ (بحارالانوار، 156:1)

"اَطْوَلُ النَّاسِ اَمَلاً اَسْوَءُهُمْ عَمَلاً"۔

''جس کی آرزو سب سے لمبی ہوگی، اس کا عمل سب سے برا ہوگا۔''(غرر الحکم:3054)

اس کے برعکس:

"مَنْ قَصَّرَ اَمَلُهُ حَسُنَ عَمَلُهُ"۔

''جس کی آرزو چھوٹی ہوگی، اس کا عمل اچھا ہوگا''۔(غرر الحکم،295:5)

یہ تینوں احادیث امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام سے مروی ہیں۔ ہماری جانیں اُنؑ کے نورانی اور رُوح پرور ارشادات پر قربان ہوجائیں۔

قساوتِ قلب کا سبب:۔

اس مبحث کے آغاز میں مندرج آیات میں سے ایک آیت کے ذیل میں ہم ایک قوم کے بارے میں پڑھ چکے ہیں کہ وہ اس خیال میں تھے کہ طویل عمریں پائیں گے (اس وجہ سے وہ لمبی آرزوؤں میں مبتلا ہوگئے) اور ان کے دل سخت ہوگئے۔

اس کی دلیل بھی واضح اور روشن ہے کیونکہ آرزوئیں انسان کو اللہ تعالیٰ سے غافل اور دُنیا کا حریص بنادیتی ہیں اور انسان آخرت سے بے خبر ہوجاتا ہے۔ ان سب باتوں کا نتیجہ قساوت قلبی کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔

ایک حدیث میں آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے فرمایا:

"یَامُوْسیٰ لَا تُطَوِّلْ فِی الدُّنْیَا اَمَلَكَ فَیَقْسُوْا قَلْبَكَ، وَالْقَاسِی الْقَلْبِ مِنِّیْ بَعِیْدٌ"۔

''اے موسیٰ علیہ السلام! دنیا میں اپنی آرزوؤں کو طویل نہ کرو ورنہ تیرا دل سخت ہوجائے گا اور سنگدل مجھ سے دُور ہوتا ہے''۔(میزان الحکمہ، 104:1)

ایک اور حدیث میں امیر المومنین علیہ السلام سے مروی ہے:

"مِنْ یَأْمُلُ اَنْ یَعِیْشَ اَبَدًا یَقْسُوْا قَلْبُهُ وَیَرْغَبُ فِی الدُّنْیَا"۔

''جو شخص یہ چاہتا ہے کہ ہمیشہ اس دُنیا میں رہے، اس کا دل سخت ہوجاتا ہے اور وہ دنیا کی طرف راغب ہو جاتا ہے۔''(میزان الحکمہ، 104:1)

آخرت فراموشی کا سبب:۔

طولِ اَمل کے اس نتیجہ کے بارے میں کسی تفصیل کی ضرورت نہیں ہے، اس لئے کہ جو لوگ اس بیماری میں مبتلا ہیں، ان کی

زندگی میں یہ نتیجہ نمایاں طور پر دکھائی دیتا ہے۔ ایسے لوگ کبھی موت کی بات کرتے ہیں نہ آخرت کی فکر کرتے ہیں بلکہ ہمیشہ گردابِ غفلت میں غوطہ زن رہتے ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور امیر المومنین علیہ السلام سے مروی ایک حدیث میں ہے:

"طُوْلُ الْاَمَلِ یُنْسِی الْآخِرَۃَ"۔

''لمبی آرزوئیں فراموشیٔ آخرت کا سبب ہوتی ہیں۔''

ایک اور حدیث میں امیر المومنین علیہ السلام فرماتے ہیں:

"اَکْثَرُ النَّاسِ اَمَلاً اَقَلُّھُمْ لِلْمَوْتِ ذِکْرًا"۔

''جس شخص کی آرزوئیں زیادہ ہوتی ہیں، وہ موت کو کم یاد کرتا ہے'' (تصنیف غرر الحکم:312)۔

موجبِ زحمت ومشقت:۔

یہ بات بالکل واضح ہے کہ انسان کی آرزوئیں جتنی لمبی ہوں گی، انہیں عملی جامہ پہنانے کیلئے اسی قدر زیادہ کوشش اور جدوجہد کی ضرورت ہوتی ہے اور ان مقاصد کے حصول کیلئے زیادہ مالی وسائل کی ضرورت ہوتی ہے۔ ان دو باتوں کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان کی زندگی گھریلو سطح پر سختی اور اقتصادی جدوجہد میں زیادہ دوڑ دُھوپ اور زحمت ومشقت کا مرقع بن جاتی ہے۔

اس حقیقت کو امیر المومنین علیہ السلام نے ایک حدیث میں اس طرح بیان فرمایا ہے:

"مَنْ کَثُرَ مُنَاہُ کَثُرَ عَنَائُہُ"۔

''جس کی آرزوئیں زیادہ ہوں گی، اس کی زندگی میں مشقت زیادہ ہوگی۔''

نیز آپؑ نے فرمایا:

"مَنِ اسْتَعَانَ بِالْاَمَانِیِّ اَفْلَسَ"۔

''جس نے آرزوؤں سے مدد طلب کی، وہ مفلس ہوگیا''۔

ایک حدیث میں آپؑ نے فرمایا:

"اَلرَّغْبَۃُ مِفْتَاحُ النَّصَبِ"۔

''دنیا کی طرف رغبت سختی ومشقت کی چابی ہے''۔ (تصنیف غرر الحکم:312)

ذِلت آمیز زندگی:۔

لمبی آرزوؤں والے انسان زندگی میں زحمت اور مشقت کے علاوہ ذِلت ورُسوائی سے بھی دو چار ہوتے ہیں۔ وہ اپنی خیالی آرزوؤں کو حقیقت کا رُوپ دینے کیلئے ہر کس وناکس کے سامنے دست سوال دراز کرتے پھرتے ہیں۔ ایک حدیث میں امیر المومنین علیہ السلام فرماتے ہیں:

"ذُلُّ الرِّجَالِ فِیْ خَیْبَةِ الْاٰمَالِ"۔

''آرزوؤں کی ناکامی انسان کو ذلیل کر دیتی ہے''۔(غرر الحکم،405:2)

نعمتوں سے محرومی:۔

جیسا کہ اُوپر بیان ہو چکا ہے کہ لمبی آرزوؤں میں گرفتار اپنے مقاصد کے حصول کے لئے زیادہ مالی وسائل اکٹھے کرنے میں لگا رہتا ہے، اس وجہ سے اُسے غیر ضروری بچت اور کفایت شعاری سے کام لینا پڑتا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ زندگی کی بہت سی نعمتوں اور آسائشوں سے اپنے آپ کو محروم کر دیتا ہے۔ ایسے افراد اپنے بیوی بچوں کے اخراجات کے معاملہ میں کنجوسی اور بخل سے کام لیتے ہیں اور دولت مند ہونے کے باوجود فقیروں جیسی زندگی گزارتے ہیں۔

ہمیں اپنے اردگرد بہت سے ایسے افراد نظر آسکتے ہیں جو''اچھے مستقبل'' کی آرزو لئے اپنے پاس موجود اللہ کی نعمتوں سے لطف اندوز ہونے سے محروم ہیں۔

حقیقت سے دُوری کا سبب:۔

لمبی آرزوؤں میں گرفتار انسان اس پیاسے کی مانند ہوتا ہے جو تلاشِ آب میں سراب کا تعاقب کر رہا ہوتا ہے۔ یہ لوگ اپنی خیالی آرزوؤں کی وجہ سے حقیقت کا اصل چہرہ نہیں دیکھ پاتے اور انہیں پتہ ہی نہیں چلتا کہ وہ کس چیز کے طالب ہیں اور ان کا مطلوب کہاں ہے؟ اس حقیقت کو حضرت علی علیہ السلام نے اس طرح بیان فرمایا ہے:

"اَلْاَمَانِیُّ تُعْمِیْ عُیُوْنَ الْبَصَائِرِ"۔

''آرزوئیں چشمِ بصیرت کو اندھا کر دیتی ہیں''۔(غرر الحکم:1351)

مختصر یہ کہ صرف وہی شخص حقیقت کا اصل چہرہ دیکھ سکتا ہے جو معرفت کے سرچشمہ سے سیراب ہو اور اس کی عقل پر آرزوؤں کا حجاب نہ پڑا ہوا ہو۔

کفرانِ نعمت:۔

لمبی آرزوؤں کی وجہ سے انسان کی آنکھیں ہمیشہ اُن چیزوں پر لگی رہتی ہیں جو اس کے پاس نہیں ہوتی ہیں اور جنہیں شاید وہ کبھی حاصل نہ کر سکے۔اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی ان نعمتوں کو، جو اُس کے پاس موجود ہیں، چھوٹا اور حقیر جاننے لگتا ہے اور یہی ناشکری اور کفرانِ نعمت ہے جو دُنیا اور آخرت میں برے انجام کا سبب ہے۔

ایک حدیث میں امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

"تَجَنَّبُوا الْمُنٰى فَاِنَّهَا تُذْهِبُ بِبَهْجَةِ نِعَمِ اللهِ عِنْدَكُمْ، وَتُلْزِمُ اِسْتِصْغَارَهَا لَدَيْكُمْ، وَعَلٰى قِلَّةِ الشُّكْرِ مِنْكُمْ"۔

"آرزوؤں سے اجتناب کرو، اس لئے کہ ان کی وجہ سے اللہ کی نعمتوں کا حسن تمہاری نظر سے جاتا رہتا ہے اور تم انہیں حقیر سمجھنے لگتے ہو اور ان پر تمہارا شکر کم ہو جاتا ہے (اس طرح تم کفرانِ نعمت کے مرتکب ہو جاتے ہو)"۔(تصنیف غرر الحکم:314)

طُولِ اَمل کے اسباب ومحرکات

لمبی آرزوؤں کا بنیادی سبب جہالت ہے۔اپنے بارے میں، دنیا کے بارے میں، اللہ کی قدرت کے بارے میں اور اُخروی جزا وسزا کے بارے میں انسان کی جہالت طول امل یعنی لمبی آرزوؤں کی کھائیوں میں پھینک دیتی ہے۔

تشریح:۔

جب انسان اپنے بارے میں جاہل اور بے خبر ہوتا ہے اور اس حقیقت سے غافل ہوتا ہے کہ کسی بھی لمحے اُس کی زندگی ختم ہوسکتی ہے تو وہ اس خیالِ خام میں مبتلا ہو جاتا ہے کہ اس کی عمر بہت لمبی ہے اور فوراً ہی آرزوہائے دراز کا ایک ہجوم اسے گھیر لیتا ہے اور اسے کسی اور چیز کے بارے میں سوچنے کی فرصت بھی نہیں دیتا۔

دُنیا کی ناپائیداری اور بے وفائی سے جہالت اور غفلت انسان کو طولِ امل کے گرداب میں پھینک دیتی ہے، حالانکہ دُنیا چھوٹے پر رحم کرتی ہے نہ بڑے پر، جوان پر رحم کرتی ہے نہ بوڑھے پر۔

بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ کسی ایک بوڑھے کے مرنے سے قبل سینکڑوں بچے اور جوان موت کے منہ میں چلے جاتے ہیں یا کسی بیمار کے مرنے سے پہلے سینکڑوں صحت مند موت کے گھاٹ میں اتر جاتے ہیں۔

بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ایک طاقتور اور مقتدر حکمران ایک دن میں اقتدار سے محروم ہو کر پسِ دیوار زندان ہو جاتا ہے یا

دولت مندترین افراد راتوں رات غربت وناداری کی چکی میں پھنس جاتے ہیں۔ان تمام امور سے غفلت اور بے خبری انسان کوطولِ امل کی دلدل میں دھکیل دیتی ہے۔

مکتبِ وحی کے ایک ممتاز شاگرد حضرت سلمانؓ فارسی فرماتے ہیں:

"ثَلٰاثٌ اَعْجَبَتْنِیْ حَتّٰی اَضْحَکَتْنِیْ: مُؤَمِلُ الدُّنْیَا وَالْمَوْتُ یَطْلِبُہُ، وَغَافِلٌ لَیْسَ بِمَغْفُوْلٍ عَنْہُ، وَضَاحِکٌ مُلِءَ فِیْہِ لَایَدْرِیْ اَسَاخِطٌ رَبُّ الْعَالَمِیْنَ عَلَیْہِ اَمْ رَاضٍ عَنْہُ"۔(المحجۃ البیضاء، 246:8)

''تین افراد پر مجھے اس قدر تعجب ہوتا ہے کہ مجھے ہنسی آنے لگتی ہے: ایک جو دُنیا کی آرزو کرتا ہے جبکہ موت اس کا پیچھا کر رہی ہوتی ہے، دوسرا وہ جو موت سے غافل ہوتا ہے جبکہ موت اس سے غافل نہیں ہوتی، تیسرا وہ جو منہ بھر کر ہنستا ہے مگر اس کو یہ معلوم نہیں ہوتا کہ رب العالمین اس سے راضی ہے یا ناراض''۔

اس کے ہم معنی ایک حدیث میں حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

مَنْ اَیْقَنَ اَنَّہُ یُفَارِقُ الْاَحْبَابَ وَیَسْکُنُ التُّرَابَ وَیُوَاجِہُ الْحِسَابَ وَ یَسْتَغْنِیْ عَمَّا خَلَّفَ، وَیَفْتَقِرُ اِلٰی مَاقَدَّمَ کَانَ حَرِیًّا بِقِصَرِ الْاَمَلِ وَطُوْلِ الْعَمَلِ"۔

''جسے یقین ہو کہ وہ جلد ہی احباب سے بچھڑ جائے گا، خاک میں سکونت اختیار کرے گا، حساب کا سامنا کرے گا، جو کچھ پیچھے چھوڑ جائے گا، اس سے بے نیاز ہو جائے گا اور جو عملِ خیر آگے بھیجا ہے، اس کا محتاج ہوگا تو ایسے شخص کیلئے یہی مناسب ہے کہ وہ اپنی آرزو چھوٹی رکھے اور عمل زیادہ کرے''۔(بحارالانوار، 167:70)

ایک اور حدیث میں آپؑ فرماتے ہیں:

"اِتَّقُوْا خِدَاعَ الْاَمَالِ، فَکَمْ مِّنْ مُؤَمِّلٍ یَوْمٍ لَمْ یُدْرِکْہُ، وَبَانِیْ بَنَاًلَمْ یَسْکُنْہُ، وَجَامِعِ مَالٍ لَمْ یَاْکُلْہُ"۔

''آرزوؤں کے فریب سے بچو، کتنے ہی ایسے لوگ ہیں جو اپنی آرزو کو نہ پا سکے اور کتنے ہی ایسے بنانے والے ہیں جو اپنے بنائے ہوئے گھروں میں نہ رہ سکے اور کتنے ہی مال جمع کرنے والے ہیں جو اپنا جمع کیا ہوا مال نہ کھا سکے''۔(تصنیف غررالحکم:313)

بعض اوقات آخرت اور اس کی لازوال نعمتوں سے غفلت اور زُہد اور دُنیوی زیب وزینت کی اسارت سے رہائی کی لذت سے بے خبری انسان کو طولِ امل کی زنجیروں میں جکڑ دیتی ہے۔

ایک حدیث میں حضرت امام محمد باقر علیہ السلام فرماتے ہیں:

"اِسْتَجْلِبْ حَلَاوَةَ الزِّهَادَةِ بِقِصَرِ الْاَمَلِ"۔ (تحف العقول: 207)

''آرزوؤں کو چھوٹا کر کے زندگی کی شیرینی کی لذت محسوس کرو''۔

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کی قدرت سے غافل یا جاہل ہو جاتا ہے۔ وہ اس بات کو بھول جاتا ہے کہ جس اللہ نے شکمِ مادر میں اس کو رزق دیا جبکہ کوئی اس تک دسترس نہ رکھتا تھا، وہی اللہ اُس کو زندگی بھر رزق دے سکتا ہے۔ اگر اس کی اولاد اللہ سے محبت کرنے والی ہو تو اللہ اسے تنہا نہیں چھوڑے گا اور اگر اللہ کی دُشمن ہوئی تو اُس کی خدمت کرنا ایک احمقانہ عمل ہے۔

ان تمام امور سے جہالت اور بے خبری کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان طولِ امل کے جال میں پھنس جاتا ہے۔

طُول اَمل کا علاج

کسی بھی بیماری کے علاج کا سب سے موثر طریقہ یہ ہے کہ اس کے اسباب کا خاتمہ کیا جائے۔ جب تک بیماری کی جڑوں کو نہ اُکھاڑا جائے، ہر علاج سطحی علاج ہوگا۔ اس بنیادی اُصول کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اور لمبی آرزوؤں کی بنیادی وجوہات کو سامنے رکھتے ہوئے بآسانی نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ طولِ امل کا خاتمہ کرنے کیلئے سب سے پہلا اور بنیادی قدم یہ ہے کہ انسان غور و فکر سے کام لے۔

اس غور و فکر کا مقصد یہ ہو کہ ایک طرف سے انسان اپنے آپ کو پہچانے اور اس حقیقت کا ادراک حاصل کرے کہ اس کے اور موت کے درمیان زیادہ فاصلہ نہیں ہے اور یہ کہ زندگی بہت مختصر ہے۔ اگر آج صحت مند ہے تو کل بیمار۔ آج طاقتور اور مالدار ہے تو ہو سکتا ہے کہ کل کمزور اور فقیر ہو۔ ایسے انقلابات کے نمونے دُنیا میں بہت سے ہیں۔

دُوسری طرف سے انسان اس دُنیا کی ناپائیداری کے بارے میں غور و فکر کرے جہاں ایک چھوٹا سا حادثہ بڑے بڑے واقعات کا سبب بن جاتا ہے۔ نادر شاہ، جو ایک طاقتور بادشاہ تھا، اس کے بارے میں کہا گیا:

شبانگہ بہ دل تاراج داشت
سحرگہ نہ تن سر، نہ سرتاج داشت

''رات کو اس نے حملے اور تاراج گری کا ارادہ کیا مگر صبح اس کا سر تن پہ تھا نہ تاج سر پر''۔

بیک گردش چرخ نیلو فری
نہ نادر ہا بہ جامی مانند ونہ نادری

''آسمان کی ایک گردش کے نتیجہ میں نہ نادر باقی رہا اور نادری''۔

تیسری طرف ہمیں یہ سوچنا چاہئے کہ ہم آخرت، حساب و کتابِ اعمال اور سزا و جزا پر ایمان رکھتے ہیں۔ یہ دُنیا ایک گزرگاہ

اور آخرت، ابدی رہائش گاہ ہے۔ ہمیں اس دنیا میں اگلی دُنیا کا مال واسباب جمع کرنا ہے۔ حرص انسان کا کوئی مسئلہ حل نہیں کرتی بلکہ روز بروز اس کی مشکلات اور پریشانیوں میں اضافہ کرتی ہے۔ انسان کے آرام وسکون کا بہترین ذریعہ تقویٰ اور اللہ پر توکل ہے، نہ کہ حرص و دنیا پرستی۔ اس مقصد کے حصول کا بہترین راستہ وہی ہے جو اس حدیث نبویؐ میں بیان ہوا ہے:

"خُذْ مِنْ دُنْيَاكَ لِآخِرَتِكَ وَمِنْ حَيَاتِكَ لِمَوْتِكَ ،وَمِنْ صِحَّتِكَ لِسُقْمِكَ، فَإِنَّكَ لَا تَدْرِيْ مَا اسْمُكَ غَدًا"۔

''اپنی دنیا سے آخرت کا سامان اور اپنی زندگی سے بعد از موت کیلئے اور صحت کے وقت بیماری کے دنوں کیلئے سامان جمع کرو، اس لئے کہ تم نہیں جانتے کہ کل تمہارا کیا نام ہوگا (یعنی معلوم نہیں کہ کل تم زندہ کہلاؤ گے یا مردہ، بیمار کہلاؤ گے یا صحت مند)''۔ (بحار الانوار، 122:74)

دنیا کی محبت طولِ اَمل کا ایک اہم سبب ہے۔ حُبِ دُنیا میں جس قدر کمی ہوگی، اسی قدر آرزوؤں کی درازی میں کمی آتی جائے گی۔ اس کے برعکس جس قدر حُبِ دُنیا میں اضافہ ہوتا جائے گا، اسی قدر آرزوئیں بھی درازتر ہوتی جائیں گی۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو موت کا ذکر آرزوؤں کو کوتاہ کرنے کا ایک موثر ذریعہ ہے جو چشمِ بصیرت کے آگے سے غفلت کے حجابات کو دُور کر دیتا ہے اور زندگی کے حقائق اپنی اصل صورت میں انسان کے سامنے رونما ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ نہج البلاغہ کے خطبہ 99 میں امیر المومنین علیہ السلام فرماتے ہیں:

"اَلَا فَاذْكُرُوْا هَادِمَ اللَّذَّاتِ، وَمُنَغِّصَ الشَّهَوَاتِ، وَقَاطِعَ الْأُمْنِيَّاتِ"

''لذتوں کو منہدم کر دینے والی، شہوات کو درہم برہم کر دینے والی اور آرزوؤں کو منقطع کرنے والی چیز (یعنی) موت کو یاد رکھو''۔

ایک اور حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"عُدَّ نَفْسَكَ فِيْ أَصْحَابِ الْقُبُوْرِ"۔

''اپنے آپ کو مُردوں میں شمار کرو (تا کہ طولِ امل کا شکار نہ ہو جاؤ)''۔ (بحار الانوار، 122:74)

اس کے برعکس امیر المومنین علیہ السلام سے منقول ہے:

"أَكْثَرُ النَّاسِ آمَالاً أَقَلُّهُمْ لِلْمَوْتِ ذِكْرًا"۔ (تصنیف غرر الحکم: 312)

''سب سے زیادہ آرزوئیں اُن لوگوں کی ہوتی ہیں جو موت کا ذکر سب سے کم کرتے ہیں''۔

طول امل کے علاج کا ایک اور طریقہ اس کے خطرناک اور منحوس اثرات ونتائج کے بارے میں غور وفکر کرنا ہے۔ اگر انسان اس نکتہ پر توجہ کرے تو اسے معلوم ہوگا کہ آرزوہائے دراز کی وجہ سے انسان بہت سے گناہوں اور اخلاقی رذائل میں گرجاتا ہے جن کا

ذکر تفصیل کے ساتھ کیا جا چکا ہے۔

یہاں دو نکتے قابلِ ذکر ہیں:

اوّل یہ کہ جسمانی اور نفسیاتی بیماریوں کے علاج میں بیمار کے رجحان کو تبدیل کیا جاتا ہے، مثلاً جو شخص روغنیات اور نشاستے کی طرف زیادہ رجحان رکھتا ہو، اسے تازہ پھل اور سبزیاں وغیرہ کھانے کی تلقین کی جاتی ہے۔

اخلاقی بیماریوں کے علاج میں بھی یہ بات صادق آتی ہے اور معلم اخلاق کا کام ہے کہ دُنیا اور مادی اُمور سے متعلق لمبی آرزوؤں کو آخرت کی نعمتوں اور اللہ تعالیٰ کے انعام واکرم کی آرزو میں تبدیل کر دے۔ دُنیوی مال و دولت اور مقام و مرتبہ کی خواہش کو معرفتِ خدا اور قربِ الٰہی کی خواہش میں تبدیل کر دے۔

دوسرا نکتہ یہ ہے کہ ان آرزوؤں کے بھی مختلف درجات ہوتے ہیں۔ بعض اوقات انسان درازیٔ عمر کی خواہش کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں یہودیوں کے بارے میں فرماتا ہے:

"يَوَدُّ اَحَدُهُمْ لَوْ يُعَمَّرُ اَلْفَ سَنَةٍ○"

''ان میں سے ہر ایک چاہتا ہے کہ ہزار سال جیئے''۔ (بقرہ:96)

یہاں ہزار سال لامحدود عمر کا استعارہ ہے۔

ممکن ہے کوئی شخص سو سال جینے کی تمنا رکھتا ہو، اس سے کم تر ممکن ہے کہ کوئی شخص پچاس سال جینے کی آرزو رکھتا ہو۔ احادیث میں ان سب کو عمر دراز کی خواہش قرار دیا گیا ہے۔ (البتہ یہ اس صورت میں ہے کہ جب انسان دُنیا کیلئے جینے کی خواہش رکھتا ہو۔ معنوی کمالات کے حصول اور انسانیت کی خدمت کیلئے طویل عمر کی خواہش کچھ اور بات ہے)۔

مختصر یہ کہ لمبی آرزوئیں، خواہ عمر سے متعلق ہوں یا مادی لذتوں، نفسانی شہوات یا مقام و مرتبہ سے متعلق، سب مذموم اور ناپسندیدہ ہیں۔ اگرچہ ان کی برائی اور ناپسندیدگی کے درجات مختلف ہیں۔

مثبت اور تعمیری آرزوئیں:۔

طولِ امل کے مبحث میں آخری بات یہ ہے کہ ساری آرزوئیں منفی اور انسان کی شخصیت کے انحطاط اور اخلاقی پستی کی دلیل نہیں ہوتی ہیں۔ اگر آرزوؤں کا رُخ اعلیٰ اخلاقی اقدار کی طرف ہو، وہ انسانی معاشرہ کے ترقی کو مدِ نظر رکھے ہوئے ہوں اور کمال کے اعلیٰ درجات تک پہنچنے کیلئے انسان کو جدوجہد اور کوشش پر اُکساتی ہوں تو ایسی آرزوئیں جس قدر بھی دراز اور طولانی ہوں، وہ انسان کے کمال کی علامت ہوتی ہیں۔ پستی سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہوتا۔

جیسا کہ آغازِ بحث میں بیان ہو چکا ہے کہ مستقبل کے بارے میں اُمید اور آرزو ہی انسان کو کوشش اور عمل کرنے پر آمادہ کرتی ہے، اگر کسی انسان کے دل میں اُمید کا چراغ بجھ جائے تو درحقیقت اس کی رُوح مر جاتی ہے، اس کی زندگی لذت اور نشاط سے

خالی ہوجاتی ہے۔ایسا انسان ایک بے مقصد اور سست رفتار موجود میں تبدیل ہوجاتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ انسان کی آرزوئیں دو قسم کی ہوتی ہیں: جھوٹی آرزوئیں، جن کی حیثیت سراب کی سی ہوتی ہے۔ یہ سراب انسان کی زندگی کے صحرا میں نمودار ہوتا ہے اور پیاسے انسانوں کو اپنی طرف کھینچ لیتا ہے۔نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان جس قدر اس کا تعاقب کرتا ہے، اُسی قدر اس کی پیاس میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے، یہاں تک کہ وہ پیاس کی شدت سے ہلاک ہوجاتا ہے۔

آرزوؤں کی دُوسری قسم سچی آرزوئیں ہیں جو انسان کی زندگی کے گلستان کیلئے آبِ حیات کی حیثیت رکھتی ہیں اور اُسے سیراب کر کے ثمر بار کر دیتی ہیں۔ ان آرزوؤں کی بنیاد پر انسان جس قدر محنت اور کوشش کرتا ہے، اُس کی زندگی کی لذت ونشاط ومعنویت میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔

قرآن شریف اس حقیقت کا ذکر اس طرح فرماتا ہے:

"اَلْمَالُ وَالْبَنُوْنَ زِيْنَةُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَالْبٰقِيٰتُ الصّٰلِحٰتُ خَيْرٌ عِنْدَ رَبِّكَ ثَوَابًا وَّخَيْرٌ اَمَلًا○"۔

''مال اور اولاد زندگی ودُنیا کی زینت ہیں، جبکہ باقی رہنے والے اعمالِ صالح تمہارے رب کے ہاں اجر وثواب کیلئے بہتر اور زیادہ اُمید کا باعث ہیں۔'' (کہف:46)

اس آیت میں دونوں قسم کی آرزوؤں کی طرف اشارہ کر دیا گیا ہے۔

احادیث میں بھی مثبت اور تعمیری آرزوؤں کے بارے میں انتہائی بامعنی بیانات ملتے ہیں۔حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

"اِنَّ الْعَبْدَ الْمُؤْمِنَ الْفَقِيْرَ لَيَقُوْلُ يَارَبِّ ارْزُقْنِيْ حَتّٰى اَفْعَلَ كَذَاوَ كَذَامِنَ الْبِرِّوَوُجُوْهِ الْخَيْرِ، فَاِذَاعَلِمَ اللهُ ذٰلِكَ مِنْهُ بِصِدْقِ نِيَّتِهٖ كَتَبَ اللهُ لَهُ مِنَ الْاَجْرِ مِثْلَ مَايَكْتُبُ لَهُ لَوْعَمِلَهُ،اِنَّ اللهَ وَاسِعٌ كَرِيْمٌ"۔(بحار الانوار، 261:8)

''جب اللہ کا کوئی نادار بندہ اس طرح دُعا کرتا ہے کہ یا اللہ! تو مجھے وسعتِ رزق عطا فرما تا کہ میں فلاں فلاں کارِخیر میں صرف کروں، اللہ کو اگر معلوم ہو کہ اس کی نیت سچی ہے تو وہ ان کارہائے خیر کا ثواب اس کے نامہ اعمال میں لکھ دے گا، خواہ فی الواقع اُس نے وہ انجام نہ دیئے ہوں۔اللہ کا کرم بہت وسیع ہے''۔

بنیادی بات یہ ہے کہ ہر انسان کی قدر و قیمت کو جانچنے کا پیمانہ اُس کی مثبت اور تعمیری آرزوئیں ہیں۔جس قدر مثبت اور تعمیری آرزوئیں وسیع تر اور عظیم تر ہوں گی، اُسی قدر اس انسان کی ہمت بھی عظیم اور بلند ہوگی۔احادیث میں بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ مومن انسان کو اس کی آرزوؤں کی عظمت کے مطابق اجر اور صلہ عطا فرمائے گا، اس لئے کہ ان کی رُوح اور جسم زیادہ سے زیادہ اعمالِ صالح انجام

دینے کیلئے آمادہ ہوتے ہیں۔

بعض احادیث میں ہے کہ اگر کوئی شخص کسی اچھے مقصد کا متمنی ہو اور اللہ کی رضا کیلئے اس مقصد کو حاصل کرنا چاہتا ہو تو اللہ تعالیٰ اُس کی زندگی کے خاتمے سے پہلے اس کی اس تمنا کو عملی جامہ پہنا دیتا ہے۔ جنابِ رسولؐ خدا کا ارشاد ہے:

"مِنْ تَمَنّٰی شَیْئًا وَّ ھُوَ لِلّٰہِ عَزَّوَجَلَ رِضًا، لَمْ یَخْرُجْ مِنَ الدُّنْیَا حَتّٰی یُعْطَاہُ"۔

''اگر کوئی شخص کسی چیز کی آرزو کرے اور اس میں اللہ کی رضا بھی ہو تو اللہ تعالیٰ اُسے اس وقت تک دُنیا سے نہیں نکالتا جب تک کہ اُس کی آرزو اُسے عطا نہ کر دے۔'' (بحار الانوار، 261:68)

البتہ بعض اوقات ممکن ہے کہ مشیتِ الٰہی کا تقاضا یہ ہو کہ انسان کی آرزو پوری نہ ہو، اس لئے کہ ہوسکتا ہے کہ آرزو پوری ہونے پر وہ غرور و تکبر، حُبِ دُنیا، غفلت اور ایسی دیگر بیماریوں میں مبتلا ہو جائے۔ ایسی صورت میں ان آرزوؤں کی تکمیل کا راستہ روکنا اللہ تعالیٰ کا ایک مخفی لطف ہوتا ہے۔

اس بحث کو ہم اس نکتہ پر ختم کرتے ہیں کہ تعمیرِ آرزوئیں انسان کو کردار کی تعمیر کا جذبہ دیتی ہیں اور رُوحانی ارتقاء کا ذریعہ بنتی ہیں، اس لئے کہ بزرگی کے اسباب فراہم کئے بغیر بزرگی حاصل نہیں کی جاسکتی۔ ایک عرب شاعر کا کہنا ہے:

أُعَلِّلُ النّفس بالآ مال أُدرکُھَا
مَااَضْیَقَ الْعَیْشُ لَوْلَا فُسْحَۃُ الْاَمَلِ

''میں تعمیری آرزوؤں کے ذریعہ اپنے آپ کو تعمیر کرتا ہوں تا کہ انہیں حاصل کر سکوں، اگر آرزوئیں وسیع نہ ہوں تو زندگی کا میدان کس قدر تنگ ہو جائے''۔

آٹھواں باب

تعصُّب اور ضد

تمہید:۔

اس بات میں کوئی شک وشبہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ کی بندگی وعبودیت کی بنیاد یہ ہے کہ انسان حق کے سامنے تواضع اور خضوع اختیار کرے اور حق کے سامنے سرِ تسلیم خم کردے۔ اس کے برعکس ہر قسم کی ضد اور تعصب کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان حق سے دُور اور سعادت سے محروم ہوجاتا ہے۔

تعصب کسی چیز کے ساتھ غیر معقول اور غیر منطقی وابستگی کو کہتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان حق کو اُس چیز پر قربان کر دیتا ہے۔ ضد، جس کیلئے فارسی میں لجاجت کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے، کسی چیز پر اس طرح اصرار کرنے کو کہتے ہیں کہ انسان عقل ومنطق کو پیروں تلے روند ڈالتا ہے۔ تعصب اور لجاجت کا نتیجہ اندھی تقلید کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے جو انسان کی ترقی وتکامل کی راہ میں ایک بڑی رکاوٹ ہے۔

جب ہم انبیاؑ کے حالات زندگی کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں یہ حقیقت واضح طور پر دکھائی دیتی ہے کہ ان کی قوموں کی گمراہی کا سبب تعصب، ضد اور اندھی تقلید کے سوا کچھ نہ تھا۔ قرآن شریف نے اس حقیقت کو اچھی طرح سے بیان فرمایا ہے۔ اس مختصر تمہید کے بعد ہم قرآنی آیات کی روشنی میں اس موضوع کا جائزہ لیتے ہیں اور حضرت نوح علیہ السلام کی قوم سے آغاز کرتے ہیں۔

قرآن مجید فرماتا ہے:

1۔ "وَاِنِّیۡ کُلَّمَا دَعَوۡتُہُمۡ لِتَغۡفِرَ لَہُمۡ جَعَلُوۡۤا اَصَابِعَہُمۡ فِیۡۤ اٰذَانِہِمۡ وَاسۡتَغۡشَوۡا ثِیَابَہُمۡ وَاَصَرُّوۡا وَاسۡتَکۡبَرُوا اسۡتِکۡبَارًا۔"

''اور میں نے جب بھی انہیں بلایا تاکہ تو انہیں بخش دے تو انہوں نے اپنی اُنگلیاں اپنے کانوں میں ٹھونس لیں اور اپنے کپڑے اپنے اوپر اوڑھ لیتے اور اپنی روِش پر اصرار کرتے رہے اور خوب استکبار کا مظاہرہ کیا''۔(نوح:7)

2۔ "وَقَالُوۡا لَا تَذَرُنَّ اٰلِہَتَکُمۡ وَلَا تَذَرُنَّ وَدًّا وَّلَا سُوَاعًا ۬ۙ وَّلَا یَغُوۡثَ وَیَعُوۡقَ وَنَسۡرًا ۝"

''اور انہوں (قوم نوحؑ) نے کہا: اپنے خداؤں کو نہ چھوڑو، خاص طور پر ود، سواع اور نسر کو نہ چھوڑو''۔(نوح:23)

اس کے بعد حضرت ہودؑ کی قوم کا قصہ بیان ہوا ہے:

3۔ "قَالُوْٓا اَجِئْتَنَا لِنَعْبُدَ اللّٰهَ وَحْدَهٗ وَنَذَرَ مَا كَانَ يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَا ۚ فَاْتِنَا بِمَا تَعِدُنَآ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ"۔

''انہوں نے کہا: تم اس لئے آئے ہو کہ ہم ایک اللہ کی عبادت کریں اور ان معبودوں کو چھوڑ دیں جن کی پرستش ہمارے آباؑ واجداد کرتے تھے اگر تم سچے ہو تو لے آؤ وہ عذاب جس سے تم ہم کو ڈراتے رہتے ہو''۔(اعراف:70)

پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے واقعہ میں ہے:

4۔ "اِذْ قَالَ لِاَبِيْهِ وَقَوْمِهٖ مَا هٰذِهِ التَّمَاثِيْلُ الَّتِيْٓ اَنْتُمْ لَهَا عٰكِفُوْنَ○قَالُوْا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا لَهَا عٰبِدِيْنَ"

''جب ابراہیمؑ نے اپنے باپ اور اپنی قوم سے کہا کہ یہ کیسی مورتیاں ہیں جن کی تم پرستش کرتے ہو؟ انہوں نے جواب دیا کہ ہم نے اپنے آباؑ واجداد کو ان کی عبادت کرتے ہوئے دیکھا ہے''۔(انبیاؑ:52و53)

5۔ قَالَ هَلْ يَسْمَعُوْنَكُمْ اِذْ تَدْعُوْنَ۝ اَوْ يَنْفَعُوْنَكُمْ اَوْ يَضُرُّوْنَ۝ قَالُوْا بَلْ وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا كَذٰلِكَ يَفْعَلُوْنَ۝

''اُس نے کہا: کیا جب تم انہیں پکارتے ہو تو وہ تمہیں جواب دیتے ہیں؟ یا تمہیں کوئی نفع یا نقصان پہنچا سکتے ہیں؟ انہوں نے جواب دیا کہ ہم نے اپنے آباؑ واجداد کو ایسا کرتے ہوئے پایا ہے''۔(شعراؑ:72تا74)

اس کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم اور فرعون کی داستان آتی ہے۔قرآن مجید فرماتا ہے:

6۔ "قَالُوْٓا اَجِئْتَنَا لِتَلْفِتَنَا عَمَّا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا وَتَكُوْنَ لَكُمَا الْكِبْرِيَآءُ فِي الْاَرْضِ ۭ وَمَا نَحْنُ لَكُمَا بِمُؤْمِنِيْنَ"۔

''(فرعونیوں نے موسیٰ علیہ السلام سے) کہا: کیا تم اس لئے آئے ہو کہ ہمیں ہمارے آباؑ واجداد کی راہ سے ہٹا دو اور تم دونوں کو معاشرے میں ہم پر برتری حاصل ہو جائے؟ ہم تو تمہاری بات ماننے والے نہیں ہیں''۔(یونس:78)

7۔ "وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ اتَّبِعُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَآ اَلْفَيْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا ۭ اَوَلَوْ كَانَ اٰبَآؤُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ شَيْـــًٔا وَّلَا يَهْتَدُوْنَ"۔

''جب ان سے کہا جاتا ہے کہ جو کچھ اللہ نے نازل کیا ہے، اس کی اتباع کرو تو وہ کہتے ہیں: ہم تو اس راہ کی اتباع کریں گے جس پر ہم نے اپنے آباؤ اجداد کو پایا۔ آیا اگر ان کے آباؤ اجداد کچھ عقل نہ رکھتے تھے اور ہدایت یافتہ بھی نہ تھے تو کیا پھر بھی یہ ان کی راہ کی اتباع کریں گے؟'' (بقرہ:170)

8۔ ''اِذْ جَعَلَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا فِیْ قُلُوْبِهِمُ الْحَمِیَّةَ حَمِیَّةَ الْجَاهِلِیَّةِ فَاَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِیْنَتَهٗ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَعَلَى الْمُؤْمِنِیْنَ وَاَلْزَمَهُمْ كَلِمَةَ التَّقْوٰى وَكَانُوْۤا اَحَقَّ بِهَا وَاَهْلَهَا ؕ وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمًا ۝''

''جب کفار نے اپنے دل جاہلیت کے تعصب سے بھرے ہوئے تھے تو اس نے اپنے رسول اور مومنین پر اپنی تسکین نازل کی اور انہیں تقویٰ کی بات پر ثابت قدم رکھا اور وہ اس کے زیادہ حقدار تھے، بے شک اللہ ہر چیز کا علم رکھتا ہے۔'' (فتح:26)

9۔ ''وَلَوْ نَزَّلْنٰهُ عَلٰى بَعْضِ الْاَعْجَمِیْنَ ۝ فَقَرَاَهٗ عَلَیْهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ مُؤْمِنِیْنَ ۝''

''اگر ہم قرآن مجید کو کسی عجمی پر نازل کرتے اور وہ یہ قرآن انہیں سناتا تو یہ ہرگز اس پر ایمان نہ لاتے''۔ (شعرا:198 تا 199)

مختلف اقوام کے ایک دوسرے کے خلاف تعصب کے بارے میں قرآن مجید فرماتا ہے:

10۔ ''وَقَالَتِ الْیَهُوْدُ لَیْسَتِ النَّصٰرٰى عَلٰى شَیْءٍ ۖ وَّقَالَتِ النَّصٰرٰى لَیْسَتِ الْیَهُوْدُ عَلٰى شَیْءٍ ۙ وَّهُمْ یَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ ؕ كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِیْنَ لَا یَعْلَمُوْنَ مِثْلَ قَوْلِهِمْ ۚ فَاللّٰهُ یَحْكُمُ بَیْنَهُمْ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ فِیْمَا كَانُوْا فِیْهِ یَخْتَلِفُوْنَ ۝''

''یہودیوں نے کہا: نصاریٰ کا اللہ کے ہاں کوئی مقام نہیں ہے اور نصاریٰ نے کہا: یہودیوں کا اللہ کے ہاں کوئی مقام نہیں ہے، حالانکہ دونوں اللہ کی کتاب کو پڑھتے تھے (لہٰذا ان میں ایسے تعصّبات نہیں ہونے چاہیں تھے) اسی طرح جاہل (مشرکین) بھی ان جیسی باتیں کرتے ہیں۔ اللہ قیامت کے دن ان کے اختلافات کا فیصلہ کردے گا''۔ (بقرہ:113)

ایک اور مقام پر اللہ تعالیٰ نے تعصب، ضد اور اندھی تقلید کو ایک گمراہ قوم کی گمراہی کا سبب قرار دیا:

11۔ ''وَكَذٰلِكَ مَاۤ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ فِیْ قَرْیَةٍ مِّنْ نَّذِیْرٍ اِلَّا قَالَ مُتْرَفُوْهَاۤ ۙ اِنَّا وَجَدْنَاۤ اٰبَآءَنَا عَلٰۤى اُمَّةٍ وَّاِنَّا عَلٰۤى اٰثٰرِهِمْ مُّقْتَدُوْنَ''۔

''اوراسی طرح جب بھی ہم نے کسی بستی میں کوئی خبردار کرنے والا بھیجا تو ان کے عیش پرست افراد نے کہا: ہم نے اپنے آباؤاجداد کوایک طریقے پر پایا ہےاور ہم انہی کے نقش قدم پر چلیں گے''۔(زخرف:23)

12۔ "وَيَقُوْلُوْنَ اَئِنَّا لَتَارِكُوْٓا اٰلِهَتِنَا لِشَاعِرٍ مَّجْنُوْنٍ○"

''اور وہ کہتے ہیں: کیا ہم ایک مجنون شاعر کیلئے اپنے معبودوں کو چھوڑ دیں؟''۔(الصافات:36)

تفسیر اور نتیجہ

گمراہ اقوام کی عمومی روِش:۔

جیسا کہ مذکورہ بالا آیات میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ مندرجہ بالا تینوں اخلاقی برائیاں یعنی تعصب،ضداور اندھی تقلید ہی ماضی کی تمام گمراہ اقوام کی عمومی روِش تھی۔وہ اپنے جاہلانہ افکاراور طرزِ زندگی سے شدید وابستگی کی وجہ سے ان کے بارے میں اپنے بزرگوں کی اندھا دھند تقلید کرتے جس کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ اللہ تعالیٰ کے بھیجے ہوئے ہادیانِ برحق کی صدا ان کے تعصب ،ضداور اندھی تقلید کے نقارخانے میں طوطی کی آواز بن کر رہ جاتی تھی۔

حضرت نوح علیہ السلام کے واقعہ سے شروع کرتے ہیں۔آپؑ کے دَور کے بت پرست اس قدر متعصب اور ضدی تھے کہ وہ اس اولوالعزم رسول کی صدائے توحید سے وحشت زدہ ہوجاتے تھے۔مذکورہ بالا آیات میں سے پہلی آیت میں ہم حضرت نوح علیہ السلام کا یہ جملہ دیکھتے ہیں:

"وَاِنِّيْ كُلَّمَا دَعَوْتُهُمْ لِتَغْفِرَ لَهُمْ جَعَلُوْٓا اَصَابِعَهُمْ فِيْٓ اٰذَانِهِمْ وَاسْتَغْشَوْا ثِيَابَهُمْ وَاَصَرُّوْا وَاسْتَكْبَرُوا اسْتِكْبَارًا ۚ"(نوح:7)

''میں نے جب بھی انہیں ایمان لانے کی دعوت دی تاکہ (اے خدا) تو انہیں بخش دے ، انہوں نے اپنی اُنگلیاں اپنے کانوں میں ٹھونس لیں اور اپنے کپڑے کھینچ کر اپنے سر اور چہروں پر ڈال دیئے،انہوں نے حق کی مخالفت پر اسرار جاری رکھا اور شدید تکبر کا مظاہرہ کیا''۔

جی ہاں!ان کا تعصب اس قدر شدید تھا کہ وہ حضرت نوح علیہ السلام کی آواز کو، جو پیغامِ حق کی حامل تھی،اپنے کانوں میں داخل ہونے کی اجازت دینے پر تیار نہ تھے اور نہ ہی ان کی شکل دیکھنے کے روادار تھے۔حق سے اس طرح دور بھاگنا واقعی نہ صرف حیرت انگیز بلکہ خطرناک بھی ہے۔

دُوسری آیت میں بھی حضرت نوح علیہ السلام کی قوم کی اسی اخلاقی برائی کی ایک اور جھلک دکھائی گئی ہے۔قرآن مجید

کہتا ہے:

"وَقَالُوْا لَا تَذَرُنَّ اٰلِهَتَكُمْ وَلَا تَذَرُنَّ وَدًّا وَّلَا سُوَاعًا ۙ وَّلَا يَغُوْثَ وَيَعُوْقَ وَنَسْرًا ۝"(نوح:23)

''اورانہوں (قوم نوحؑ) نے کہا: اپنے خداؤں کو نہ چھوڑو، خاص پرود، سواع اور نسر کو نہ چھوڑو''۔

اب اگر ان سے پوچھا جائے کہ آخر کیا بات ہے کہ تم اپنے ہاتھوں کے تراشے ہوئے بتوں کو اپنی اور ساری کائنات کی تقدیر کا مالک سمجھتے ہو؟ تو ان کے پاس تعصب اور اندھی تقلید کے علاوہ اور کوئی دلیل موجود نہیں۔

تیسری آیت میں قومِ عاد اور اُن کے رسول حضرت ہودؑ کے درمیان ہونے والی گفتگو کو بیان کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

"قَالُوْٓا اَجِئْتَنَا لِنَعْبُدَ اللّٰهَ وَحْدَهٗ وَنَذَرَ مَا كَانَ يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَا ۚ فَاْتِنَا بِمَا تَعِدُنَآ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ۝"(اعراف: 70)

یعنی قومِ ہودؑ اس قدر ضدی، متعصب اور جاہل تھی کہ اللہ کے رسول کی دعوتِ توحید کے جواب میں کہنے لگی: کیا تم اس لئے ہمارے پاس آئے ہو کہ ہم صرف اللہ کی عبادت کریں اور اپنے آباؤ اجداد کے معبودوں کو چھوڑ دیں؟ (ہم تو ایسا نہیں کریں گے) اگر تم سچے ہو تو لے آؤ وہ عذاب جس کا تم ہم سے وعدہ کر رہے ہو۔

یہ اُن کے تعصب، ضد اور اندھی تقلید کا نتیجہ تھا کہ وہ خالص توحید سے، جو عالم ہستی کی روح ہے، اس طرح وحشت زدہ ہو رہے تھے اور عقل وشعور سے عاری بتوں کی پرستش اُن کی نظر میں دلکش اور جاذب تھی، یہاں تک کہ وہ نقصان سے بچنے کے آفاقی اصول کے پیش نظر اللہ کے عذاب سے بچنے کی کوشش کرنے کی بجائے اصرار کر رہے تھے کہ اگر تم سچے ہو تو جس عذاب سے ہمیں ڈرا رہے ہو، اُسے لے ہی آؤ۔

اس طرح وہ حق سے فرار اور اندھی تقلید پر اصرار کرتے رہے۔

چوتھی آیت میں نمرود اور قومِ نمرود کی حالت کا ذکر ہے جو تعصب اور ہٹ دھرمی کی بدولت ان پر آئی۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

"اِذْ قَالَ لِاَبِيْهِ وَقَوْمِهٖ مَا هٰذِهِ التَّمَاثِيْلُ الَّتِيْٓ اَنْتُمْ لَهَا عٰكِفُوْنَ ۝"(انبیأ: 52)

حضرت ابراہیمؑ نے اپنے باپ (چچا آذر) سے کہا: یہ بے جان مورتیاں کیا ہیں جن کی تم پرستش کرتے ہو؟

اُن کی قوم کے پاس کوئی جواب نہیں تھا، لہٰذا وہ کہنے لگے:

"قَالُوْا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا لَهَا عٰبِدِيْنَ ۝"(انبیأ: 53)

''انہوں نے کہا: ہم نے اپنے آباؤاجداد کو ان کی عبادت کرتے ہوئے دیکھا ہے''۔

جب حضرت ابراہیمؑ نے انہیں کہا کہ تم بھی گمراہ ہو اور تمہارے باپ دادا بھی گمراہ تھے تو وہ پھر بھی بیدار نہ ہوئے۔ حضرت ابراہیمؑ نے ان کے بتوں کا کھوکھلا پن ظاہر کرنے کیلئے انہیں توڑ ڈالا۔ پھر بھی انہیں عقل نہ آئی بلکہ انہوں نے حضرت ابراہیمؑ کو آگ میں جلانے کا منصوبہ بنالیا اور اس منصوبے پر عمل کرتے ہوئے انہیں آگ میں پھینک دیا۔ جب آگ حضرت ابراہیمؑ کو جلانے کی بجائے ٹھنڈی ہوگئی اور گلستان بن گئی اور انہوں نے یہ عظیم معجزہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا، پھر بھی ضد، تعصب اور جہالت کی راہ پر چلنے سے باز نہ آئے۔

ان سب باتوں سے یہ حقیقت آشکار ہو جاتی ہے کہ تعصب اور ضد اس قدر خطرناک اخلاقی برائی ہیں کہ انسان پر آزادی سے سوچنے اور حق کی طرف جانے کے راستے بند کر دیتی ہیں۔ ایک بار جو شخص ان کے چنگل میں پھنس جائے، وہ ہر ذِلت اور حقارت کو قبول کرنے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ یہ برائیاں اس انسانی مقام کی عظمت اور اُس کی روح کی بلندی کو چکنا چور کر دیتی ہیں مگر وہ حق کے سامنے سرِ تسلیم خم نہیں کرتا۔

پانچویں آیت میں بھی نمرود کی قوم کی متعصّبانہ بت پرستی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ حضرت ابراہیمؑ نے انتہائی واضح اور دو ٹوک دلیل سے بت پرستی کا ابطال کرتے ہوئے فرمایا:

قَالَ هَلْ يَسْمَعُوْنَكُمْ اِذْ تَدْعُوْنَ ﴿۷۲﴾ اَوْ يَنْفَعُوْنَكُمْ اَوْ يَضُرُّوْنَ ﴿۷۳﴾

ابراہیمؑ نے کہا: جب تم انہیں بلاتے ہو تو کیا یہ تمہاری بات سنتے ہیں؟ یا کیا یہ تمہیں کوئی نفع یا نقصان پہنچاتے ہیں؟ (شعراء۔73:72)

ان کے پاس اس واضح منطقی دلیل کا کوئی جواب نہ تھا۔ انہوں نے اندھی تقلید کی پناہ لیتے ہوئے کہا:

"قَالُوْا بَلْ وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا كَذٰلِكَ يَفْعَلُوْنَ"

''ہم نے اپنے آباؤاجداد کو ایسا کرتے ہوئے دیکھا ہے''۔ (شعرأ:74)

حالانکہ اگر انسان کو تقلید کرنا بھی ہو تو کسی عالم اور دانش مند کی تقلید کرنی چاہئے، نہ کہ کسی متعصب جاہل کی۔ لیکن متعصب اور ہٹ دھرمی کا حجاب اس قدر ضخیم ہوتا ہے کہ آفتابِ ہدایت کی روشنی، منطق اور عقلی دلائل اس کے اندر سے گزر کر دُوسری طرف روشنی نہیں کر سکتے۔

چھٹی آیت میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے واضح معجزات کے سامنے فرعون اور اُس کے ساتھیوں کی ضد اور ہٹ دھرمی کا ذکر ہے۔ انہوں نے اپنے آباؤاجداد کی بت پرستی کی روِش پر اصرار کرتے ہوئے حضرت موسیٰؑ کو جواب دیا:

"قَالُوْٓا اَجِئْتَنَا لِتَلْفِتَنَا عَمَّا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا وَتَكُوْنَ لَكُمَا الْكِبْرِيَآءُ فِي الْاَرْضِ ۭ وَمَا

نَحْنُ لَكُمَا بِمُؤْمِنِيْنَ"۔

انہوں نے کہا: کیا تم اس لئے آئے ہو کہ ہمیں اس راہ سے پھیر دو جس پر ہم نے اپنے آباء واجداد کو پایا ہے اور تم دونوں کو زمین میں بڑائی حاصل ہو جائے؟ ہم تو دونوں کی بات ماننے والے نہیں ہیں (یونس:78)

انہوں نے کبھی اس بات پر غور کرنے کی زحمت نہیں کی کہ آیا موسیٰ علیہ السلام دین حق ہے یا باطل اور یہ کہ اسے ان کے آباؤ اجداد کے دین پر کوئی برتری حاصل ہے یا نہیں؟ وہ تو اس بات کی رٹ لگا رہے تھے کہ ہم تو اپنے آباؤاجداد کی روِش کی حفاظت کریں گے، خواہ وہ حق ہو یا باطل، ہمارے لئے یہی اہم ہے۔

صرف یہی نہیں بلکہ وہ بدگمانی سے کام لیتے ہوئے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر الزام لگاتے ہیں کہ تمہارا مقصد یہ ہے کہ ہمیں ہمارے آباؤاجداد کی روِش سے ہٹا کر تم ہم پر حکومت کرنا چاہتے ہو؟ درحقیقت تم نے اپنے سیاسی مقاصد کے حصول کیلئے یہ سارا سلسلہ شروع کر رکھا ہے ورنہ کوئی خدا ہے اور نہ کوئی وحی اور نہ ہی کوئی رسالت!

اُن کی یہ بدگمانی بھی ان کے تعصب کا نتیجہ تھی اور وہ حق سے فرار کیلئے بے بنیاد عذر تراشی کر رہے تھے۔ شاید وہ اس بات سے خوفزدہ تھے کہ اگر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لائے ہوئے دین کی روشنی نے مصر کے لوگوں کے افکار کو منور کر دیا تو نہ صرف یہ کہ ان کے آباؤاجداد کا بیہودہ دین تباہ ہو جائے گا بلکہ ان کی حکومت کا بھی خاتمہ ہو جائے گا۔ لہٰذا وہ پوری قوت کے ساتھ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سامنے محاذ آرائی پر اُتر آئے اور لوگوں میں بھی تعصب اور ضد کی آگ کو ہوا دینے لگے۔ چونکہ فرعون اور اُس کے درباری صرف اپنی حکومت بچانے کیلئے فکرمند تھے، لہٰذا وہ سمجھتے تھے کہ موسیٰ علیہ السلام اور ہارون علیہ السلام بھی سب کچھ حکومت حاصل کرنے کیلئے کر رہے تھے۔

یہ سلسلہ تاریخ کے ہر دور میں جاری رہا، یہاں تک کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا دور آ گیا۔

ساتویں آیت میں بھی ہم دیکھتے ہیں کہ مشرکین عرب کی گمراہی کا بنیادی سبب اندھی تقلید اور تعصب کے سوا کچھ نہ تھا۔ ان کے اس تعصب کا اثر یہ تھا کہ معرفتِ حق کے تمام دروازے ان پر بند ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ ان کی حالت کو اس طرح بیان فرماتا ہے:

"وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ اتَّبِعُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَآ اَلْفَيْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا ؕ

''جب ان سے کہا جاتا ہے کہ جو کچھ اللہ نے نازل کیا ہے، اس کی اتباع کرو تو وہ کہتے ہیں: ہم تو اس راہ کی اتباع کریں گے جس پر ہم نے اپنے آباؤاجداد کو پایا۔'' (بقرہ:170)

قرآن مجید انہیں دندان شکن جواب دیتے ہوئے فرماتا ہے:

اَوَلَوْ كَانَ اٰبَآؤُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ شَيْـًٔا وَّلَا يَهْتَدُوْنَ"۔ (بقرہ:170)

''کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ ان کے آباؤاجداد عقل سے کام نہ لیتے تھے اور ہدایت یافتہ نہ تھے؟''

آیت کے الفاظ سے یہ بات بخوبی واضح ہوجاتی ہے کہ وہ اس بات کا انکار نہیں کرتے تھے کہ رسول اللہ ﷺ جو کچھ پیش کررہے ہیں، وہ ''مَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ'' یعنی اللہ کا نازل کردہ تھا بلکہ وہ جہالت اور تعصب میں اس قدر اندھے ہو چکے تھے کہ اپنے آباؤ اجداد کے دین کو اس پر مقدم گردانتے تھے، وہ آباؤ اجداد جن کی جہالت اور گمراہی بھی اُن پر واضح تھی۔

اس طرح جہالت وتعصب کی وجہ سے انسان اس مقام پر آجاتا ہے کہ اللہ کی نازل کردہ ہدایات کو ترک کر کے حق کی طرف پشت کرلیتا ہے اور باطل کو گلے سے لگائے رہتا ہے، حالانکہ وہ حق اور باطل کو پہچانتا ہے۔

آٹھویں آیت میں اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو حدیبیہ کا واقعہ یاد دلا رہا ہے کہ کس طرح کفار رسول اللہ ﷺ کی حقانیت کے تمام دلائل کو دیکھنے کے باوجود دورِ جاہلیت کے تعصب کی وجہ سے ایمان لانے پر تیار نہ ہوئے اور اس اخلاقی برائی نے انہیں ایک عظیم سعادت سے محروم کردیا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

''اِذْ جَعَلَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا فِیْ قُلُوْبِھِمُ الْحَمِیَّۃَ حَمِیَّۃَ الْجَاھِلِیَّۃِ فَاَنْزَلَ اللّٰہُ سَکِیْنَتَہٗ عَلٰی رَسُوْلِہٖ وَعَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ وَاَلْزَمَھُمْ کَلِمَۃَ التَّقْوٰی وَکَانُوْٓا اَحَقَّ بِھَا وَاَھْلَھَا ؕ وَکَانَ اللّٰہُ بِکُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمًا ○''

''یاد کرو جب کفار نے اپنے دل جاہلیت کے تعصب سے بھر لیا تھا تو (اور نہ صرف یہ کہ ایمان نہیں لائے بلکہ مقابلے پر اتر آئے) اس کے برعکس اللہ نے اپنے رسول اور مومنین پر اپنی تسکین نازل کی (تاکہ وہ حق اور عدالت کے اصولوں پر قائم رہتے ہوئے متعصب دُشمنوں کا مقابلہ کرسکیں) اور اس نے انہیں تقویٰ کی بات پر پختہ کردیا اور وہ اس کے حقدار اور اہل تھے، بے شک اللہ ہر چیز کا علم رکھنے والا ہے۔'' (فتح:26)

اس آیت میں حمیت کا لفظ استعمال ہوا ہے جو ''حَمٌّ'' (بروزن حَمْدٌ) سے مشتق ہے اور یہ اس حرارت کو کہتے ہیں جو بیرونی عوامل کی وجہ سے انسان یا کسی اور چیز میں پیدا ہوجاتی ہے۔ اسی وجہ سے بخار کو بھی عربی میں ''حُمّٰی'' کہتے ہیں۔

عربی میں یہ لفظ غصے، تکبر اور تعصب پر بھی بولا جاتا ہے کیونکہ یہ انسان کے اندر ایک قسم کی گرمی پیدا کردیتے ہیں۔

یہ نکتہ بھی قابل غور ہے کہ آیت میں حمیت کو جاہلیت کی طرف نسبت دی گئی ہے جو اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ ان کے تعصب کی بنیاد جہالت اور نادانی ہے۔ اس کے برعکس تسکین کو اللہ کی طرف نسبت دی گئی ہے، اس لئے کہ یہ تسکین اللہ پر ایمان کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے اور اس میں آگاہی ومعرفت کا عنصر بھی شامل ہوتا ہے۔

اگلے مباحث میں ہم مثبت اور منفی تعصب پر روشنی ڈالتے ہوئے حمیت کو جاہلیت کی طرف نسبت دینے کے نکتہ کو مزید واضح کریں گے۔

نویں آیت میں ایک اور نکتے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جو زمانہ جاہلیت کے مشرکینِ عرب کے شدید تعصب سے پردہ

اُٹھا رہا ہے۔اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

"وَلَوْ نَزَّلْنٰهُ عَلٰى بَعْضِ الْاَعْجَمِيْنَ○فَقَرَاَهٗ عَلَيْهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ مُؤْمِنِيْنَ○"

اگرہم اس قرآن کوکسی غیرعرب پرنازل کرتے اوروہ اسے ان کے سامنے پڑھتا تو یہ اس پرایمان نہ لاتے۔(شعرا:198 تا199)

یہ آیت اس حقیقت کو بیان کررہی ہے کہ اگران اعلیٰ وارفع مطالب ومعارف پرمشتمل یہ فصیح وبلیغ قرآن کسی غیرعرب پر نازل کرتے تو یہ عرب اپنے تعصب کی وجہ سے اس پرایمان نہ لاتے۔

اس سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ تعصب اورہٹ دھرمی کس قدر بری صفت ہے اورانسان کوحق سے دُور رکھنے میں کس قدر گہرا کردارادا کرتی ہیں۔

بعض مفسرین نے اس آیت کے بعض اورمعنی بھی بیان کیے ہیں مگر ہماری نظر میں یہی معنی درست ہیں جوہم نے بیان کئے ہیں۔

اسی وجہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک حدیث میں تمام متعصب افرادکو جاہلیت کے عربوں کے انجام میں شریک قرار دیاہے:

"مَنْ كَانَ فِيْ قَلْبِهٖ حَبَّةٌ مِنْ خَرْدَلٍ مِنْ عَصَبِيَّةٍ بَعَثَهُ اللهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ مَعَ اَعْرَابِ الْجَاهِلِيَّةِ"۔

''جس کے دل میں رائی کے دانے کے برابربھی تعصب ہو، قیامت کے دن اللہ اسے جاہلیت کے عربوں کے ساتھ محشور کرے گا''۔(اصول کافی،2:308)

دسویں آیت میں تعصب کا ایک اور پہلو بیان کیا گیا ہے جس کی وجہ سے بعض اقوام یا گروہوں کے افراد اپنے آپ کوسب اقوام اورگروہوں سے بہتر سمجھتے ہیں اور دوسری اقوام کے افرادکوکم تر سمجھتے ہیں۔گویا وہی اللہ کی برگزیدہ ترین قوم ہیں اوردوسرے کچھ بھی نہیں ہیں۔اسی بنیاد پرمختلف اقوام کے درمیان ایک مسلسل جنگ جاری رہتی ہے۔اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

"وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ لَيْسَتِ النَّصٰرٰى عَلٰى شَيْءٍ ۖ وَّقَالَتِ النَّصٰرٰى لَيْسَتِ الْيَهُوْدُ عَلٰى شَيْءٍ ۙ وَّهُمْ يَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ ۭ كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ مِثْلَ قَوْلِهِمْ ۚ فَاللّٰهُ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ○"

یہودیوں نے کہا کہ اللہ کے ہاں مسیحیوں کی کوئی حیثیت نہیں ہے اورمسیحی بھی کہتے ہیں کہ یہودیوں اللہ کے ہاں کوئی حیثیت نہیں ہے،حالانکہ دونوں اللہ کی کتاب کی تلاوت کرتے ہیں(جوایسے تعصّبات کی مذمت کرتی ہے)

ایسی ہی باتیں جاہل لوگ (عرب کے مشرک) بھی کہتے ہیں جن باتوں میں یہ باہم اختلاف کرتے ہیں، قیامت کے دن اللہ ان کے درمیان اس کا فیصلہ کردے گا۔(بقرہ:113)

اس آیت میں استعمال شدہ الفاظ سے یہ حقیقت بخوبی واضح ہوجاتی ہے کہ ایسے تعصّبات اور خود پسندی کے احساسات کا سر چشمہ جہالت اور نادانی کے سوا کچھ نہیں ہوتا اور ہر جاہل و نادان قوم ایسے تعصّبات میں مبتلا ہوجاتی ہے۔

''الَّذِیۡنَ لَا یَعۡلَمُوۡنَ''، ''جو لوگ نہیں جانتے'' کے الفاظ ایک وسیع مفہوم کے حامل ہیں اور مشرکین عرب اس کے مصادیق میں سے ایک مصداق ہیں۔بعض مفسرین نے اس سے قومِ نوحؑ یا تمام گزشتہ اُمتوں کو مراد لیا ہے جو جہالت اور نادانی کی وجہ سے تعصب میں مبتلا ہوگئی تھیں۔

گیارہویں آیت میں ایک عام کلی حکم بیان کیا گیا ہے جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ہر دَور میں کفر کے استمرار اور توحید کے خلاف مسلسل جنگ کا بنیادی سبب تعصب تھا۔اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

"وَ کَذٰلِکَ مَاۤ اَرۡسَلۡنَا مِنۡ قَبۡلِکَ فِیۡ قَرۡیَۃٍ مِّنۡ نَّذِیۡرٍ اِلَّا قَالَ مُتۡرَفُوۡہَاۤ ۙ اِنَّا وَجَدۡنَاۤ اٰبَآءَنَا عَلٰۤی اُمَّۃٍ وَّ اِنَّا عَلٰۤی اٰثٰرِہِمۡ مُّقۡتَدُوۡنَ"۔

آپ سے قبل ہم نے جس بستی میں کوئی خبردار کرنے والا بھیجا تو وہاں کے مغرور امراء نے کہا کہ ہم نے اپنے آباءواجداد کو ایک دین پر پایا ہے اور ہم تو انہیں کی اقتداء کرتے رہیں گے۔(زخرف:23)

اس آیت سے یہ بات بخوبی واضح ہوجاتی ہے کہ اللہ کے رسولوں کی دعوت پر ایمان لانے میں تعصب ہر دور میں سب سے بڑی رُکاوٹ بنا رہا۔اس سے یہ بھی معلوم ہوجاتا ہے کہ یہ اخلاقی برائی کس قدر خطرناک ہے۔

بارھویں آیت میں ہم دیکھتے ہیں کہ جاہل اقوام اپنے تعصب کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے انبیاؑ کو، جو عقلِ کُل ہوتے تھے، دیوانہ کہا کرتے تھے اور اس بہانے سے اُن کے خلاف صف آرائی کرتے تھے۔اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

"وَیَقُوۡلُوۡنَ اَئِنَّا لَتَارِکُوۡۤا اٰلِہَتِنَا لِشَاعِرٍ مَّجۡنُوۡنٍ○"

''اور وہ کہتے ہیں: کیا ہم ایک مجنون شاعر کیلئے اپنے معبودوں کو چھوڑ دیں؟''۔(الصافات:36)

وہ اپنی جہالت اور تعصب میں اس قدر اندھے ہو چکے تھے کہ اپنی بات کے تضاد کو بھی محسوس نہیں کرتے تھے۔شاعر ہونے کیلئے غیر معمولی عقل اور ذوقِ سلیم کی ضرورت ہوتی ہے۔لہٰذا شاعر اور دیوانگی کا آپس میں کوئی جوڑ ہی نہیں۔اسی طرح وہ انبیاؑ کو دیوانہ اور ساحر بھی کہتے تھے، حالانکہ سحر کیلئے بھی بعض علوم کی ضرورت ہوتی ہے۔

ظاہر سی بات ہے کہ دیوانہ، عالم اور ساحر نہیں ہوسکتا۔لیکن متعصب کفار اپنے تعصب، جہالت اور ضد کی وجہ سے ایسی متضاد باتیں کرتے تھے اور اپنے تضاد کو محسوس نہیں کرتے تھے۔

آخری نتیجہ:۔

گزشتہ آیات پر ایک اجمالی نظر ڈالنے سے یہ حقیقت ثابت ہوجاتی ہے کہ حق کی شناخت کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ اندھی تقلید ہے جو تعصب، ہٹ دھرمی اور خواہشاتِ نفسانی کی غیر مشروط پیروی سے جنم لیتی ہے۔ اس اخلاقی برائی کے تباہ کن نتائج نے انسانی تاریخ کے سیاہ ترین ابواب رقم کیے ہیں۔ یہ اللہ کے رسولوں کے سامنے سب سے بڑی رکاوٹ تھی اور اسی کی وجہ سے انسانی تاریخ میں بہت سی خونریزی ہوئی ہے۔

اگر یہ برائی نہ ہوتی تو آج انسانی تاریخ کی شکل کچھ اور ہوتی۔ انسانی تمدن تیزی سے ترقی کرتا اور تعمیری کوششیں انسان کو تیز رفتاری سے منزلِ سعادت سے ہمکنار کر دیتیں۔

تعصب اور ہٹ دھرمی احادیث کی روشنی میں

تعصب کے معنی، اس کے اسباب اور تباہ کن نتائج کے بارے میں بحث کرنے سے قبل ضروری ہے کہ اس موضوع سے متعلق اسلامی احادیث پر ایک نظر ڈالی جائے، اس لئے کہ ہم جن اُمور سے بحث کرنا چاہتے ہیں، اُن میں سے بہت سی باتیں ان احادیث میں بیان ہوئی ہیں۔

اس ضمن میں احادیث کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ بطور نمونہ ہم چند احادیث یہاں درج کرتے ہیں۔

1۔ ایک حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

"مَنْ كَانَ فِيْ قَلْبِهٖ حَبَّةٌ مِنْ خَرْدَلٍ مِنْ عَصَبِيَّةٍ بَعَثَهُ اللهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ مَعَ اَعْرَا بِ الْجَاهِلِيَّةِ"۔

"جس شخص کے دل میں رائی کے دانے کے برابر بھی تعصب ہو، قیامت کے دن اللہ اسے دور جاہلیت کے عربوں کے ساتھ اٹھائے گا"۔ (اصول کافی، 308:2)

2۔ ایک حدیث میں حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

"اِنَّ اللهَ يُعَذِّبُ السِّتَّةَ بِالسِّتَّةِ، اَلْعَرَبَ بِالْعَصَبِيَّةِ، وَالدَّهَاقِيْنَ بِالْكِبْرِ، وَالْاُمَرَأَ ب الْجَوْرِ، وَالْفُقَهَأَ بِالْحَسَدِ، وَالتُّجَّارَ بِالْخِيَانَةِ، وَاَهْلَ الرَّسَاتِيْقِ بِالْجُهْلِ"۔ (کافی، 162:8)

"اللہ تعالیٰ چھ قسم کے لوگوں کو چھ برائیوں کی وجہ سے عذاب میں مبتلا کرے گا: عربوں کو تعصب کی وجہ سے، زمینداروں کو تکبر کی وجہ سے، حکمرانوں کو ناانصافی کی وجہ سے، فقہا کو حسد کی وجہ سے، تاجروں کو خیانت کی وجہ

سے اور دیہاتیوں کو جہالت کی وجہ سے"۔

یہاں یہ نکتہ قابلِ توجہ ہے کہ اس حدیث میں تعصب کا ذکر باقی گناہوں سے پہلے کیا گیا ہے، حالانکہ باقی سارے گناہ گناہانِ کبیرہ ہیں۔

3۔ ایک اور حدیث میں جنابِ رسولؐ خدا فرماتے ہیں:

"لَيْسَ مِنَّا مَنْ دَعَا إِلَى عَصَبِيَّةٍ، وَلَيْسَ مِنَّا مَنْ قَاتَلَ عَلَى عَصَبِيَّةٍ، وَلَيْسَ مِنَّا مَنْ مَاتَ عَلَى عَصَبِيَّةٍ"۔ (سنن ابی داؤد: حدیث: 5121)

"جو شخص لوگوں کو تعصب کی دعوت دے، وہ ہم میں سے نہیں، جو تعصب کی وجہ سے جنگ کرے، وہ ہم میں سے نہیں اور جو تعصب کی حالت میں مر جائے، وہ ہم میں سے نہیں"۔

4۔ حضرت علی علیہ السلام کا ایک خطبہ جو خطبہ قاصعہ کے نام سے معروف ہے، اس میں تکبر اور تعصب کی نفی کی گئی ہے جو ابلیس کی گمراہی کا بنیادی سبب تھا۔ اس خطبہ میں آپؑ فرماتے ہیں:

"اِعْتَرَضَتْهُ الْحَمِيَّةُ فَافْتَخَرَ عَلٰى آدَمَ بِخَلْقِهٖ وَتَعَصَّبَ عَلَيْهِ لِاَصْلِهٖ فَعَدُوُّ اللّٰهِ اِمَامُ الْمُتَعَصِّبِيْنَ وَسَلَفُ الْمُسْتَكْبِرِيْنَ الَّذِيْ وَضَعَ اَسَاسَ الْعَصَبِيَّةِ"۔

"تکبر اور تعصب اس پر حاوی ہو گیا اور اس نے اپنی خلقت کے سبب آدم کے خلاف فخر کیا۔ اس نے اپنی اصل اور اساس کی وجہ سے آدم کے خلاف تعصب برتا جس کی وجہ سے اللہ کا دشمن متعصب لوگوں کا پیشوا ہے اور تکبر کرنے والوں کا پیشرو ہے جس نے تعصب کی بنیاد ڈالی"۔ (نہج البلاغہ، خطبہ: 192)

5۔ ایک اور حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

"مَنْ تَعَصَّبَ اَوْ تُعُصِّبَ لَهٗ فَقَدْ خَلَعَ رِبْقَةَ الْاِيْمَانِ مِنْ عُنُقِهٖ"۔

"جس نے تعصب سے کام لیا یا جس کے حق میں تعصب سے کام لیا گیا، اس نے اپنی گردن ایمان کے رشتے سے آزاد کر لی"۔ (اصول کافی، 2:308)

یہ بات واضح ہے کہ تعصب اور ہٹ دھرمی لازم و ملزوم ہیں۔ اسی لئے ہم نے ان دونوں کو ایک عنوان میں جمع کر دیا ہے۔ ہٹ دھرمی (جسے عربی اور فارسی میں میں لجاجت کہتے ہیں) کے بارے میں بہت سی احادیث وارد ہوئی ہیں جن میں سے چند یہاں درج کی جاتی ہیں۔

1۔ ایک حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

"اِيَّاكَ وَاللَّجَاجَةَ فَاِنَّ اَوَّلَهَا جَهْلٌ وَآخِرُهَا نَدَامَةٌ"۔(میزان الحکمہ:4)

''لجاجت (ہٹ دھرمی اور ضد) سے اجتناب کرو، اس کی ابتدا جہالت اور انتہا ندامت ہے''۔

2۔ ایک حدیث میں امیر المومنین علیہ السلام فرماتے ہیں:

"اَللِّجَاجُ اَكْثَرُ الْاَشْيَاءِ مَضَرَّةً فِي الْعَاجِلِ وَالْآجِلِ"۔

''لجاجت دُنیا اور آخرت میں سب سے بڑھ کر نقصان دہ ہے''۔(میزان الحکمہ :4۔ مادہ لجاجت)

3۔ ایک اور حدیث میں آپؑ کا فرمان ہے:

"اَللِّجَاجُ بَذْرُ الشَّرِّ"۔

''لجاجت برائی کا بیج ہے''۔(میزان الحکمہ :4۔ مادہ لجاجت)

4۔ نہج البلاغہ میں ہے:

"اَللِّجَاجَةُ تَسُلُّ الرَّأْيَ"۔

''لجاجت انسان کی رائے کو سست کر دیتی ہے''۔(نہج البلاغہ، کلماتِ قصار:179)

امیر المومنین علیہ السلام فرماتے ہیں:

"لَيْسَ لِلْجُوْجِ تَدْبِيْرٌ"۔

''لجاجت کرنے والے کے پاس کوئی تدبیر نہیں ہوتی''۔(غرر الحکم)

ان روایات کی روشنی میں یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ تعصب اور لجاجت انسان کی ذاتی اور معاشرتی زندگی پر کس قدر گہرے منفی اثرات مرتب کرتے ہیں، یہاں تک کہ ان کی وجہ سے انسان ایمان اور اسلام کی نعمت سے محروم ہو جاتا ہے اور کفر و شرک کی راہوں پر چل کر شیطان کی اتباع کرتے ہوئے ایمان کی حدوں سے آزاد ہو جاتا ہے۔ ان باتوں کے دلائل آپ آئندہ مباحث میں ملاحظہ فرمائیں گے۔

تعصب کا مفہوم اور اس کے محرکات

تعصب کا مادہ (ROOT) عصب ہے۔ اس سے مراد انسان جسم میں موجودہ ریشے ہیں جو ہڈیوں کے جوڑوں اور عضلات کو آپس میں جوڑتے ہیں۔ اس کے بعد یہ لفظ ہر قسم کی مضبوط وابستگی کے معنوں میں استعمال ہونے لگا جو عام طور پر منفی مفہوم رکھتا ہے۔ البتہ بعض اوقات مثبت معنوں میں بھی یہ لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ اس کی تفصیل انشاءاللہ آئندہ مباحث میں آئے گی۔

ظاہری بات ہے کہ کسی شخص، عقیدے یا چیز کے ساتھ غیر منطقی وابستگی انسان کو ضد، ہٹ دھرمی اور اندھی تقلید کی راہ پر ڈال دیتی ہے اور ایسی ہی وابستگی بہت سی جنگوں، خونریزی اور اختلافات کا سبب بنتی ہے۔

اگرچہ تعصّبات انسانی معاشرے سے ختم ہوجائیں اور لوگ عقل ومنطق کی روشنی میں غور وفکر کے عادی بن جائیں تو بہت سے اختلافات خود بخود ختم ہوجائیں اور انسانی معاشرہ امن وسکون کا گہوارہ بن جائے۔

ایسے تعصّبات جن کا نتیجہ ضد، لجاجت اور ہٹ دھرمی کی صورت میں رونما ہوتا ہے، مندرجہ ذیل اسباب سے وجود میں آتے ہیں:

1۔آباؤاجداد سے غیر معمولی محبت:۔

کسی بھی چیز کے ساتھ غیر معمولی وابستگی کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان اس کے بارے میں عقلی اور منطقی رویے سے دُور ہو جاتا ہے۔آباؤاجداد اور اُن کے دین سے غیر معمولی محبت اور وابستگی بھی اسی زمرے میں آتی ہے۔

یہ شدید اور غیر معمولی وابستگی اس چیز کا سبب بنتی ہے کہ آنے والی نسلیں اپنے آباؤاجداد کے بیہودہ اور جاہلانہ طریقوں کو مقدس رسوم کی حیثیت سے نہ صرف اپنالیتی ہیں بلکہ ان کی حفاظت کیلئے اس حدتک آگے چلی جاتی ہیں کہ جہاں ان کے اور حق کے درمیان ٹکراؤ کی صورت پیدا ہوجائے۔وہاں وہ حق کو ترک کردیتی ہیں۔

اس تعصب کا نتیجہ بعض اوقات اس شکل میں بھی ظاہر ہوتا ہے کہ کوئی قوم اپنی بدترین رسوم کو اس حدتک کامل واکمل سمجھنے لگتی ہے کہ اس کے مقابلے میں دُوسری اقوام کی اچھی رسوم اور اچھے آداب کو بھی برا اور ہیچ جاننے لگتی ہے۔

2۔کوتاہ نظری:۔

جس قدر کسی قوم کی فکر پست اور ان کی تہذیب وثقافت کمزور ہوگی، اُن کے اندر جاہلانہ تعصّبات اور اندھی تقلید زیادہ ہوگی۔ اس کے برعکس جس قدر کسی قوم کی فکری سطح بلند ہوگی اور اُس کی ثقافت اعلیٰ اقدار پر اُستوار ہوگی، اُس کی سوچ اُسی قدر عقل ومنطق کے ساتھ ہم آہنگ ہوگی۔اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تعصب اور ہٹ دھرمی کا خاتمہ ہوگا اور اندھی تقلید کی جگہ تحقیق لے لے گی۔

3۔شخصیت پرستی:۔

بعض اوقات کوئی شخص کسی انسان کی نظر میں اتنا مقدس ہوجاتا ہے کہ وہ اُس کے ہر قول وفعل کو تنقید سے بالاتر سمجھنے لگتا ہے، خواہ اُس کے افکار ونظریات علمی اور فکری لحاظ سے انتہائی پست ہی کیوں نہ ہوں۔اس صورت میں یہ ہوتا ہے کہ اُس شخص کا تقدس، اُسے مقدس ماننے والوں کی آنکھوں اور دل ودماغ پر ایک دبیز پردہ ڈال دیتا ہے جو اُن کے اور حق کے درمیان رُکاوٹ بن جاتا ہے۔ یہ لوگ اندھادھند اس کے پیچھے چل پڑتے ہیں اور اُس کے افکار ونظریات کا جائزہ لئے بغیر اُس کیلئے جان ومال کی قربانی دینے سے بھی

گریز نہیں کرتے۔

4۔فکری اور معاشرتی گوشہ نشینی:۔

جب کوئی شخص اپنی ذاتی اور معاشرتی سوچ کے خول میں بند ہو جائے اور دیگر افراد اور معاشروں کے افکار سے بیگانہ اور نا آشنا ہو جائے تو ایسی صورت میں وہ اپنی ذاتی او معاشرتی سوچ کے ساتھ شدید وابستگی قائم کر لیتا ہے اور اس سوچ سے ہٹ کر ہر فکر ونظریہ کے خلاف تعصب برتنے لگتا ہے۔اگر یہ شخص دوسروں کے ساتھ تعلق اور میل جول رکھتا ہو اور ان کے اور اپنے افکار کا موازنہ کرتا ہو تو دونوں سوچوں کے مثبت اور منفی نکات اُس پر واضح ہو جائیں اور منفی افکار کو ترک کر کے اچھے افکار کو اپنانے کی جرأت اُس کے اندر پیدا ہو جائے۔

تعصب اور لجاجت کے منفی اثرات

تعصب اور لجاجت کے منفی اثرات بہت شدید ہوتے ہیں جو متعصب اور لجاجت باز (لجاجت یعنی ضد اور ہٹ دھرمی سے کام لینے والے شخص کو لجاجت باز، لج باز اور لجوج کہتے ہیں) افراد کی زندگی میں ظاہر ہوتے ہیں۔

1۔ تعصب یعنی کسی شخص، چیز، عقیدے، عادت یا رسم ورواج کے ساتھ غیر منطقی وابستگی درحقیقت انسان کی عقل پر ایک ضخیم پردہ ڈال دیتا ہے جس کے نتیجہ میں انسان خیر وشر، صلاح وفساد اور اپنے کاموں کے انجام وغیرہ کے بارے میں غور وفکر اور صحیح راستے کے انتخاب کی صلاحیت سے محروم ہو جاتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ مذکورہ احادیث میں سے ایک حدیث میں بیان ہوا کہ متعصب انسان صلاحیت تدبیر سے محروم ہوتا ہے۔ شیطان کے حالات میں بھی یہ بات نمایاں طور پر نظر آتی ہے کہ تعصب کی وجہ سے وہ واضح ترین حقائق کا ادراک کرنے سے محروم رہا۔ اُس نے اللہ تعالیٰ کی بندگی سے کنارہ کشی اختیار کر لی اور ہمیشہ کیلئے اللہ کی بارگاہ سے دُھتکار دیا گیا۔

2۔ تعصب اور لجاجت ایک ایسی آگ ہے جو معاشرتی تعلقات کو جلا کر خاکستر کر دیتی ہے۔اس سے معاشرے کے مختلف طبقات کے درمیان اتحاد ویگانگت ختم ہو جاتی ہے اور نفاق واختلاف کو تقویت ملتی ہے۔اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ معاشرے میں پائے جانے والے وسائل اور توانائیاں تعمیری مقاصد کیلئے صرف ہونے کی بجائے تخریبی مقاصد کیلئے استعمال ہونے لگتی ہیں۔یہی وجہ ہے کہ تعصب کے بارے میں امیر المومنین علیہ السلام فرماتے ہیں:

"اَللِّجَاجُ يُنْتِجُ الْحُرُوْبَ وَيُوْغِرُ الْقُلُوْبَ"۔

''لجاجت جنگوں کی آگ کو بھڑکاتی ہے اور دِلوں کو کینہ سے بھر دیتی ہے''۔(غرر الحکم)

3۔ تعصب کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دوست ایک دوسرے سے دور ہو جاتے ہیں اور محبت عداوت میں تبدیل ہو

جاتی ہے۔

4۔ تعصب اور لجاجت کفر کے بنیادی اسباب میں سے ہیں۔گزشتہ اُمتوں کے کفر کی اصل وجہ یہ تھی کہ وہ اپنے آباؤ اجداد کے طور طریقوں کے ساتھ متعصّبانہ وابستگی رکھتی تھیں جو دینِ حق کو اختیار کرنے کی راہ میں بڑی رُکاوٹ تھی۔

5۔ تعصب اور لجاجت درد ورنج اور زحمت وتکلیف کا سبب ہیں،اس لئے کہ ان کی وجہ سے انسان عرصہ دراز تک گمراہی کے اندھیروں میں بھٹکتا رہتا ہے اور آخر کار ایک بند گلی میں پہنچ جاتا ہے اور اُسے واپسی کا سفر اختیار کرنا پڑتا ہے جو نہایت تکلیف دہ اور پر رنج وزحمت ہوتا ہے۔اسی نکتے کے پیشِ نظر حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

"ثَمَرَةُ اللِّجَاجِ الْعَطَبُ"۔

''لجاجت کا پھل شکست اور ہلاکت ہے''(غرر الحکم)

یہی وجہ ہے کہ عام طور پر ندامت اور پشیمانی بھی اس کے ساتھ ہوتے ہیں۔جیسا کہ حدیث میں آیا ہے:

''تعصب ولجاجت کا آغاز جہالت اور انجام ندامت ہے''۔

6۔ تعصب اور لجاجت کی وجہ سے بعض اوقات انسان کے معاملات کی باگ ڈور انسان کے ہاتھ سے نکل جاتی ہے اور وہ ایسی صورتِ حال میں پھنس جاتا ہے جس کا اُس نے تصور بھی نہیں کیا ہوتا۔اس حقیقت کو امیر المومنین علیہ السلام نے اس طرح بیان فرمایا ہے:

"لَا مَرْكَبَ أَجْمَحَ مِنَ اللِّجَاجِ"۔

''لجاجت سے زیادہ کوئی سواری سرکش نہیں''۔(غرر الحکم)

7۔ تعصب اور لجاجت انسان کی دُنیا اور آخرت دونوں کو برباد کر دیتے ہیں۔اس کی وجہ یہ ہے کہ دُنیا میں یہ دُشمنی ،تفرقہ اور بہت سے دُوسرے غلط اقدامات کا باعث بنتے ہیں جن سے انسان کی زندگی کا سکون برباد ہو جاتا ہے۔یہی چیزیں آخرت میں اللہ کی رحمت سے دُوری کا سبب بن جاتی ہیں۔یہ وہی بات ہے جو ہم امیر المومنین علیہ السلام کی اس حدیث میں پڑھ چکے ہیں:

اَللِّجَاجُ اَكْثَرُ الْاَشْيَاءِ مَضَرَّةٌ فِي الْعَاجِلِ وَالْآجِلِ"۔

''دنیا اور آخرت میں سب سے مضر چیز لجاجت ہے''۔

ہم اس نکتے کی طرف ایک بار پھر متوجہ کرنا ضروری سمجھتے ہیں کہ اگر چہ تعصب،لجاجت اور اندھی تقلید معنی ومفہوم کے لحاظ سے ایک دوسرے سے جدا ہیں لیکن چونکہ ان کے درمیان بہت گہرا تعلق پایا جاتا ہے، یہاں تک کہ یہ آپس میں لازم وملزوم ہیں،لہٰذا ہم نے ان تینوں کو ایک موضوع کے ذیل میں زیر بحث قرار دیا۔

پسندیدہ اور ناپسندیدہ تعصب:۔

تعصب، حمیت اور تقلید تین چیزیں ہیں جو ایک دوسرے کے بہت قریب ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کی دو اقسام ہیں: پسندیدہ اور ناپسندیدہ۔ یہ اور بات ہے کہ عام طور پر تعصب صرف منفی معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔

اگر انسان کی وابستگی غلط چیزوں یا باطل نظریات سے ہو تو اس سے پیدا ہونے والا تعصب بھی مذموم اور ناپسندیدہ ہوگا۔ یہ وہی چیز ہے جسے قرآن میں ''تعصب جاہلیت'' کہا گیا ہے۔ اس کے برعکس اگر انسان کی وابستگی صحیح چیزوں اور برحق نظریات کے ساتھ ہو تو اُس سے پیدا ہونے والا تعصب بھی پسندیدہ اور ممدوح ہوگا۔

خطبہ قاصعہ میں امیر المومنین علیہ السلام نے دونوں کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔ ایک مقام پر فرماتے ہیں:

"فَاَطْفِئُوْا مَا كَمَنَ فِيْ قُلُوْبِكُمْ مِنْ نِيْرَانِ الْعَصَبِيَّةِ، وَاَحْقَادِ الْجَاهِلِيَّةِ، فَاِنَّمَا تِلْكَ الْحَمِيَّةُ تَكُوْنُ فِي الْمُسْلِمِ مِنْ خَطَرَاتِ الشَّيْطَانِ وَنَخَوَاتِهِ وَنَزَعَاتِهِ وَنَفَثَاتِهِ"۔

''جاہلیت کے تعصب اور کینے چنگاریاں ہیں جو تمہارے دِلوں میں پنہاں ہیں، انہیں خاموش کر دو، اس لئے کہ مسلمانوں میں ایسے ناروا تکبر اور تعصّبات شیطان کی خود پسندی، اُس کی فساد انگیزی اور ولولہ اندازی کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں''۔ (نہج البلاغہ: خطبہ 192۔ بند 22 تا 23)

اسی خطبہ میں ایک اور مقام پر آپؑ فرماتے ہیں:

"فَاِنْ كَانَ لَابُدَّ مِنَ الْعَصَبِيَّةِ فَلْيَكُنْ تَعَصُّبُكُمْ لِمَكَارِمِ الْخِصَالِ، وَمَحَامِدِ الْاَفْعَالِ، وَمَحَاسِنِ الْاُمُوْرِ الَّتِيْ تَفَاضَلَتْ فِيْهَا الْمُهَدَاُ وَالنُّجَدَاءُ مِنْ بُيُوْتَاتِ الْعَرَبِ..... فَتَعَصَّبُوْا لِخِلَالِ الْحَمْدِ، مِنَ الْحِفْظِ لِلْجِوَارِ، وَالْوَفَاءِ بِالذِّمَامِ، وَالطَّاعَةِ لِلْبِرِّ، وَالْمَعْصِيَةِ لِلْكِبْرِ، وَالْاَخْذِ بِالْفَضْلِ، وَالْكَفِّ عَنِ الْبَغْيِ"۔

''اگر تمہیں تعصب سے کام لینا ہی ہے تو پسندیدہ اخلاقی صفات، نیک اعمال، عربوں کے ممتاز گھرانوں کی شخصیات کے اعمال واطوار کے بارے میں تعصب سے کام لو..... تمہارا تعصب ہمسایوں کے حقوق کی حفاظت، ایفائے عہد، نیکی کی اطاعت، تکبر کے خلاف بغاوت، بخشش وسخاوت اور ظلم وستم سے اجتناب کے بارے میں ہونا چاہئے''۔ (نہج البلاغہ: خطبہ 192، بند 76 تا 79)

اس طرح امیر المومنین علیہ السلام تعصب کی دونوں شاخوں کے بارے میں نصیحت فرماتے ہوئے نظر آرہے ہیں۔

حضرت امام زین العابدین علیہ السلام سے پوچھا گیا کہ عصبیت کیسی چیز ہے؟ آپؑ نے اس کے دونوں پہلوؤں کو مدِ نظر

رکھتے ہوئے فرمایا:

"اَلْعَصَبِيَّةُ الَّتِيْ يَأْثُمِ عَلَيْهَا صَاحِبُهَا اَنْ يَرَى الرَّجُلُ شَرَارَ قَوْمِهٖ خَيْرًا مِنْ خِيَارِ قُوْمٍ آخِرِيْن! وَلَيْسَ مِنَ الْعَصَبِيَّةِ اَنْ يُحِبَّ الرَّجُلُ قُوْمَهُ وَلٰكِنْ مِنَ الْعَصَبِيَّةِ اَنْ يُعِيْنَ قُوْمَهُ عَلَى الظُّلْمِ"۔

''وہ تعصب جس کی وجہ سے انسان گناہگار ہوتا ہے، یہ ہے کہ انسان اپنی قوم کے برے لوگوں کو دوسری قوم کے اچھے لوگوں سے بہتر سمجھے۔ اپنی قوم کے کسی فرد سے محبت کرنا تعصب نہیں ہے بلکہ تعصب یہ ہے کہ انسان ظلم میں اپنی قوم کا ساتھ دے۔''(اصول کافی، 308:2)

اس حدیث کی روشنی میں اپنی قوم سے محبت کرنا اور نیکی کے معاملات میں ان کی مدد کرنا مزموم نہیں ہے، اس لئے کہ یہ محبت اور وابستگی اُسے کسی برے کام پر نہیں اُکسا رہی بلکہ محبت سے سرشار مثبت تعلقات کی مضبوطی پر متحرک کر رہی ہے۔ ناپسندیدہ اور مذموم تعصب یہ ہے کہ انسان قومی وابستگی کی وجہ سے حق اور عدالت کے اُصولوں کو پامال کر دے اور اپنی قوم کے برے افراد کو دوسری اقوام کے اچھے افراد سے بہتر سمجھے۔

ایک اور حدیث میں حضرت امام زین العابدین علیہ السلام فرماتے ہیں:

"لَمْ يَدْخُلِ الْجَنَّةَ حَمِيَّةٌ غَيْرُ حَمِيَّةِ حَمْزَةَ ابْنِ عَبْدُ الْمُطَّلِبِ، وَذٰلِكَ حِيْنَ اَسْلَمَ غَضَبًا لِلنَّبِيِّ فِيْ حَدِيْثِ الَّلسَلا الَّذِيْ اُلْقِيَ عَلَى النَّبِيِّ"۔

''کوئی تعصب جنت میں داخل نہیں ہوا، سوائے ایک تعصب کے اور وہ حضرتِ حمزہؓ بن حضرت عبدالمطلب کا تعصب ہے کہ جب رسولؐ اللہ پر گندگی ڈالی گئی تو وہ غضب ناک ہو گئے (اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مدد کرتے ہوئے مسلمان ہو گئے)''(اصول کافی، 308:2)

ظاہری بات ہے کہ ناپاک اور نامعقول مشرکوں کے خلاف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حمایت کا تعصب جو حضرتِ حمزہؓ نے برتا، وہ حق اور عدل کی حمایت کیلئے تھا، لہٰذا اُن کا یہ تعصب قابلِ تعریف ٹھہرا۔ اگر اُن کا تعصب حق اور عدل کے خلاف ہوتا ہے تو یقیناً ناپسندیدہ اور مذموم ہوتا۔

مثبت تقلید اور اندھی تقلید:۔

تعصب کی طرف تقلید کی بھی دو شاخیں یا اقسام ہیں: مثبت تقلید اور منفی تقلید۔ اگر زیادہ باریک نظر سے مشاہدہ کیا جائے، تو تقلید کی چار اقسام قابلِ تصور ہیں جن میں سے تین منفی اور ایک مثبت ہے:

1۔جاہل کا جاہل کی تقلید کرنا:۔

یہ ایسی تقلید ہے جس میں کچھ جاہل اور نادان افراد بعض دیگر جاہل یا نادانوں کی تقلید کرتے ہیں۔قرآن شریف میں ایسی تقلید کی شدید مذمت کی گئی ہے اور اسے بعض اوقات تعصب اور لجاجات کا سبب اور بعض اوقات ان کا نتیجہ قرار دیا گیا ہے۔اس تقلید کی وجہ سے ایک نسل کی جہالت اگلی نسل میں منتقل ہوجاتی ہے اور وہ اس کے ساتھ وابستگی کی وجہ سے انبیأ کی دعوت کے سامنے محاذ آرائی کرتے تھے۔

2۔عالم کا جاہل کی تقلید کرنا:۔

یہ تقلید کی بدترین قسم ہے۔اس میں یہ ہوتا ہے کہ بعض اوقات تعصب میں گرفتار شخص اپنے علم سے دستبردار ہوکر اندھادھند جاہلوں کی تقلید کرنے لگتا ہے۔علمأ اور مفکرین کی عوام زدگی درحقیقت اسی زمرے میں آتی ہے۔

3۔عالم کا کسی اور عالم کی تقلید کرنا:۔

اس تقلید میں بعض اوقات ایک عالم اور محقق شخص کسی خاص مسئلہ کی زحمت سے بچنے کیلئے آنکھیں بند کرکے کسی اور عالم کی تقلید کرنے لگتا ہے۔ظاہری بات ہے کہ یہ بھی مذموم اور ناپسندیدہ تقلید کے زمرے میں آتی ہے۔اگرچہ پہلی دو اقسام سے پھر بھی بہتر ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر قوم کے علمأ اور دانش مندوں پر لازم ہے کہ وہ تحقیق کی راہ اختیار کریں اور علمی سرمایہ رکھنے کے باوجود اندھی تقلید نہ کریں۔یہی وجہ ہے کہ فقہ میں یہ بات مسلم ہے کہ مجتہد پر تقلید کرنا حرام ہے اور جب کوئی مجتہد کسی کو سندِ اجتہاد دیتا ہے تو اس میں لکھتا ہے:''یحرم علیہ التقلید''۔یعنی اس پر تقلید حرام ہے۔

ہاں!اپنے شعبۂ مہارت کے علاوہ کسی اور شعبے میں اس شعبے کے مخصوص معاملات میں تقلید کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔مثلاً آنکھوں کا ماہر ڈاکٹر دِل کی بیماری کے معاملات میں امراضِ قلب کے ماہر کی رائے کے مطابق عمل کرے گا یا یہ کہ کوئی ماہر اپنے ہی شعبے میں اپنے استاد یا اپنے سے زیادہ ماہر کی طرف رجوع کرے تو اس میں کوئی قباحت نہیں ہے،اس لئے کہ یہ عمل تقلید کی مذموم اقسام میں شمار نہیں ہوتا بلکہ تقلید کی چوتھی قسم کے زمرے میں آتا ہے۔

4۔جاہل کا عالم کی تقلید کرنا:۔

اس تقلید میں غیر عالم شخص عالم کے علم کی روشنی میں عمل کرتا ہے یعنی انسان جس چیز کا علم نہیں رکھتا،اُس کے بارے میں اس چیز کے عالم سے رہنمائی حاصل کرتا ہے(جس طرح کسی بیماری میں مبتلا شخص اس بیماری کے ماہر طبیب کی طرف رجوع کرتا ہے)۔

تشریح:۔

علوم وفنون کی حدیں اس قدر وسیع ہیں کہ کسی ایک انسان کیلئے ممکن ہی نہیں ہے کہ تمام علوم وفنون میں مہارت تامہ حاصل کر سکے۔ایسی صورت میں یہی راستہ باقی رہ جاتا ہے کہ جو شخص جس علم میں آگاہی نہیں رکھتا، اُس میں اُس علم کے ماہر کی طرف رجوع کرے۔یہ ایک ایسا عقلی اُصول ہے جس پر دُنیا بھر کے عقلا متفق ہیں۔اگر اس اُصول کو ترک کر دیا جائے تو معاشرے کا شیرازہ ہی بکھر کر رہ جائے۔

معنوی واخلاقی امور اور دینی علوم میں بھی یہی صورت حال ہے۔ہم یہ توقع نہیں کر سکتے کہ ہر انسان تمام اسلامی علوم میں ماہر اور متخصص ہو جائے۔ان میں سے بعض علوم اس قدر وسیع ہیں کہ پچاس سال غور وفکر اور تحقیق کے بعد بھی مزید تحقیق ومطالعہ کی ضرورت رہتی ہے جیسا کہ علم فقہ۔

ظاہری بات ہے کہ ایسے علوم میں غیر عالم افراد، صاحبانِ علم کی طرف رجوع کریں گے۔البتہ اصولِ دین، جو دین کی بنیاد کی حیثیت رکھتے ہیں۔ان میں ضروری ہے کہ ہر شخص اپنی علمی وفکری سطح کے مطابق دلیل کے ساتھ ان کے بارے میں علم رکھے کیونکہ ان میں تقلید جائز نہیں ہے۔

تقلید کی یہ قسم ناپسندیدہ اور مذموم نہیں ہے۔اس کا:

اِنَّا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا عَلٰٓى اُمَّةٍ وَّاِنَّا عَلٰٓى اٰثٰرِهِمْ مُّقْتَدُوْنَ﴿۲۳﴾ (زخرف:23)

سے کوئی تعلق نہیں ہے بلکہ یہ:

فَسْـَٔلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ" (نحل:43)

کا مصداق ہے۔

وہ مذموم تعصب جو لجاجت اور اندھی تقلید کو جنم دیتا ہے، اس کا اس مسئلہ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

راہِ علاج:۔

تمام رذائل اخلاقی کے علاج کی طرح اس صفتِ رذیلہ کے علاج کا پہلا قدم بھی یہ ہے کہ اس کے اسباب اور محرکات کا خاتمہ کیا جائے۔چونکہ کسی چیز سے حد سے زیادہ محبت کرنا، معاشرے کی ثقافتی اور فکری سطح کا پست اور معاشرتی وفکری تنہائی تعصب کے بنیادی اسباب ہیں، لہٰذا اس صفتِ رذیلہ کا خاتمہ کرنے کیلئے ضروری ہے کہ افراد کی فکری سطح کو بلند کیا جائے، مختلف اقوام کے درمیان فکری اور ثقافتی تعلقات بڑھائے جائیں، محبتوں اور قوم پرستی کے میلانات کو اعتدال پر لایا جائے تاکہ تعصب، لجاجت اور اندھی تقلید کا خاتمہ کیا جا سکے۔

اسی طرح تعصب کے خطرناک نتائج کے بارے میں غور وفکر کرنے سے بھی اس صفتِ رذیلہ کا خاتمہ کرنے میں مدد ملتی ہے۔ اگر انسان اس حقیقت پر توجہ کرے کہ تعصب اس کے دل ودماغ پر ایسے پردے ڈال دیتا ہے۔ جن کی وجہ سے انسان حقائق کا درست ادراک کرنے سے محروم رہ جاتا ہے، اس کی وجہ سے انسانی وحدت پارہ پارہ ہوجاتی ہے، اختلاف ونفاق میں شدت پیدا ہوجاتی ہے، فرد اور معاشرے کیلئے تکلیف دہ مسائل پیدا ہوجاتے ہیں اور بعض اوقات فرد یا معاشرہ ایسی صورت حال سے دوچار ہو جاتے ہیں جن کا انہوں نے تصور تک نہیں کیا ہوتا۔ ان تمام اُمور پر غور وفکر کرنے کے نتیجہ میں انسان اس برائی سے اجتناب پر آمادہ ہوجاتا ہے اور فرد اور معاشرہ خوش بختی اور سعادت کی راہ پر گامزن ہوجاتے ہیں۔

اخلاقی رذائل کا ایک علاج یہ ہے کہ ان کی سمت کو تبدیل کر دیا جائے، بالفاظِ دیگر ان کو منفی صورت سے مثبت صورت میں تبدیل کر دیا جائے، مثلاً اگر کسی شخص کے اندر منفی اور ناپسندیدہ چیزوں کے بارے میں تعصب پایا جاتا ہے تو اس کے اندر سے تعصب کا خاتمہ کرنے کی بجائے اس کے تعصب کو مثبت اور تعمیری اقدار کے ساتھ جوڑ دیا جائے۔

یہ وہی بات ہے جو امیر المومنین علیہ السلام نے خطبہ قاصعہ میں اسی طرح بیان فرمائی ہے:

''اگر تمہیں تعصب سے کام لینا ہی ہے تو کوشش کرو کہ تمہارا تعصب اچھے اخلاق، پسندیدہ افعال اور بہترین امور کے بارے میں ہو''۔ (نہج البلاغہ: خطبہ 192)

حق کے سامنے سر تسلیم خم کرنا:۔

تعصب، لجاجت اور اندھی تقلید کی ضد ''حق کے سامنے سر تسلیم کرنا'' ہے اور یہ ایک بہت بڑی اخلاقی فضیلت ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان حق کو جہاں کہیں بھی دیکھے، خواہ کسی ایسے شخص کے پاس جس سے اُس کا دور کا بھی تعلق نہ ہو اور وہ شخص کتنا ہی حقیر اور پست کیوں نہ ہو، اُس حق کے سامنے اپنا سر جھکا لے۔

یہ اخلاقی فضیلت انسان کے علم ودانش میں ترقی، گمراہی سے اجتناب اور صراطِ مستقیم پر قدم رکھنے میں بہت مثبت کردار ادا کرتی ہے۔ لیکن یہ اخلاقی فضیلت صرف صالح مؤمنین کو نصیب ہوتی ہے جو محبت میں زیادہ روی اور ہر قسم کی متعصّبانہ وابستگی اور قومی وگروہی تعصّبات سے دُور رہتے ہیں۔

حق کے سامنے سر تسلیم خم کر لینا ایمان، فکری سلامتی، ثقافت کی سطح کے بلند ہونے اور تہذیبِ نفس کی دلیل ہے۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ رسولؐ اللہ کو مخاطب کرتے ہوئے فرماتا ہے۔

''فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتّٰى يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِيٓ أَنفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا○''

''تیرے رب کی قسم! یہ اس وقت تک مومن نہیں ہوسکتے جب تک اپنے اختلافات میں تجھے حاکم نہ بنالیں او

رپھر جو فیصلہ تو کردے، اس پر اپنے دل میں بھی تنگی محسوس نہ کریں اور آپ کے فیصلے کو دل وجان سے تسلیم کرلیں''۔(نسأ:65)

ایک اور مقام پر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

"وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ ؕ

''کسی مومن مرد یا عورت کو یہ حق حاصل نہیں کہ جب اللہ اور اس کا رسولؐ کسی بات کا فیصلہ کردیں تو پھر انہیں اپنے معاملے میں کوئی اختیار حاصل ہو''۔(احزاب:36)

یہاں اس نکتہ کا ذکر ضروری ہے کہ حق کے سامنے سرِتسلیم خم کرنے کے دو معنی ہیں: ایک یہ کہ انسان جہاں بھی حق کو دیکھے، بغیر کسی رُکاوٹ اور تعصب کے اس کے سامنے سر جھکا لے۔ دُوسرے یہ کہ انسان قضاوقدرِ الٰہی کے سامنے سرِتسلیم خم کردے، راضی بہ قضا رہے۔

یہاں پر ہماری گفتگو پہلے معنی کے بارے میں ہے۔ دوسرے معنی کے حوالے سے ہم ''تسلیم ورضا'' کے ذیل میں بحث کریں گے۔

نواں باب

بُزدلی اور شجاعت

تمہید:۔

بزدلی اور بے جا خوف اُن رذائلِ اخلاقی میں سے ہے جو انسانوں کی ذِلت اور پسماندگی کا سبب ہوتی ہیں۔ یہ انسان کی صلاحیت اور استعداد کو تباہ کر کے رکھ دیتی ہے اور انسان کے دُشمن کو اس پر غالب آنے کا راستہ فراہم کرتی ہے۔

اس صفتِ رذیلہ کی ضد شجاعت ہے جو کامیابی کی سب سے اہم چابی اور انسانی عظمت و سربلندی کا زینہ ہے۔ شجاعت صرف میدان جنگ میں ہی نہیں بلکہ سیاسی، معاشرتی اور علمی میدان میں بھی کلیدی کردار ادا کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ علمائے اخلاق نے بزدلی اور شجاعت کے بارے میں تفصیل سے بحث کی ہے اور ان کے اسباب، آثار اور نتائج کا باریک بینی سے تجزیہ کیا ہے۔

علمِ اخلاق کی سابقہ کتب میں شجاعت چار بنیادی فضائلِ اخلاقی میں سے ایک فضیلت قرار دی گئی ہے جبکہ بزدلی کو چار بنیادی رذائل میں سے ایک قرار دیا گیا ہے۔

انبیاؑ اور ان کے سچے پیروکاروں کی تاریخ شجاعت کے مظاہر سے بھری پڑی ہے۔ بے شک وہ تمام انسانوں کیلئے جرأت اور بہادری کا قابلِ تقلید نمونہ ہیں۔

اب ہم اس اخلاقی فضیلت کے جلووں کا مشاہدہ کرنے کیلئے قرآن مجید کی طرف رجوع کرتے ہیں اور آیاتِ قرآنی کی روشنی میں بزدلی کے منحوس اثرات کا بھی جائزہ لیں گے۔

1۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے واقعہ میں ہے:

"وَلَقَدْ اٰتَيْنَآ اِبْرٰهِيْمَ رُشْدَهٗ مِنْ قَبْلُ وَ كُنَّا بِهٖ عٰلِمِيْنَ○ اِذْ قَالَ لِاَبِيْهِ وَقَوْمِهٖ مَا هٰذِهِ التَّمَاثِيْلُ الَّتِيْٓ اَنْتُمْ لَهَا عٰكِفُوْنَ○ قَالُوْا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا لَهَا عٰبِدِيْنَ○ قَالَ لَقَدْ كُنْتُمْ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ○ قَالُوْٓا اَجِئْتَنَا بِالْحَقِّ اَمْ اَنْتَ مِنَ اللّٰعِبِيْنَ○ قَالَ بَلْ رَّبُّكُمْ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الَّذِيْ فَطَرَهُنَّ ۖ وَاَنَا عَلٰى ذٰلِكُمْ مِّنَ الشّٰهِدِيْنَ○ وَتَاللّٰهِ لَاَكِيْدَنَّ اَصْنَامَكُمْ بَعْدَ اَنْ تُوَلُّوْا مُدْبِرِيْنَ○ فَجَعَلَهُمْ جُذٰذًا اِلَّا كَبِيْرًا لَّهُمْ لَعَلَّهُمْ اِلَيْهِ يَرْجِعُوْنَ○"

"ہم نے ابراہیمؑ کو پہلے ہی سے رُشد عطا کر دیا تھا اور ہم اس سے آگاہ تھے۔ جب اُس نے اپنے باپ (آزر)

اور اپنی قوم سے کہا کہ یہ بے رُوح مورتیاں کیا ہیں جن کی تم پوجا کرتے ہو؟ انہوں نے جواب دیا کہ ہم نے اپنے آباؤاجداد کو ان کی پوجا کرتے دیکھا ہے۔ ابراہیمؑ نے کہا: تم اور تمہارے آباؤاجداد کھلی گمراہی میں ہو۔ انہوں نے کہا: کیا تم حق بات کہہ رہے ہو یا مذاق کر رہے؟ ابراہیمؑ نے کہا: تمہارا رب وہی ہے جو آسمانوں اور زمین کا رب ہے، جس نے انہیں پیدا کیا اور میں اس بات پر گواہوں میں سے ہوں۔ اللہ کی قسم! تمہارے یہاں سے چلے جانے کے بعد میں تمہارے بتوں کو تباہ کر دوں گا۔ پس اس نے اُن کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے، سوائے اُن کے بڑے بت کے، تاکہ ہو سکتا ہے کہ وہ اس کے پاس آئیں (اور وہ انہیں حقائق سے آگاہ کرے)''۔ (انبیأ:51 تا58)

2۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بارے میں ہے:

"یٰمُوْسٰی لَا تَخَفْ ۫ اِنِّیْ لَا یَخَافُ لَدَیَّ الْمُرْسَلُوْنَ○"

''اے موسیٰؑ! نہ ڈرو کیونکہ میرے ہاں رسول خوفزدہ نہیں ہوتے''۔ (نمل:10)

3۔ قوم طالوت اور اُس کے بہادر سپاہیوں کے بارے میں ہے:

"فَلَمَّا فَصَلَ طَالُوْتُ بِالْجُنُوْدِ ۙ قَالَ اِنَّ اللّٰهَ مُبْتَلِیْكُمْ بِنَهَرٍ ۚ فَمَنْ شَرِبَ مِنْهُ فَلَیْسَ مِنِّیْ ۚ وَمَنْ لَّمْ یَطْعَمْهُ فَاِنَّهٗ مِنِّیْۤ اِلَّا مَنِ اغْتَرَفَ غُرْفَةًۢ بِیَدِهٖ ۚ فَشَرِبُوْا مِنْهُ اِلَّا قَلِیْلًا مِّنْهُمْ ؕ فَلَمَّا جَاوَزَهٗ هُوَ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ ۙ قَالُوْا لَا طَاقَةَ لَنَا الْیَوْمَ بِجَالُوْتَ وَجُنُوْدِهٖ ؕ قَالَ الَّذِیْنَ یَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوا اللّٰهِ ۙ كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِیْلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِیْرَةًۢ بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِیْنَ○وَلَمَّا بَرَزُوْا لِجَالُوْتَ وَجُنُوْدِهٖ قَالُوْا رَبَّنَاۤ اَفْرِغْ عَلَیْنَا صَبْرًا وَّثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِیْنَ○"

''جب وہ اور وہ لوگ جو ایمان لائے تھے، نہر کو پار کر چکے تو وہ کہنے لگے: آج ہم میں جالوت اور اُس کی فوج سے لڑنے کی طاقت نہیں ہے۔ لیکن ان میں جو یہ جانتے تھے کہ انہیں اللہ سے ملاقات کرنا ہے۔ اُنہوں نے کہا: کئی بار ایسا ہوا ہے کہ چھوٹی فوج اللہ کے حکم سے بڑی فوج پر غالب آجاتی ہے اور اللہ تو صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔ جب وہ جالوت اور اُس کی فوج کے سامنے آئے تو کہنے لگے: اے ہمارے رب! تو ہم پر صبر نازل فرما، ہمیں ثابت قدم رکھ اور کافروں کے خلاف ہماری مدد فرما''۔ (بقرہ : 249 اور 250)

4۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اُنؐ پر ایمان لانے والے بہادر مومنین اور ایمان کو جھوٹا دعویٰ کرنے والے بزدلوں

کے بارے میں ہے:

"وَاِذْ قَالَتْ طَّآىِٕفَةٌ مِّنْهُمْ يٰٓاَهْلَ يَثْرِبَ لَا مُقَامَ لَكُمْ فَارْجِعُوْا ۚ وَيَسْتَاْذِنُ فَرِيْقٌ مِّنْهُمُ النَّبِيَّ يَقُوْلُوْنَ اِنَّ بُيُوْتَنَا عَوْرَةٌ ۛ وَمَا هِيَ بِعَوْرَةٍ ۛ اِنْ يُّرِيْدُوْنَ اِلَّا فِرَارًا ○ وَلَمَّا رَاَ الْمُؤْمِنُوْنَ الْاَحْزَابَ ۙ قَالُوْا هٰذَا مَا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَصَدَقَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ ۫ وَمَا زَادَهُمْ اِلَّا اِيْمَانًا وَّتَسْلِيْمًا ○" (احزاب:13اور22)

''اور یاد کرو جب ان (منافقوں) میں سے ایک گروہ نے کہا: اے اہلِ یثرب (اہل مدینہ) اب تمہارے ٹھہرنے کا موقع نہیں ہے، لہٰذا واپس چلے جاؤ اور ان میں سے کچھ لوگ نبی سے اجازت مانگتے تھے کہ ہمارے گھر غیر محفوظ ہیں، حالانکہ وہ غیر محفوظ نہیں تھے، حالانکہ وہ صرف جنگ سے بھاگنا چاہتے تھے۔ لیکن جب اہلِ ایمان نے احزاب کے لشکر کو دیکھا تو کہنے لگے: یہ وہی چیز ہے جس کا اللہ اور اُس کے رسول نے ہم سے وعدہ کیا تھا اور اللہ اور اُس کے رسول نے سچ کہا اور اس سے صرف ان کے ایمان میں اضافہ ہوا۔''

5۔ ایک اور مقام پر اسی بارے میں آیا ہے:

"قُلْ هَلْ تَرَبَّصُوْنَ بِنَآ اِلَّآ اِحْدَى الْحُسْنَيَيْنِ ۭ وَنَحْنُ نَتَرَبَّصُ بِكُمْ اَنْ يُّصِيْبَكُمُ اللّٰهُ بِعَذَابٍ مِّنْ عِنْدِهٖٓ اَوْ بِاَيْدِيْنَا ۚ فَتَرَبَّصُوْٓا اِنَّا مَعَكُمْ مُّتَرَبِّصُوْنَ ○"

''ان سے کہو: کیا تم ہمارے بارے میں دو بہتر انجاموں کے علاوہ کسی اور کی توقع رکھتے ہو؟ (یا ہم تمہارے خلاف کامیاب ہو جائیں گے یا جامِ شہادت نوش کریں گے) لیکن ہمیں تو یہ توقع ہے کہ اللہ ہم پر اپنی طرف سے عذاب بھیجے یا ہمارے ہاتھوں تمہیں سزا دے۔ لہٰذا اب تم بھی انتظار کرو اور ہم بھی انتظار کرتے ہیں''۔ (توبہ:52)

6۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعض اصحاب کے بارے میں ہے:

"اَلَّذِيْنَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ اِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوْا لَكُمْ فَاخْشَوْهُمْ فَزَادَهُمْ اِيْمَانًا ۖ وَّقَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ ۔ اِنَّمَا ذٰلِكُمُ الشَّيْطٰنُ يُخَوِّفُ اَوْلِيَآءَهٗ ۠ فَلَا تَخَافُوْهُمْ وَخَافُوْنِ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ○"

''یہ وہ لوگ ہیں کہ جب لوگوں نے انہیں کہا کہ دُشمن کی فوجیں تم پر حملہ کرنے کیلئے جمع ہوگئی ہیں، لہٰذا ان سے ڈرو تو ان باتوں سے ان کے ایمان میں اضافہ ہوگیا اور انہوں نے کہا: اللہ ہمارے لئے کافی ہے اور بہترین کارساز

ہے۔یہ تو شیطان ہے(جوایسی باتوں سے)اپنے پیروکاروں کوڈراتا ہے،ان سے نہ ڈرواوراگرایمان رکھتے ہو توصرف مجھ سے ڈرو''۔(آل عمران 173 تا175)

7۔ "اَلَّذِيْنَ يُبَلِّغُوْنَ رِسٰلٰتِ اللّٰهِ وَيَخْشَوْنَهٗ وَلَا يَخْشَوْنَ اَحَدًا اِلَّا اللّٰهَ ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ حَسِيْبًا○"

''(گزشتہ انبیاؑ)ایسے تھے جواللہ کے پیغامات کی تبلیغ کرتے تھےاورصرف اُسی سے ڈرتے تھے اوراللہ کے سواکسی سے نہیں ڈرتے تھے۔ یہ بات کافی ہے کہ اللہ (اعمال کا)حساب کرنے والا (اور جزادینے والا)ہے۔''(احزاب۔39)

تفسیر

انبیائے الٰہی بزدل نہیں ہوتے:۔

پہلی آیات میں توحید کےعظیم الشان پیروحضرت ابراہیم علیہ السلام کی اپنی بت پرست اورمتعصب قوم کے سامنے جرأت وبہادری کو بیان کیا گیا ہے۔ان آیات میں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ عظیم پیغمبرؑ یکہ وتنہا اپنی بت پرست قوم کے مقابلہ پرڈٹے ہوئے تھے۔اگرچہ حکومتِ وقت بھی بت پرست قوم کی حمایت کررہی تھی مگرحضرت ابراہیمؑ کی جرأت اورہمت میں کوئی سستی پیدانہ ہوئی۔

ان آیات میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:''ہم نے پہلے ہی سے ابراہیمؑ کورُشدعطا کردیا تھااورہم (اس کی قابلیت سے) آگاہ تھے۔

وَلَقَدْ اٰتَيْنَآ اِبْرٰهِيْمَ رُشْدَهٗ مِنْ قَبْلُ وَكُنَّا بِهٖ عٰلِمِيْنَ۝ (انبیاء)

درحقیقت اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ کونہایت عمدہ صلاحیتوں سے نوازا تھا۔حضرت ابراہیمؑ اُن صلاحیتوں کوبہترین انداز سے بروئے کارلائے اورانسانوں کی بدبختی کی اصل وجہ یعنی شرک اوربت پرستی کے خلاف میدان میں اُترآئے۔انہوں نے اس جنگ کا آغازاپنے چچاآزرسے کیااورکہا:

''یہ بےجان مورتیاں کیاہیں جن کی تم پوجا کرتے ہو؟''

جب آزرنے جواب دیا کہ یہی ہمارے آباؤاجداد کا طریقہ ہےتوحضرت ابراہیمؑ نے نہایت جرأت اوربیباکی سے جواب دیا کہ تم بھی کھلی گمراہی میں ہواورتمہارے آباؤاجداد بھی کھلی گمراہی میں تھے۔

آزرکویقین نہیں آرہا تھا کہ ابراہیمؑ واقعی بت پرستی کے خلاف جنگ کررہے ہیں یامذاق میں یہ باتیں کررہے ہیں۔لہٰذااس

نے حضرت ابراہیمؑ سے کہا: تم مذاق تو نہیں کر رہے؟ ابراہیمؑ جواب دیتے ہیں کہ ہرگز نہیں۔ میں بالکل سنجیدہ ہوں۔ تمہارا رب وہی ہے جو آسمانوں اور زمین کا رب ہے۔ انہوں نے مزید کہا: اللہ کی قسم! میں نے تہیہ کر رکھا ہے کہ تمہاری عدم موجودگی میں تمہارے بتوں کو پاش پاش کر دوں گا۔

"وَتَاللّٰهِ لَاَكِيْدَنَّ اَصْنَامَكُمْ بَعْدَ اَنْ تُوَلُّوْا مُدْبِرِيْنَ○"(انبیأ: 57)

آخر کار حضرت ابراہیمؑ نے اپنی بات پر عمل کرتے ہوئے ایک مناسب موقع پا کر اُن کے سب بتوں کو پاش پاش کر دیا مگر اُن کے بڑے بت کو چھوڑ دیا تا کہ جب وہ اپنے بتوں کے پاس آئیں تو اس صورتِ حال کو دیکھ کر عبرت حاصل کریں۔

"فَجَعَلَهُمْ جُذٰذًا اِلَّا كَبِيْرًا لَّهُمْ لَعَلَّهُمْ اِلَيْهِ يَرْجِعُوْنَ○"(انبیأ: 58)

ان آیات سے یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ انبیأ کے فضائل میں شجاعت انتہائی نمایاں تھی۔ وہ اللہ کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے تھے اور اللہ کی راہ میں کسی قسم کی کمزوری کا مظاہرہ نہیں کرتے تھے۔ بزدلی، جو ایک اخلاقی رذیلت ہے، انبیأ اس سے مکمل طور پر پاک ہوتے تھے۔ وہ یکہ و تنہا ہجوم دُشمنان کے سامنے ڈٹ جاتے تھے اور کامیاب ہو جاتے تھے۔ اگر بزدلی ان کے اوپر اپنا سایہ ڈال سکتی تو نہ وہ اپنے فرائض کو انجام دے سکتے اور نہ ہی دُشمنوں پر غالب آ سکتے۔

دُوسری آیت میں حضرت موسیٰؑ سے خطاب ہے۔ پہلی وحی میں جب اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حکم دیا کہ اپنا عصأ زمین پر پھینک دو اور عصأ ایک بہت بڑا سانپ بن گیا جسے دیکھ کر حضرت موسیٰ علیہ السلام خوفزدہ ہو گئے۔ یہاں اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا: ''اے موسیٰؑ! خوفزدہ نہ ہو کیونکہ رسول میرے پاس خوفزدہ نہیں ہوتے''۔

"يٰمُوْسٰى لَا تَخَفْ ۫ اِنِّىْ لَا يَخَافُ لَدَىَّ الْمُرْسَلُوْنَ○"(نمل: 10)

اگر اس حقیقت کو مدِ نظر رکھا جائے کہ اللہ تعالیٰ کی مقدس ذات ہر جگہ موجود ہے تو اہلِ ایمان کو کسی حال میں اور کسی مقام پر خوفزدہ نہیں ہونا چاہئے بلکہ انہیں ہر حال میں اُس پاک ذات پر توکل کرنا چاہئے اور جرأت اور بہادری کے ساتھ مقدس الٰہی مقاصد کے حصول کیلئے مسلسل آگے بڑھتے رہنا چاہئے۔

سورۂ قصص کی آیت 31 میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اس واقعہ کا ذکر ان الفاظ میں کیا گیا ہے:

"۟ يٰمُوْسٰٓى اَقْبِلْ وَلَا تَخَفْ ۫ اِنَّكَ مِنَ الْاٰمِنِيْنَ○"(قصص: 31)

''اے موسیٰؑ! آگے بڑھو اور خوفزدہ نہ ہو، تم امان میں ہو''۔

اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس اطمینان بخش خطاب کے آجانے کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام مطمئن اور پرسکون ہو گئے۔ اب حضرت موسیٰ علیہ السلام کو یہ حکم دیا گیا کہ نہ صرف یہ کہ اس بہت بڑے سانپ سے ڈریں نہیں بلکہ اسے اپنے ہاتھ میں پکڑ لیں تا کہ وہ دوبارہ عصأ بن جائے۔

"قَالَ خُذْهَا وَلَا تَخَفْ ۖ سَنُعِيدُهَا سِيرَتَهَا الْأُولَىٰ ○" (طٰہٰ: 21)

''اللہ نے کہا: اسے پکڑ لو اور مت ڈرو۔ ہم اسے اس کی پہلی حالت پر لوٹا دیں گے''۔

یقیناً یہ کام حضرت موسیٰ علیہ السلام کیلئے بہت مشکل تھا مگر اُنہوں نے اسے انجام دیا اور کامیاب ہو گئے۔

اللہ تعالیٰ کے حضور میں یہ تجربہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کیلئے ضروری تھا تا کہ وہ فرعون اور اُس جیسے اژدہوں کا دلیری سے مقابلہ کر سکیں۔

یہ نکتہ قابلِ ذکر ہے کہ قرآن مجید میں یہ جملہ ''لَا تَخَفْ''، ''مت ڈرو'' نو بار آیا ہے جن میں سے پانچ بار اس خطاب کا رُخ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو فرعون جیسے بڑے دُشمن کا سامنا تھا۔

آیات کے تیسرے گروہ میں طالوت کا ذکر ہے جسے اس دور کے نبی حضرت سموئیل نے بنی اسرائیل کی فوج کا سالار مقرر فرمایا تھا تا کہ وہ جالوت جیسے ظالم کا مقابلہ کر سکیں۔

طالوت نے جالوت کے لشکر کا سامنا کرنے سے پہلے اپنے لشکر کو آزمایا تا کہ جواں مرد اور ناجواں مرد میں امتیاز ہو سکے اور وہ کم ہمت اور بزدل جو دوسروں کی ہمت کمزور کرنے کا سبب بن سکتے ہوں، اُن کی پہچان ہو جائے۔ طالوت نے اپنے سپاہیوں کو، جو یقیناً پیاسے تھے، نہر کے پانی سے آزمایا اور کہا کہ جو کوئی اس پانی سے پیئے گا، وہ ہم میں سے نہیں ہے اور جو لوگ اپنی پیاس کا مقابلہ کرتے ہوئے صرف ایک گھونٹ پئیں، وہ ہمارے ساتھی ہیں۔ لیکن ہوا یہ کہ سپاہیوں کی اکثریت نے، جو کم ہمت اور سُست عزم و ارادہ کے مالک تھے، اس آزمائش میں ناکام ہو گئے۔ ایک چھوٹی سی اقلیت اس آزمائش میں سرفراز ہوئی۔ اسی اقلیت کے بارے میں قرآن مجید فرماتا ہے کہ جب طالوت اور جالوت کے لشکر آمنے سامنے ہوئے تو انہوں نے کہا: کئی بار ایسا ہوا کہ چھوٹی فوج اللہ کے حکم سے بڑی فوج پر غالب آ گئی اور پھر اُنہوں نے دُعا مانگی: (بقرہ: 250)

"رَبَّنَا أَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَثَبِّتْ أَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِينَ ○"

اللہ تعالیٰ نے اس شجاع اور باہمت گروہ کی برکت سے انہیں جالوت کے کیل کانٹے سے لیس لشکرِ جرار پر فتح عطا فرمائی۔

آیات کے اگلے مجموعے میں حضورؐ کے دور میں جنگِ احزاب کے موقع پر منافقوں اور ضعیف الایمان مسلمانوں کی بزدلی اور حقیقی مومنین کی جرأت اور شجاعت کا ذکر کیا گیا ہے۔

پہلے یہ کہا جا رہا ہے: ''یاد کرو جب ان (منافقوں) میں سے ایک گروہ نے کہا: اے اہلِ مدینہ! یہ جگہ یعنی میدانِ جنگ ٹھہرنے کی جگہ نہیں ہے، اپنے گھروں کو چلے جاؤ اور ان میں سے بعض رسولؐ اللہ سے رُخصت مانگ رہے تھے کہ ہمارے گھر غیر محفوظ ہیں، حالانکہ ان کے گھر غیر محفوظ نہیں تھے (بلکہ خوف کی وجہ سے وہ میدان سے جانے کا بہانہ بنا رہے تھے) اور فرار کرنا چاہ رہے تھے۔

"وَإِذْ قَالَتْ طَّائِفَةٌ مِّنْهُمْ يَا أَهْلَ يَثْرِبَ لَا مُقَامَ لَكُمْ فَارْجِعُوا ۚ وَيَسْتَأْذِنُ فَرِيقٌ مِّنْهُمُ

النَّبِيَّ يَقُوْلُوْنَ اِنَّ بُيُوْتَنَا عَوْرَةٌ ۛ وَمَا هِيَ بِعَوْرَةٍ ۛ اِنْ يُّرِيْدُوْنَ اِلَّا فِرَارًا ○ (احزاب:13)

دشمن کے لشکر کی کثرت اور ساز وسامان کی فراوانی اس قدر خوفناک تھی کہ بزدل اور ڈرپوک افراد میں ان کا مقابلہ کرنے کی ہمت نہ تھی۔

لیکن اسی سورۃ کی آیت 22 میں ہے کہ جو حقیقی مومن تھے، انہوں نے کفار کے مختلف قبائل پر مشتمل لشکر کو دیکھا تو ذرا بھی خوفزدہ نہیں ہوئے بلکہ اسے اللہ کے وعدوں کی سچائی کی دلیل سمجھا جس کے نتیجہ میں ان کے ایمان، تسلیم اور شجاعت میں بھی اضافہ ہوگیا۔

"وَلَمَّا رَاَ الْمُؤْمِنُوْنَ الْاَحْزَابَ ۙ قَالُوْا هٰذَا مَا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَصَدَقَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ ۡ وَمَا زَادَهُمْ اِلَّا اِيْمَانًا وَّتَسْلِيْمًا ○" (احزاب:22)

دلچسپ بات یہ ہے کہ بعض روایات میں آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے منافقین اور ضعیف الایمان مسلمانوں کو مدینہ واپس چلے جانے کی اجازت دے دی تھی، اس لئے کہ اگر وہ محاذ پر رہتے تو نہ صرف یہ کہ کوئی کارنامہ انجام نہ دے پاتے بلکہ دُوسروں کے حوصلے بھی پست کر دیتے۔

یہی وجہ ہے کہ سورۂ توبہ کی آیت 47 میں آیا ہے:

"لَوْ خَرَجُوْا فِيْكُمْ مَّا زَادُوْكُمْ اِلَّا خَبَالًا"۔

''اگر وہ تمہارے ساتھ چلتے تو تمہارے تذبذب اور اضطراب میں ہی اضافہ کرتے''۔

عربی زبان میں ''خبل'' اور خبال'' اضطراب اور تذبذب کے معنی دیتے ہیں جو عقل کی کمزوری اور قوتِ فیصلہ کی کمی سے پیدا ہوتے ہیں۔ خوف اور وحشت کا نتیجہ یہی ہوتا ہے کہ انسان کا فکری توازن درہم برہم ہوجاتا ہے اور اس کی قوتِ ارادی اور قوتِ فیصلہ میں کمی آجاتی ہے۔

پانچویں آیت میں رسول اللہ ﷺ کے جاں نثار ساتھیوں کی شجاعت کا ایک اور چہرہ نظر آتا ہے۔ یہ ایسی شجاعت ہے جس کا سرچشمہ ایمان سے جنم لینے والی سوچ ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے یہ ساتھی بخوبی جانتے تھے کہ میدان جنگ میں ان کے سامنے دو ہی راستے ہیں۔ ایک فتح وکامرانی کا راستہ اور دوسرا شہادت کا راستہ۔ دونوں راستے صاحبانِ ایمان کیلئے کامیابی وسعادت کے راستے ہیں۔ دوسری طرف سے دشمن کے سامنے بھی صرف دو ہی راستے ہیں یا تو دُنیا میں لشکر اسلام کے ہاتھوں شکست کھا کر ذلیل ہوں اور اگر انہیں ظاہری اور وقتی کامیابی حاصل ہو بھی جائے تو بالآخر آخرت میں صرف عذابِ الٰہی ہی ان کا مقدر ہے۔

ظاہر سی بات ہے کہ ایسی سوچ رکھنے والا شخص کبھی خوف وہراس کا شکار نہیں ہوتا اور بزدلی جیسی اخلاقی رذیلت اس کے قریب نہیں آسکتی۔

"قُلْ هَلْ تَرَبَّصُوْنَ بِنَآ اِلَّآ اِحْدَى الْحُسْنَيَيْنِ ۭ وَنَحْنُ نَتَرَبَّصُ بِكُمْ اَنْ يُّصِيْبَكُمُ اللّٰهُ بِعَذَابٍ مِّنْ عِنْدِهٖٓ اَوْ بِاَيْدِيْنَا ۚ فَتَرَبَّصُوْٓا اِنَّا مَعَكُمْ مُّتَرَبِّصُوْنَ○"(توبہ:52)

حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں کی کامیابی کا راز ہی اسی طرزِ تفکر سے پیدا ہونے والی شجاعت میں مضمر ہے۔

چھٹی آیت میں جنگِ اُحد میں اہلِ ایمان کی شجاعت کا ایک نمونہ بیان کیا گیا ہے۔

ہم یہ بات جانتے ہیں کہ جنگِ اُحد میں مالِ دُنیا کے دلدادہ کچھ مسلمان سپاہیوں نے اپنے مورچے چھوڑ دیئے اور مالِ غنیمت سمیٹنے میں مصروف ہو گئے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسلام کو سنگین جانی نقصان اُٹھانا پڑا۔

مشرکین کا لشکر فتح کے نعرے لگاتا ہوا میدانِ اُحد سے مکہ کی طرف واپس چل پڑا۔ راستے میں اُنہیں خیال آیا کہ موقع سے فائدہ اُٹھا کر دوبارہ لشکرِ اسلام پر حملہ کر دیا جائے تا کہ اُن کی فتح مستحکم ہو جائے۔

رسولؐ اللہ نے اس موقع پر ایک انتہائی مؤثر تدبیر اختیار فرمائی اور حکم دیا کہ لشکرِ اسلام کے تمام مجاہد، حتیٰ کہ وہ بھی جو شدید زخمی تھے، اس طرف پیش قدمی کریں جہاں سے دُشمن واپس آ رہا تھا۔ لہٰذا لشکرِ اسلام پیش قدمی کر کے حمرأ الاسد کے مقام پر آ گیا۔ جب دُشمن کو اس کی خبر ہوئی تو اُس نے یہ سوچ کر کہ اپنی اس چھوٹی سی فتح کی حفاظت کرنا زیادہ مناسب ہے، لشکرِ اسلام پر حملہ کرنے کا خیال ترک کر دیا اور مکہ کی طرف پلٹ گیا۔

اس آیت میں مسلمانوں کے اس اقدام پر ان الفاظ میں ان کی تعریف کی گئی:

"اَلَّذِيْنَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ اِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوْا لَكُمْ فَاخْشَوْهُمْ فَزَادَهُمْ اِيْمَانًا ۖ وَّقَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ○(آل عمران:173)"

''یہ وہ لوگ ہیں کہ جب لوگوں نے انہیں کہا کہ دُشمن حملہ کرنے کیلئے جمع ہو رہے ہیں، ان سے ڈرو تو (ڈرنے کی بجائے) ان کے ایمان میں اضافہ ہو گیا اور وہ کہنے لگے: اللہ ہمارے لئے کافی ہے اور وہ بہترین کارساز ہے''۔

دُنیا میں کہیں ایسی مثال نہیں ملتی کہ زخمی سپاہی فوراً میدانِ جنگ میں آ کر صفِ اوّل میں کھڑے ہو جائیں۔

ان کی اس بے مثال شجاعت نے دُشمن کی ہمت پست کر دی اور اسے مایوس اور ناکام واپس ہو جانے پر مجبور کر دیا۔

لشکرِ اسلام کے حمرأ الاسد پر موجود ہونے کی اطلاع نے نہ صرف دشمن کے عزائم کو خاک میں ملا دیا بلکہ ان کی فتح کی لذت کو بھی تلخی میں بدل دیا۔ لشکرِ اسلام کے اس جرأت مندانہ اقدام سے دُشمن کو یہ پیغام مل گیا کہ اگرچہ کچھ مسلمان سپاہیوں کی غفلت سے انہیں عارضی شکست کا سامنا کرنا پڑا مگر ان کی ہمت نہیں ٹوٹی۔ اس طرح نہ صرف یہ کہ لشکرِ اسلام نے ایک شکست کا راستہ روک دیا بلکہ اپنی شکست کے منفی اثرات پر قابو پا لیا اور اللہ پر توکل کے ذریعے دِلوں میں اُمید کی شمع روشن کر دی۔

اس آیت سے یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ جب بعض شیاطین نے لشکرِ اسلام کو دشمن کی فوج کے مجتمع ہونے کی خبر سنا کر

خوفزدہ کرنا چاہا تو وہ بالکل خوفزدہ نہ ہوئے بلکہ ان کے ایمان اور توکل میں اضافہ ہوگیا۔اس کی ایک ہی وجہ تھی کہ اللہ اور اس کے رسولؐ اللہ کے وعدوں کی سچائی ان پر آشکار ہوگئی اور رسولؐ اللہ کی بات کی صداقت ان پر عیاں ہوگئی کہ اگر وہ میدانِ اُحد میں آپؐ کے حکم کی پیروی کرتے تو انہیں اس شکست کا سامنا نہ کرنا پڑتا۔

اس جنگ کی ایک حیرت انگیز بات یہ ہے کہ آنحضرتؐ نے حکم دیا کہ جن لوگوں نے جنگِ اُحد میں شرکت کی تھی،صرف وہی حمرأالاسد کی طرف پیش قدمی کریں۔اس طرح آپؐ نے دُشمن پر واضح کر دیا کہ زخمی مجاہدین پوری طرح سے جنگ کیلئے آمادہ ہیں اور ان کے عزم میں ذراسی بھی کمزوری پیدا نہیں ہوئی ہے۔یہی وہ بات ہے جس نے دُشمن کو پریشان اور مضطرب کر دیا۔

آگے چل کر اسی سورۂ کی آیت 175 میں ضعیف الایمان بزدلوں اور بہادر مومنین کا فرق اس طرح واضح کیا گیا ہے:

"اِنَّمَا ذٰلِكُمُ الشَّيْطٰنُ يُخَوِّفُ اَوْلِيَآءَهٗ ۪ فَلَا تَخَافُوْهُمْ وَخَافُوْنِ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ○"

(آلِ عمران:175)

''یہ شیطان ہی ہے جو اپنے دوستوں کو ڈراتا ہے،پس تم ان سے نہ ڈرو اور صرف مجھ سے ڈرو،اگر تم مومن ہو''۔

اس آیت سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اس قسم کے خوف شیطانی وسوسے ہوتے ہیں جن کا مقصد مومنین کے ایمان کو کمزور کرنا ہوتا ہے لیکن حقیقی مومن اللہ کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے۔

جس طرح اس قسم کے خوف شیطانی وسوسوں کا نتیجہ ہوتے ہیں،اسی طرح مومنین کی جرأت اور بہادری کی بنیاد ان کا ایمان ہوتا ہے۔مومن اللہ پر بھروسہ کرتا ہے۔چونکہ اللہ کی طاقت اور قوت ہر طاقت اور قوت سے برتر ہے،لہٰذا مومن کو ہر میدان میں کامیابی کا یقین ہوتا ہے۔اس کے برعکس کفار چونکہ اپنی طاقت پر بھروسہ کرتے ہیں،لہٰذا جب وہ اپنے آپ کو کمزور محسوس کرتے ہیں تو خوف اور وحشت کا سایہ ان پر چھا جاتا ہے۔

غزوۂ حمرأالاسد میں شیطانی طاقتوں نے گٹھ جوڑ کیا تا کہ قریش کی طاقت کو بڑھا چڑھا کر مسلمانوں کے سامنے پیش کریں اور وہ خوفزدہ ہو جائیں جبکہ قرآن کے مطابق ایسے حالات میں شیطان اور اس کے ساتھی ہی خوفزدہ ہوتے ہیں اور اللہ کے اولیأ کسی قسم کے خوف اور حزن کو قریب نہیں آنے دیتے۔

ساتویں اور آخری آیت مبلغانِ رسالت الٰہی کی یہ صفت بیان کر رہی ہے کہ وہ خوف جیسی صفتِ رذیلہ سے پاک ہوتے ہیں:

"الَّذِيْنَ يُبَلِّغُوْنَ رِسٰلٰتِ اللّٰهِ وَيَخْشَوْنَهٗ وَلَا يَخْشَوْنَ اَحَدًا اِلَّا اللّٰهَ ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ حَسِيْبًا○"

یہ ایسے افراد تھے جواللہ کی رسالتوں کی تبلیغ کرتے تھے اوراسی سے ڈرتے تھے اوراس کے سواکسی سے نہیں ڈرتے تھے یہی بات ہے کہ اللہ حساب لینے والا ہے۔(احزاب:39)

اللہ کے رسولوں کا سب سے اہم فریضہ یہ ہے کہ وہ اللہ کے پیغامات کی تبلیغ کریں اوراس کی بنیادی شرط یہ ہے کہ وہ خوف سے بالکل پاک ہوں۔

یہ آیت جوگزشتہ انبیاؑ کا ذکرکررہی ہے،رسولؐ اللہ اورانؐ کے بعد آنے والے تمام مبلغین الٰہی کوخبردارکیا جارہا ہے کہ وہ اللہ کا پیغام اُس کے بندوں تک پہنچانے میں اللہ کے سواکسی چیز سے نہ ڈریں۔بالفاظِ دیگر یہ آیت اس حقیقت کو بیان کررہی ہے کہ ڈرپوک اور بزدل افراداللہ کے پیغام کی تبلیغ کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔

بعض مفسرین نے اس آیت سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ انبیاؑ کوتبلیغ کرتے وقت تقیہ سے کام نہیں لینا چاہئے۔لیکن یہ تفسیر صرف اسی صورت میں صحیح ہوسکتی ہے جب تقیہ مخالفین کے خوف کی وجہ سے ہو۔لیکن تقیہ ہمیشہ مخالفین کے خوف کی وجہ سے نہیں ہوتا بلکہ بعض اوقات اس کا مقصد مخالفین کوجذب کرنا یا بتدریج انہیں حق کے قریب لانے کیلئے بھی ہوتا ہے۔حضرت ابراہیمؑ کا سورج، چاند اور ستارے کودیکھ کر''ھٰذَا رَبِّیْ'' کہنااس مفہوم کا حامل ہوسکتا ہے۔

نتیجہ:۔

قرآن مجید کی آیات جن میں سے چندنمونے ہم دیکھ چکے ہیں، جرأت اورشجاعت کی اہمیت اورانسان کی مادی اورمعنوی ترقی میں ان کے کرداراورخوف کے منفی نتائج کوبخوبی آشکارکردیتی ہیں۔

یہ بات صحیح ہے کہ ان آیات میں بہادری اور بزدلی کوبطورمستقل زیربحث نہیں لایا گیالیکن ضمنی طور پرانہیں اس انداز سے بیان کیا گیاہے کہ ان کی اہمیت واضح ہوجاتی ہے۔

خوف اور بُزدلی احادیث کی روشنی میں

احادیث میں اس صفتِ رذیلہ کی وسیع پیمانے پرمذمت کی گئی ہے۔امام محمد باقر علیہ السلام فرماتے ہیں:

1۔ ''لَایَکُوْنُ الْمُؤْمِنُ جَبَاناًوَّلَاحَرِیْصًاوَّلَاشَحِیْحًا۔''

''مومن بزدل،حریص اوربخیل نہیں ہوتا''۔(بحارالانوار،301:72)

اس حدیث سے یہ بات بخوبی واضح ہوجاتی ہے کہ خوف،حرص اوربخل کا ایمان کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے،اس لئے کہ مؤمن اللہ پر بھروسہ کرتا ہے اور جواللہ پر بھروسہ کرے وہ اللہ کے فضل وکرم کی اُمید سے مالا مال ہوتا ہے۔ایسے شخص کے بزدل، حریص یا بخیل ہونے کی گنجائش ہی نہیں ہوتی۔

2۔ امیرالمومنین علیہ السلام فرماتے ہیں:

"اَلْجُبْنُ وَالْحِرْصُ وَالْبُخْلُ غَرَائِزُ سُوْءٍ يَجْمَعُهَا سُوْءُ الظَّنِّ بِاللهِ سُبْحَانَهٗ"۔

''خوف، حرص اور بخل اللہ تعالیٰ کے بارے میں بدگمانی سے پیدا ہوتے ہیں''۔(غررالحکم)

یہ حدیث مذکورہ بالا حدیث کی خوبصورت تشریح ہے۔

3۔ حضرت علی علیہ السلام نے اپنے دوستوں کو نصیحت کی کہ کبھی کسی بزدل شخص سے مشورہ نہ کریں:

"لَا تُشْرِكَنَّ فِيْ رَأْيِكَ جَبَانًا يُضَعِّفُكَ عَنِ الْاَمْرِ وَيُعَظِّمُ عَلَيْكَ مَا لَيْسَ بِعَظِيْمٍ"۔

''بزدل انسان کو ہرگز اپنے مشورہ میں شریک نہ کرو، وہ اہم کاموں میں تمہیں کمزور کردے گا اور چھوٹی چھوٹی چیزوں کو بڑا کر کے دکھائے گا''۔(غررالحکم: حدیث:10349)

مالک اشتر کے نام اپنے حکم نامے میں بھی آپؑ نے بخیل، بزدل اور حریص سے مشورہ کرنے سے منع فرمایا:(نہج البلاغہ، مکتوب:53)

4۔ یہ معاملہ اس قدر اہم ہے کہ ایک حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حکم فرماتے ہیں کہ بزدل افراد جنگوں میں شریک نہ ہوں کیونکہ وہ دوسروں کی حوصلہ شکنی کا باعث بن سکتے ہیں۔آپؐ فرماتے تھے:

"مَنْ اَحَسَّ مِنْ نَفْسِهٖ جَبْنًا فَلَا يَغْزُ"۔

''جو شخص اپنے اندر بزدلی محسوس کرتا ہے، وہ جنگ میں شرکت نہ کرے''۔

5۔ ایک حدیث میں امیرالمومنین علیہ السلام نے مذکورہ بالا حدیث کی بہت عمدہ تشریح فرمائی ہے:

"لَا يَحِلُّ لِلْجَبَانِ اَنْ يَغْزُوْا، لِاَنَّهٗ يَنْهَزِمُ سَرِيْعًا وَلٰكِنْ لِيَنْظُرْ مَا كَانَ يُرِيْدُ اَنْ يَغْزُوَ بِهٖ فَلْيُجَهِّزْ بِهٖ غَيْرَهٗ"۔

(بحارالانوار، 49:97)

''بزدل افراد کیلئے جنگ میں شرکت کرنا جائز نہیں ہے، اس لئے کہ وہ جلد ہی میدان چھوڑ کر بھاگ جائیں گے(اس سے دوسروں کے حوصلے بھی پست ہوجائیں گے) لہٰذا انہیں چاہئے کہ اپنا سامانِ جنگ کسی اور کو دے دیں''۔

معقول خوف اور غیر معقول خوف

خوف کی دو اقسام ہیں: معقول اور غیر معقول۔ اس بات میں کوئی شک وشبہ نہیں ہونا چاہئے کہ قرآن وحدیث میں جس خوف کی مذمت کی گئی ہے، وہ غیر معقول خوف ہے۔

اس کی وضاحت یہ ہے کہ جو چیزیں واقعی خطرناک ہیں، ان سے ڈرنا ایک قدرتی سی بات ہونے کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ کی نعمت بھی ہے، اس لئے کہ اگر انسان کسی بھی خطرناک چیز سے نہ ڈرے تو جلد ہی اس کی زندگی کا خاتمہ ہوجائے، مثلاً اگر کوئی شخص دائیں بائیں دیکھے بغیر سڑک پار کرنا چاہے تو اس کی زندگی خطرناک حادثات کا شکار ہوسکتی ہے۔ اس قسم کے خوف روزمرہ کی زندگی میں ہوں، مشکوک خوراک کے بارے میں یا سیاسی اور معاشی معاملات میں مکمل طور پر معقول اور منطقی ہوتے ہیں اور انسان کو مہلک حادثات سے بچانے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔

غیر معقول اور قابلِ مذمت خوف وہ ہوتا ہے کہ انسان ایسی چیزوں سے خوفزدہ ہو جن سے خوفزدہ نہیں ہونا چاہئے۔ اگر انسان چھوٹے چھوٹے خیالی خطرات سے ڈرنے لگے اور خیالی دُشمنوں سے وحشت زدہ ہونے لگے تو رفتہ رفتہ ایسے شخص کی حالت یہ ہوجاتی ہے کہ وہ اپنے سائے سے بھی ڈرنے لگتا ہے۔ ایسا شخص ہر اس کام کو ہاتھ لگانے سے ڈرتا ہے جس میں ناکامی کا امکان ہو۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ یہ خوف انسان کی پسماندگی اور بدبختی کا سبب بن جاتا ہے اور اُسے ذِلت وخواری کی زندگی بسر کرنے پر مجبور کردیتا ہے۔

یہ دُنیا جس میں ہم زندگی گزار رہے ہیں، ایک میدانِ جنگ ہے جس میں ہر قدم پر مشکلات، رُکاوٹیں اور خطرات سامنے آتے ہیں۔ انسان ان کے ساتھ مقابلہ کرکے ہی کامیابی کی منزل کو حاصل کرسکتا ہے۔

دُنیا میں شاید ہی کوئی ایسا کام ہو جس میں کامیابی کی سو فیصد ضمانت دی جاسکے یا جس کو کرنے میں کسی قسم کا خطرہ درپیش نہ ہو۔ اگر انسان میں جرأت اور شجاعت موجود نہ ہو تو وہ ہر قدم پر ناکام ہوتا رہے گا۔ یہاں سے شجاعت اور جرأت کی اہمیت اور ضرورت بخوبی آشکار ہوجاتی ہے اور بزدلی کا منفی کردار بھی کھل کر سامنے آجاتا ہے۔

ہر کسان اور کاشتکار کے کھیت اور فصل کے نقصان کا امکان موجود ہوتا ہے۔ ہر تاجر کو تجارت میں نقصان کا امکان ہوتا ہے۔ کوئی مسافر سفر میں حادثے کے امکان کو نظرانداز نہیں کرسکتا۔ ہر آپریشن میں ناکامی یا بعد میں پیچیدگی پیدا ہونے کا امکان موجود ہوتا ہے۔ اگر انسان تمام معاملات کی بنیاد منفی امکانات پر رکھ دے تو وہ کسی کام کو شروع ہی نہیں کرسکے گا۔ ایسا انسان ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر صرف موت کا انتظار کرسکتا ہے۔

اس کے معنی یہ بھی نہیں ہیں کہ ان خطرات کو یکسر نظرانداز کردیا جائے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ان خطرات کا اچھی طرح سے جائزہ لے کر ان سے بچنے کی مناسب تدبیر کی جائے اور پھر جرأت اور شجاعت کے ساتھ میدانِ عمل میں قدم رکھا جائے۔

مختصر یہ ہے جس طرح غیر معقول اور خیالی خطرات سے خوفزدہ ہونا صحیح نہیں ہے، اسی طرح حقیقی خطرات کو نظرانداز کرنا، ان

سے بے پرواہ ہو کر مقہورانہ اندازِ عمل اختیار کرنا بھی درست نہیں ہے۔

حضرت امام حسن علیہ السلام نے بزدلی کی نہایت خوبصورت تعریف بیان فرمائی ہے:

"اَلْجُرْأَةُ عَلَى الصَّدِيْقِ وَالنُّكُوْلُ عَنِ الْعَدُوِّ"۔ (میزان الحکمہ، 370:1)

''بزدلی یہ ہے کہ انسان دوست کے خلاف جرأت منداور دُشمن کے سامنے کمزور ہو''۔

ایک اور حدیث میں آپؑ شجاعت کی تعریف میں فرماتے ہیں:

"مُوَافِقَةُ الْاَقْرَانِ وَالصَّبْرِ عِنْدَ الطِّعَانِ"۔ (میزان الحکمہ، 1412:2)

''شجاعت یہ ہے کہ انسان دوست کا ساتھ دے اور دُشمن کے سامنے ثابت قدم رہے''۔

قرآن مجید میں ایک مقام پر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

"وَلَا تُلْقُوْا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ ۛ" (بقرہ: 195)

''اور اپنے ہاتھوں سے اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو''۔

ایک اور مقام پر مومنین کی یہ صفت بیان فرمائی:

"اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ" (فتح: 29)

''وہ کفار کے خلاف شدت سے کام لیتے ہیں''۔ (یعنی اُن کے مقابلے میں خوف اور کمزوری کا مظاہرہ نہیں کرتے)۔

مذکورہ بالا بحث سے یہ بات بخوبی واضح ہوجاتی ہے کہ شجاعت ایک ایسی اخلاقی فضیلت ہے جو بزدلی اور تہور کے درمیان اعتدال کی راہ ہے۔

انفرادی اور قومی زندگی پر بزدلی کے منفی اثرات

یہ صفتِ رذیلہ انسان کی زندگی کے ہر پہلو پر بہت سے منفی اثرات مرتب کرتی ہے اور یقیناً شکست، ذِلت اور پستی کے یقینی اسباب میں سے ایک ہے۔

ہمیں تاریخ میں بہت سی ایسی اقوام کا ذکر ملتا ہے جن کے پاس افرادی قوت اور ساز و سامان کی فراوانی تھی مگر اس کے باوجود سالہا سال تک ذلت اور غلامی کی زندگی بسر کرتی رہیں۔ لیکن جیسے ہی ان میں ایک بہادر رہنما سامنے آیا، اُن کی ساری افرادی قوت اور سارا ساز و سامان حصولِ آزادی کیلئے مصروفِ عمل ہوگیا اور قلیل سی مدت میں وہ ایک آزاد اور معزز قوم بن گئی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی غیر معمولی شجاعت نے تمام غزوات میں لشکر اسلام کی کامیابی میں اہم کردار ادا کیا اور اسلام کی تیز رفتار ترقی بھی اس کی مرہونِ منت تھی۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت علیؑ فرماتے ہیں:

"اَلشَّجَاعَةُ عِزٌّ حَاضِرٌ وَالْجُبْنُ ذُلٌّ ظَاهِرٌ"۔ (شرح فارسی غرر الحکم، 171:7)

''شجاعت ایسی عزت ہے جو حاضر ہے جبکہ بزدلی ایک ظاہر آشکار ذِلت ہے''۔

ایک اور مقام پر آپؑ نے یہی بات اس طرح بیان فرمائی:

"اَلشَّجَاعَةُ نُصْرَةٌ حَاضِرَةٌ ظَاهِرَةٌ"۔ (شرح فارسی غرر الحکم، 171:7)

''شجاعت ایک ایسی نصرت ہے جو حاضر ہے اور ایسی فضیلت ہے جو ظاہر و آشکار ہے''۔

اس صفتِ رذیلہ کا ایک اور منفی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان کو بڑے کاموں سے روک دیتی ہے، اس لئے کہ بڑے کاموں میں ہمیشہ مشکلات سے واسطہ پڑتا ہے جنہیں صرف بہادر اور شجاع افراد ہی برداشت کر سکتے ہیں۔

بزدلی افراد کو زندگی میں یا تو کوئی کامیابی نصیب نہیں ہوتی یا اگر ان کی زندگی میں کوئی کامیابی ہوتی ہے تو وہ بہت چھوٹی اور معمولی ہوتی ہے۔ بزدل افراد کوئی اصلاحی یا انقلابی قدم نہیں اٹھا سکتے۔ یہ مسئلہ اس قدر اہم ہے کہ اسلام میں بزدل افراد سے مشورہ کرنے سے منع کیا گیا ہے جس کے بارے میں بھی احادیث ہم بیان کر چکے ہیں۔

بزدلی کے اسباب:۔

1۔ ایمان کی کمزوری اور اللہ تعالیٰ کے بارے میں بدگمانی بزدلی کی بنیادی وجہ ہے، اس لئے کہ حقیقی مومن اللہ پر توکل اور اس کے وعدوں کی سچائی پر بھروسہ کرتے ہیں۔ ایسے افراد بڑے سے بڑے حوادث اور بحرانوں میں بھی مطمئن اور ثابت قدم رہتے ہیں۔ مالک اشتر کے نام اپنے حکم نامے میں حضرت علیؑ نہج البلاغہ کے خطبہ: 53 میں فرماتے ہیں:

"اِنَّ الْبُخْلَ وَالْجُبْنَ وَالْحِرْصَ غَرَائِزُ شَتّٰى يَجْمَعُهَا سُوْءُ الظَّنِّ بِاللّٰهِ"۔

''بخل، بزدلی اور حرص ایسے رجحانات ہیں جو اللہ کے بارے میں بدگمانی میں جمع ہوتے ہیں''۔

2۔ احساسِ کمتری بھی بزدلی کے اسباب میں سے ایک سبب ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جس قدر کسی شخص میں عزتِ نفس اور خود اعتمادی زیادہ ہوگی، اُسی قدر وہ بہادر ہوگا۔ ایک حدیث میں امیر المومنینؑ فرماتے ہیں:

"شِدَّةُ الْجُبْنِ مِنْ عَجْزِ النَّفْسِ وَضَعْفِ الْيَقِيْنِ"۔ (شرح فارسی غرر الحکم، 185:4)

''بزدلی کی شدت نفسیاتی ناتوانی اور یقین کی کمزوری سے پیدا ہوتی ہے''۔

3۔ اکثر اوقات ایسا ہوتا ہے کہ انسان بعض افراد، بعض جانوروں یا بعض دیگر موجودات کے بارے میں صحیح

معلومات نہ رکھنے کی وجہ سے ان سے خوفزدہ ہوتا ہے۔ جیسے ہی ان کے بارے میں صحیح معلومات مل جائیں، اس کا خوف برطرف ہوجاتا ہے۔

4۔ بزدلی کا ایک سبب عافیت طلبی ہے۔ شجاعت اگرچہ کامیابیوں کی راہ ہموار کرتی ہے لیکن ممکن ہے کہ انسان کو اس کی وجہ سے مشکلات کا بھی سامنا کرنا پڑے۔ لہٰذا عافیت طلب افراد کسی ایسے کام کو ہاتھ نہیں لگاتے جو مشکلات کا باعث ہو۔

5۔ بعض اوقات انسان کی زندگی میں ایسے تلخ تجربات آتے ہیں جنہیں انسان نہیں دُہرانا چاہتا۔ یہ تجربات انسان کے اندر ایک قسم کا خوف پیدا کردیتے ہیں جو زندگی بھر انسان کے ساتھ لگا رہتا ہے اور اس کو مناسب نفسیاتی علاج کے ذریعے ہی برطرف کیا جاسکتا ہے۔

6۔ غیر ضروری احتیاط کسی خوف کا نتیجہ بھی ہوسکتی ہے اور خوف کا سبب بھی ہوسکتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جو انسان ہر قسم کے خطرات سے اجتناب کرنا چاہتا ہو، وہ کبھی ایسا قدم نہیں اٹھائے گا جس میں کوئی خطرہ پنہاں ہو۔ غیر ضروری احتیاط درحقیقت عافیت طلبی ہی کی ایک صورت ہے۔

7۔ بعض اوقات نامعلوم نفسیاتی اسباب انسان کے اندر خوف اور بزدلی کی کیفیت پیدا کردیتے ہیں۔ ان میں سے اکثر افراد اپنی اس حالت کو پسند نہیں کرتے اور یہ کہتے ہیں کہ ہم کیا کریں! ہمارا بس نہیں چلتا اور یہ خوف خود بخود ہم پر مسلط ہو جاتا ہے لیکن یہ خوف بھی ناقابلِ علاج نہیں ہے۔ مناسب نفسیاتی علاج سے اس قسم کے خوف سے نجات حاصل کی جاسکتی ہے۔

علاج اور احتیاط

تمام رذائلِ اخلاقی کی طرح بزدلی کے علاج کا بھی ایک طریقہ ہے کہ انسان اس کے منفی نتائج کے بارے میں غور وفکر کرے۔ جب کوئی بزدل شخص بزدلی کی وجہ سے رونما ہونے والی ذِلت، پسماندگی اور ناکامی پر غور کرتا ہے تو وہ اپنے طرز زندگی پر نظرثانی کرنے پر آمادہ ہوجاتا ہے اور اس صفتِ رذیلہ سے نجات کے بارے میں سوچنے لگتا ہے۔

اس صفتِ رذیلہ کے دیگر اسباب کا خاتمہ اس کے علاج کے ذریعے کیا جاسکتا ہے۔ جب اللہ تعالیٰ کے بارے میں بدگمانی کے سیاہ بادل انسان کے دل ودماغ کے اُفق سے چھٹ جائیں گے اور اللہ پر توکل کا خورشیدِ درخشاں انسان کے قلب وجان کو منور کردے تو خوف پیدا کرنے والے خیالات وافکار انسان کے ذہن سے نکل جاتے ہیں۔ لیکن اس بات کو نظرانداز نہیں کرنا چاہئے کہ اس طریقہ سے اس بیماری کا علاج کرنے کیلئے احتیاط اور مطالعہ کی ضرورت ہوتی ہے۔

بزدلی کے علاج کا ایک اور موثر علاج یہ ہے کہ انسان جن چیزوں سے ڈرتا ہو، اُن میں داخل ہوجائے اور انہیں بار بار انجام دے۔ بعض لوگ دوائی پینے یا ٹیکہ لگوانے سے ڈرتے ہیں۔ اگر ایسے افراد چند بار دوائی پی لیں یا ٹیکہ لگوالیں تو ان کا خوف برطرف ہوجاتا ہے۔

بعض لوگ سمندری یا ہوائی سفر سے خوفزدہ ہوتے ہیں۔لیکن چندمرتبہ اس عمل سے گزرنے کے بعدان کا خوف زائل ہوجاتا ہے۔اس طرح بعض لوگ مجمع میں تقریر کرنے سے ڈرتے ہیں۔یہ خوف بھی چندبار تجربہ کرنے کے بعدختم ہوجاتا ہے۔

فوجی مشقوں کی ایک وجہ یہ بھی ہوتی ہے کہ ایسی مشقوں کی وجہ سے سپاہیوں اور افسروں کے دل میں جنگ کا خوف نہیں رہتا۔

امیرالمومنین علیہ السلام نے اس سلسلہ میں ایک نہایت خوبصورت جملہ ارشادفرمایا ہے:

"اِذَا هَبْتَ اَمْرًا فَقَعْ فِيْهِ، فَاِنَّ شِدَّةَ تَوَقِّيْهِ اَعْظَمَ مِمَّا تَخَافُ مِنْهُ"۔

''جب تم کسی چیز سے ڈروتو اس میں داخل ہو جاؤ، اس لئے کہ اس کا خوف اس سے زیادہ خوفناک ہوتاہے''۔(نہج البلاغہ،کلماتِ قصار:175)

مرحوم علامہ حبیب اللہ خوئی رحمۃ اللہ علیہ اپنی کتاب''شرح نہج البلاغہ''میں اس جملہ کی تشریح کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''اکثر ہوتاہے کہ انسان کوکسی ایسے کام سے واسطہ پڑتا ہے جسے وہ خوف اور بزدلی کی وجہ سے نہیں کرپاتا۔اس کی یہ وحشت جو بزدلی کی وجہ سے ہوتی ہے،اُسے اپنے کاموں میں ترقی اور پیشرفت سے باز رکھتی ہے۔ایسی صورتِ حال میں امیرالمومنین علیہ السلام اس خوف سے نجات کیلئے حوصلہ افزائی فرماتے ہیں کیونکہ اکثر اوقات تذبذب اوردودِلی سے پیدا ہونے والاخوفناک چیز سے زیادہ خوفناک ہوتاہے''۔

اس کے بعدوہ کہتے ہیں:

''محققین اورموجدین نے اس اصول پرعمل کرکے قابلِ فخر کارنامے انجام دیئے ہیں۔افریقہ کے جنگلوں اور صحراؤں میں اورسمندر کے نیچے چلے گئے اورنہ صرف بہت سی دولت کے ساتھ ساتھ شہرت بھی حاصل کی بلکہ سائنس کی خدمت بھی کی اورانسان کےعلم ودانش کے ذخیرے میں اضافہ کیا''۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ تذبذب اوردودِلی اوردردناک انجام اُس کام سے زیادہ انسان کیلئے وحشت ناک ہوتاہے۔

عربی زبان میں اس بارے میں یہ ضرب المثل مشہور ہے:

"اُمُّ الْمُقْتُوْلِ تَنَامُ وَاُمُّ الْمُهَدَّدِ لَا تَنَامُ"۔(منہاج البراعۃ، 252:21)

''مقتول کی ماں سوجاتی ہے مگر جسے قتل کی دھمکی دی گئی ہو،اس کی ماں نہیں سوسکتی''۔

نیز یہ بھی کہا گیاہے:

"كُلُّ اَمْرٍ مِنْ خَيْرٍ اَوْشَرٍّ فَسَمَاعُهُ اَعْظَمَ مِنْ عَيَانِهٖ"۔

''ہر اچھا یا برا کام ایسا ہوتا ہے کہ جو کچھ اس کے بارے میں سنا جاتا ہے، وہ اس کی حقیقت سے بڑا ہوتا ہے''۔(شرح نہج البلاغہ، 17:18)

خوف اور بزدلی کے علاج کا ایک طریقہ یہ ہے کہ انسان پاکیزہ زندگی بسر کرے، اس لئے کہ خوف کی ایک وجہ یہ بھی ہوتی ہے کہ انسان اپنے برے کاموں کے نتائج سے خائف ہوتا ہے۔ وہ اس بات سے بھی ڈرتا ہے کہ کہیں اُس کے برے اعمال لوگوں پر آشکار نہ ہو جائیں۔

اس بات کو امیر المومنینؑ نے اس طرح بیان فرمایا ہے:

"مَا اَشْجَعُ الْبَرِئ وَاَجْبَنَ الْمُرِيْبُ"۔ (غرر الحکم: 9626)

''پاک دامن شخص کتنا بہادر ہوتا ہے اور جس کا کردار داغدار ہو، وہ کتنا ڈرپوک ہوتا ہے''۔

ایک اور حدیث میں آپؑ فرماتے ہیں:

"لَوْ تَمَيَّزَتِ الْاَشْيَاءُ لَكَانَ الصِّدْقُ مَعَ الشَّجَاعَةِ وَكَانَ الْجُبْنُ مَعَ الْكِذْبِ"۔ (شرح فارسی غرر الحکم، 172:7)

''اگر تمام اشیاء نمایاں ہو کر سامنے آ جائیں تو سچائی بہادری کے ساتھ اور بزدلی جھوٹ کے ساتھ نظر آئے گی''۔

انسان کی زندگی پر شجاعت کے اثرات

بزدلی اور خوف کی ضد شجاعت اور دلیری ہے۔ ان دونوں کو ایک دُوسرے کے ساتھ موازنہ کر کے ہی بہتر طور پر سمجھا جا سکتا ہے۔ جس طرح شجاعت کا مفہوم سمجھے بغیر بزدلی کے معنی ناقابلِ فہم ہوتے ہیں، اسی طرح بزدلی کے مفہوم کی شناخت کے بغیر شجاعت کے مفہوم کی پہچان بہت دُشوار ہے۔

اس کے باوجود گزشتہ مباحث کی تکمیل کیلئے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ احادیث کی روشنی میں شجاعت اور زندگی پر اس کے اثرات کے بارے میں مزید وضاحت پیش کی جائے۔

1۔ امیر المومنین علیہ السلام نے مالک اشتر کے نام اپنے عہد نامہ میں، جسے ''الٰہی سیاست کا جامع ترین منشور'' کہا جا سکتا ہے، متعدد مقامات پر شجاعت کی اہمیت کو اجاگر کیا ہے۔ ایک مقام پر مالک اشتر کو خبردار کرتے ہیں کہ ڈرپوک اور حریص افراد کو اپنے مشیروں میں شامل نہ کرو۔

ایک اور مقام پر فوجی سالاروں اور تمام اعلیٰ عہدیداروں کے بارے میں فرماتے ہیں:

"ثُمَّ الْصَقْ بِذَوِى الْمُرُوآتِ وَالْاَحْسَابِ وَاَهْلِ الْبُيُوْتَاتِ الصَّالِحَةِ وَ السَّوَابِقِ الْحَسَنَةِ

ثُمَّ اَهْلِ النَّجْدَةِ وَالشَّجَاعَةِ وَالسَّخِيِّ وَالسَّمَاحَةِ، فَاِنَّهُمْ جِمَاعٌ مِنَ الْكَرَمِ وَشُعَبٌ مِنَ الْعُرْفِ"۔(نہج البلاغہ:53)

''معزز اور خاندانی افراد کے ساتھ، جن کا ماضی بے داغ ہو، تعلقات قائم کرو۔ بہادر سخی اور کریم افراد کے ساتھ تعاون کرو کیونکہ ایسے افراد ہی نیکی اور شرافت کا مرکز ہوتے ہیں''۔

2۔ ایک اور حدیث میں آپؑ فرماتے ہیں:

"اَلشَّجَاعَةُ زَيْنٌ، اَلْجُبْنُ شَيْنٌ۔"(شرح فارسی غرر الحکم، 171:7)

''شجاعت زینت اور بزدلی عیب ہے''۔

3۔ ایک اور حدیث میں آپؑ کا فرمان ہے:

"اَلسَّخَاءُ وَالشَّجَاعَةُ غَرَائِزُ شَرِيْفَةٌ يَضَعُهَااللهُ سُبْحَانَهٗ فِيْ مَنْ اَحَبَّهُ وَ اَمْتَحِنُهُ"(غرر الحکم: 1820)

''سخاوت اور شجاعت پسندیدہ صفات ہیں جو اللہ اُن کو عطا فرماتا ہے جن سے وہ محبت کرتا ہے اور جن کا وہ امتحان لے چکا ہے''۔

4۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے اہلِ بیتؑ کے فضائل بیان کرتے ہوئے سات صفات کا ذکر فرماتے ہیں جن میں سے ایک شجاعت ہے۔(بحار الانوار، 265:26)

5۔ شبِ ہجرت حضرت علیؑ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بستر پر سوئے۔ صبح کے وقت جب محاصرہ کرنے والے دھاوا بول کر اندر داخل ہوئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بستر پر حضرت علیؑ کو پایا تو حضرت علیؑ کے بارے میں نازیبا کلمات کہنے لگے۔ آپؑ نے ان کے جواب میں فرمایا کہ اللہ نے مجھے بہت سے فضائل سے آراستہ کیا ہے۔ پھر اپنے فضائل کا ذکر کرتے ہوئے آپؑ فرماتے ہیں:

"وَمِنَ الشَّجَاعَةِ مَالَوْ قُسِّمَ عَلٰى جَمِيْعِ جُبَنَاءِ الدُّنْيَا لَصَارُوْا بِهٖ شُجْعَانًا"۔

''اور اللہ نے مجھے وہ شجاعت عطا فرمائی ہے کہ اگر اسے دُنیا کے سب بزدلوں میں تقسیم کر دیا جائے تو وہ سب کے سب شجاع اور بہادر بن جائیں''۔(بحار الانوار، 83:19)

حضرت امام زین العابدین علیہ السلام نے شام میں اپنے ایک خطبہ میں فرمایا:

"اَيُّهَا النَّاس:اُعْطِيْنَا سِتًّا وَّفُضِّلْنَا بِسَبْعٍ اُعْطِيْنَا الْعِلْمَ وَالسَّمَاحَةَ وَالْفَصَاحَةَ

وَالشَّجَاعَةَ وَالْمَحَبَّةَ فِيْ قُلُوْبِ الْمُؤْمِنِيْنَ"۔ (بحار، 138:45)

''اے لوگو! اللہ نے ہمیں چھ نعمتیں عطا فرمائی ہیں اور سات چیزوں سے ہمیں فضیلت دی ہے۔ جو چھ نعمتیں اُس نے ہمیں عطا کی ہیں، وہ ہیں: علم، حلم، سخاوت، فصاحت، شجاعت اور مومنین کے دل میں محبت''۔

اگرچہ اس بارے میں بہت کچھ کہنے کی گنجائش موجود ہے مگر ہم حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کی اس حدیث پر اس بحث کو ختم کرتے ہیں۔ آپؑ نے فرمایا:

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں کچھ قیدی لائے گئے۔ آپؐ نے اُن کے سنگین جرائم کی وجہ سے اُن میں سے ایک کے علاوہ سب کیلئے سزائے موت کا حکم صادر فرمایا۔ اُس شخص نے حیرت سے پوچھا کہ آپؐ نے مجھے کیوں آزاد کر دیا؟ آپؐ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے جبرائیلؑ کے ذریعے مجھے خبر دی ہے کہ تم میں پانچ ایسی خوبیاں پائی جاتی ہیں جو اللہ اور اُس کے رسولؐ کو بہت پسند ہیں:''

"اَلْغِيْرَةُ الشَّدِيْدَةُ عَلٰى حَرَمِكَ، وَالسَّخَاءُ، وَحُسْنُ الْخُلُقِ، وَصِدْقُ اللِّسَانِ وَالشَّجَاعَةِ"۔

''اپنے ناموس کے بارے میں شدید غیرت، سخاوت، حسنِ اخلاق، سچائی اور شجاعت''۔

یہ بات سن کر وہ شخص مسلمان ہو گیا اور اس کا شمار اچھے مسلمانوں میں ہونے لگا۔

مندرجہ بالا احادیث اور دیگر آیات و روایات کی روشنی میں ہم نے جو بحث کی، اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اسلام کی نظر میں شجاعت کی کتنی اہمیت ہے۔

یہ نکتہ بھی قابلِ ذکر ہے کہ شجاعت کا مفہوم بہت وسیع ہے اور میدانِ جنگ کی شجاعت اس کا صرف ایک پہلو ہے۔ سیاست اور علم کے میدان میں شجاعت، علمی تحقیقات کی روشنی میں رونما ہونے والے نئے نظریات کے بیان کی شجاعت، جج کی حیثیت سے فیصلہ کرتے وقت شجاعت وغیرہ شجاعت کا اہم پہلو ہیں۔ بعض احادیث میں ہے:

"اَلصَّبْرُ شَجَاعَةٌ"۔

''صبر شجاعت ہے''۔ (نہج البلاغہ، حکمت: 4)

ایک حدیث میں حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

"اَشْجَعُ النَّاسِ اَسْخَاهُمْ"۔

''سب سے بہادر انسان وہ ہے جو سب سے زیادہ سخی ہے''۔ (غرر الحکم: 2899)

ایک اور حدیث میں آپؑ فرماتے ہیں:

"لَوْ تَمَيَّزَتِ الْاَشْيَاءُ لَكَانَ الصِّدْقُ مَعَ الشَّجَاعَةِ وَكَانَ الْجُبْنُ مَعَ الْكِذْبِ"۔(شرح فارسی غرر الحکم، 118:5)

''اگر تمام اشیاً نمایاں ہوکر سامنے آجائیں تو سچائی بہادری کے ساتھ اور بزدلی جھوٹ کے ساتھ کھڑی نظر آئے گی''۔

ان احادیث میں سے ہر حدیث شجاعت کے وسیع مفہوم کے ایک پہلو کو اُجاگر کررہی ہے۔

دسواں باب

توکل

تمہید:۔

قرآن مجید کی بہت سی آیات اور بہت سی احادیث کے علاوہ انبیاؑ، اولیاؑ اور صالحین کے حالاتِ زندگی اور اخلاق وعرفان کی کتب میں توکل کو ایک اہم اخلاقی فضیلت قرار دیا گیا ہے۔جس کے بغیر انسان قربِ الٰہی کا مقام حاصل نہیں کرسکتا۔

توکل کے معنی ہیں اپنے کاموں کو اللہ کے سپرد کرنا اور اس کے لطف وکرم پر اعتماد کرنا۔توکل ''وکالت'' سے ماخوذ ہے جس کے معنی ہیں کسی کو اپنے کام کی انجام دہی میں اپنا وکیل بنانا۔ظاہر سی بات ہے کہ انسان کا وکیل جس قدر زیادہ عالم اور اپنے کام میں ماہر ہو، انسان اُسی قدر زیادہ مطمئن اور پرسکون ہوتا ہے۔چونکہ اللہ کا علم اور اس کی قدرت لامحدود ہے، لہٰذا جب انسان اپنے کاموں میں اس پر توکل کرتا ہے، یعنی اُسے وکیل بناتا ہے تو اُسے بے حد اطمینان وسکون نصیب ہوتا ہے۔مشکلات کے مقابلے میں اُس کی ہمت اور جرأت میں اضافہ ہوجاتا ہے اور کہیں وہ اپنے آپ کو بندگلی میں محسوس نہیں کرتا اور اپنے مقصد کی طرف آگے بڑھتا رہتا ہے۔

جو انسان اللہ پر توکل کرتا ہے، وہ کبھی احساسِ کمتری کا شکار نہیں ہوتا بلکہ وہ اللہ تعالیٰ کی لامحدود قدرت اور اُس کے بے پایاں علم پر اعتماد کرتے ہوئے ہمیشہ اپنے آپ کو فاتح اور کامیاب محسوس کرتا ہے۔اگر کبھی وقتی طور پر اسے ناکامی ہوجائے تو وہ ہرگز مایوس نہیں ہوتا۔

اگر توکل کی صفت صحیح معنوں میں کسی انسان کے دل میں پیدا ہوجائے تو یقیناً اس کے دل میں اُمید کی شمع روشن ہوجاتی ہے۔اس کے ارادے میں قوت اور اس کی ثابت قدمی کو دوام اور پامردی کو استحکام حاصل ہوجاتا ہے۔

انبیاؑ کی زندگی میں توکل کی صفت بہت نمایاں تھی۔قرآنی آیات کا مطالعہ کرنے سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ انبیاؑ تمام مشکلات اور شدید ترین حالات میں توکل کو اپنی ڈھال بناتے تھے۔ان کی کامیابی کی ایک اہم وجہ یہی تھی کہ وہ اس اخلاقی فضیلت کی دولت سے مالا مال تھے۔

توکل کے بارے میں اس مختصر تمہید کے بعد قرآنی آیات کی روشنی میں انبیاؑ کی تاریخ کی ترتیب سے اُن کی زندگی میں توکل کے کردار پر گفتگو کریں گے۔حضرت نوحؑ سے اس کا آغاز کرکے جنابِ رسولِ خداؐ پر اس بحث کو ختم کریں گے۔

1۔ ''وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَأَ نُوحٍ ۘ إِذْ قَالَ لِقَوْمِهِ يَا قَوْمِ إِنْ كَانَ كَبُرَ عَلَيْكُمْ مَقَامِي وَتَذْكِيرِي

بِاٰيٰتِ اللّٰهِ فَعَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْتُ فَاَجْمِعُوْٓا اَمْرَكُمْ وَشُرَكَآءَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُنْ اَمْرُكُمْ عَلَيْكُمْ غُمَّةً ثُمَّ اقْضُوْٓا اِلَيَّ وَلَا تُنْظِرُوْنِ"۔

''اے رسول! انہیں نوحؑ کا واقعہ سناؤ کہ جب انہوں نے اپنی قوم سے کہا: اے میری قوم! اگر میرا مقام اور اللہ کی آیات کے ذریعے میرا تم کو نصیحت کرنا تم پر گراں گزرتا ہے تو میں نے تو اللہ پر توکل کرلیا ہے۔ تم اپنے معاملے کو سمیٹو اور اپنے شرکا کو اکٹھا کرو، یہاں تک کہ کوئی بات تم پر مبہم نہ رہے پھر میرا خاتمہ کردو اور مجھے ذرا بھی مہلت نہ دو''۔(یونس:71)

2۔ "اِنِّيْ تَوَكَّلْتُ عَلَى اللّٰهِ رَبِّيْ وَرَبِّكُمْ ط"

''میں نے اللہ پر توکل کرلیا، جو میرا اور تمہارا رب ہے''۔(ھود:56)

3۔ "رَبَّنَآ اِنِّيْٓ اَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّيَّتِيْ بِوَادٍ غَيْرِ ذِيْ زَرْعٍ عِنْدَ بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ ۙ رَبَّنَا لِيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ فَاجْعَلْ اَفْئِدَةً مِّنَ النَّاسِ تَهْوِيْٓ اِلَيْهِمْ وَارْزُقْهُمْ مِّنَ الثَّمَرٰتِ لَعَلَّهُمْ يَشْكُرُوْنَ"۔(ابراھیم: 37)

''اے ہمارے رب! میں نے اپنی ذریت کے کچھ افراد کو تیرے بیت الحرام کے پاس بے آب و گیاہ وادی میں سکونت دی تاکہ وہ نماز قائم کریں۔ پس تو لوگوں کے دِلوں کو ان کی طرف مائل کردے اور انہیں پھلوں میں سے رزق عطا فرما تاکہ وہ شکر کریں''۔

4۔ "اِنْ اُرِيْدُ اِلَّا الْاِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ ط وَمَا تَوْفِيْقِيْٓ اِلَّا بِاللّٰهِ ط عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَاِلَيْهِ اُنِيْبُ"۔

''میں تو جہاں تک میری استطاعت ہے، اصلاح کے سوا کچھ نہیں چاہتا۔ میری ساری توفیقات اللہ کے طرف سے ہیں اور میں اُسی کی طرف رجوع کرتا ہوں''۔(ھود:88)

5۔ "وَقَالَ يٰبَنِيَّ لَا تَدْخُلُوْا مِنْۢ بَابٍ وَّاحِدٍ وَّادْخُلُوْا مِنْ اَبْوَابٍ مُّتَفَرِّقَةٍ ط وَمَآ اُغْنِيْ عَنْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ ط اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ط عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ ج وَعَلَيْهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُتَوَكِّلُوْنَ○ "(یوسف: 67)

''حضرت یعقوبؑ نے اپنے بیٹوں سے کہا: اے میرے بچو! تم سب ایک دروازے سے داخل نہ ہونا بلکہ الگ الگ دروازوں سے داخل ہونا، میں اللہ کی طرف پیش آنے والے کسی حادثہ میں تمہارے کام نہیں آسکتا۔ حکم تو

صرف اللہ کا ہے۔ میں نے اسی پر توکل کیا اور سب توکل کرنے والوں کو اسی پر توکل کرنا ضروری ہے''۔

6۔"وَقَالَ مُوْسٰى يٰقَوْمِ اِنْ كُنْتُمْ اٰمَنْتُمْ بِاللّٰهِ فَعَلَيْهِ تَوَكَّلُوْٓا اِنْ كُنْتُمْ مُّسْلِمِيْنَ۝۸۴ فَقَالُوْا عَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْنَا ۚ رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا فِتْنَةً لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ۝۸۵" (یونس: 85,84)

''اور موسیٰؑ نے کہا: اے میری قوم! اگر تم اللہ پر ایمان لائے ہو اور اس کے حکم کو مانتے ہو تو پھر اس پر توکل کرو۔ انہوں نے کہا: ہم نے اللہ پر توکل کیا جو ہمارا رب ہے۔ اے ہمارے رب! تو ہمیں کافروں کیلئے آزمائش نہ بنا''۔

7۔"وَلَمَّا بَرَزُوْا لِجَالُوْتَ وَجُنُوْدِهٖ قَالُوْا رَبَّنَآ اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَّثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ"(بقرہ: 250)

''جب وہ جالوت اور اس کے لشکر کے سامنے آرا ہوئے تو انہوں نے کہا: اے ہمارے رب! تو ہم پر صبر نازل فرما ہمیں ثابت قدم رکھ اور کافروں کے خلاف ہماری مدد فرما''۔

8۔"فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُلْ حَسْبِيَ اللّٰهُ ۖ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۭ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَهُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ۝" (توبہ: 129)

''اگر وہ روگردانی کریں تو کہو: اللہ میرے لئے کافی ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں، میں نے اس پر توکل کیا اور وہ عرشِ عظیم کا رب ہے''۔

9۔"وَمَا لَنَآ اَلَّا نَتَوَكَّلَ عَلَى اللّٰهِ وَقَدْ هَدٰىنَا سُبُلَنَا ۭ وَلَنَصْبِرَنَّ عَلٰي مَآ اٰذَيْتُمُوْنَا ۭ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُتَوَكِّلُوْنَ"۔(ابراھیم: 12)

''ہم کیوں اللہ پر توکل نہ کریں جبکہ اس نے ہمیں (سعادت کی راہ کی) ہدایت کی اور ہم یقیناً تمہاری طرف سے آنے والی تکالیف پر صبر کریں گے اور توکل کرنے والوں کو صرف اللہ پر توکل کرنا چاہیئے''۔

10۔"وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ"(طلاق: 3)

''اور جو اللہ پر توکل کرتا ہے، اللہ اس کیلئے کافی ہوتا ہے''۔

تفسیر

انبیاؑ کی زندگی میں توکل کا عکس:۔

قرآن شریف کی آیات میں، خصوصاً انبیاؑ کی تاریخ میں ''توکل'' کو ان کی نمایاں ترین صفت کے طور بیان کیا گیا ہے۔ انہوں نے اپنی زندگی میں پیش آنے والے تمام حوادث میں اور دُشمن کی بے رحمانہ کاروائیوں کے نتیجہ میں رونما ہونے والی سخت ترین تکالیف اور مصائب میں صرف اللہ پر توکل کیا اور غیر اللہ پر بھروسہ کرنے سے مکمل طور پر دُور رہے۔

ہم حضرت نوحؑ کے واقعہ سے اس بحث کا آغاز کرتے ہیں۔

مذکورہ بالا آیات میں سے پہلے آیات میں ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت نوحؑ اللہ پر توکل کے نتیجہ میں ایک نا قابلِ شکست عزم کے ساتھ اپنے طاقتور اور متعصب دُشمنوں کے سامنے کھڑے ہیں۔ اللہ تعالیٰ رسولؐ اللہ کو حکم دے رہا ہے کہ آغازِ اسلام کے مسلمانوں کو ، جو کفار کی طرف سے شدید ترین مصائب میں مبتلا کئے جاتے تھے، نوحؑ کا واقعہ سناؤ کہ اُنہوں نے اپنی قوم سے کہا:

''اے میری قوم! اگر میرا مقام اور اللہ کی آیات کے ذریعے میرا تمہیں نصیحت کرنا تم پر گراں گزرتا ہے (تو جو کچھ تم سے ہوسکتا ہے، کرلو، مجھے کوئی خوف نہیں ہے) میں نے اللہ پر توکل کیا ہوا ہے۔ تم اپنی طاقت اور اپنے معبودوں کو جمع کرلو، پھر کسی بات کو بھی مبہم اور پوشیدہ نہ رہنے دو اور مجھے ایک لحظہ کی مہلت دیئے بغیر میرا کام تمام کردو (لیکن یاد رکھو کہ اللہ کی قدرت کے سامنے تم کچھ نہیں کرسکتے ہو)''۔

"وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ نُوْحٍ ۘ اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ اِنْ كَانَ كَبُرَ عَلَيْكُمْ مَّقَامِيْ وَتَذْكِيْرِيْ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ فَعَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْتُ فَاَجْمِعُوْٓا اَمْرَكُمْ وَشُرَكَآءَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُنْ اَمْرُكُمْ عَلَيْكُمْ غُمَّةً ثُمَّ اقْضُوْٓا اِلَيَّ وَلَا تُنْظِرُوْنِ"۔ (یونس: 71)

یہ کونسی طاقت تھی جس نے حضرت نوحؑ کو طاقتور اور متعصب دُشمنوں کے خلاف اتنی جرأت اور ہمت بخشی کہ وہ ان کے سامنے کھڑے ہوکر ان کی طاقت کا مذاق اُڑا رہے ہیں اور اُن کی تمام چالوں اور حربوں کو پائے حقارت سے ٹھوکر مار رہے ہیں اور اس طرح دشمنوں کو ایک نفسیاتی شکست سے دوچار کررہے ہیں۔

حضرت نوح علیہ السلام کی اس طاقت کا راز اللہ پر اُنؑ کا توکل تھا۔ یہ بات بھی بڑی عجیب ہے کہ حضرت نوحؑ اپنے دشمنوں کی طاقت اور اُن کے معبودوں کو کوئی اہمیت نہ دیتے تھے بلکہ اُنہیں اپنی زیادہ سے زیادہ طاقت استعمال کرنے پر اُکسا رہے تھے اور انہیں دعوتِ مبارزہ دے رہے تھے۔ ایسی قدرت نمائی صرف اُن لوگوں کو زیب دیتی ہے، جو اللہ پر توکل کرتے ہیں۔

اس حقیقت کے پیش نظر کہ سورۂ یونس، جس میں یہ آیت ہے، ایک مکمل سورۃ ہے، یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ اس واقعہ کے ذکر سے مکہ کے مسلمانوں کو، جو شمعِ رسالت کے پروانے بنے ہوئے تھے، دُشمن کے سامنے جرأت اور ہمت دینا چاہتا تھا اور انہیں یہ بتادینا چاہتا تھا کہ مشرکینِ مکہ کی کھوکھلی طاقت سے خوفزدہ نہ ہوں۔

اس آیت میں ''شُرَكَاءَكُمْ'' کا لفظ استعمال کیا گیا ہے جس کے دو معنی ہوسکتے ہیں: ایک یہ کہ اس سے مراد اُن کے بت ہوں جنہیں وہ اللہ کا شریک قرار دیتے تھے۔ دُوسرے یہ کہ اس سے مراد اُن کے دوست اور ساتھی ہوں۔ اس صورت میں اس آیت کے معنی یہ ہوں گے کہ تم اور تمہارے دوست اور ساتھی یکجا ہوکر اپنی ساری طاقت استعمال کر دیکھو۔

دوسری آیت میں حضرت ہودؑ کی بات ہورہی ہے۔ ان کا زمانہ حضرت نوحؑ کے بعد تھا۔ جب ان کی بت پرست قوم نے انہیں جان سے مار ڈالنے کی دھمکی دی تو اُنہوں نے واضح الفاظ میں جواب دیا:

قَالَ اِنِّیۡۤ اُشۡہِدُ اللّٰہَ وَاشۡہَدُوۡۤا اَنِّیۡ بَرِیۡٓءٌ مِّمَّا تُشۡرِکُوۡنَ ۙ﴿۵۴﴾ مِنۡ دُوۡنِہٖ فَکِیۡدُوۡنِیۡ جَمِیۡعًا ثُمَّ لَا تُنۡظِرُوۡنِ ﴿۵۵﴾ اِنِّیۡ تَوَکَّلۡتُ عَلَی اللّٰہِ رَبِّیۡ وَرَبِّکُمۡ ؕ (ھود: 54تا56)

''میں اللہ کو گواہ ٹھہراتا ہوں اور تم بھی گواہ رہو کہ تم نے اللہ کے جو شریک بنا رکھے ہیں، میں اُن سے لاتعلق ہوں۔ تم سب مل کر میرے خلاف جیسی چاہو، چالیں چلو اور مجھے مہلت نہ دو (مگر یاد رکھو کہ تم میرا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتے کیونکہ) میں نے اللہ پر توکل کیا ہے جو میرا اور تمہارا رب ہے''۔

حضرت ہودؑ نہ صرف یہ کہ اپنی بت پرست قوم کی عظیم طاقت اور اُن کی سازشوں اور شرارتوں کو خاطر میں نہیں لائے بلکہ انہیں اپنی طاقت کے استعمال پر اُکسا بھی رہے ہیں تاکہ اُن پر یہ ثابت کریں کہ میری رُوح اور میرے قلب کا رابطہ کسی اور مرکز سے ہے جس پر توکل کر کے مجھے دُشمنوں کا کوئی خوف نہیں ہے۔

زجاج جو کہ مشہور مفسر ہیں، اس آیت کی تفسیر میں کہتے ہیں:

''انبیأ کے بارے میں نازل شدہ آیات میں یہ سب سے اہم آیت ہے جو یہ بتاتی ہے کہ ایک رسول مخالفین کی عظیم تعداد کے سامنے عزم و ہمت کا پیکر بن کر کھڑا ہوجائے اور ان سے اُس لہجہ میں بات کرے۔ اس کی مثال حضرت نوحؑ کے واقعہ میں بھی ملتی ہے''۔

یہ نکتہ بھی قابلِ غور ہے کہ حضرت ہود علیہ السلام اپنے مؤقف کے حق میں استدلال کرتے ہوئے اسی آیت میں آگے چل کر یہ کہہ رہے ہیں:

''مَا مِنۡ دَآبَّۃٍ اِلَّا ہُوَ اٰخِذٌۢ بِنَاصِیَتِہَا''

''ہر جاندار کی پیشانی اللہ کے ہاتھ میں ہے''۔ (ھود: 56)

پھر فرماتے ہیں:

"اِنَّ رَبِّیْ عَلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ ○"

''میرا رب صراطِ مستقیم پر ہے''۔(ھود:56)

اس نکتہ کو بیان کرنے کا مقصد یہ واضح کرنا ہے کہ عام طور پر طاقتور افراد صراطِ مستقیم سے بھٹک جاتے ہیں مگر میرا رب قدرتِ کاملہ کا مالک ہونے کے باوجود صراطِ مستقیم پر ہے۔

بالفاظِ دیگر وہ اپنی قوم کو یہ بتا رہے ہیں کہ میرا توکل اُس ذات پر ہے جو لامحدود قدرت کا مالک ہونے کے باوجود تمام کاموں کو عدل کے معیار پر ٹھیک ٹھیک انجام دیتا ہے۔

تیسری آیت میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے واقعہ کے ایک گوشے پر نظر ڈالی گئی ہے اور سخت ترین حالات میں اللہ پر اُنؑ کے توکل کا ذکر کیا جا رہا ہے۔حضرت ابراہیمؑ اللہ کی بارگاہ میں عرض کرتے ہیں:

"رَبَّنَآ اِنِّیْٓ اَسْکَنْتُ مِنْ ذُرِّیَّتِیْ بِوَادٍ غَیْرِ ذِیْ زَرْعٍ عِنْدَ بَیْتِکَ الْمُحَرَّمِ ۙ رَبَّنَا لِیُقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ فَاجْعَلْ اَفْئِدَۃً مِّنَ النَّاسِ تَھْوِیْٓ اِلَیْھِمْ وَارْزُقْھُمْ مِّنَ الثَّمَرٰتِ لَعَلَّھُمْ یَشْکُرُوْنَ"۔(ابراھیم: 37)

''اے میرے رب! میں نے (تیرے حکم سے اور تجھ پر توکل کرتے ہوئے) اپنی ذریت کے کچھ افراد کو تیرے بیت الحرام کے قریب بے آب و گیاہ وادی میں ساکن کر دیا ہے تاکہ وہ نماز قائم کریں۔اب تو لوگوں کے دِلوں کو ان کی طرف مائل کر دے اور انہیں پھلوں میں سے رزق عطا فرما تاکہ وہ شکر ادا کریں''۔

اگر انسان کا ایمان پہاڑ سے بھی اونچا اور اس کا توکل سمندر سے بھی گہرا ہو، تب کہیں جا کر انسان اپنی بیوی اور شیر خوار بچے کو اللہ کے حکم کی اطاعت کے جذبے سے بے آب و گیاہ صحرا میں چھوڑ کر اپنے وطن واپس آ سکتا ہے۔

اس سے حضرت ابراہیمؑ کی زندگی کا ایک اور واقعہ بھی یاد آ جاتا ہے کہ جب اُنؑ کی متعصب، ضدی اور غضب ناک قوم نے بت شکنی کی خاطر حضرت ابراہیمؑ پر مقدمہ چلایا اور وہ موت سے صرف ایک قدم کے فاصلہ پر تھے۔اس وقت بھی اپنی قوم کے معبودوں پر طنز کر رہے تھے اور بت پرستی کے بارے میں اُن کی بیہودہ سوچ پر خطِ بطلان پھیر رہے تھے(انبیاؑ:58 تا 67)

چوتھی آیت میں حضرت شعیبؑ کا واقعہ بیان ہو رہا ہے جو حضرت ہودؑ کے بعد اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دَور سے کچھ عرصہ قبل کے دور میں تھے۔وہ بھی اپنی قوم کی دھمکیوں کے جواب میں کہتے ہیں:

"اِنْ اُرِیْدُ اِلَّا الْاِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ ؕ وَمَا تَوْفِیْقِیْٓ اِلَّا بِاللّٰہِ ؕ عَلَیْہِ تَوَکَّلْتُ وَاِلَیْہِ اُنِیْبُ"۔

''(میں جو کچھ کر رہا ہوں، اس میں) میں حتی الامکان، اصلاح کے سوا کچھ نہیں چاہتا۔میری توفیق صرف اللہ کے

طرف سے ہے اور میں اُسی کی طرف رجوع کرتا ہوں''۔(ھود:88)

یعنی میں اللہ کی پاک ذات پر ایمان اور توکل کی دولت سے مالا مال ہوں اور کسی چیز سے نہیں ڈرتا ہوں اور پوری قوت سے اپنے مقصد کی طرف بڑھتا رہوں گا۔

یہ نکتہ قابلِ غور ہے کہ حضرت شعیبؑ اپنی قوم میں پھیلے ہوئے بگاڑ کی ہمہ گیر اصلاح کرنے کیلئے تین چیزوں پر انحصار کررہے ہیں:

1۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے فراہم شدہ اسباب پر، جن کی طرف لفظ''توفیق'' سے اشارہ کیا جارہا ہے۔

2۔ کام شروع کرنے کیلئے طاقتور ارادہ جو اللہ پر''توکل'' سے حاصل ہوتا ہے۔

3۔ اور مثبت محرک، جس کی طرف لفظ''اِلَیۡہِ اُنِیۡبُ''(میں اُسی کی طرف رجوع کرتا ہوں) سے اشارہ کیا جارہا ہے۔

پانچویں آیت میں بنی اسرائیل کے جدِ اعلیٰ حضرت یعقوبؑ کا ذکر کیا گیا ہے۔ جب وہ انتہائی تنگی کی حالت میں تھے کہ ایک طرف سے اُن کا عزیز بیٹا یوسفؑ اُن سے بچھڑ چکا تھا، دوسری طرف سے شدید قحط پڑا ہوا تھا جس کی وجہ سے سارا خاندان مشکل میں گرفتار تھا اور وہ اپنے ایک اور عزیز بیٹے بنیامین کو اس کے سنگدل بھائیوں کے ساتھ بھیجنے پر مجبور تھے تاکہ وہ مصر جاکر وہاں سے کچھ غلہ لاسکیں۔

یہاں وہ اپنے بیٹوں کو نصیحت کررہے ہیں کہ:

''تم سب ایک دروازے سے مصر میں داخل نہ ہونا بلکہ الگ الگ دروازوں سے داخل ہونا''۔

اس کے بعد فرماتے ہیں:

''..... وَمَاۤ اُغۡنِیۡ عَنۡکُمۡ مِّنَ اللّٰہِ مِنۡ شَیۡءٍ ؕ اِنِ الۡحُکۡمُ اِلَّا لِلّٰہِ ؕ عَلَیۡہِ تَوَکَّلۡتُ ۚ وَعَلَیۡہِ فَلۡیَتَوَکَّلِ الۡمُتَوَکِّلُوۡنَ''۔ (یوسف: 67)

''میں اس نصیحت کے ذریعے اللہ کی طرف سے آنے والی کسی مصیبت کو تم سے نہیں ٹال سکتا، فیصلہ تو صرف اللہ کا چلتا ہے۔ میں نے اُسی پر توکل کیا ہے اور سب توکل کرنے والوں کو اُسی پر توکل کرنا چاہئے''۔

درحقیقت حضرت یعقوبؑ اس نصیحت میں بھی اپنے بیٹوں کو توکل کا درس دے رہے ہیں اور کہہ رہے ہیں کہ چونکہ ہر چیز اللہ کے حکم سے ہی وقوع پذیر ہوتی ہے، لہٰذا صرف اُسی پر توکل کرنا چاہئے کیونکہ اُس کے ارادے کے سامنے کسی کا ارادہ مؤثر نہیں ہے۔

ظاہر سی بات ہے کہ یہاں حکم سے مراد''حکمِ تکوینی'' ہے، نہ کہ حکمِ شریعی۔

چھٹی آیت میں حضرت موسیٰ علیہ السلام اور بنی اسرائیل کا قصہ بیان کیا جارہا ہے۔ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی دعوت کا آغاز کیا اور اپنی صداقت وحقانیت کی دلیل کے طور پر معجزات دِکھائے تو اس کے باوجود اُن کی قوم میں سے ایک گروہِ قلیل ہی

ان پر ایمان لایا اور ان کی حالت بھی یہ تھی کہ فرعون کی طرف سے خوفزدہ تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ دیکھ چکے تھے کہ ایمان لانے کے نتیجہ میں فرعون نے اپنی بیوی کو کس قدر اذیت ناک تکالیف پہنچائی تھیں۔ ظاہر سی بات ہے کہ جو اپنی بیوی کو کوئی رعایت دینے پر آمادہ نہ تھا، بنی اسرائیل میں سے چند افراد، جو ایمان لائے تھے، وہ کس طرح اُس سے کسی قسم کی رعایت کی توقع کر سکتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام انہیں اس وحشت سے نجات دینے اور ان کے دلوں میں اطمینان وسکون پیدا کرنے کیلئے انہیں اللہ پر توکل کرنے کا حکم دے رہے ہیں۔

"وَقَالَ مُوْسٰى يٰقَوْمِ اِنْ كُنْتُمْ اٰمَنْتُمْ بِاللّٰهِ فَعَلَيْهِ تَوَكَّلُوْٓا اِنْ كُنْتُمْ مُّسْلِمِيْنَ○"

''اور موسیٰ علیہ السلام نے کہا: اے میری قوم! اگر تم اللہ پر ایمان لائے ہو اور اُس کے حکم کو تسلیم کرتے ہو تو اس پر توکل کرو''۔ (یونس:84)

گویا وہ اپنی قوم کو یہ درس دے رہے ہیں کہ صرف اللہ پر توکل کر کے ہی فرعون جیسے ظالم اور طاقتور حکمران کا مقابلہ کیا جا سکتا ہے۔

ظاہر سی بات ہے کہ توکل کی صفت میں حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم سے آگے تھے ورنہ یہ ممکن ہی نہ تھا کہ ایک چرواہا جس کے پاس کوئی ظاہری طاقت نہ تھی، اپنے دَور کی طاقتور ترین حکومت سے ٹکر لے سکتا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم کے مومن افراد نے اُن کی دعوت پر لبیک کہتے ہوئے کہا:

"فَقَالُوْا عَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْنَا ۚ"

''ہم نے اللہ پر توکل کیا''۔ (یونس:85)

پھر اُنہوں نے اللہ کی بارگاہ میں رجوع کر کے کہا:

"رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا فِتْنَةً لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ○" (یونس: 85)

''اے ہمارے رب! تو ہمیں ان ظالموں کے ظلم وستم کا نشانہ نہ بننے دے''۔

"وَنَجِّنَا بِرَحْمَتِكَ مِنَ الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ○" (یونس: 86)

''اور اپنی رحمت سے ہمیں کافروں سے نجات عطا فرما''۔

یہاں فتنہ سے مراد اذیت اور ظلم وستم (torture) ہے جو بعض قرآنی سورتوں میں، جیسا کہ سورۂ بروج میں اصحابِ اخدود کے بارے میں اور سورۂ یوسف کی آیت 83 میں استعمال ہوا ہے جس کی طرف ہم پہلے اشارہ کر چکے ہیں۔

یہ احتمال بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ ان دونوں مقامات پر فتنہ سے مراد دین کی راہ سے گمراہ ہو جانا ہو، اس لئے کہ اگر فرعون اور اُس کا نظام حضرت موسیٰ علیہ السلام کے خلاف کامیاب ہو جاتا تو وہ اسے اپنے برحق ہونے کی دلیل بنا لیتے اور اپنی گمراہی

میں مزید پختہ ہوجاتے۔

ساتویں آیت میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد کے دور کی بات ہورہی ہے۔اس دَور میں بنی اسرائیل جالوت نامی ایک ظالم بادشاہ کے محکوم تھے۔انہوں نے مجبور ہوکر اپنے دور کے نبی حضرت سموئیل سے درخواست کی کہ ان کیلئے ایک سپہ سالار مقرر کریں جس کی قیادت میں جنگ کر کے وہ اپنے علاقے جالوت کے قبضے سے آزاد کرواسکیں۔حضرت سموئیل نے طالوت کو، جو ہر لحاظ سے باصلاحیت اور طاقتور جوان تھا، اُن کا سپہ سالار مقرر کیا جسے انہوں نے پس وپیش اور حیل وحجت کے بعد قبول کرلیا۔

اس کے بعد طالوت نے متعدد آزمائشوں کے ذریعے میدانِ جنگ میں لڑنے والے حقیقی جنگجوؤں کا انتخاب کیا۔زیر بحث آیت اس موقعہ کا ذکر کررہی ہے کہ جب جالوت کا بظاہر بڑا اور ہر لحاظ سے طاقتور لشکر اور طالوت کا بظاہر چھوٹا اور کمزور لشکر آمنے سامنے کھڑے ہوگئے۔

"وَلَمَّا بَرَزُوْا لِجَالُوْتَ وَجُنُوْدِهٖ قَالُوْا رَبَّنَآ اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَّثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ○"

''جب وہ جالوت کے مدِ مقابل آئے تو اُنہوں نے کہا: اے ہمارے رب! ہم پر صبر نازل فرما، ہمیں ثابت قدم رکھ اور کافروں کے خلاف ہماری مدد فرما''۔(بقرہ:250)

بظاہر دونوں لشکروں کے درمیان کوئی توازن نہ تھا لیکن جس چیز نے طاقت کے توازن کو بنی اسرائیل کے چھوٹے اور کمزور لشکر کے حق میں کردیا، وہ اللہ پر اُن کا توکل اور اللہ سے ثابت قدمی اور نصرت کی دُعا تھی۔اسی لئے اگلی آیت میں ہے:

"فَهَزَمُوْهُمْ بِاِذْنِ اللّٰهِ"(بقرہ: 251)

''انہوں نے اللہ کے حکم سے جالوت کے لشکر کو شکست دے دی''۔

بظاہر بات ہے کہ صبر واستقامت، ثابت قدمی کا سبب اور ثابت قدمی کامیابی کا سبب ہوتی ہے۔یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اپنی دعا میں ان تین چیزوں کی درخواست کی اور ان سب باتوں کی روح توکل اور اللہ پر پختہ ایمان ہے۔

آٹھویں آیت میں جنابِ رسولؐ خدا اور انؐ کے مقامِ توکل کا ذکر کیا جارہا ہے۔جب آپ ﷺ کو کفار کی طرف سے سخت ترین حالات کا سامنا تھا تو اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو سکھایا کہ ان حالات میں ان سختیوں پر کس طرح قابو پایا جاسکتا ہے۔اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

"فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُلْ حَسْبِيَ اللّٰهُ ۖ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۭ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَهُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ"(توبہ: 129)

''پس اے رسولؐ! اگر یہ ایمان لانے کی بجائے رُوگردانی کریں تو (آپ فکرمند نہ ہوں) اور کہیں کہ اللہ میرے

لئے کافی ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں، میں نے اُسی پر توکل کیا اور وہ عرشِ عظیم کا رب ہے''۔

اس آیت سے یہ بات بخوبی واضح ہوجاتی ہے کہ انسان جتنا بھی اکیلا ہوجائے۔ اگر وہ اللہ پر توکل رکھتا ہو تو اسے کسی قسم کی پریشانی نہیں ہوتی، اس لئے کہ اللہ عرشِ عظیم کا رب اور لامحدود قدرت کا مالک ہے، ایسی قدرت جس کے سامنے انسانوں کی طاقت کی حیثیت ہی کچھ نہیں ہے۔ لہٰذا کیسے ممکن ہے کہ اگر اُس کے بندے اس پر توکل کریں تو وہ دشمن کے مقابلے میں انہیں تنہا چھوڑ دے۔

اس آیت سے یہ بات اچھی طرح واضح ہوجاتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا اصل سرمایہ اللہ پر توکل تھا۔ سورۂ زمر کی آیت 38 میں بھی اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کو حکم دیا:

"قُلْ حَسْبِيَ اللّٰهُ ؕ عَلَيْهِ يَتَوَكَّلُ الْمُتَوَكِّلُوْنَ" (زمر: 38)

''اے رسولؐ! کہہ دو اللہ میرے لئے کافی ہے اور توکل کرنے والوں کو اس پر توکل کرنا چاہئے''۔

نویں آیت میں تمام گزشتہ انبیاؑ کا ذکر کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ انبیاؑ کے موقف کو ان الفاظ میں بیان فرما رہا ہے:

"وَمَا لَنَآ اَلَّا نَتَوَكَّلَ عَلَى اللّٰهِ وَقَدْ هَدٰىنَا سُبُلَنَا ؕ وَلَنَصْبِرَنَّ عَلٰى مَآ اٰذَيْتُمُوْنَا ؕ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُتَوَكِّلُوْنَ"۔ (ابراھیم: 12)

''آخر ہم کیوں اللہ پر توکل نہ کریں جبکہ اسی نے ہمیں (سعادت کی راہ کی) ہدایت کی اور ہم یقیناً تمہاری طرف سے آنے والی تکالیف پر صبر کریں گے اور توکل کرنے والوں کو صرف اللہ پر توکل کرنا چاہیئے''۔

اس آیت سے یہ بات اچھی طرح روشن ہوجاتی ہے کہ طاقت فرسا شدائد کے خلاف ہر دور میں توکل انبیاؑ کا ہتھیار تھا اور اُن کی تمام کامیابیاں اسی ایک بات کی مرہونِ منت تھیں ''اللہ کی لامحدود قدرت پر توکل''۔ بڑے بڑے جابر حکمرانوں کی حاکمیت اور طاقت کو ان کی نظر میں پست اور حقیر کر دیتی تھی۔

یہ نکتہ بھی قابلِ غور ہے کہ اس آیت میں کہا گیا ہے: 'وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُتَوَكِّلُوْنَ'' یعنی توکل کرنے والوں کو اللہ پر ہی توکل کرنا چاہئے۔ جبکہ سورۂ ابراہیمؑ کی آیت 11 میں ہے:

"وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُتَوَكِّلُوْنَ"

''مومنین کو اللہ پر ہی توکل کرنا چاہئے''۔

اگر ان دونوں آیات کا حاصل جمع لیا جائے تو وہ یہ ہوگا کہ جو لوگ اللہ پر توکل کرتے ہیں، وہی حقیقی مومن ہیں اور جو لوگ مومن ہیں، وہ یقیناً اللہ پر توکل کرتے ہیں۔ بالفاظِ دیگر ان دونوں آیات کی رو سے (متوکلون مومنین) ثابت ہوجاتا ہے۔

اس آیت سے یہ بھی واضح ہوجاتا ہے کہ توکل اللہ کی معرفت اور اس کی بخشی ہوئی ہدایت کا ثمر ہے جبکہ مشکلات

اور شدائد کے سامنے صبر وثابت قدمی توکل کا ثمر ہے۔

دسویں آیت میں اللہ پر توکل کے واضح نتائج کا ذکر کرتے ہوئے سب کو اللہ پر توکل کی تحریک دی جارہی ہے اور ان سے نجات کو وعدہ کیا جارہا ہے۔اللہ تعالیٰ فرمارہا ہے:

"وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ ؕ اِنَّ اللهَ بَالِغُ اَمْرِهٖ ؕ قَدْ جَعَلَ اللهُ لِكُلِّ شَيْءٍ قَدْرًا"(طلاق:3)

''جواللہ پر توکل کرتا ہے،اللہ اس کیلئے کافی ہے اور اللہ اپنے کام کو انجام تک ضرور پہنچاتا ہے اور اللہ نے ہر چیز کی مقدار مقرر کررکھی ہے''۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے سب توکل کرنے والوں سے وعدہ کیا ہے کہ وہ ان کی مشکلات کو حل کرے گا۔اس کے بعد اس کی دلیل کا ذکر کرتے ہوئے فرمارہا ہے کہ وہ ایسا قادر ہے کہ اپنے کام کو اور اپنے حکم کو ضرور انجام تک پہنچاتا ہے۔

اس جملے کے ذریعے اللہ تعالیٰ یہ واضح کررہا ہے کہ اگر اس نے توکل کرنے والوں کی مدد کا وعدہ کیا ہے تو وہ اس وعدے پر عمل کرنے کی پوری پوری قدرت رکھتا ہے۔

بعد ازاں''قد جَعَلَ اللهُ لِكُلِّ شَيْءٍ قدرًا''یعنی''اللہ نے ہر چیز کی ایک مقدار مقرر کررکھی ہے''،فرما کر اس سوال کا جواب دے رہا ہے کہ بعض اوقات ایسا کیوں ہوتا ہے کہ اللہ پر توکل کے باوجود ہمیں مطلوبہ نتائج حاصل نہیں ہوتے یا تاخیر سے حاصل ہوتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ اس سوال کا جواب اس طرح دے رہا ہے کہ تم لوگ اُمورِ کائنات اور ان کی مصلحتوں سے آگاہ نہیں ہو جبکہ اللہ کے ہاں ہر معاملہ کی کچھ حدود مقرر ہیں۔ہر کام کیلئے مناسب وقت کی ضرورت ہوتی ہے اور ہر واقعہ مخصوص حالات میں رونما ہوتا ہے۔لہٰذا بعض اوقات اللہ کی حکمت اور مشیت کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ کوئی کام تاخیر سے ہو،ایسے معاملات میں جلد بازی جائز نہیں ہوتی۔

ایسی ہی بات سورۂ آلِ عمران میں بھی کہی گئی ہے کہ فتح وشکست اللہ کی طرف سے ہے اور اللہ پر توکل مومنین کیلئے کامیابی تک پہنچنے کا ذریعہ ہے۔

"اِنْ يَّنْصُرْكُمُ اللهُ فَلَا غَالِبَ لَكُمْ ۚ وَاِنْ يَّخْذُلْكُمْ فَمَنْ ذَا الَّذِيْ يَنْصُرُكُمْ مِّنْۢ بَعْدِهٖ ؕ وَعَلَى اللهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ○"

''اگر اللہ تمہاری مدد کرے تو کوئی تم پر غالب نہیں آسکتا اور اگر وہ تمہیں بے یارومددگار چھوڑ دے تو اس کے بعد

کون تمہاری مدد کرے گا؟ اور مومنوں کو اللہ پر توکل کرنا چاہئے۔" (آل عمران۔160)

نتیجہ:۔

مندرجہ بالا آیات میں انسانوں کی زندگی، انبیاؑ کے جہاد اور مشکلات پر غلبہ پانے میں توکل کے اہم کردار کو اچھی طرح نمایاں کیا گیا ہے اور یہ بھی واضح کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ پر عدم اعتماد کس حد تک فرد اور معاشرے کی ہلاکت کا سبب ہے۔

توکل احادیث کی روشنی میں

احادیث میں اس اخلاقی فضیلت کی غیر معمولی اہمیت بیان کی گئی ہے اور جس قدر اس کے آثار و برکات کو بیان کیا گیا ہے، شاید کسی اور چیز کے بیان کئے گئے ہوں۔ مندرجہ ذیل روایات احادیث کے گلستان میں سے ایک گلدستہ کی حیثیت رکھتی ہیں جن میں ایسے دقیق اور لطیف مطالب بیان کئے گئے ہیں جو ہماری بات کا بہترین ثبوت ہیں۔

1۔ جناب رسولِ خدا فرماتے ہیں:

"مِنْ سَرَّهُ اَنْ يَكُوْنَ اَقْوَى النَّاسِ فَلْيَتَوَكَّلْ عَلَى اللهِ"۔

"جو شخص یہ چاہتا ہے کہ سب لوگوں سے زیادہ طاقتور ہو، وہ اللہ پر توکل کرے"۔ (کنز العمال، 110:3)

2۔ ایک حدیث میں امیر المومنین علیہ السلام فرماتے ہیں:

"فِي التَّوَكُّلِ حَقِيْقَةُ الْاِيْقَانِ"۔ (غرر الحکم)

"یقین کی حقیقت توکل میں ہے"۔

تفسیر قمی میں حضرت ابراہیمؑ کے واقعہ کے ذیل میں ایک پر معنی حدیث میں آیا ہے کہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آگ میں پھینکنے کیلئے منجنیق میں رکھا گیا تو اُنؑ کے چچا آزر نے ان کے قریب جا کر ان کے چہرے پر ایک زوردار تھپڑ مارا اور کہا کہ اپنے توحیدی مذہب کو چھوڑ دو (مگر حضرت ابراہیمؑ نے کوئی توجہ نہیں کی)۔

اس وقت اللہ تعالیٰ نے تمام فرشتوں کو یہ منظر دیکھنے کے لئے دنیا کے آسمان پر جانے کا حکم دیا۔ اس وقت کائنات کی ہر چیز نے اللہ سے دعا کی کہ ابراہیمؑ کو نجات دے۔ زمین نے کہا: "یا اللہ! اس وقت میری پشت پر ابراہیمؑ کے علاوہ کوئی موحد نہیں ہے اور اب اسے بھی آگ میں ڈالا جا رہا ہے"۔ اللہ نے کہا: "اگر وہ مجھے پکارے تو میں ضرور اس کی مشکل کو حل کروں گا۔ اس وقت جبرائیلؑ حضرت ابراہیمؑ کے پاس گئے اور کہا: ابراہیمؑ! میں تمہاری کیا مدد کر سکتا ہوں؟ ابراہیمؑ نے جواب دیا: مجھے تمہاری مدد نہیں، اللہ کی مدد درکار ہے۔ اس موقع پر جبرائیلؑ نے ایک انگوٹھی حضرت ابراہیمؑ کو دی جس پر لکھا تھا:

"لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ. اَلْجَأْتُ ظَهْرِیْ اِلَی اللّٰهِ. اَسْنَدْتُ اَمْرِیْ اِلَی اللّٰهِ. وَفَوَّضْتُ اَمْرِیْ اِلَی اللّٰهِ"۔

''لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللہِ، میں نے اپنے آپ کو اللہ کی پناہ میں دیا، میں نے اپنا معاملہ اللہ سے منسوب کر دیا اور میں نے اپنا معاملہ اللہ کے سپرد کر دیا''۔

جب حضرت ابراہیمؑ کو آگ میں پھنکا گیا تو اللہ نے آگ کو حکم دیا کہ ابراہیمؑ کیلئے ٹھنڈی ہو جا۔ اس پر سردی کی شدت سے ابراہیمؑ کے دانت بجنے لگ گئے۔ پھر اللہ نے آگ کو حکم دیا کہ ابراہیمؑ کیلئے سلامتی بن جا۔ آگ حضرت ابراہیمؑ کیلئے سرد اور سلامتی بن گئی اور ابراہیمؑ اور جبرائیل وہاں باتیں کر رہے تھے۔

نمرود ایک بلند مقام سے یہ سارا منظر دیکھ رہا تھا۔ اُس نے جب یہ دیکھا تو کہا: اگر کوئی کسی خدا کو اپنانا چاہے تو اسے چاہے کہ ابراہیمؑ کے خدا جیسا خدا اپنائے۔

اللہ پر توکل آگ کو انسان کیلئے گلزار بنا دیتی ہے۔ ایسا ابراہیمی توکل میں جس میں وہ جبرائیل سے مدد مانگنے کو اللہ سے دُوری تصور کرتے ہیں اور اس بات پر ایمان رکھتے ہیں کہ پانی اُس مقام سے حاصل کرنا چاہئے جہاں سے چشمہ شروع ہو رہا ہو۔ (تفسیر قمی، 72:2)

3۔ ایک حدیث میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

"اِنَّ الْغِنٰی وَالْعِزَّ یَجُوْلَانِ فَاِذَا ظَفَرَا بِمَوْضِعِ التَّوَکُّلِ اَوْطَنَاهُ"۔ (کافی، 65:2)

''بے نیازی اور عزت حرکت میں رہتی ہیں، جہاں توکل دیکھتی ہیں، وہاں ڈیرہ ڈال دیتی ہیں''۔

اس حدیث میں یہ نکتہ بیان کیا گیا ہے کہ جس دل میں توکل موجود ہے، وہی اپنے آپ کو غیر اللہ سے بے نیاز محسوس کرتا ہے اور اُسی کو عزت عطا ہوتی ہے، اس لئے کہ اُس نے ایک ایسی ذات پر بھروسہ کیا ہے جو عزت اور بے نیازی کا سرچشمہ ہے۔

4۔ ایک حدیث میں اس سے بھی زیادہ لطیف پیرائے میں حضرت امام محمد باقر علیہ السلام فرماتے ہیں:

"مَنْ تَوَکَّلَ عَلَی اللّٰهِ لَا یُغْلَبُ وَمَنِ اعْتَصَمَ بِاللّٰهِ لَا یُهْزَمُ"۔

''جو اللہ پر توکل کرے، وہ مغلوب نہیں ہوتا اور جو اللہ کا سہارا لے، وہ شکست نہیں کھاتا''۔

(میزان الحکمہ، 4۔ حدیث: 22547)

6۔ ایک حدیث میں حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

"مَنْ تَوَکَّلَ عَلَی اللّٰهِ ذَلَّتْ لَهُ الصِّعَابُ وَتَسَهَّلَتْ عَلَیْهِ الْاَسْبَابُ"۔

''جو اللہ پر توکل کرتا ہے، مشکلات اُس کے سامنے عاجز ہو جاتی ہیں اور اسباب اُس کیلئے آسان ہو جاتے

ہیں"۔(غررالحکم:9028)

ظاہری بات ہے کہ اگر مسبب الاسباب ذات پر توکل کیا جائے تو اس کا یہی نتیجہ ہوگا، اس لئے کہ ہر چیز اس کے حکم کے آگے سر تسلیم خم کئے ہے ہے۔

7۔ ایک حدیث میں آپؑ اس نکتے پر روشنی ڈالتے ہیں کہ توکل صرف بیرونی اسباب پر ہی اثر انداز نہیں ہوتا بلکہ انسان کے اندر بھی مثبت اثر ڈالتا ہے اور اسے وسوسوں اور شکوک وشبہات سے نجات دلاتا ہے۔

حدیث کے الفاظ یہ ہیں:

"مَنْ تَوَكَّلَ عَلَى اللهِ آضَائَتْ لَهُ الشُّبَهَاتُ"۔(غرر الحکم: 8985)

8۔ امیر المومنین علیہ السلام سے روایت ہے کہ آپؑ نے فرمایا:(بحارالانوار،265:55)

"يَاأَيُّهَا النَّاسُ تَوَكَّلُوْ عَلَى اللهِ وَاتَّقُوْا بِهِ فَإِنَّهُ يَكْفِيْ مِمَّنْ سِوَاهُ"۔

"اے لوگو! اللہ پر توکل کرو اور اس سے ڈرتے رہو کیونکہ وہ دُوسروں سے بے نیاز کر دیتا ہے"۔

9۔ جابر بن یزید جعفی کہتے ہیں کہ میں اٹھارہ سال حضرت امام محمد باقرؑ کی خدمت میں رہا۔ آپؑ نے مجھے کہا کہ اے جابر! ہمارے شیعوں کو میرا اسلام پہنچا دو اور ان سے کہو کہ ہمارے اور اللہ کے درمیان کوئی ایسی رشتہ داری نہیں ہے جو نجات کا سبب ہو، نجات کا ذریعہ اس کا قرب اور اس کی اطاعت کے سوا کچھ نہیں۔

پھر آپؑ نے فرمایا:

"يَاجَابِرُ مَنْ هٰذَا الَّذِيْ سَئَلَ اللهَ فَلَمْ يُعْطِهِ؟ اَوْ تَوَكَّلَ عَلَيْهِ وَلَمْ يَكْفِهِ؟ اَوْ وَثَقَ بِهِ فَلَمْ يُنْجِهِ"۔

"اے جابر! وہ کونسا انسان ہے جس نے اللہ سے مانگا اور اللہ نے اسے نہ دیا یا اس پر توکل کیا اور اس نے اس کا کام نہ بنایا؟ یا اس پر اعتماد کیا اور اس نے اسے نجات نہ دی؟"

اس حدیث میں اللہ پر توکل، اس کے ذات پر اعتماد اور اس سے دعا کو کامیابی کے تین وسائل قرار دیا گیا ہے۔

10۔ توکل اور انسان کی مادی ومعنوی زندگی پر اس کے اثرات کے بارے میں گفتگو کی گنجائش تو بہت زیادہ ہے مگر ہم اس بحث کو لقمان حکیم کے اس حکیمانہ بیان پر ختم کرتے ہیں۔ انہوں نے اپنے بیٹے کو نصیحت کرتے ہوئے کہا:

"يَابُنَيَّ! تَوَكَّلْ عَلَى اللهِ ثُمَّ سَلْ فِي النَّاسِ، مَنْ ذَا الَّذِيْ تَوَكَّلَ عَلَى اللهِ فَلَمْ يَكْفِهِ"۔

(میزان الحکمہ:4۔ حدیث:22661)

''اے بیٹا! اللہ پرتوکل کرو اور پھر لوگوں میں جا کر پوچھو کہ کون ہے جس نے اللہ پرتوکل کیا ہو اور اللہ نے اس کا کام نہ بنایا ہو!''

توکل کی فضیلت اور عظمت ان احادیث کی روشنی میں اس قدر واضح وآشکار ہے کہ اسے مزید کسی وضاحت کی ضرورت نہیں ہے۔اس کے برعکس اللہ پرتوکل نہ کرنا اور مخلوق کا سہارا تلاش کرنا ایک ایسی صفتِ رذیلہ ہے جو انسان کو ذِلت ورُسوائی اور ناکامی ونامرادی کی پستیوں میں گرادیتی ہے۔

توکل کی حقیقت:۔

جیسا کہ بحث کے آغاز میں بیان ہوا کہ توکل کا مصدر وکالت ہے جس کے معنی ہیں اپنے کام اللہ کے سپرد کرنا اور اس پر اعتماد کرنا۔لیکن اس کے یہ معنی ہرگز نہیں ہیں کہ انسان کام اور کوشش کو ترک کردے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ جو کچھ انسان کے بس میں ہے، اس حدتک اپنی پوری کوشش کرے اور کسی بھی کام کو انجام دینے کے مختلف مراحل کو انجام دیتا رہے اور جو کچھ اس کے بس میں نہیں، وہاں معاملہ اللہ کے سپرد کردے اور اس کے الطافِ خفیہ وجلیہ کے ذریعے اس سے مدد مانگے۔

علمِ اخلاق کے ایک معروف عالم نے توکل کی تفسیر میں کہا ہے:

''توکل، ایمانی منازل میں سے ایک منزل اور اہلِ یقین کے درجات میں سے ایک درجہ ہے، ایسا درجہ جو مقربین سے مخصوص ہے، جو مفہوم کے لحاظ سے پیچیدہ اور عمل کے لحاظ سے سنگین ہے''۔

اس مفہوم کے پیچیدہ ہونے کے معنی یہ ہیں کہ عالمِ اسباب پر اعتماد کرنا ایک قسم کا شرک ہے اور اسباب سے غفلت اور بے اعتنائی برتنا شریعت میں ممنوع ہے بلکہ شریعت نے ان کے طرف راغب بھی کیا ہے۔

اس کے بعد وہ کہتے ہیں: ''شریعتِ اسلامی میں جس توکل کا حکم دیا گیا ہے، اس کی حقیقت یہ ہے کہ انسان ہر کام میں قلبی اعتماد صرف اللہ تعالیٰ پر رکھے اور یہ حصول اسباب کے خلاف نہیں ہے، بشرطیکہ انسان اسباب کو اپنی کامیابی اور حصولِ مقصد کا بنیادی سبب نہ سمجھے۔''

اس کے بعد وہ فرماتے ہیں: ''جیسا کہ نادان لوگوں نے سمجھ رکھا ہے، توکل کا مفہوم یہ نہیں ہے کہ انسان تدبیر وعمل کو جو ترک کردے۔ یہ محض جاہلانہ تصور ہے جو شریعتِ اسلامی میں حرام ہے۔انسان پر فرض ہے کہ اللہ کے بتائے ہوئے طریقے اختیار کرتے ہوئے زراعت، تجارت، صنعت وحرفت وغیرہ کے ذریعے کسبِ معاش کیلئے عمل کرے.....اس کے باوجود اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے کہ اسباب پر بھروسہ نہ کیا جائے اور ان میں غرق نہ

ہواجائے''(اخلاقِ شبر:ص275)

المحجۃ البیضاءمیں حقیقت توکل کے مبحث میں ہے:

''توکل ایمان کے دروازوں میں سے ایک دروازہ ہے اور ایمان کے تمام دروازوں کے تین رُکن ہیں:علم، حالت،اورعمل۔علم کی حیثیت بنیاداور جڑجیسی ہے۔توکل پر مبنی اعمال پھل کی حیثیت رکھتے ہیں اور باطنی حالت توکل کے مفہوم کی مصداق ہوتی ہے''۔

اس کے بعدوہ اس علم کی تشریح کرتے ہیں جوتوکل کی بنیاداور جڑ کی حیثیت رکھتا ہےاورتوحید کے مراحل کی وضاحت کرتے ہیں جوتوحید کی اساس اور جڑ کی تشکیل کرتے ہیں۔پھروہ اس طویل بحث کے بعدحقیقتِ توکل کے بارے میں کہتے ہیں کہ توکل درحقیقت وکیل(یعنی اللہ تعالیٰ) پرمکمل قلبی اعتماد کا نام ہے۔

مختصر یہ کہ توکل کا مفہوم بہت لطیف اور دقیق ہے،اس لئے اس میں ضرورت اس امر کی ہے کہ اسباب کواستعمال کرنے کے ساتھ ساتھ اس پراعتمادنہ کیاجائے اورغیراللہ پرقلبی انحصار سے، جوایک قسم کا شرک ہے،اپنے آپ کوآلودہ نہ کیاجائے۔

انسان کیلئے ضروری ہے کہ حصولِ مقصد کیلئے تمام مادی وسائل کو بروئے کار لائے اورتمام رُکاوٹوں کودُور کرنے کی پوری کوشش کرے مگراس کے باوجوداس کی قلبی حالت یہ ہوکہ نتائج کیلئے اس کی نظرصرف اورصرف اللہ تعالیٰ کے لطف پر ہواوروہ نتائج اور کامیابی کوصرف اورصرف اللہ کا عطیہ سمجھے،اسباب کا کرشمہ نہیں۔

ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جبرائیل سے پوچھا:

"مَالتَّوَكُّلُ عَلَى عَزَّوَجَلَّ..... اَلْعِلْمُ بِاَنَّ الْمَخْلُوْقَ لَايَضُرُّوَلَايَنْفَعُ وَلَاعُطِيَ وَلَايَمْنَعُ وَاِسْتِعْمَالُ الْيَاسِ مِنَ الْخَلْقِ"۔(بحار الانوار،138:68)

''اللہ پرتوکل کیا ہے؟ جواب دیا:توکل کی حقیقت یہ ہے کہ انسان کواس بات کا علم ہوکہ مخلوق کوئی نفع ونقصان نہیں پہنچاسکتی،مخلوق کسی کوکوئی چیزنہیں دے سکتی اورکسی سے کوئی چیزنہیں روک سکتی اور یہ کہ انسان لوگوں سے مکمل طور پر مایوس ہوجائے''۔

اس کے بعد جبرائیلؑ نے مزید کہا:

"فَاِذَاكَانَ الْعَبْدُ كَذٰلِكَ لَمْ تَعْمَلْ لِاَحَدٍسِوَى اللهِ وَلَمْ يَرْجُ وَلَمْ يَخَفْ سَوَى اللهِ وَلَمْ يَطْمَعْ فِيْ اَحَدٍسِوَى اللهِ فَهٰذَاهُوَ التَّوَكُّلُ"۔(بحار الانوار،138:68)

''جب بندہ اس منزل پرپہنچ جائے تووہ اللہ کے علاوہ کسی کے لئے کوئی عمل انجام نہیں دیتا،اوراللہ کے سوا کسی سے خوفزدہ نہیں ہوتااورکسی حال میں اللہ کے سوا کسی سے دل نہیں لگاتا،یہ ہے توکل کی حقیقت!''

ایک اور حدیث میں ہے امامِ معصومؑ سے پوچھا گیا کہ توکل کیا ہے؟

آپؑ نے فرمایا:

"لَا تَخَافُ سِوَاهُ۔"

یعنی ''توکل یہ ہے کہ تم اللہ کے سوا کسی سے نہ ڈرو۔'' (بحارالانوار، 143:48)

ان تمام احادیث سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ توکل کی روح یہ ہے کہ انسان کا سارا انحصار صرف اور صرف اللہ تعالیٰ پر ہو۔ جس شخص میں یہ حالت نہ پائی جائے، وہ توکل کی حقیقت پر فائز نہیں ہوا ہے۔

توکل کی اہمیت کے ساتھ ساتھ احادیث میں اس بات پر بھی زور دیا گیا ہے کہ انسان اسباب سے غفلت نہ کرے۔ مشہور واقعہ ہے کہ ایک شخص اپنا اُونٹ کھلا چھوڑ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپؐ نے اُس سے پوچھا تو اُس نے کہا:

"تَوَكَّلْتُ عَلَى اللهِ"۔

''میں نے اللہ پر توکل کیا''۔

آپؐ نے فرمایا:

"اِعقِلْهَا وَتَوَكَّلْ"۔

''اس کا زانو باندھ لو اور توکل کرو''۔ (الحجۃ البیضاء، 426:7)

یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید کی آیات اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت ایسی عبارات سے پُر ہیں جن میں مومنین کو حکم دیا گیا ہے کہ حتی الامکان مادی وسائل سے ضرور استفادہ کریں۔ دُشمن کے مقابلہ کیلئے تیار رہنے کا حکم دیتے ہوئے اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں ارشاد فرماتا ہے:

"وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّاللهِ وَعَدُوَّكُمْ" (انفال: 60)

''ان کا مقابلہ کرنے کیلئے جہاں تک کرسکو، قوت حاصل کرو، ایسے تربیت یافتہ گھوڑے جن کے ذریعے تم اللہ کے دُشمنوں کو اور اپنے دشمنوں کو مرعوب کرسکو''۔

نمازِ خوف کا حکم دیتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میدانِ جنگ میں نماز ادا کرتے وقت اپنا اسلحہ اپنے ساتھ اُٹھائے رکھو۔

"وَلْيَاْخُذُوْا حِذْرَهُمْ وَاَسْلِحَتَهُمْ ○" (نسأ: 102)

جب اللہ تعالیٰ عین حالتِ نماز میں مادی اسباب و وسائل سے غفلت کی اجازت نہیں دیتا تو عام حالات میں اس کی اجازت کیسے دی جاسکتی ہے۔ بنابرایں اسباب و وسائل سے استفادہ توکل کے منافی نہیں ہے۔

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مکہ سے ہجرت کرنے لگے تو آپؐ تدبیر (planning) کے بغیر توکل علی اللہ کہہ کر گھر سے نہیں نکل پڑے۔ آپؐ نے دشمن کو غافل کرنے کیلئے ایک طرف سے حضرت علیؑ کو اپنے بستر پر سوجانے کا حکم دیا اور دوسری طرف سے خود رات کی تاریکی میں پنہاں ہوکر مکہ سے باہر تشریف لے گئے۔ آپؐ سیدھے مدینہ کی طرف جانے کی بجائے، جو شمال کی سمت میں تھا، جنوب کی سمت میں جا کر چند روز غارِ ثور میں روپوش رہے، یہاں تک کہ جب دُشمن آپؐ کی تلاش میں مایوس ہو گئے تو آپؐ مکہ کا چکر کاٹ کر مدینہ کی طرف چل پڑے۔ اس کے باوجود آپؐ راتکی تاریکی میں سفر کرتے تھے اور دن کو روپوش ہوجاتے تھے۔

جنابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بڑھ کر کس کا دل نورِ توکل سے منور ہوگا! اس کے باوجود آپؐ نے اسباب وتدبیر کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا۔

اصولی طور پر اللہ تعالیٰ کی مشیت ہی یہ ہے کہ لوگ اپنے مقاصد کے حصول کیلئے اسباب اور وسائل کی مدد حاصل کریں۔ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ایک مشہور ومعروف حدیث میں ہے:

"اَبَی اللّٰہُ اَنْ یَجْرِیَ الْاَشْیَاءَ اِلَّا بِاَسْبَابٍ فَجَعَلَ لِکُلِّ شَیْءٍ سَبَبًا"۔

''اللہ تعالیٰ کا ارادہ یہ ہے کہ ہر کام سبب کی بنیاد پر انجام پائے اور اُس نے ہر چیز کا ایک سبب مقرر کر رکھا ہے''۔ (اصولِ کافی، 138:1)

بنابرایں عالمِ اسباب سے بے اعتنائی نہ صرف یہ کہ توکل نہیں ہے بلکہ سنتِ الٰہی سے بے اعتنائی ہے جو رُوحِ توکل کے ساتھ سازگار نہیں ہے۔

ہم اس بحث کو حضرت موسیٰ ؑ کے دور سے متعلق ایک حدیث پر ختم کرتے ہیں۔ حدیث میں آیا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام بیمار ہوگئے۔ بنی اسرائیل ان کی عیادت کو گئے۔ انہوں نے ان کی بیماری کی تشخیص کر لی اور کہا کہ اگر آپؑ فلاں دوائی استعمال کریں تو صحت یاب ہوجائیں گے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ میں کوئی دوائی استعمال نہیں کروں گا۔ اللہ مجھے دوائی کے بغیر اچھا کردے گا۔ مگر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بیماری بڑھ گئی۔ لوگ پھر ان کے پاس گئے کہ یہ دوائی اس بیماری کی مجرب دوا ہے۔ ہم اسی سے اس بیماری کا علاج کرتے ہیں اور ٹھیک ہوجاتے ہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے پھر کہا کہ میں دوائی استعمال نہیں کروں گا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بیماری بڑھتی چلی گئی، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے اُن کی طرف وحی بھیجی کہ میری عزت اور میرے جلال کی قسم! میں تجھے اس وقت تک صحت نہیں دوں گا جب تک وہ دوائی استعمال نہ کرے جو لوگوں نے تجھے بتائی ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دوائی استعمال کی اور صحت مند ہوگئے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دل میں یہ وسوسہ پیدا ہوگیا کہ اللہ نے توکل کی بنیاد پر مجھے کیوں شفا نہ دی؟ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف وحی بھیجی کہ تم یہ چاہتے تھے کہ توکل کے ذریعہ میری حکمت کو باطل کردو، کیا دواؤں کے اندر شفا بخش اثرات میرے سوا کسی اور نے رکھے ہیں؟ (الحجۃ البیضاء، 432:7)

اس حدیث سے توکل کی حقیقت واضح وآشکار ہوجاتی ہے۔

ممکن ہے کسی کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہو کہ جب فرشتوں نے حضرت ابراہیمؑ کی مدد کی پیشکش کی تو انہوں نے اسے قبول نہیں کیا بلکہ صرف اللہ پر توکل کیا۔ کیا ان کا واقعہ اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کا واقعہ ایک دوسرے کی نفی نہیں کرتے؟ جواب یہ ہے کہ حضرت ابراہیمؑ ایسی صورت حال میں گرفتار ہو چکے تھے۔ جب طبیعی اسباب کو کام میں لانا ان کے بس میں نہیں رہا تھا۔ ان کیلئے ایک ہی راستہ باقی تھا کہ وہ عالمِ اسباب اور عالمِ طبیعت سے ماورا کسی سے مدد طلب کریں۔ یہاں اُنہوں نے فرشتوں کی مدد قبول کرنے سے انکار کیا کیونکہ فرشتے طبیعی اسباب نہیں تھے۔ حضرت ابراہیمؑ نے یہ پسند نہیں کیا کہ اللہ کے علاوہ کسی اور سے مدد طلب کریں جبکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کیلئے طبیعی اسباب و وسائل کا راستہ مکمل طور پر کھلا تھا۔

توکل کے آثار و نتائج:۔

متوکل اپنے اُمور اللہ کے سپرد کر دیتے ہیں۔ وہ اللہ جو ہر چیز پر پوری قدرت رکھتا ہے، جو ہر چیز کے بارے میں مکمل علم و آگہی رکھتا ہے، جس کیلئے کوئی کام مشکل نہیں ہے۔ لہٰذا توکل کا پہلا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ توکل کرنے والے کے اندر ایک زبردست اعتماد پیدا ہو جاتا ہے اور مشکلات کے مقابلے میں بہت مضبوط ہو جاتا ہے۔

اگر کوئی میدانِ جنگ میں ایک طاقتور دشمن کو اپنے سامنے پائے تو اس کی ہمت جواب دے جائے گی لیکن اگر اسے یہ بتا دیا جائے کہ تمہارے پیچھے تمہاری مدد کیلئے ایک طاقتور لشکر موجود ہے تو اس کے اندر جرأت اور اعتماد پیدا ہو جائے گا۔ اگر انسان کو یقین ہو کہ اللہ تعالیٰ کی لامحدود قدرت اس کی حامی و مددگار ہے تو پھر کیسے ممکن ہے کہ وہ کمزوری اور تنہائی کے احساس کو قریب آنے دے۔ ایک دُعا میں حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

"کَیْفَ اَخَافُ وَاَنْتَ اَمَلِیْ وَ کَیْفَ اُضَامُ وَاَنْتَ مُتَّکَلِیْ"۔

''پروردگار! میں کیسے ڈروں، جب میری اُمید تو ہے اور کیسے ممکن ہے کہ میں شکست کھا جاؤں جبکہ میرا سہارا تو ہے''۔ (بحارالانوار، 229:91)

حضرت امام محمد باقر علیہ السلام ایک حدیث میں فرماتے ہیں:

"مَنْ تَوَکَّلَ عَلَی اللّٰہِ لَا یُغْلَبُ، وَمَنْ اِعْتَصَمَ بِاللّٰہِ لَا یُھْزَمُ"۔

''جو اللہ پر توکل کرے، وہ مغلوب نہیں ہوتا اور جو اللہ کو سہارا بنائے، وہ شکست نہیں کھاتا'' (میزان الحکمہ، ج 4، ص 3659، حدیث: 22547)

امام جعفر صادق علیہ السلام کی ایک حدیث پہلے بیان ہو چکی ہے کہ بے نیازی اور عزت حرکت میں رہتے ہیں، جہاں توکل کو دیکھتے ہیں، وہاں ڈیرہ ڈال دیتے ہیں۔

ان باتوں سے بڑھ کر توکل کا اثر یہ ہوتا ہے کہ انسان حرص، بخل، حسد، دُنیا پرستی اور تنگ نظری جیسی صفاتِ رذیلہ سے پاک

ہوجاتا ہے۔وجہ صاف ظاہر ہے کہ جب انسان قادرِ مطلق پر بھروسہ کرلیتا ہے تو پھر ان پست صفات کی گنجائش ہی باقی نہیں رہتی۔

جب انسان اس آیۂ شریفہ:

"وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ ط"

''اور جو اللہ پر توکل کرتا ہے، اللہ اس کیلئے کافی ہے''۔(طلاق:3)

کا ورد کرتا ہے تو کامیابی اور بے نیازی کے احسانات سے لبریز ہوجاتا ہے اور اس کے پاس کامیابی کے امکانات بہت زیادہ ہوجاتے ہیں۔بعض دُعاؤں میں آیا ہے۔

"اَللّٰهُمَّ اَغْنِنِیْ بِالْیَقِیْنِ وَاکْفِنِیْ بِالتَّوَکُّلِ عَلَیْكَ"۔

''یا اللہ! مجھے اپنی ذاتِ بابرکات پر یقین کی بدولت غنی کردے اور اپنے اوپر توکل کی برکت سے میرا کام بنادے''۔(بحارالانوار:14:87)

اللہ تعالیٰ پر توکل انسان کے دل کو اُمید سے بھر دیتا ہے اور اس کی بدولت انسان کی توانائی اور صلاحیت میں نکھار پیدا ہو جاتا ہے۔تھکن اس پر غالب نہیں آتی اور وہ ہر حال میں مطمئن ہوتا ہے۔

حضرت علی علیہ السلام نے کیا خوب فرمایا ہے:

"لَیْسَ لِمُتَوَکِّلٍ عَنَاءٌ"۔

''متوکل کبھی تھکتا نہیں ہے''۔(شرح غررالحکم،72:5)

توکل سے انسان کی ذہانت اور فکری صلاحیتوں کو نشوونما ملتی ہے اور اس میں ایک خاص بصیرت پیدا ہوجاتی ہے، اس لئے کہ توکل کی بدولت مشکلات اور مصائب میں انسان حواس باختہ اور وحشت زدہ نہیں ہوتا بلکہ پرسکون رہتا ہے اور مشکلات کے باوجود اُس کی صحیح فیصلہ کرنے کی صلاحیت محفوظ رہتی ہے۔

یہ بات ایک حدیث میں حضرت علی علیہ السلام نے اس طرح بیان فرمائی ہے:

"مَنْ تَوَکَّلَ عَلَى اللّٰهِ اَضَائَتْ لَهُ الشُّبَهَاتِ وَکَفَى الْمَؤُوْنَاتِ وَاَمِنَ التَّبِعَاتِ"۔(شرح غررالحکم، 414:5)

''جو شخص اللہ پر توکل کرتا ہے، شبہات کی تاریکیوں میں اسے روشنی مل جاتی ہے، اسے کامیابی کے اسباب میسر ہو جاتے ہیں اور وہ سختیوں سے نجات پالیتا ہے''۔

توکل کے اسباب:۔

دیگر اخلاقی فضائل کی طرح توکل کے بھی متعدد سرچشمے ہیں لیکن ہم کہہ سکتے ہیں کہ توکل کا عمدہ ترین سبب اللہ تعالیٰ کی ذات اور اُس کی صفاتِ جلال و جمال پر ایمان اور یقین ہے۔

جب انسان اللہ تعالیٰ کے علم اور اس کی قدرت کے بارے میں علم الیقین کی منزل پر پہنچ جاتا ہے اور کائنات کی ہر چیز کو اس کا محتاج پاتا ہے اور:

"لَا مُؤَثِّرَ فِی الْوُجُوْدِ اِلَّا اللہ"۔

''اللہ کے سوا کائنات میں کوئی مؤثر طاقت نہیں ہے۔''

کے مفہوم سے آگہی حاصل کر لیتا ہے، اپنی رُوح، جان اور دِل کو بھی اس کے زیر اختیار سمجھ لیتا ہے، ساری کائنات کو اللہ تعالیٰ کے الطافِ بیکراں کی تجلی گاہ سمجھتا ہے تو اُس کے دل میں بھی یقیناً توکل کا نور جگمگانے لگتا ہے۔ وہ اپنے آپ کو اللہ کے سپرد کر دیتا ہے۔ ہر قسم کی کمی بیشی میں اُس کے لطف و کرم کے زیر سایہ پناہ حاصل کرتا ہے اور اپنی تمام سرگرمیوں اور محنت و کوشش کے باوجود کامیابی کیلئے اللہ تعالیٰ پر انحصار کرتا ہے۔

بالفاظِ دیگر توکل کے درخت کے نورانی پھل کو ''توحید افعالی'' کا نام دے سکتے ہیں۔ یہ وہی شجرۂ طیبہ ہے جس کی جڑیں زمین میں اور شاخیں آسمان میں ہیں جس کا پھل ہر موسم میں اس کی شاخوں پر لگتا ہے جن میں سے سب سے اہم پھل توکل ہے۔

قرآنی آیات اور احادیث میں بھی اس کی طرف بار بار اشارہ کیا گیا ہے۔ قرآن مجید میں سات مقامات پر یہ جملہ موجود ہے:

"وَعَلَی اللہِ فَلْیَتَوَکَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ"۔

یعنی ''مؤمنین کو صرف اللہ پر ہی توکل کرنا چاہئے''۔

اس جملے سے ایمان اور توکل کا باہمی تعلق بخوبی واضح اور روشن ہو جاتا ہے۔

امیر المومنین علیہ السلام فرماتے ہیں:

"اَلتَّوَکُّلُ مِنْ قُوَّةِ الْیَقِیْنِ"۔

''توکل یقین کی قوت سے پیدا ہوتا ہے''۔ (غرر الحکم، حدیث: 669)

ایک اور حدیث میں آپؑ فرماتے ہیں:

"اَقْوَی النَّاسِ اِیْمَاناً اَکْثَرُھُمْ تَوَکُّلًا عَلَی اللہِ سُبْحَانَہٗ"۔ (غرر الحکم: 3150)

''اللہ تعالیٰ پر جس کا ایمان سب سے زیادہ ہے، اُس کا توکل بھی سب سے زیادہ ہے''۔

اصبغ بن نباتہ اصحابِ امیر المومنین علیہ السلام میں سے ہیں وہ کہتے ہیں کہ حضرت علی علیہ السلام سجدہ میں کہا کرتے تھے:

"وَاَتَوَكَّلُ عَلَيْكَ مَنْ يَعْلَمُ اَنَّكَ عَلٰى شَيْءٍ قَدِيْرٍ"۔ (بحار، 227:83)

''یا اللہ! میں تجھ پر اُس شخص کی طرح توکل کرتا ہوں جو یہ جانتا ہے کہ تو ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے''۔

یہ نکتہ قابلِ توجہ ہے کہ عام طور پر ڈرپوک اور بزدل افراد توکل کی دولت سے بے نصیب ہوتے ہیں، اس لئے کہ توکل کا نور انسان کے اندر سے خوف اور بزدلی کی تاریکی کو نکال باہر کرتا ہے۔ اگر اس مسئلہ کی موشگافی کریں تو یہاں بھی بات ایمان اور یقین تک پہنچتی ہوئی دکھائی دیتی ہے، اس لئے کہ جس قدر انسان کا ایمان اور یقین پختہ ہوگا، اسی قدر اس کا توکل زیادہ ہوگا۔

یہ نکتہ بھی ضرور مدِ نظر رہے کہ توکل کے مثبت نتائج پر غور کرنا اور توکل کرنے والوں کے حالات کا مطالعہ کرنا بھی انسان کے اندر توکل کی روح کو طاقتور اور اس شجرۂ طیبہ کو زیادہ بارآور کرتا ہے۔

توکل کے درجات:۔

گزشتہ بحث سے یہ بات بخوبی واضح ہوجاتی ہے کہ بعض لوگوں میں توکل کمزور اور بعض میں مضبوط کیوں ہوتا ہے، جب یہ بات طے ہوگئی کہ توکل ایمان سے پیدا ہوتا ہے تو یہ بات خود بخود واضح ہوجاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات اور صفات پر ایمان جس قدر پختہ ہوگا، توکل بھی اُتنا ہی زیادہ ہوگا۔ غیر معمولی توکل غیر معمولی ایمان کا نتیجہ ہوتا ہے۔ شبِ ہجرت امیر المومنین علیہ السلام کا توکل اس لحاظ سے عجیب اور بے مثال تھا۔ اگر انسان کا ایمان درمیانے یا کمزور درجے کا ہو تو اس کا توکل بھی ویسا ہی ہوگا۔

کسی شخص نے حضرت امام رضا علیہ السلام سے سوال کیا کہ ''وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ'' کے کیا معنی ہیں؟ آپؑ نے فرمایا:

"لَلتَّوَكُّلِ دَرَجَاتٌ..... مِنْهَا اَنْ تَثِقَ بِهٖ فِيْ اَمْرِكَ كُلِّهٖ فِيْ مَافَعَلَ بِكَ فَمَافَعَلَ بِكَ دُكُنْتَ رَاضِيًا وَتَعْلَمَ اَنَّهٗ لَمْ يَأْلُكَ خَيْرًا وَنَظَرًا، وَتَعْلَمَ اَنَّ الْحُكْمَ فِيْ ذٰلِكَ لَهٗ، فَتَتَوَكَّلْ عَلَيْهِ بِتَفْوِيْضِ ذٰلِكَ اِلَيْهِ"۔

(بحار انوار، 336:75)

''توکل کے مختلف درجات ہیں..... ان میں سے ایک یہ ہے کہ تم اپنے تمام اُمور میں اللہ پر اعتماد کرو اور پھر جو کچھ بھی وہ کردے، اُس پر راضی رہو اور اطمینان رکھو کہ تمہاری سرپرستی اور بھلائی میں اُس نے کوئی کوتاہی نہیں کی، نیز یہ بھی جان رکھو کہ تمام معاملات میں حاکمیت کا حق صرف اُس کا ہے۔ پس اپنے تمام

معاملات اُس کے سپرد کر کے اس پر توکل کرو‘‘۔

علمِ اخلاق کے بعض بزرگ علمانے توکل کے تین درجات بیان کیے ہیں:

1۔ اللہ تعالیٰ پر انسان کا ایمان اور اطمینان اُس شخص کی طرح سے ہو جس کا کوئی قابل اور مہربان وکیل ہو اور وہ اپنا کام اُس کے سپرد کر دے۔ یہ توکل کا کمزور ترین درجہ ہے۔

2۔ اللہ تعالیٰ پر اُس کا اعتماد ایسا ہو جیسا ایک بچے کا اپنی ماں پر ہوتا ہے۔ بچہ ابتدائے طفولیت میں ماں کے سوا کسی کو نہیں جانتا۔ اس کے علاوہ کسی پر اعتماد نہیں کرتا، جیسے ہی اسے اپنی ماں نظر آتی ہے، فوراً اس سے لپٹ جاتا ہے۔ ماں کی عدم موجودگی میں اسے کوئی بھی حادثہ پیش آجائے تو وہ فوراً ماں کو پکارتا ہے۔

یقیناً یہ توکل کا بلند تر درجہ ہے جس میں انسان خود کو اللہ تعالیٰ کی عنایات اور رحمتوں کے سمندر میں غرق پاتا ہے۔ اس کے سوا کسی کو نہیں دیکھتا اور اس کے سوا کسی کو نہیں پکارتا۔

3۔ توکل کا یہ درجہ اس بات کا متقاضی ہے کہ اللہ کے سامنے انسان کا کوئی ارادہ بھی نہ ہو، جو اللہ چاہے، وہی یہ چاہے اور جو وہ نہ چاہے، یہ بھی نہ چاہے۔

علمائے علمِ اخلاق نے حضرت ابراہیمؑ کے توکل کو اسی درجہ کا توکل قرار دیا ہے کہ جب اُنہیں آگ میں پھینکا جا رہا تھا تو اُنہوں نے فرشتوں سے مدد نہیں مانگی اور جب فرشتوں نے اُن سے کہا کہ اللہ سے دعا کریں تو اُنہوں نے کہا کہ وہ میرے حال کو بخوبی جانتا ہے۔ لہٰذا مجھے اس سے سوال کرنے کی حاجت نہیں ہے۔

توکل کا یہ درجہ عوام میں بہت کم پایا جاتا ہے۔ یہ صدیقین کا مقام ہے۔ یہ درجہ اُن لوگوں کیلئے مخصوص ہے جو اللہ تعالیٰ کی ذات کے سامنے مکمل فنا کی حالت میں اور اُس کے جلال و جمال کے مشاہدے میں محو ہیں (تلخیص از معراج السعادۃ)

توکل تک پہنچنے کے راستے:۔

علمائے علم اخلاق نے توکل کی منزل تک پہنچنے کی متعدد راہیں تجویز کی ہیں جن میں سے ہر ایک اس اخلاقی فضیلت کے حصول میں معاون ہے۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ انسان توحیدِ افعالی پر پختہ ایمان رکھے اور اس بات پر یقین رکھے کہ اس کائنات کی ہر چیز کا مصدر وہی ذاتِ مقدس ہے، وہی مسبب الاسباب ہے اور ہر سبب اُسی کے حکم سے اپنا اثر ظاہر کرتا ہے اور تمام موجودات اس کے سرچشمہ فیض سے سیراب ہو رہے ہیں۔

ان اُمور میں غور و فکر اور اپنے گزشتہ حالات کا مطالعہ کرنے سے انسان پر یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ کس طرح اس نے ہمیں نیستی سے نکال کر وجود کا لباس پہنایا، رحمِ مادر میں ’’تین تاریکیوں‘‘ میں، جہاں کسی کی دسترس ممکن نہیں ہے، تو یہ اللہ کا لطف و کرم

ہی تھا جس نے اس کی تمام ضروریات کو پورا کیا۔

اس دُنیا میں آجانے کے بعد خوشگوار اور لذیذ شیرِ مادر سے لے کر تمام عزیزوں کی محبتیں تک اُس نے فراہم کیں۔ اُسے ماں کی چھاتی سے دُودھ چوسنا سکھایا اور کس طرح اس کے جذبات واحساسات کو اُبھار کر ان سے کام لیتا ہے اور ماں ان تمام مادرانہ فرائض کو انجام دینے میں ذرا بھی نہیں تھکاوٹ محسوس کرتی۔

جب بچہ تھوڑا سا بڑا ہوتا ہے تو زمین وآسمان سے اللہ تعالیٰ کی نعمتیں اس پر برسنے لگتی ہیں اور وہ اللہ تعالیٰ کے بے پایاں الطاف کے سمندر میں غرق ہوجاتا ہے۔

جب انسان ان اُمور پر غور وفکر کرتا ہے تو اُسے یقین ہوجاتا ہے کہ ہر چیز اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے اور صرف اُسی پر توکل کرنا چاہئے، اس لئے کہ:

وَاِنْ يَّمْسَسْكَ اللّٰهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهٗٓ اِلَّا هُوَ ۚ وَاِنْ يُّرِدْكَ بِخَيْرٍ فَلَا رَآدَّ لِفَضْلِهٖ ۭ يُصِيْبُ بِهٖ مَنْ يَّشَاۗءُ مِنْ عِبَادِهٖ ۭ وَهُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ○ (یونس: 107)

''اگر اللہ تمہیں کوئی نقصان پہنچاتا ہے تو کوئی اس کو برطرف نہیں کرسکتا اور اگر وہ تمہیں خیر سے بہرہ مند کرنے کا ارادہ کرے تو کوئی اُس کے فضل کو روکنے والا نہیں ہے، وہ اپنے بندوں میں سے جسے چاہتا ہے، اپنے فضل سے نوازتا ہے اور وہ غفور ورحیم ہے۔''

جب انسان حقائق پر توجہ کرتا ہے تو وہ توکل کی حقیقت کے نزدیک ہوجاتا ہے اور متوکلین کے زمرے میں داخل ہو جاتا ہے۔

گیارہواں باب

شہوت پرستی

تمہید:۔

لغوی اعتبار سے لفظِ شہوت کا اطلاق تمام مادی اور شہوانی خواہشات اور لذتوں پر ہوتا ہے۔بعض اوقات کسی مادی چیز کی شدید خواہش پر بھی شہوت کا اطلاق ہوسکتا ہے۔

عام مفہوم کے علاوہ شہوت کا لفظ ''جنسی شہوت'' کے مخصوص معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔قرآن مجید میں یہ لفظ عام اور خاص دونوں معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔اس بحث میں ہم اس کے خاص مفہوم یعنی جنسی شہوت کے بارے میں گفتگو کریں گے۔اس لئے کہ اس کے منفی اور مخرب اثرات دیگر تمام مادی خواہشات اور شہوات سے زیادہ ہیں۔

شہوت کا متضاد عفت ہے۔عفت بھی عام اور خاص معنی رکھتا ہے۔اس کے عام معنی یہ ہیں کہ ہر قسم کی مادی لذت میں زیادہ روی سے اجتناب کیا جائے اور اس کے خاص معنی جنسی بے راہ روی سے اجتناب کرنا ہے۔

عفت ایک اہم اخلاقی فضیلت ہے جو انسانی معاشرے کی پیش رفت اور ارتقاء میں انتہائی اہم کردار ادا کرتی ہے جبکہ شہوت فرد اور معاشرے کے زوال اور بربادی کا ذریعہ ہے۔

تاریخی حقائق اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ جن افراد یا معاشروں میں عفت کا کردار نمایاں ہوتا ہے، وہ اپنی اور اپنے معاشرے کی ترقی و پیشرفت کیلئے اپنی خداداد صلاحیتوں کو بہترین انداز میں بروئے کار لاتے ہیں اور اطمینان وسکون کی ایک اعلیٰ منزل پر زندگی گزارتے ہیں۔اس کے برعکس وہ معاشرے اور افراد جو شہوت پرستی میں ڈوبے ہوتے ہیں، وہ اپنی تمام صلاحیتوں اور توانائیوں کو برباد کردیتے ہیں اور بربادی کے گڑھے کے کنارے تک جا پہنچتے ہیں۔

قانون دانوں کا نظریہ ہے کہ جنسی شہوت کا جرائم کے ارتکاب میں بہت اہم کردار ہوتا ہے، یہاں تک کہ یہ بھی کہا گیا ہے کہ کوئی جرم ایسا نہیں ہے جس میں کسی نہ کسی طرح جنسی شہوت کا ہاتھ نہ ہو۔

اگرچہ یہ بات مبالغہ آمیز ہوسکتی ہے لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ بہت سی برائیاں اور خرابیاں جنسی شہوت سے جنم لیتی ہیں۔بہت سے قتل، وسیع پیمانے پر ہونے والی خونریزیاں، ڈاکے، غارت گری جیسی خرابیوں کی وجہ یہی جنسی شہوت ہوتی ہے۔حسین اور چالاک جاسوس عورتیں اسی کمزوری کا فائدہ اُٹھاتے ہوئے ممالک کے پوشیدہ راز چرانے میں کامیاب ہوجاتی ہیں جن کا نقصان پوری قوم کو اُٹھانا پڑتا ہے۔اسی کمزوری کی وجہ سے بہت سے معززین کی عزت برباد ہوجاتی ہے۔

آیاتِ قرآن اور احادیثِ اسلامی میں جنسی شہوت شیطان کا ایک اہم ہتھیار ہے۔قرآن مجید میں بھی مختلف مقامات پر عفت اور شہوت کا ذکر کیا گیا ہے جن کا ہم ذیل میں مطالعہ کرتے ہیں:

1۔ "فَخَلَفَ مِنۢ بَعۡدِهِمۡ خَلۡفٌ اَضَاعُوا الصَّلٰوةَ وَاتَّبَعُوا الشَّهَوٰتِ فَسَوۡفَ يَلۡقَوۡنَ غَيًّا ۙ اِلَّا مَنۡ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَاُولٰٓئِكَ يَدۡخُلُوۡنَ الۡجَنَّةَ وَلَا يُظۡلَمُوۡنَ شَيۡـًٔا ۙ"

''پھران کے بعد نااہل اولاد ان کی جانشین ہوگئی جنہوں نے نماز کو ضائع کر دیا اور اپنی شہوت کی پیروی کی، جلد ہی وہ اپنی گمراہی کی سزا کا سامنا کریں گے۔سوائے اُن کے جنہوں نے توبہ کی، ایمان لائے اور عملِ صالح انجام دیتے رہے۔یہ جنت میں داخل ہوں گے اور ان پر کچھ ظلم نہ کیا جائے گا۔''(مریم:59اور60)

2۔ "وَاللّٰهُ يُرِيۡدُ اَنۡ يَّتُوۡبَ عَلَيۡكُمۡ ۖ وَيُرِيۡدُ الَّذِيۡنَ يَتَّبِعُوۡنَ الشَّهَوٰتِ اَنۡ تَمِيۡلُوۡا مَيۡلًا عَظِيۡمًا ۙ"(نسأ: 27)

''اور اللہ چاہتا ہے کہ تمہیں معاف کرے اور جو لوگ شہوات کی پیروی کرتے ہیں، وہ چاہتے ہیں کہ تم مکمل طور پر گمراہ ہو جاؤ''۔

3۔ "وَلُوۡطًا اِذۡ قَالَ لِقَوۡمِهٖۤ اِنَّكُمۡ لَتَاۡتُوۡنَ الۡفَاحِشَةَ ۖ مَا سَبَقَكُمۡ بِهَا مِنۡ اَحَدٍ مِّنَ الۡعٰلَمِيۡنَ ۞ اَئِنَّكُمۡ لَتَاۡتُوۡنَ الرِّجَالَ وَتَقۡطَعُوۡنَ السَّبِيۡلَ ۙ وَتَاۡتُوۡنَ فِىۡ نَادِيۡكُمُ الۡمُنۡكَرَ ؕ فَمَا كَانَ جَوَابَ قَوۡمِهٖۤ اِلَّاۤ اَنۡ قَالُوا ائۡتِنَا بِعَذَابِ اللّٰهِ اِنۡ كُنۡتَ مِنَ الصّٰدِقِيۡنَ ۞"(عنکبوت 28اور29)

''اور ہم نے لوط کو بھیجا، جب انہوں نے اپنی قوم سے کہا کہ تم ایسی بدکاری کے مرتکب ہوئے ہو جس کی تم سے پہلے کسی قوم میں مثال نہیں ملتی۔تم مردوں کے پاس جاتے ہو اور نسل انسانی کی بقا کا راستہ روکتے ہو اور اپنی محفلوں میں برے اعمال انجام دیتے ہو۔لیکن اُن کی قوم کے پاس اس کے سوا کوئی جواب نہ تھا کہ اگر تم سچے ہو تو اللہ کا عذاب لا کر دکھاؤ''۔

4۔ "وَلَمَّا جَآءَتۡ رُسُلُنَا لُوۡطًا سِىۡٓءَ بِهِمۡ وَضَاقَ بِهِمۡ ذَرۡعًا وَّقَالَ هٰذَا يَوۡمٌ عَصِيۡبٌ ﴿۷۷﴾ وَجَآءَهٗ قَوۡمُهٗ يُهۡرَعُوۡنَ اِلَيۡهِ ؕ وَمِنۡ قَبۡلُ كَانُوۡا يَعۡمَلُوۡنَ السَّيِّاٰتِ ؕ قَالَ يٰقَوۡمِ هٰٓؤُلَآءِ بَنَاتِىۡ هُنَّ اَطۡهَرُ لَـكُمۡ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَلَا تُخۡزُوۡنِ فِىۡ ضَيۡفِىۡ ؕ اَلَيۡسَ مِنۡكُمۡ رَجُلٌ رَّشِيۡدٌ ﴿۷۸﴾ قَالُوۡا لَقَدۡ عَلِمۡتَ مَا لَنَا فِىۡ بَنٰتِكَ مِنۡ حَقٍّ ۚ وَاِنَّكَ لَتَعۡلَمُ مَا نُرِيۡدُ ﴿۷۹﴾

قَالَ لَوۡ اَنَّ لِیۡ بِکُمۡ قُوَّۃً اَوۡ اٰوِیۡۤ اِلٰی رُکۡنٍ شَدِیۡدٍ﴿۸۰﴾
قَالُوۡا یٰلُوۡطُ اِنَّا رُسُلُ رَبِّکَ لَنۡ یَّصِلُوۡۤا اِلَیۡکَ فَاَسۡرِ بِاَہۡلِکَ بِقِطۡعٍ مِّنَ الَّیۡلِ وَلَا یَلۡتَفِتۡ مِنۡکُمۡ اَحَدٌ اِلَّا امۡرَاَتَکَ ؕ اِنَّہٗ مُصِیۡبُہَا مَاۤ اَصَابَہُمۡ ؕ اِنَّ مَوۡعِدَہُمُ الصُّبۡحُ ؕ اَلَیۡسَ الصُّبۡحُ بِقَرِیۡبٍ﴿۸۱﴾ فَلَمَّا جَآءَ اَمۡرُنَا جَعَلۡنَا عَالِیَہَا سَافِلَہَا وَاَمۡطَرۡنَا عَلَیۡہَا حِجَارَۃً مِّنۡ سِجِّیۡلٍ ۙ مَّنۡضُوۡدٍ﴿۸۲﴾ مُّسَوَّمَۃً عِنۡدَ رَبِّکَ ؕ وَمَا ہِیَ مِنَ الظّٰلِمِیۡنَ بِبَعِیۡدٍ﴿۸۳﴾"

''جب ہمارے بھیجے ہوئے (عذاب کے فرشتے) لوط کے پاس آئے تو یہ اُس پر شاق گزرا اور اس نے کہا: یہ تو بڑا سخت دن ہے (اس لئے کہ اُس نے انہیں پہچانا نہیں تھا اور اس بات سے خائف ہوا کہ کہیں اس کی قوم ان کے درپے نہ ہو جائے) اور اس کی قوم کے لوگ جو پہلے سے بدکاری کرتے تھے، اس کی طرف دوڑے چلے آئے، اُس نے ان سے کہا: یہ میری بیٹیاں ہیں اور تمہارے لئے زیادہ پاکیزہ ہیں (ان سے شادی کر لو اور بدکاری سے باز آؤ) اللہ سے ڈرو اور میرے مہمانوں کے معاملہ میں مجھے رُسوا نہ کرو، آیا تم میں ایک بھی سمجھدار انسان نہیں ہے۔ اُنہوں نے کہا: تم جانتے ہو کہ ہمیں تمہاری بیٹیوں سے کوئی دلچسپی نہیں ہے اور تم اچھی طرح جانتے ہو کہ ہم کیا چاہتے ہیں! لوط نے کہا: کاش مجھے تمہارے مقابلے میں کوئی قوت حاصل ہوتی یا میری کوئی مضبوط پناہ گاہ ہوتی۔ (ہود۔ 77 تا 83)

(عذاب کے فرشتوں نے) کہا: اے لوط! ہم تمہارے رب کے بھیجے ہوئے ہیں۔ ان کا ہاتھ تم تک نہ پہنچ سکے گا۔ تم اس بات کے دوران اپنے خاندان کو لے کر یہاں سے نکل جاؤ اور تم میں سے کوئی پیچھے مڑ کر نہ دیکھے لیکن تمہاری بیوی انہی کے ساتھ عذاب کا شکار ہوگی، ان کیلئے صبح کا وقت مقرر ہے۔ کیا صبح قریب نہیں ہے؟ اور جب ہمارا حکم آ گیا تو ہم نے شہر کو تہس نہس کر دیا اور ان پر پتھروں کی بارش برسائی، جن پر تمہارے رب کی ہاں نشانی لگی ہوئی تھی اور یہ عذاب دُوسرے مجرموں سے بھی دُور نہیں ہے۔''

5۔ "کَذَّبَتۡ قَوۡمُ لُوۡطٍۭ بِالنُّذُرِ﴿۳۳﴾ اِنَّاۤ اَرۡسَلۡنَا عَلَیۡہِمۡ حَاصِبًا اِلَّاۤ اٰلَ لُوۡطٍ ؕ نَجَّیۡنٰہُمۡ بِسَحَرٍ﴿۳۴﴾"

''قومِ لوط نے (اپنے رسول کی) تکذیب کی اور ہم نے ان پر ایسی تیز ہوا بھیجی، جو کنکریوں کو اُڑا لے جاتی تھی، ہم نے اس کے خاندان کے سوا سب کو ہلاک کر دیا اور انہیں صبح کے وقت نجات دی''۔ (قمر 33 اور 34)

6۔ "وَلُوۡطًا اِذۡ قَالَ لِقَوۡمِہٖۤ اَتَاۡتُوۡنَ الۡفَاحِشَۃَ مَا سَبَقَکُمۡ بِہَا مِنۡ اَحَدٍ مِّنَ الۡعٰلَمِیۡنَ﴿۸۰﴾ اِنَّکُمۡ

لَتَاْتُوْنَ الرِّجَالَ شَهْوَةً مِّنْ دُوْنِ النِّسَآءِ ؕ بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ مُّسْرِفُوْنَ○ مَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهٖۤ اِلَّاۤ اَنْ قَالُوْۤا اَخْرِجُوْهُمْ مِّنْ قَرْيَتِكُمْ ۚ اِنَّهُمْ اُنَاسٌ يَّتَطَهَّرُوْنَ○ فَاَنْجَيْنٰهُ وَاَهْلَهٗۤ اِلَّا امْرَاَتَهٗ ۖ كَانَتْ مِنَ الْغٰبِرِيْنَ○ وَاَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ مَّطَرًا ؕ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُجْرِمِيْنَ"۔

''اور ہم نے لوط کو بھیجا، جب اُس نے اپنی قوم سے کہا: کیا تم ایسا برا عمل انجام دیتے ہو جس کی تم سے پہلے کسی قوم میں مثال نہیں ملتی۔ کیا تم از رُوئے شہوت عورتوں کی بجائے مردوں کے پاس ہوتے ہو، تم گمراہی میں حد سے بہت گزر چکے ہو۔ لیکن ان کی قوم کا جواب صرف یہ تھا کہ ان کو اپنے شہر سے نکال دو، یہ پاکیزگی پسند لوگ ہیں۔ پس ہم نے اسے اور اس کے خاندان والوں کو نجات دی، سوائے اس کی بیوی کے، کہ وہ شہر میں رہ جانے والوں میں تھی۔ پھر ان پر پتھروں کی ایسی بارش برسائی (جس نے انہیں تباہ و برباد کر دیا) پس دیکھ لو، مجرموں کا کیا انجام ہوا؟'' (اعراف 80 تا 83)

تفسیر:۔

پہلی آیت میں بعض انبیاؑ کا ذکر کرنے کے بعد اور اُن کے کردار کی اعلیٰ ترین صفات کو بیان کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ یہ فرما رہا ہے کہ ان کے بعد ان کے فرزندانِ ناخلف ان کے جانشین ہو گئے جنہوں نے نماز کو ضائع کیا اور اپنی شہوات کی پیروی کی اور جلد ہی یہ اپنی گمراہی کی سزا کا سامنا کریں گے۔

"فَخَلَفَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ اَضَاعُوا الصَّلٰوةَ وَاتَّبَعُوا الشَّهَوٰتِ فَسَوْفَ يَلْقَوْنَ غَيًّا۔ (مریم: 59)

اس کے بعد بلا فاصلہ ایک استثنا بیان کیا جا رہا ہے کہ جو لوگ توبہ کریں، ایمان لے آئیں اور عملِ صالح کرتے رہیں، وہ جنت میں داخل ہوں گے اور ان پر ذرا سا بھی ظلم نہیں کیا جائے گا۔

اِلَّا مَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَاُولٰٓئِكَ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ وَلَا يُظْلَمُوْنَ شَيْـًٔا○" (مریم: 60)

یہ نکتہ قابل توجہ ہے کہ نماز ضائع کرنے کے بعد شہوات کی پیروی کا ذکر اور اس کے بعد گمراہی کا ذکر کیا گیا ہے۔ یہ ترتیب بہت نپی تلی ہے جو ایک طرف سے اس حقیقت کی طرف اشارہ کر رہی ہے کہ نماز شہوات کو توڑنے کا اہم ذریعہ ہے۔ یہ وہی بات ہے جسے سورۂ عنکبوت، آیت 45 میں اس طرح بیان کیا گیا ہے:

"اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْکَرِ "(عنکبوت:45)

''یقیناً نماز فحش کاموں ومنکرات سے باز رکھتی ہے''۔

دوسری طرف سے یہ آیت اس حقیقت کو بیان کررہی ہے کہ اتباعِ شہوات کا نتیجہ گمراہی ہوتا ہے۔اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

"ثُمَّ کَانَ عَاقِبَۃَ الَّذِیْنَ اَسَآءُوا السُّوْٓاٰی اَنْ کَذَّبُوْا بِاٰیٰتِ اللّٰہِ وَکَانُوْا بِھَا یَسْتَھْزِءُوْنَ○"(روم۔10)

''اس کے بعد برے کام کرنے والوں کا انجام یہ ہوا کہ انہوں نے اللہ کی آیات کی تکذیب کی اور ان کا مذاق اڑایا''۔

واضح سی بات ہے کہ یہاں شہوات کا لفظ اپنے وسیع معنوں میں استعمال ہوا ہے اور اس سے صرف جنسی شہوت مراد نہیں ہے بلکہ ہر قسم کی مادی اور نفسانی خواہشات مراد ہیں۔البتہ جو لوگ توبہ کرلیں اور اپنے ایمان کی تجدید کرلیں اور اعمالِ صالح انجام دیتے رہیں،وہ جنت میں جائیں گے۔نماز ضائع کرنے اور شہوات کی پیروی کرنے کے منفی اثرات ان کی زندگی سے مٹادیئے جائیں گے۔

دوسری آیت میں اللہ کی طرف لوٹنے اور شہوات کی پیروی کے درمیان ایک تقابل کیا گیا ہے۔اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

"وَاللّٰہُ یُرِیْدُ اَنْ یَّتُوْبَ عَلَیْکُمْ ۚ وَیُرِیْدُ الَّذِیْنَ یَتَّبِعُوْنَ الشَّھَوٰتِ اَنْ تَمِیْلُوْا مَیْلًا عَظِیْمًا○"(نسا:27)

''اور اللہ چاہتا ہے کہ تمہاری توبہ قبول کرے جبکہ شہوات کی پیروی کرنے والے چاہتے ہیں کہ تم مکمل طور پر گمراہ ہوجاؤ''۔

جو لوگ گمراہی میں مبتلا ہوتے ہیں،اُن کی خواہش ہوتی ہے کہ دوسروں کو بھی گمراہ کرکے انہیں اپنے جیسا بنالیں۔اس کے برعکس اللہ تعالیٰ یہ چاہتا ہے کہ جو لوگ شہوتوں میں ڈوبے ہوئے ہیں،وہ اپنی شہوت رانی کی روِش ترک کرکے اللہ کے حضور توبہ کریں اور اس کی معرفت واطاعت اور تقویٰ وپاکیزگی کے نور سے اپنے آپ کو منور کرکے سعادت اور خوش بختی کی منزل سے ہمکنار ہوجائیں۔

مفسرین کا کہنا ہے کہ اس آیت میں ''میلًا عظیمًا'' کے جو الفاظ استعمال ہوئے ہیں،ان سے مراد اللہ کی حدود کی حرمت کو پامال کرنا اور مختلف قسم کے گناہوں کا ارتکاب کرنا ہے۔

اس نکتہ کی طرف توجہ ضروری ہے کہ ممکن ہے کہ اس آیت میں شہوات کے عام معنی مراد ہوں۔چونکہ یہ آیت ان آیات کے بعد واقع ہے جن میں محرم عورتوں سے نکاح کی ممانعت کی گئی ہے،لہٰذا ممکن ہے کہ اس سے مراد جنسی شہوت ہو۔بہرحال اس آیت سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ شہوات کا راستہ اللہ کے راستے سے بالکل جدا ہے۔

تیسری، چوتھی، پانچویں اور چھٹی آیت میں حضرت لوط علیہ السلام کی قوم کی شہوت پرستی کا ذکر کیا گیا ہے۔ان میں سے ہر آیت میں ایک خاص نکتہ کو پیشِ نظر رکھا گیا جن کی طرف ہم اختصار کے ساتھ اشارہ کریں گے۔

تیسری آیت میں حضرت لوطؑ کی اپنی قوم کے ساتھ گفتگو کو بیان کیا گیا ہے۔اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

"وَلُوْطًا اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖٓ اِنَّكُمْ لَتَاْتُوْنَ الْفَاحِشَةَ ۡ مَا سَبَقَكُمْ بِهَا مِنْ اَحَدٍ مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ "۔(عنکبوت:28)

''اور ہم نے لوط کو بھیجا۔جب اس نے اپنی قوم سے کہا کہ تم ایسی بدکاری کے مرتکب ہوئے ہو جس کی تم سے پہلے کسی قوم میں مثال نہیں ملتی''۔

اس آیت میں ''الْفَاحِشَة'' کا لفظ استعمال ہوا ہے جس کا اطلاق ہر اُس کام پر ہوتا ہے جو بہت زیادہ برا ہو،اگرچہ عام طور پر یہ جنسی بدکاری کیلئے بولا جاتا ہے۔اس آیت سے یہ بات بھی واضح ہوجاتی ہے کہ ہم جنس پرستی کی برائی حضرت لوط کی قوم سے شروع ہوئی،اس سے قبل اس کا کوئی وجود نہ تھا۔

آگے چل کر آیت میں کہا جارہا ہے:''تم مردوں کی طرف جاتے ہو اور نسلِ انسانی کی بقا کی راہ منقطع کرتے ہو اور اپنی محفلوں میں بدکاری کرتے ہو''۔

اس آیت میں ہم جنس پرستی کی تحریم کی ایک اہم وجہ بھی واضح کردی گئی ہے اور وہ ہے انسانی نسل کا خاتمہ،اس لئے کہ اگر یہ عمل ایک عمومی صورت اختیار کرلے تو نسلِ انسانی کے منقطع ہوجانے کا خطرہ سنگین ہوجائے گا۔

بعض مفسرین نے کہا کہ ''تَقْطَعُوْنَ السَّبِيْلَ'' یعنی ''تم راستہ کاٹتے ہو'' کے یہ معنی ہیں کہ قومِ لوط کے بدکار افراد راستوں پر بیٹھ جاتے تھے اور ڈاکہ زنی کے علاوہ مسافروں کو اپنی ہوس کا نشانہ بھی بناتے تھے۔

'نادی' کا مصدر ندا ہے اور یہ عام محفل یا تفریح کی محفل کیلئے بولا جاتا ہے کیونکہ وہاں لوگ ایک دُوسرے کو ندا کرتے ہیں۔ اگرچہ قرآن مجید میں اس بات کی وضاحت نہیں کی گئی ہے کہ وہ اپنی محفلوں میں کسی نوعیت کی بدکاری کرتے تھے لیکن ظاہر سی بات ہے کہ وہ جو بھی بدکاری کرتے ہوں گے،وہ ان کی مشہور و معروف بدکاری سے ہی مناسبت رکھتی ہوگی۔

روایات میں ہے کہ وہ اپنی محفلوں میں ننگے ہوجایا کرتے تھے،ایک دوسرے کو انتہائی رکیک قسم کی گالیاں دیتے اور انتہائی فحش اور بیہودہ جملوں کا تبادلہ کرتے تھے۔اس کے علاوہ وہ ایسی حرکات بھی کرتے تھے جن کا ذکر کرنے کی عفتِ قلم اجازت نہیں دیتی۔

وہ اپنی اس شہوت پرستی میں اس قدر غرق تھے کہ اللہ تعالیٰ اور اخلاقی و انسانی اقدار کا مذاق اُڑاتے تھے۔لہٰذا جب حضرت لوطؑ نے انہیں ان کے برے عمل کے خطرناک نتائج سے ڈرایا تو انہوں نے جواب دیا ہے اگر تمہاری ان باتوں میں سچائی ہے تو اللہ کا عذاب لاکر دِکھاؤ۔

فَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهٖٓ اِلَّآ اَنْ قَالُوا ائْتِنَا بِعَذَابِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ"۔(عنکبوت: 29)

ان کے اس جواب سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اللہ کے عذاب کو بھی تضحیک وتمسخر کا نشانہ بناتے تھے۔

چوتھے پیراگراف کی آیات میں قومِ لوطؑ کی داستان کے ایک اور پہلو پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ان آیات میں اس موقعہ کا ذکر ہے۔جب عذاب کے فرشتے حسین وجمیل جوانوں کی صورت میں حضرت لوطؑ کے پاس آئے۔چونکہ حضرت لوطؑ انہیں نہیں جانتے تھے ،لہٰذا انہیں دیکھ کر پریشان ہوگئے اور کہنے لگے کہ یہ تو بڑا مشکل دن ہے۔انہیں اس بات کا خوف تھا کہ ان کی بدکار قوم کوئی ایسی حرکت نہ کر ڈالے جس سے مہمانوں کی عزت اور احترام پر حرف آئے۔

"وَلَمَّا جَآءَتْ رُسُلُنَا لُوْطًا سِيْٓءَ بِهِمْ وَضَاقَ بِهِمْ ذَرْعًا وَّقَالَ هٰذَا يَوْمٌ عَصِيْبٌ"۔(ھود: 77)

''دریں اثنا ان کی قوم کو ان مہمانوں کی آمد کی خبر ہوجاتی ہے۔وہ دوڑے ہوئے حضرت لوطؑ کے پاس آتے ہیں اور ان کے مہمانوں سے دست درازی کی کوشش کرتے ہیں۔قرآن شریف کے یہ الفاظ کہ:''اس سے قبل بھی یہ بدکاری کرتے تھے''،ممکن ہے اس بات کی طرف اشارہ کررہے ہوں کہ ان کے ہاں مہمانوں کے ساتھ بدکاری کرنا عام سی بات ہو۔

"وَجَآءَهٗ قَوْمُهٗ يُهْرَعُوْنَ اِلَيْهِ ؕ وَمِنْ قَبْلُ كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ السَّيِّاٰتِ ؕ "(ھود: 78)

حضرت لوطؑ بہت پریشان ہوئے اور اپنے مہمانوں کی عزت واحترام کی حفاظت کی خاطر انہوں نے عجیب ایثار کا مظاہرہ کیا کہ اپنی قوم سے کہا: یہ میری بیٹیاں ہیں جو تمہارے لئے زیادہ پاکیزہ ہیں (ان سے شادی کرلو) خدا سے ڈرو اور میرے مہمانوں کے سامنے رُسوا نہ کرو۔کیا تم میں کوئی سمجھدار انسان نہیں ہے؟

"قَالَ يٰقَوْمِ هٰٓؤُلَآءِ بَنَاتِيْ هُنَّ اَطْهَرُ لَكُمْ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَلَا تُخْزُوْنِ فِيْ ضَيْفِيْ ؕ اَلَيْسَ مِنْكُمْ رَجُلٌ رَّشِيْدٌ○"(ھود: 78)

لیکن وہ بے شرم نہایت بے حیائی اور ڈھٹائی سے حضرت لوطؑ کو جواب دیتے ہیں کہ تم خود جانتے ہو کہ ہمیں تمہاری بیٹیوں سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔تم خود اچھی طرح جانتے ہو کہ ہم کیا چاہتے ہیں!

"قَالُوْا لَقَدْ عَلِمْتَ مَا لَنَا فِيْ بَنٰتِكَ مِنْ حَقٍّ ۚ وَاِنَّكَ لَتَعْلَمُ مَا نُرِيْدُ○"(ھود: 79)

جب حضرت لوطؑ نے یہ صورت حال دیکھی تو بے بسی سے کہنے لگے: کاش! میرے پاس کوئی طاقت ہوتی، کاش میرے پاس کوئی مضبوط پناہ گاہ ہوتی۔

"قَالَ لَوۡ اَنَّ لِیۡ بِکُمۡ قُوَّۃً اَوۡ اٰوِیۡۤ اِلٰی رُکۡنٍ شَدِیۡدٍ○"(ھود:80)

بعد میں حضرت لوطؑ کو معلوم ہو گیا کہ ان کے مہمان اللہ کے فرشتے ہیں اور کوئی انہیں نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ فرشتوں نے حضرت لوطؑ کو خبر دے دی کہ صبح کے وقت تباہ کن عذاب اس قوم پر آئے گا اور ان پر آسمان سے پتھروں کی بارش برسے گی۔ فرشتوں نے حضرت لوطؑ سے یہ بھی کہا کہ وہ اپنی بیوی کے علاوہ خاندان کے دیگر افراد کو لے کر رات کو ہی وہاں سے چلے جائیں کیونکہ صبح اللہ کا عذاب آجائے گا۔

پانچویں پیراگراف کی آیات میں اس بدکار قوم کو سخت سزا کا ذکر کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ لوطؑ کی قوم نے اپنے رسول کی طرف سے دی جانے والی عذاب کی خبر کو بار بار جھٹلایا۔ ہم نے ان پر ایک تیز ہوا بھیجی جو سنگریزوں کو اُڑا لے جاتی تھی (اور ان سب کو ان کے نیچے دفن کر دیا اور حضرت لوطؑ کی بیوی کے علاوہ ان کے خاندان کے دیگر افراد کو اس عذاب سے بچا لیا۔

"کَذَّبَتۡ قَوۡمُ لُوۡطٍۭ بِالنُّذُرِ○ اِنَّاۤ اَرۡسَلۡنَا عَلَیۡہِمۡ حَاصِبًا اِلَّاۤ اٰلَ لُوۡطٍ ؕ نَجَّیۡنٰہُمۡ بِسَحَرٍ○"(قمر:33تا34)

البتہ یہ ان کے اُوپر آنے والے عذاب کا ایک حصہ تھا۔ قرآن شریف واضح طور پر فرما رہا ہے کہ پہلے ہمارے حکم سے ایک زلزلہ آیا جس نے ان کے شہر کو تہہ و بالا کر دیا، یعنی نیچے والے حصے کو اُوپر اور اُوپر والے حصے کو نیچے کر دیا۔

"فَلَمَّا جَآءَ اَمۡرُنَا جَعَلۡنَا عَالِیَہَا سَافِلَہَا "(ھود:82)

''اور ہم نے ان پر پتھروں کی بارش نازل کی۔

"وَّاَمۡطَرۡنَا عَلَیۡہَا حِجَارَۃً مِّنۡ سِجِّیۡلٍ ۙ مَّنۡضُوۡدٍ"۔(ھود۔82)

ممکن ہے اس سے مراد فضا میں معلق آسمانی پتھر ہوں جو اللہ کے حکم سے ان کے ویران شدہ شہر کے کھنڈر اور ان کے بے جان جسموں کے اُوپر آ گرے ہوں۔

ایک احتمال یہ بھی ہے کہ ''حاصب'' کے معنی سنگریزوں کا طوفان ہو۔ یہ طوفان بعض اوقات صحرا کے سنگریزوں کے ایک ٹیلے کو ایک جگہ سے اُٹھا کر آسمان پر لے جاتا ہے اور وہاں سے بارش کی مانند کسی اور سرزمین پر برسا دیتا ہے اور بعض اوقات پورے کا پورا قافلہ سنگریزوں کی بارش میں دفن ہو جاتا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کے ذریعے ایسے عذاب کے آنے کا مخصوص وقت تک حضرت لوطؑ کو بتا دیا تھا۔

ایک اور احتمال یہ ہے کہ پہلے ہولناک زلزلے نے ان کے شہر کو ویران کر دیا ہو اور اس کے بعد ان پر آسمان سے پتھروں کی بارش برسی ہو اور بعد ازاں سنگریزوں کا طوفان آیا ہو۔ یہ تین قسم کے عذاب اس بدکار قوم کے خلاف اللہ کے غضب کی شدت کو ظاہر کرتے ہیں۔

چھٹے پیرا گراف کی آیات میں قومِ لوطؑ کا سارا واقعہ بطورِ خلاصہ بیان کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ''یاد کرو جب لوطؑ نے اپنی قوم سے کہا کہ آیا تم ایسا برا عمل انجام دیتے ہو جس کی تم سے پہلے کسی قوم میں مثال نہیں ملتی؟''

"وَلُوْطًا اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖٓ اَتَاْتُوْنَ الْفَاحِشَةَ مَا سَبَقَكُمْ بِهَا مِنْ اَحَدٍ مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ○"(اعراف: 80)

تم از رُوئے شہوت عورتوں کی بجائے مردوں کی طرف جاتے ہو، تم بدکاری میں حد سے گزر جانے والی قوم ہو، اس لئے کہ تم نے اللہ کے قوانین کو چھوڑ کر گمراہی کا راستہ اختیار کر لیا ہے، ایسا راستہ جو نسلِ انسانی کی بربادی، مختلف اقسام کی بیماریوں اور دیگر معاشرتی برائیوں کی طرف لے جاتا ہے۔

اگرچہ ''ایڈز'' ہمارے دور کی ایک مہلک بیماری ہے لیکن ممکن ہے یہ بیماری اُس دَور میں بھی موجود ہو اور حضرت لوطؑ کی قوم کے بعض افراد بھی اس میں مبتلا ہوں اور اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان کے اجسام کو پتھروں اور سنگریزوں کے نیچے دفن کر دیا ہو تا کہ اس طرح دُوسروں کیلئے عبرت کا درس بنانے کے ساتھ ساتھ دُوسروں پر یہ احسان بھی ہو کہ یہ بیماری ان تک سرایت نہ کرے۔

بہر حال حضرت لوطؑ کی قوم اس قدر بے شرم تھی کہ نہ صرف یہ کہ حضرت لوطؑ کی بات نہیں مانتی تھی بلکہ انہوں نے یہ قرارداد منظور کر لی کہ لوطؑ اور انؑ کے خاندان کو ان کی پاکیزگی کی سزا کے طور پر شہر بدر کر دیا جائے۔

"وَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهٖٓ اِلَّآ اَنْ قَالُوْٓا اَخْرِجُوْهُمْ مِّنْ قَرْيَتِكُمْ ۚ اِنَّهُمْ اُنَاسٌ يَّتَطَهَّرُوْنَ"(اعراف: 82)

آگے چل کر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ہم نے لوطؑ اور اس کے خاندان کو نجات دی، سوائے اس کی بیوی کے جو شہر میں رہ جانے والوں میں تھی۔ پھر ہم نے ان پر ایک بارش (پتھروں کی) برسائی۔ دیکھو! ان مجرموں کا انجام کیسا ہوا!

"فَاَنْجَيْنٰهُ وَاَهْلَهٗٓ اِلَّا امْرَاَتَهٗ ۖ كَانَتْ مِنَ الْغٰبِرِيْنَ○ وَاَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ مَّطَرًا ۭ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُجْرِمِيْنَ"۔(اعراف: 83تا84)

یہ قوم کس قدر بگڑ چکی تھی کہ پاکیزگی اور عفت کو قابلِ سزا جرم سمجھنے لگی تھی اور لوطؑ اور ان کے خاندان کو شہر بدر کرنے کا فیصلہ کر چکی تھی۔ لیکن اللہ کے عذاب نے انہیں اپنی اس قرارداد پر عمل کرنے کی مہلت نہ دی۔

مذکورہ بالا آیات کا بڑا حصہ شہوت پرستی، عام اور خاص دونوں معنی میں، کے خطرناک نتائج کو بیان کرنے کے ساتھ ساتھ، اس ناشائستہ اور پست اخلاقی عمل کی سخت مذمت کر رہی ہیں جو بہت سی معاشرتی برائیوں اور گناہوں کا سبب ہے۔

شہوت پرستی احادیث کی روشنی میں

شہوت پرستی کے مسئلہ کو احادیث میں بھی خاص اہمیت دی گئی ہے۔ زیادہ تر احادیث میں شہوت پرستی کے خطرناک نتائج کے بارے میں خبردار کیا گیا ہے۔ جھنجھوڑ دینے والی احادیث ہر پڑھنے والے کو شدید متاثر کرتی ہیں اور اس بات کو واضح کر دیتی ہیں کہ شہوت پرستی، خواہ عام معنی میں ہو یا خاص معنی میں، انسان کو کمال اور سعادت کی منزل تک پہنچنے سے روکنے والا سب سے بڑا عامل ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ انسانی معاشرے میں گناہ اور دیگر برائیوں کے پھیلنے کا ایک بنیادی سبب بھی یہی شہوت پرستی ہے۔

1۔ جناب رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

"مَاتَحْتَ ظِلِّ السَّمَاءِ مِنْ اِلٰه يُعبدُ مِنْ دُوْنِ اللهِ اَعْظَمُ عِنْدَاللهِ مِنْ هَوًى مُتَّبِع"۔ (الدر المنثور، 261:6)

''آسمان کے نیچے اللہ کے سوا جتنے بھی معبودوں کی پرستش کی جاتی ہے، ان میں سے کوئی بھی اللہ کے ہاں ہوائے نفس سے زیادہ برا نہیں ہے جو انسان کو اپنے پیچھے چلاتی ہے''۔

اس حدیث سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ شہوت برائی کی طرف کھینچ کر لے جانے والے عوامل میں سب سے خطرناک ہے۔

2۔ حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

"اَلشَّهَوَاتُ سُمُوْمٌ قَاتِلاتٌ"۔ (غرر الحکم، حدیث 876)

''شہوات قتل کر دینے والی زہریں ہیں (جو انسان کے ایمان، مروّت اور اُس کے اعتبار کو قتل کر دیتی ہیں)''۔

3۔ ایک اور حدیث میں حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

"اَلشَّهَوَاتُ مَصَايِدُ الشَّيْطَانِ"۔ (غرر الحکم: 2121)

''شہوات شیطان کا جال ہیں (جن کے ذریعے وہ ہر عمر کے انسان کو شکار کر لیتا ہے)''۔

4۔ آپؑ ہی سے مروی ایک اور حدیث ہے:

"اِمْنَعْ نَفْسَكَ مِنَ الشَّهَوَاتِ تَسْلَمْ مِنَ الْآفَاتِ"۔ (غرر الحکم: 2440)

''اپنے آپ کو شہوات سے روکو، آفات سے محفوظ ہو جاؤ گے''۔

5۔ آپؑ ہی سے منقول ایک حدیث میں ہے:

"تَرْكُ الشَّهَوَاتِ اَفْضَلُ عِبَادَةٍ وَاَجْمَلُ عَادَةٍ"۔ (غرر الحکم: 4527)

''شہوات کو ترک کرنا افضل ترین عبادت اور خوبصورت ترین عادت ہے''۔

6۔ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

"مَنْ مَلَكَ نَفْسَهُ اِذَا غَضِبَ وَاِذَا رَغِبَ وَاِذَا رَهِبَ وَاِذَا اشْتَهٰى، حَرَّمَ اللهُ جَسَدَهُ عَلَى النَّارِ"۔ (بحار الانوار، 243:75)

''جو شخص غضب کی حالت میں اور رغبت اور خوف کی حالت میں اور شہوت کی حالت میں اپنے آپ پر قابو رکھے، اللہ اُس کے جسم کو آتشِ جہنم پر حرام کر دے گا''۔

7۔ ایک حدیث میں امیر المومنینؑ فرماتے ہیں:

"ضَادُّوا الشَّهْوَةَ مُضَادَّةَ الضِّدِّ ضِدَّهُ وَحَارِبُوْهَا مُحَارِبَةَ الْعَدُوِّ الْعَدُوَّ"۔

''اپنی شہوات کی اس طرح مخالفت کرو جیسے ایک مخالف اپنے مخالف کی کرتا ہے اور ان کے خلاف اس طرح جنگ کرو جیسے کوئی شخص اپنے دُشمن سے جنگ کرتا ہے''۔ (غرر الحکم، حدیث: 5934)

شہوت پرستی کے بارے میں امیر المومنین علیہ السلام کے ارشادات

احادیث اسلامی میں شہوت اور ہوائے نفسانی کے بارے میں ہلا دینے والی احادیث موجود ہیں۔

اس بحث میں صرف امیر المومنین علیہ السلام کے ارشادات کی طرف اشارہ کریں گے:

1۔ امیر المومنین علیہ السلام فرماتے ہیں:

"اُهْجُرُوا الشَّهَوَاتِ فَاِنَّهَا تَقُوْدُكُمْ اِلٰى رُكُوْبِ الذُّنُوْبِ وَالتَّهَجُّمِ عَلَى السَّيِّئَاتِ"۔ (غرر الحکم، حدیث: 2505)

''شہوات کو ترک کرو کیونکہ تمہیں ارتکابِ گناہ اور بدکاری کی طرف پیش قدمی کی طرف لے جاتی ہیں''۔

2۔ یہ مسئلہ بعض اوقات اس قدر شدت پیدا کر لیتا ہے کہ انسان کے دین کو مکمل طور پر برباد کر دیتا ہے۔

"طَاعَةُ الشَّهْوَةِ تُفْسِدُ الدِّيْنَ"۔ (غرر الحکم، حدیث: 5985)

''شہوات کی اطاعت انسان کے دین کو برباد کر دیتی ہے''۔

3۔ ایک اور حدیث میں آپؑ فرماتے ہیں:

"طَاعَةُ الْهَوىٰ تُفْسِدُ الْعَقْلَ"۔ (غرر الحکم، حدیث: 5983)

''ہوائے نفس کی اطاعت عقل کو تباہ کر دیتی ہے''۔

4۔ ایک اور مقام پر آپؑ فرماتے ہیں:

"اَلْجَاهِلُ عَبْدُ شَهْوَتِهٖ"۔ (غرر الحکم، حدیث: 449)

''جاہل شخص اپنی شہوت کا بندہ ہوتا ہے''۔

5۔ ایک اور جگہ آپؑ فرماتے ہیں:

"عَبْدُ الشَّهْوَةِ اَسِيْرٌ لَا يَنْفَكُّ اَسْرُهٗ"۔ (غرر الحکم، حدیث: 6300)

''شہوت کا بندہ ایسا قیدی ہے جس کی قید ختم نہیں ہوتی''۔

6۔ آپؑ کا فرمان ہے:

"حَلَاوَةُ الشَّهْوَةِ يُنَغِّصُهَا عَارُ الْفَضِيْحَةِ"۔ (غرر الحکم، حدیث: 4885)

''شہوات کی پیروی کی رُسوائی اس کی شیرینی کا خاتمہ کر دیتی ہے''۔

7۔ ایک اور حدیث میں آپؑ ارشاد فرماتے ہیں:

"شَبَبَ الشَّرِّ غَلَبَةُ الشَّهْوَةِ" (شرح غرر الحکم، حدیث: 5533)

''شہوت کا غلبہ ہی برائی کا سبب ہے''۔

8۔ ایک اور حدیث میں آپؑ کا فرمان ہے:

"كَيْفَ يَسْتَطِيْعُ الْهُدىٰ مَنْ يَغْلِبُهَا الْهَوىٰ"۔ (شرح غرر الحکم، حدیث: 7001)

''جو شخص ہوائے نفس سے مغلوب ہو، وہ ہدایت کیسے پا سکتا ہے!''

امیر المومنین علیہ السلام کے اس ارشاد کی رُو سے خواہشات نفسانی کی پیروی کرنے والے پر ہدایت وسعادت کے دروازے بند ہو جاتے ہیں۔

9۔ ایک اور حدیث میں آپؑ فرماتے ہیں:

"مَنْ زَادَتْ شَهْوَتُهٗ قَلَّتْ مُرُوَّتُهٗ"۔ (شرح غرر الحکم، حدیث: 8022)

''جس کی شہوت بڑھ جاتی ہے، اُس کی شخصیت گھٹ جاتی ہے''۔

10۔ ایک اور مقام پر آپؑ فرماتے ہیں:

"مَنْ اِشْقَاقَ اِلَى الْجَنَّةِ سَلَا عَنِ الشَّهَوَات"۔ (شرح غرر الحکم، حدیث: 8591)

''جو شخص جنت کا اشتیاق رکھتا ہے شہوت پرستی کو ترک کر دیتا ہے''۔

11۔ ایک اور حدیث میں آپؑ ارشاد فرماتے ہیں:

"لَا تَسْكُنُ الْحِكْمَةُ قَلْبًا مَعَ الشَّهْوَةِ"۔ (شرح غرر الحکم، حدیث: 10915)

''جس دل میں شہوت کا بسیرا ہو، حکمت وہاں ساکن نہیں ہو سکتی''۔

اس حدیث سے یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ حکمت اور شہوت ایک دل میں جمع نہیں ہو سکتے۔

شہوت پرستی کے نقصانات:۔

گزشتہ مباحث سے یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ شہوت کا مفہوم بہت وسیع ہے جس میں ہر قسم کی مادی خواہشات داخل ہو جاتی ہیں۔ اگرچہ اس کا زیادہ تر اطلاق جنسی شہوت پر ہوتا ہے لیکن یہ اس کے ساتھ مخصوص نہیں ہے۔ قرآن مجید میں یہ لفظ گیارہ مقامات پر عام مفہوم میں استعمال ہوا ہے اور صرف دو مقامات پر مخصوص معنی میں استعمال ہوا ہے۔

احادیثِ معصومینؑ اور علماؒ کی عبارات میں بھی یہ لفظ زیادہ تر عام معنوں میں استعمال ہوا ہے جس کا متضاد ''عفت'' یعنی گناہ آلودہ لذتوں سے اجتناب کرنا ہے۔

شہوت کا لفظ عام طور پر منفی معنوں میں استعمال ہوتا ہے لیکن بعض اوقات یہ مثبت معنی میں بھی دیتا ہے مثلاً قرآن مجید میں اہلِ بہشت سے اللہ تعالیٰ کے خطاب میں کہا گیا ہے:

"وَلَكُمْ فِيْهَا مَا تَشْتَهِيْٓ اَنْفُسُكُمْ ....."(فصلت: 31)

''جو کچھ تمہارا دل چاہے گا، وہ جنت میں تمہارے لئے میسر ہوگا''۔

ایک اور مقام پر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

"..... وَفِيْهَا مَا تَشْتَهِيْهِ الْاَنْفُسُ وَتَلَذُّ الْاَعْيُنُ ....."(زخرف: 71)

''جنت میں وہ سب کچھ موجود ہوگا جو تمہارا دل چاہے گا اور جس سے آنکھوں کو لذت ملے گی''۔

لیکن زیادہ تر یہ لفظ منفی مفہوم میں استعمال ہوتا ہے جہاں نفسانی خواہشات انسان کے تمام وجود پر مسلط ہو کر اُسے گناہ وانحراف کی راہ پر ڈال دیتی ہیں۔

یہ لفظ اور اس کے مشتقات قرآن مجید میں تیرہ مقامات پر استعمال ہوئے ہیں جن میں چھ جگہ مثبت اور سات جگہ منفی معنی مراد لئے گئے ہیں۔

بہرحال شہوت کے منفی معنی، خواہ عام ہوں یا خاص، انتہائی خطرناک نتائج کے حامل ہیں جن کا واضح طور پر مشاہدہ کیا جاسکتا ہے۔ جو روایات ہم نے بیان کی ہیں اور اس کے علاوہ ساری تاریخ کے بہت سے واقعات شہوت پرستی کے خطرناک نتائج کو روزِ روشن کی طرح واضح کر دیتے ہیں۔ ہم ان نقصانات کا ذیل میں اختصار کے ساتھ ذکر کرتے ہیں۔

گناہ سے آلودگی:۔

شہوت پرستی انسان کو انواع واقسام کے گناہوں کی طرف لے جاتی ہے۔ درحقیقت یہی تمام گناہوں کا بنیادی سبب ہے، اس لئے کہ حدیث نبویؐ کے مطابق 'حبک للشیٔ یُعمی ویُصم''، 'کسی بھی چیز کے بارے میں تمہاری محبت اندھا اور بہرہ کر دیتی ہے''۔ (بحارالانوار، 165:74)

شہوت انسان کو ایسے اندھے پن میں مبتلا کر دیتی ہے اُسے حقائق کے ادراک کی بصیرت سے محروم کر دیتا ہے، اچھائی اُسے برائی اور برائی اُسے اچھائی نظر آنے لگتی ہے۔

امیرالمومنین علیہ السلام کی بیان کردہ احادیث میں سے آٹھویں حدیث میں اسی حقیقت کو اس طرح بیان کیا گیا ہے: ''شہوتِ سرکش سے بچ کر رہو کیونکہ یہ مختلف قسم کے گناہوں کے ارتکاب کی طرف لے جاتی ہے''۔

اسی طرح دسویں حدیث میں ہم یہ دیکھ چکے ہیں کہ امیرالمومنین علیہ السلام نے فرمایا:

''شہوت پرستی انسان کی عقل کو برباد کر دیتی ہے''۔

جبکہ نویں حدیث میں ہے کہ آپؑ نے فرمایا: ''شہوت پرستی کی شدت انسان کے دین کو برباد کر دیتی ہے اور اسے بت پرستی کی حدوں تک لے جاتی ہے''۔

سورۂ حشر کی آیات 16 تا 17 کے ذیل میں مفسرین نے بنی اسرائیل کے ایک عابد کا واقعہ نقل کیا ہے۔ اس عابد کا نام برصیصا تھا۔ اگرچہ اس کا واقعہ مشہور ومعروف ہے لیکن یہاں اس کا ذکر بے جا نہ ہوگا۔

بنی اسرائیل کا یہ عابد برسوں کی عبادت وریاضت کے نتیجہ میں قربِ الٰہی کے اُس مقام پر پہنچ گیا تھا کہ اس کی دُعائیں قبول ہوتی تھیں اور اس کی دعا سے بیماروں کو شفا مل جاتی تھی۔ ایک روز ایک حسین عورت کو، جو بیمار تھی، اس کے پاس لایا گیا، اس کے رشتہ دار اُسے وہاں چھوڑ کر چلے گئے۔ شیطان نے اس عابد کی شہوت کو اس طرح بھڑکایا کہ وہ اپنے آپ پر قابو نہ رکھ سکا اور گناہ کا مرتکب ہو گیا۔ چونکہ اس بات کا خوف تھا کہ اس گناہ کے نتیجہ میں عورت حاملہ ہو جائے اور یہ اُس کی بدنامی اور رُسوائی کا سبب بن جائے، لہٰذا شیطان اور اُس کی ہوائے نفس نے اُسے یہ سمجھایا کہ وہ اس عورت کو قتل کر دے اور اس وسیع وعریض صحرا میں دفن کر دے۔

جب اس بیمار عورت کے بھائی اپنی بہن کی خبر لینے کیلئے اس عابد کی عبادت گاہ میں گئے تو اُس نے لاعلمی کا اظہار کیا۔ انہیں عابد پر شک گزرا اور انہوں نے تحقیق شروع کر دی۔ آخرکار انہیں اپنی بہن کی لاش مل گئی۔ یہ خبر سارے شہر میں پھیل گئی اور حکمران کو بھی

اس کی اطلاع ہوگئی۔ عابد کو سزائے موت دینے کا فیصلہ ہوا۔ جب اُسے تختہ دار پر لے جایا گیا تو شیطان اس کے سامنے مجسم ہوا اور اس سے کہنے لگا کہ میں نے ہی اپنے وسوسوں کے ذریعے تمہیں یہاں تک پہنچایا ہے اور اگر تم میری اطاعت کرو تو میں تمہیں بچا سکتا ہوں۔

عابد: بتاؤ کیا کروں؟

شیطان: مجھے ایک سجدہ کرو، یہی کافی ہے۔

عابد: رسی میرے گلے میں ڈالی جا چکی ہے، میں کیسے سجدہ کروں؟

شیطان: اشارے سے سجدہ کر دو، یہی کافی ہے۔

نادان عابد نے اشارے سے سجدہ کر دیا اور ساتھ ہی پھانسی کا پھندا تنگ ہوا اور اُس کی جان نکل گئی۔

عقل کی خرابی:۔

شہوت پرستی انسان کی عقل پر پردہ ڈال دیتی ہے۔ حق اُسے باطل اور باطل اُسے حق نظر آنے لگتا ہے۔

احادیث میں ہم یہ حدیث بیان کر چکے ہیں:

"طَاعَةُ الْهَوىٰ تُفْسِدُ الْعَقْلَ"۔ (شرح غرر الحکم، حدیث: 5983)

''ہوائے نفس کی پیروی عقل کو فاسد کر دیتی ہے''۔

یہی وجہ ہے کہ بہت سے شہوت پرست شہوت سے مغلوب ہو کر ایسے کام کر گزرتے ہیں کہ جب ان کی شہوت کا زور ٹوٹتا ہے تو سوائے ندامت اور پشیمانی کے ان کی پاس کچھ نہیں ہوتا۔

امیر المومنین علیہ السلام ایک حدیث میں فرماتے ہیں:

"إِذَا أَبْصَرَتِ الْعَيْنُ الشَّهْوَةَ عَمِيَ الْقَلْبُ عَنِ الْعَاقِبَةِ"۔

''جب آنکھ شہوت پر نظر کرتی ہے تو قلب انجام پر نظر نہیں کر سکتا''۔ (شرح غرر الحکم، حدیث: 4063)

معاشرتی حیثیت کا نقصان:۔

شہوت پرستی انسان کی معاشرتی حیثیت کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچاتی ہے، اس لئے کہ شہوانی لذتوں کی تکمیل کیلئے انسان معاشرتی اقدار کو بھی پامال کر جاتا ہے۔ ایک محترم اور صاحبِ حیثیت شخص جب شہوانی کشمکش اور اپنی عزت و احترام کے دوراہے پر کھڑا ہوتا ہے تو اُسے ان دونوں میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا ہوتا ہے۔ یہ دونوں جمع نہیں ہو سکتی ہیں۔

امیر المومنین علیہ السلام فرماتے ہیں:

"زِيَادَةُ الشَّهْوَةِ تُزْرِي بِالْمُرُوَّةِ"

''شہوت کی زیادتی انسان کی شخصیت کوعیب دار کر دیتی ہے''۔(شرح غرر الحکم،حدیث:5507)

نفس کی غلامی:۔

شہوت پرستی کا ایک اور نقصان نفس کی غلامی ہے۔شہوت پرست انسان اس طرح شہوت کا اسیر ہو جاتا ہے کہ اُس کیلئے ان زنجیروں کو توڑنا مشکل اور بعض اوقات ناممکن ہو جاتا ہے۔اس کا واضح ترین نمونہ اُن لوگوں کی صورت میں دیکھا جا سکتا ہے جو نشہ کی عادی ہو جاتے ہیں۔اگر شہوت پرستی جنون کی حد تک جنسی معاشقوں تک جا پہنچے تو ایسی صورت میں انسان کی غلامی بھی بدترین صورت اختیار کر لیتی ہے۔

امیر المومنین علیہ السلام کا یہ ارشاد ہم پڑھ چکے ہیں کہ شہوت کا غلام ایسا غلام ہے جس کی غلامی ختم نہیں ہوتی۔ایک اور حدیث میں امیر المومنینؑ فرماتے ہیں:

"وَ كَمْ مِنْ عَقْلٍ أَسِيْرٌ تَحْتَ هَوىً أَمِيرٌ"۔

''بہت سی عقلیں اس طرح شہوت کی اسیر ہیں جن پر ہوائے نفس کی حکمرانی ہے''۔(نہج البلاغہ،کلماتِ قصار:211)۔

حضرت علی علیہ السلام مزید فرماتے ہیں:

"اَلشَّهَوَاتُ تَسْتَرِقُ الْجُهُوْلَ"۔(نہج البلاغہ،حدیث:922)

''شہوات جہلاؑ کو اپنا غلام بنا لیتی ہیں''۔

رُسوائی اور بے عزتی:۔

رُسوائی اور بے عزتی بھی شہوت پرستی کے نقصانات میں سے ایک ہے۔تاریخ ایسے بہت سے واقعات کو اپنے صفحات میں محفوظ کئے ہوئے ہے جن میں ہم دیکھتے ہیں کہ معاشرے کی ممتاز شخصیات شہوت پرستی کی دلدل میں گر کر ذلیل ورُسوا ہو گئیں۔ادیبوں اور شاعروں کے ادب پاروں اور اشعار میں بھی شہوت پرستی اور رُسوائی کو لازم وملزوم قرار دیا گیا۔

سورۂ یوسف میں زوجہ عزیز مصر کا واقعہ بھی اس بات کا ثبوت ہے کہ شہوت پرستی کے نتیجہ میں عزیز مصر کی زوجہ کس طرح رُسوا ہو گئی۔

انّ الْهَوای هُوَ الهَوانِ قُلِبَ اِسْمُهُ فَاِذا هَوَيْتَ فَقَدْ لَقَيْتَ هَوانًا

''شہوت پرستی پستی ہی کا دوسرا نام ہے،اسی لئے ہر شہوت پرست ذلیل اور پست ہو جاتا ہے''۔

شہوت پرستی کے اسباب:۔

ہم دیگر مباحث میں یہ بات کہہ چکے ہیں کہ تمام اخلاقی برائیوں کا علاج کرنے سے قبل ان کے عوامل و اسباب کو معلوم کرنا ضروری ہے۔علمائے اخلاق نے اپنے مباحث میں اس بات کو بہت اہمیت دی ہے۔لہٰذا ضروری ہے کہ ہم بھی شہوت پرستی کے اسباب کا کھوج لگائیں۔

انسان کے اندرونی میلانات جنہیں شہوات کہا جاتا ہے،خصوصاً جنسی شہوت، بالکل طبیعی اور خداداد ہیں اور انسان کی ترقی و پیشرفت میں ان کا کردار بہت اہم ہے۔لہٰذا انہیں مکمل طور پر کچل دینا تو ممکن اور معقول نہیں ہے۔ضرورت اس امر کی ہے کہ انہیں حدِ اعتدال پر رکھا جائے کیونکہ اس طرح نہ صرف کوئی مسائل پیدا نہیں ہوں گے بلکہ یہ انسانی معاشرے کی ترقی میں اپنا مثبت کردار بھی ادا کرتے رہیں گے۔مسائل اُس وقت پیدا ہوتے ہیں جب شہوات سرکش ہو کر عقل کی حاکمیت کے دائرے سے خارج ہو جائیں۔

اب دیکھنا یہ ہے وہ کیا اسباب ہیں جن کی وجہ سے طبیعی میلانات یا شہوات عقل کی حاکمیت کے دائرے سے خارج ہو کر ایک تباہ کن طاقت کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ہم سمجھتے ہیں کہ مندرجہ ذیل اُمور اس سلسلہ میں اہم کردار ادا کرتے ہیں:

1۔ایمان کی کمزوری:۔

ایمان کی کمزوری اللہ کے احکام کو نظر انداز کرنے کا بنیادی سبب ہے۔اگر انسان اس بات پر ایمان رکھتا ہو کہ اللہ تعالیٰ حاضر و ناظر ہے اور قیامت کے دن قائم ہونے والی عدالت کو چشمِ بصیرت سے دیکھتا ہو تو وہ ہرگز شہوات کے ہاتھوں مغلوب ہو کر اللہ تعالیٰ کے احکام کو نظر انداز نہیں کرے گا اور اس کی حدود کو نہیں توڑے گا۔

یہی وہ برہانِ الٰہی ہے جس نے مشکل ترین حالات میں حضرت یوسفؑ کی رہنمائی کی اور انہیں فحشاء و گناہ سے آلودہ ہونے سے بچایا۔

اگر انسان کا ایمان کمزور ہو تو اللہ اور آخرت کی طرف انسان کی توجہ کم ہو جائے گی اور شہوت کی سرکشی کے حالات فراہم ہو جائیں گے۔ایسے حالات میں انسان کی حالت ایک ایسے چوپائے جیسی ہو جائے گی جو اپنے پنجرے سے نکل کر، اپنے آپ کو بے قید و بند دیکھ کر، اندھا دھند عمل کرتا ہے اور جو اُس کے راستے کی رُکاوٹ بننے کی کوشش کرے، اُسے چیر پھاڑ کر رکھ دیتا ہے۔اس سلسلہ میں حضرت علی علیہ السلام کا یہ فرمان ضرور مدِ نظر رہے:

"مَنِ اشْتَاقَ إِلَى الْجَنَّةِ سَلَا عَنِ الشَّهَوَاتِ"۔(نہج البلاغہ، کلماتِ قصار: 31)

''جو کوئی جنت میں جانے کا اشتیاق رکھتا ہو، وہ شہوات کو نظر انداز کر دیتا ہے''۔

بعض اوقات انسان شہوات سے لطف اندوز ہونے کیلئے ایمان کی حدود توڑ ڈالتا ہے تاکہ آزادی کے ساتھ اپنی شہوات کی

زیادہ سے زیادہ تسکین کر سکے۔اس بات کو قرآن مجید میں اس طرح بیان کیا گیا ہے:

"بَلْ يُرِيْدُ الْاِنْسَانُ لِيَفْجُرَ اَمَامَهٗ ۝ يَسْئَلُ اَيَّانَ يَوْمُ الْقِيٰمَةِ ۝" (قیامت:5و6)

''انسان یہ چاہتا ہے کہ آزاد ہو (اور قیامت کے خوف سے بے پروا ہو کر) عمر بھر گناہ کرے، لہٰذا وہ سوال کرتا ہے کہ قیامت کب ہوگی؟ (ایسا سوال جو اُس کے انکار یا شک کو ظاہر کرتا ہے)''۔

2۔معاشرتی حیثیت اور احترام کو نظر انداز کرنا:۔

جب انسان اپنی معاشرتی حیثیت کو نظر انداز کر دے اور اس کی اپنی نظر میں اُس کی شخصیت کا احترام کمزور ہو جائے تو وہ شہوت پرستی سے آلودہ ہو جاتا ہے۔اس کے برعکس اپنی معاشرتی حیثیت کا خیال انسان کو شہوات کے مقابلہ میں مضبوط بنا دیتا ہے، خواہ وہ اللہ پر ایمان رکھتا ہو۔

یہی وجہ ہے کہ لادینی معاشروں میں بھی معزز لوگ، شہوت کی اندھا دھند پیروی نہیں کرتے اور بے قید و شرط جنسی لذت کے حصول کی کوشش نہیں کرتے۔درحقیقت یہ اُن لوگوں کی عزتِ نفس ہی ہے جو انہیں شہوات کی سرکشی کے خلاف بناتی ہے۔البتہ پست اور گھٹیا افراد ہر قسم کے پست اور گھٹیا کام کرتے رہتے ہیں۔

3۔غفلت اور بے خبری:۔

شہوت پرستی کے اثرات سے غفلت اور بے خبری بھی شہوت پرستی کی دلدل میں گر جانے کا ایک اہم سبب ہے۔ہر قسم کی شہوت پرستی، خواہ وہ کھانے کی شہوت ہو یا جنسی شہوت، مختلف قسم کی بیماریوں کا سبب بنتی ہے اور انسان کی صحت پر برے اثرات ڈال کر انسان کی عمر کو کم کر دیتی ہے۔بعض اوقات اس کے انسان کی خاندانی زندگی پر بھی منفی اثرات پڑتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ غیر مذہبی معاشروں میں بھی ان منفی اثرات سے بچنے کیلئے بہت سے لوگ شہوات کی تسکین میں اعتدال کی راہ پر چلتے ہیں۔

4۔بری صحبت اور ناپاک ماحول:۔

بری صحبت، بدچلن دوست، ناپاک ماحول اور ذرائع ابلاغ کی گمراہ کن روِش بھی شہوت پرستی کی طرف دھکیلنے والے اسباب میں سے ہیں۔عام طور پر ایسا ہوتا ہے کہ برے دوست اپنے دوستوں کو گناہ کی طرف مائل کر دیتے ہیں اور پھر انہیں گناہ کی دلدل میں غرق کر دیتے ہیں۔برے دوست انسان کو گناہ کے مختلف طریقے اور راستے سکھا دیتے ہیں۔لہٰذا یہ بات بلا جھجک کہی جا سکتی ہے کہ برے اور گناہگار افراد کی دوستی شہوت پرستی اور گناہ کی طرف مائل کرنے کا رائج ترین ذریعہ ہیں۔

ذرائع ابلاغ کی غلط روِش بھی شہوت پرستی سے آلودہ ہونے کا ایک اہم سبب ہے۔اس سلسلہ میں ہم نے اپنی

کتاب ''کلیاتِ مسائلِ اخلاقی'' کی پہلی جلد میں ''زمینہ ساز مفاسدِ اخلاقی'' کے عنوان سے تفصیل سے گفتگو کی ہے اور وضاحت سے بیان کیا ہے۔ برائی سے آلودہ صحبت نہ صرف یہ کہ انسان کو گناہ اور اخلاقی برائیوں سے آلودہ کر دیتی ہے بلکہ بسا اوقات کفر کی حد تک بھی لے جاتی ہے۔ قرآن مجید اس بارے میں فرماتا ہے۔

"وَيَوْمَ يَعَضُّ الظَّالِمُ عَلٰى يَدَيْهِ يَقُوْلُ يٰلَيْتَنِي اتَّخَذْتُ مَعَ الرَّسُوْلِ سَبِيْلًا○ يٰوَيْلَتٰى لَيْتَنِيْ لَمْ اَتَّخِذْ فُلَانًا خَلِيْلًا○ لَقَدْ اَضَلَّنِيْ عَنِ الذِّكْرِ بَعْدَ اِذْ جَآءَنِيْ ؕ وَكَانَ الشَّيْطٰنُ لِلْاِنْسَانِ خَذُوْلًا○" (الفرقان: 27تا29)

''اور اس روز (قیامت کے دن) ظالم حسرت زدہ ہو کر اپنے ہی دانتوں سے اپنا ہاتھ کاٹے گا اور کہے گا: کاش! میں نے رسول اللہ ﷺ کی راہ کو اپنایا ہوتا، کاش میں نے فلاں کو اپنا دوست نہ بنایا ہوتا، اُس نے نصیحت کے آجانے کے بعد مجھے گمراہ کیا اور شیطان تو انسان کو بے یار و مددگار چھوڑ دینے والا ہے''۔

براماحول، بگڑے ہوئے اخلاق والے والدین بھی شہوت پرستی اور گناہ کی طرف مائل کرنے والے اسباب میں سے ہیں جن کی منفی تاثیر کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔ لہٰذا جب اچھے افراد ایسے ماحول میں داخل ہوتے ہیں تو ان کا دل اور ایمان بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا اور وہ گناہ اور شہوت پرستی سے آلودہ ہو جاتے ہیں۔

چونکہ ''کلیاتِ مسائلِ اخلاق'' میں ہم اس موضوع پر تفصیل سے بات کر چکے ہیں، لہٰذا یہاں اتنی ہی گفتگو پر اکتفا کرتے ہیں۔

شہوت پرستی کا علاج

تمام اخلاقی برائیوں کا طریقہ علاج اُصولی طور پر تقریباً ایک جیسا ہے جس کو ہم علمی طریقے اور عملی طریقے میں تقسیم کر سکتے ہیں:

الف: علمی طریقہ:۔

علمی طریقے سے مراد یہ ہے کہ انسان شہوت پرستی کے اثرات اور نتائج کے بارے میں غور کرے اور دیکھے کہ شہوات کی اندھا دھند پیروی کس طرح انسان کو ذِلت، بدبختی، معاشرتی حیثیت کے کمزور ہو جانے اور اللہ سے دُوری جیسے نقصانات سے دوچار کر دیتی ہے۔ جن لوگوں نے اپنی زندگی شہوت پرستی کی راہ میں گزاری ہے، اُن کا انجام اس حقیقت کی بین دلیل ہے۔

لہٰذا ان اُمور میں غور و فکر، اولیاؑ اللہ اور اُن کے سچے پیروکاروں کے حالاتِ زندگی کا مطالعہ انسان کی شہوت پرستی کی راہ پر

چلنے سے باز رکھتا ہے، اس لئے کہ یہ وہ لوگ تھے جو اپنی شہوات کے خلاف جہاد کر کے دُنیا میں بھی اور اللہ کے ہاں بھی بلند مقامات تک پہنچے ہیں۔

اس کے علاوہ عقل کی بنیادوں کو مستحکم کرنا بھی انسان کو اپنی شہوت پر مسلط ہونے میں مدد دیتا ہے۔ اس بارے میں امیر المومنین علیہ السلام فرماتے ہیں:

"مَنْ كَمُلَ عَقْلُهُ اِسْتَهَانَ بِالشَّهَوَاتِ"۔ (شرح فارسی غرر الحکم، حدیث: 8226)

''جس کی عقل کامل ہوجاتی ہے، وہ شہوات کو حقیر جاننے لگتا ہے''۔

ایک اور مقام پر آپؑ فرماتے ہیں:

"مَنْ غَلَبَ شَهْوَتَهُ ظَهَرَ عَقْلُهُ"۔ (شرح فارسی غرر الحکم، حدیث: 7953)

''جو اپنی شہوت پر غالب ہوجائے، اُس کی عقل غالب ہوجاتی ہے''۔

اسی طرح ایک اور مقام پر آپؑ نے فرمایا:

"كُلَّمَا قَوِيَتِ الْحِكْمَةُ ضَعُفَتِ الشَّهْوَةُ"۔ (شرح فارسی غرر الحکم، حدیث: 7205)

''جیسے جیسے حکمت مضبوط ہوتی ہے، شہوت ضعیف ہوتی جاتی ہے''۔

امیر المومنین علیہ السلام نے ایک اور پُرمعنی پیغام میں اس حقیقت کو اس طرح بیان فرمایا ہے:

"اُذْكُرْ مَعَ كُلِّ لَذَّةٍ زَوَالَهَا وَمَعَ كُلِّ نِعْمَةٍ اِنْتِقَالَهَا وَمَعَ كُلِّ بَلِيَّةٍ كَشْفَهَا، فَاِنَّ ذٰلِكَ اَبْقٰى لِلنِّعْمَةِ، وَاَنْفٰى لِلشَّهْوَةِ، وَاَذْهَبُ لِلْبَطَرِ، وَاَقْرَبُ اِلَى الْفَرَجِ وَاَجْدَرُ بِكَشْفِ الْغُمَّةِ وَدَرْكِ الْمَامُوْلِ"۔ (میزان الحکمہ، 4:3483)

''ہر (حرام) لذت کے ساتھ اس کے زوال کو بھی یاد کرو اور ہر نعمت کے ساتھ اُس بات کو بھی یاد رکھو کہ ایک روز وہ تم سے سلب ہوجائے گی اور ہر مصیبت کے وقت یہ یاد رکھو کہ اس نے برطرف ہوجانا ہے۔ ایسا کرنے سے نعمتوں میں پائیداری پیدا ہوتی ہے، شہوات کی نفی ہوتی ہے، خود پرستی کا نشہ اُتر جاتا ہے، آسانیاں نزدیک ہو جاتی ہیں اور غم و نداوہ برطرف ہوجاتے ہیں''۔

اس طرح نتائج کے بارے میں غور و فکر کرنا، انسان کو شہوات پرستی سے باز رکھنے میں گہرا اثر رکھتا ہے۔ اللہ کے بھیجے ہوئے تمام پیشواؤں کی کوشش یہی تھی کہ لوگوں کو شہوات کے منحوس نتائج سے آگاہ کریں اور انہیں شہوت کی قید سے آزاد کروائیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی یہ حدیث بھی اس بات کو بیان کرتی ہے:

"خَمْسٌ اِنْ اَدْرَكْتُمُوْهُنَّ فَتَعوذُّوْا بِاللهِ مِنْهُنَّ: لَمْ تَظْهَرِ الْفَاحِشَةُ فِيْ قَوْمٍ قَطُّ حَتّٰى يُعْلِنُوْهَا، اِلَّاظَهَرَ فِيْهِمُ الطَّاعُوْنُ وَالاوَجَاعُ الَّتِيْ لَمْ تَكُنْ فِيْ اَسْلَافِهِمْ اَلَّذِيْنَ مَضَوْاوَلَمْ يَنْقُصُواالْمِكْيَالَ وَالْمِيْزَانَ اِلَّااَخِذُوابِالسِّنِيْنَ وَشِدَّةِ الْمَؤُنَةِ وَجَوْرِ السُّلْطَانِ، وَلَمْ يَمْنَعُوْاالزَّكَاةَ اِلَّامُنِعُوالْمَطَرَمِنَ السَّمَاءِ، وَلَوْلَا الْبَهَائِمُ لَمْ يُمْطَرُوقاوَلَمْ يَنْقُضُوْا عَهْدَاللهِ وَعَهْدَرَسُوْلِهٖ اِلَّاسَلَّطَ اللهُ عَلَيْهِمْ عَدُوَّهُمْ وَاَخَذُوْابَعْضَ مَافِيْ اَيْدِيْهِمْ، وَلَمْ يَحْكُمُوْابِغَيْرِ مَااَنْزَلَ اللهُ اِلَّاجَعَلَ اللهُ عَزَّوَجَلَّ بِأْسَهُمْ بَيْنَهُمْ"۔(اصولِ کافی، 373:2)

"پانچ چیزیں ایسی ہیں کہ اگر تم اُن کو دیکھو تو اُن کے شر سے بچنے کیلئے اللہ کے ہاں پناہ طلب کرو: جب بھی کسی قوم میں برے اعمال اعلانیہ ظاہر ہونے لگیں تو وہ طاعون اور ایسی بیماریوں میں مبتلا ہوجاتے ہیں جو اُن سے پہلے کسی قوم میں نہ تھیں۔ جب بھی کوئی قوم ناپ تول میں کمی کی مرتکب ہوتی ہے تو وہ قحط، بدحالی اور ظالم حکمرانوں کی حکومت میں مبتلا ہوجاتی ہے۔ جب کوئی قوم زکوٰۃ کی ادائیگی کو روک لیتی ہے تو اُسے بارش سے محروم کر دیا جاتا ہے اور اگر بارش ہوتی ہے تو جانوروں کی خاطر ہوتی ہے اور جب بھی کوئی قوم اللہ اور اس کے رسول سے کئے ہوئے عہد و پیمان کو توڑتی ہے تو اللہ اُن کے دُشمن کو ان پر مسلط کر دیتا ہے اور جو کچھ ان کے پاس ہوتا ہے، اُس کا ایک حصہ وہ دشمن لے جاتا ہے اور جب بھی کوئی قوم اللہ کے نازل کردہ احکام کے بغیر فیصلے کرتی ہے تو اللہ باہمی اختلافات کے ذریعے ان کو سختی میں مبتلا کر دیتا ہے"۔

یقیناً ان اُمور میں غور و فکر کرنا انسان کو گناہ اور غیر اخلاقی اعمال کی انجام دہی سے مستقل طور پر عارضی طور پر باز رکھتا ہے۔

ب۔ عملی طریقہ:۔

شہوت پرستی کا عملی علاج کرنے کے کئی طریقے ہیں:

1۔ شہوت کے طوفان سے محفوظ رہنے کا بہترین عملی راستہ یہ ہے کہ جائز طریقوں سے جنسی شہوت کی صحیح تسکین کی جائے، اس لئے کہ اگر انسان کے اندر پائے جانے والے فطری اور طبیعی میلانات کی صحیح طریقے سے تسکین ہوتی رہے تو وہ تخریبی اور تباہ کن صورت اختیار نہیں کرتی ہیں۔ بالفاظِ دیگر ان فطری تقاضوں کو کچلنے کی بجائے ان سے صحیح اور مثبت طریقے سے استفادہ کرنا چاہئے۔ بصورتِ دیگر یہ فطری خواہشات ایک تباہ کن سیلاب میں تبدیل ہوکر نسلوں اور کھیتیوں کو تباہ کر دیتی ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ اسلام نے نہ صرف یہ کہ صحت مند تفریحات سے منع نہیں کیا بلکہ ان کی حوصلہ افزائی بھی کی ہے۔ حضرت امام

محمد تقی علیہ السلام سے منقول خطبہ نکاح میں ہے:

"اَمَّابَعْدُ فَقَدْكَانَ مِنْ فَضْلِ اللهِ عَلَى الْاَنَامِ اَنْ اَغْنَاهُمْ بِالْحَلَالِ عَنِ الْحَرَامِ"۔(بحار الانوار، 76:50)

''بندوں پر اللہ کا ایک فضل یہ بھی ہے کہ اُس نے حلال کی بدولت انہیں حرام سے بے نیاز کر دیا''۔

ایک اور حدیث میں یہ نکتہ اس پیرائے میں بیان ہوا ہے:

"لِلْمُؤْمِنِ ثَلاثُ سَاعَاتٍ، فَسَاعَةٌ يُنَاجِيْ فِيْهَا رَبَّهُ، وَسَاعَةٌ يَرُمُّ مَعَاشَهُ، وَسَاعَةٌ يُخَلِّيْ بَيْنَ نَفْسِهِ وَبَيْنَ لَذَّتِهَا فِيْمَا يَحِلُّ وَيَجْمُلُ"۔

''مؤمن اپنے اوقات کو تین حصوں میں تقسیم کرتا ہے: ایک حصہ وہ جس میں وہ اپنے رب سے راز و نیاز کرتا ہے، ایک حصہ وہ جس میں وہ اپنی معاش کی اصلاح کرتا ہے اور ایک حصہ وہ جس میں وہ حلال لذتوں سے لطف اندوز ہوتا ہے''۔(نہج البلاغہ، کلماتِ قصار:390)

2۔ شہوت پرستی سے نجات کا ایک راستہ یہ ہے کہ انسان اپنی زندگی میں نظم وضبط کی پابندی کرے۔ جب انسان کا نظام الاوقات (time table) مکمل ہوگا، اُس کی زندگی میں شہوت پرستی سے آلودہ ہونے کی گنجائش باقی نہیں رہے گی۔

3۔ شہوانی آلودگی کے اسباب کو برطرف کرنا بھی شہوت پرستی کا علاج کرنے کا ایک مؤثر ذریعہ ہے کیونکہ اسباب وعوامل کی موجودگی میں انسان کے آلودہ ہوجانے کے امکانات بھی بڑھ جاتے ہیں۔ اگر انسان کو شہوانی ماحول میسر ہو اور شہوت پرستی کے وسائل مہیا ہوں تو ایسی صورت میں نوجوانوں اور کمزور ایمان ومعرفت رکھنے والوں کا محفوظ رہنا دُشوار ہوجائے گا۔

4۔ معاشرے کے افراد کی رُوحانی اور معنوی شخصیت کی تعمیر یا بالفاظِ دیگر کردار سازی بھی شہوت پرستی کی آلودگی سے محفوظ رکھنے میں مؤثر کردار ادا کرتی ہے۔ جب انسان کو اپنے وجود کی قدر و قیمت کا اندازہ ہوجائے، اسے یہ معلوم ہوجائے کہ وہ اشرف المخلوقات ہے اور اُسے یہ بھی احساس ہوجائے کہ اللہ نے اُسے زمین میں خلافت کا مقام دے رکھا ہے تو پھر وہ آسانی سے اپنے آپ کو شہوت کے ہاتھ نہیں بیچتا۔

امیر المومنین علیہ السلام فرماتے ہیں:

"مَنْ كَرُمَتْ عَلَيْهِ هَانَتْ عَلَيْهِ شَهْوَتُهُ"۔(بحار الانوار، 71:78)

''جسے اپنی عزت کا احساس ہوجائے، اُس کی شہوت اُس کی نظر میں حقیر ہوجاتی ہے''۔

ایک اور حدیث میں آپؑ فرماتے ہیں:

"مَنْ عَرَفَ شَرَفَ مَعْنَاهُ صَانَهُ عَنْ دَنَائَةِ شَهْوَتِهِ"۔(غرر الحکم: 9049)

''جوشخص اپنی عزت اور شرافت کو پہچان لے،تو یہ بات اُسے اُس کی شہوت کی پستی سے بچالیتی ہے''۔

آخری نکتہ جس کا ذکر ضروری معلوم ہوتا ہے، یہ ہے کہ صرف شہوات کا مقابلہ کرنے کیلئے ہی نہیں بلکہ تمام اخلاقی برائیوں کا مقابلہ کرنے کیلئے ضروری ہے کہ عملی جہاد کو اہمیت دی جائے۔اس کے معنی یہ ہیں کہ جس قدر انسان بری صفات کا مقابلہ کرے اور ان کی مخالف سمت میں حرکت کرے،اُسی قدر بری صفات کمزور ہوتی جاتی ہیں اور اُن کی مخالف اچھی صفات طاقتور ہوتی چلی جاتی ہیں۔مثلاً اگر بخیل انسان اپنے اُوپر ہر جبر کر کے تھوڑی تھوڑی سخاوت کرنا شروع کر دے تو آہستہ آہستہ سخاوت کی عادت اس میں پیدا ہونا شروع ہوجائے گی۔

اگر شہوت پرست افراد بھی شہوت کی طغیانی کے مقابلے میں ہمت سے کام لیں تو شہوت کی طغیانی کا زور آہستہ آہستہ ٹوٹ جائے گا اور عفت کی روح اس کے اندر بیدار ہوتی چلی جائے گی۔

امیر المومنین علیہ السلام نے بھی اپنے ایک ارشاد میں اس نکتہ کو اس طرح بیان فرمایا ہے:

"قَاوِمِ الشَّهْوَةَ بِالْقَمْعِ لَهَا تَظْفُرْ" (شرح فارسی غرر الحکم، 514:4)

''شہوات کا مقابلہ ثابت قدمی سے کرو، کامیاب ہوجاؤ گے''۔

شکم پرستی اور جنسی شہوت:۔

مرحوم فیض کاشانی نے ''المحجۃ البیضا'' میں، محقق نراقی نے ''معراج السعادۃ'' اور مرحوم شبر نے ''الاخلاق'' میں شکم پرستی اور جنسی شہوت پر مستقل بحث کی ہے۔

مرحوم فیض کاشانی ''المحجۃ البیضا'' میں فرماتے ہیں: ''انسان کی ہلاکت کا سب سے اہم سبب شکم کی شہوت ہے جس نے آدم وحوا کو جنت سے دُنیا میں دھکیل دیا۔درحقیقت شہوتِ شکم ہر قسم کی شہوت اور تمام آفات اور آلام کا سرچشمہ ہے۔جنسی شہوت اسی کے نتیجہ میں پیدا ہوجاتی ہے اور یہ دونوں مل کر مال و دولت جمع کرنے اور مقام و مرتبہ کے حصول کی خواہش کو تقویت دیتی ہیں۔ان سب کے نتیجہ میں اختلافات، جھگڑے اور کشمکش کا سب بنتی ہیں۔ریاکاری، خودنمائی، کثرتِ مال و مقام اور احساسِ برتری جیسی برائیاں بھی یہیں سے جنم لیتی ہیں۔حسد، کینہ، عداوت اور دُشمنی بھی اسی سے جنم لیتی ہیں۔جب یہ سب چیزیں انسان میں پیدا ہوجاتی ہیں تو ہر قسم کے ظلم، فساد، گناہ و منکرات کی راہیں کھل جاتی ہیں۔

اب جبکہ صورت حال ایسی ہے تو ضروری ہے کہ ان آفات کو کھول کر بیان کیا جائے اور ان کا مقابلہ کرنے کی راہیں واضح کی جائیں''۔(المحجۃ البیضا، 145:5)

اس سے بھی زیادہ خطرناک بات یہ ہے کہ شکم پرستی اور شہوت پرستی کی وجہ سے آخر کار انسان اپنے دین و ایمان سے بھی ہاتھ دھو بیٹھتا ہے۔

مندرجہ ذیل قرآنی آیت میں اللہ تعالیٰ نے اسی بات کو اس طرح سے بیان فرمایا ہے:

"وَاٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلْتُ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ وَلَا تَكُوْنُوْٓا اَوَّلَ كَافِرٍ بِهٖ ۪ وَلَا تَشْتَرُوْا بِاٰيٰتِيْ ثَمَنًا قَلِيْلًا ۫ وَّاِيَّايَ فَاتَّقُوْنِ"۔ (بقرہ: 41)

''اور ایمان لاؤ اُس کتاب پر جو میں نے نازل کی ہے، جو اس کتاب کی تصدیق کرتی ہے جو تمہارے پاس موجود ہے اور اس کا انکار کرنے میں پہل کرنے والوں میں سے نہ بنو اور میری آیات کو کم قیمت پر نہ بیچو اور مجھ سے ڈرتے رہو''۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے یہودیوں کے علمأ کی مذمت کی ہے۔ روایات میں ہے کہ یہودیوں کے بعض بزرگ علمأ کی اپنی قوم کے امرأ میں بہت عزت تھی اور وہ ان کے احترام میں پرتکلف دعوتیں کرتے۔ یہ علمأ ان لوگوں کو خوش رکھنے کیلئے آیاتِ الٰہی میں تحریف کر دیتے تھے۔ اس طرح وہ آیاتِ الٰہی کو دُنیوی مفادات کی حقیر قیمت پر فروخت کر دیتے تھے۔ (اس طرح انہوں نے اُس رسول کی رسالت کا انکار کر دیا جس کی بشارت تورات میں دی گئی تھی اور بنی اسرائیل سالہا سال سے ان کا انتظار کر رہے تھے)۔

احادیث میں بھی شہوت کی ان دو اقسام پر مفصل بحث کی گئی ہے، چند احادیث ذیل میں بیان کی جاتی ہیں:

1۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

"ثَلَاثٌ اَخَافُهُنَّ بَعْدِيْ عَلٰى اُمَّتِيْ اَلضَّلَالَةُ بَعْدَ الْمَعْرِفَةِ وَمُضِلَّاتُ الْفِتَنِ وَشَهْوَةُ الْبَطْنِ وَالْفَرْجِ"۔ (اصولِ کافی، 79:2)

''تین چیزیں ایسی ہیں جن سے میں اپنے بعد اپنی اُمت کے بارے میں ڈرتا ہوں: حق کو پہچان لینے کے بعد گمراہ ہو جانا، گمراہ کر دینے والے فتنے اور شکم اور شرم گاہ کی شہوت''۔

یہاں معرفتِ حق کے بعد گمراہی کا مطلب یہ ہے کہ انسان حق کو پہچان لینے کے بعد گمراہ کرنے والی طاقتوں کے وسوسوں اور شکوک وشبہات کی وجہ سے گمراہ ہو جائے۔ یہ مسئلہ ہر دَور میں موجود رہا ہے اور ہمارے دَور میں خاص طور پر موجود ہے۔

''مُضِلَّاتُ الْفِتَنِ''، یعنی گمراہ کرنے والے فتنوں سے مراد وہ آزمائشیں ہیں جو اللہ کی طرف سے انسان کو پیش آتی ہیں اور شہوت پرستی کی وجہ سے انسان ان میں کامیاب نہیں ہو پاتا اور شہوتِ بطن وفرج سے مراد شکم پرستی اور جنسی شہوت میں زیادہ روی ہے۔

2۔ ایک اور مقام پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

"اَكْثَرُ مَا تَلِجُ بِهٖ اُمَّتِيَ النَّارَ الْاَجْوَفَانِ الْبَطْنُ وَالْفَرْجُ"۔ (اصول کافی، 79:2)

''میری امت کے زیادہ تر لوگ دو چیزوں کی وجہ سے جہنم میں جائیں گے: پیٹ اور شرم گاہ''۔

3۔ حضرت امام محمد باقر علیہ السلام فرماتے ہیں:

"اِذَا شَبِعَ الْبَطْنُ طَغٰی"۔ (اصولِ کافی، 270:6)

''جب پیٹ بھر جائے تو وہ سرکش ہو جاتا ہے''۔

4۔ ایک اور حدیث میں آپؑ فرماتے ہیں:

"مَامِنْ شَیْءٍ اِلَی اللہِ عَزَّوَجَلَّ مِنْ بَطْنٍ مَمْلُوٍّ"۔ (اصولِ کافی، 79:02)

''اللہ کے ہاں سب سے ناپسندیدہ چیز بھرا ہوا پیٹ ہے''۔

5۔ امیر المومنین علیہ السلام فرماتے ہیں:

لا یفسد التقویٰ بغلبة الشهوة"۔ (شرح غرر الحکم، حدیث: 10606)

''شہوت کے غلبہ کے سوا کوئی چیز تقویٰ کو خراب نہیں کرتی''۔

6۔ ایک اور حدیث میں آپؑ فرماتے ہیں:

"لَا تَجْتَمِعُ الْحِکْمَةُ وَالشَّهْوَةُ"۔ (شرح غرر الحکم، حدیث: 10573)

''علم و حکمت اور شہوت ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے''۔

7۔ ایک اور مقام پر آپؑ فرماتے ہیں:

"مَارَفَعَ اِمْرَءًا کَهِمَّتِهٖ وَلَا وَضَعَهُ کَشَهْوَتِهٖ"۔ (شرح غرر الحکم، جلد6، حدیث: 9707)

''کوئی چیز ہمت کی طرح انسان کو بلندی پر نہیں لے جاتی اور کوئی چیز شہوت کی طرح انسان کو پستی کی طرف نہیں لے جاتی''۔

بارھواں باب

عفّت: ایک عظیم اخلاقی فضیلت

تمہید:۔

''عفت'' شکم پرستی اور شہوت پرستی کی ضد ہے اور اس کا شمار اہم انسانی فضائل میں ہوتا ہے۔ راغب اصفہانی اپنی مشہور کتاب ''المفردات'' میں عفت کے معنی بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اس کے معنی یہ ہیں کہ انسان کے نفس میں ایسی حالت پیدا ہو جائے جو اُسے شہوت سے باز رکھے اور جس شخص میں یہ حالت یا صفت پائی جاتی ہو، اُسے عفیف کہتے ہیں۔

''مقاییس اللّغہ'' میں اس کے معنی اس طرح بیان کئے گئے ہیں:

''بنیادی طور پر عفت کے دو معنی ہیں: ایک یہ کہ برے کاموں کو انجام دینے سے باز رہنا، دُوسرے یہ کہ کسی چیز کا کم ہونا۔ لہٰذا عربی زبان میں پستان میں باقی بچے ہوئے دُودھ کو ''عفَّتْ'' (بروزنِ مدت) کہا جاتا ہے۔

لیکن مفردات میں راغب اصفہانی نے جو معنی بیان کئے اُن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دو معنی درحقیقت ایک ہی ہیں، اس لئے کہ عفیف انسان تھوڑی چیز پر قانع رہتا ہے۔

''التحقیق'' میں کہا گیا ہے: ''اس لفظ کے بنیادی معنی یہ ہیں کہ انسان اپنے آپ کو شہوانی اور نفسانی رجحانات سے محفوظ رکھے۔ جس طرح تقویٰ کے معنی اپنے آپ کو گناہوں سے بچانے کے ہیں۔ بنابرایں عفت ایک اندرونی صفت ہے، جیسا کہ تقویٰ کا تعلق انسان کے ظاہری اعمال سے ہے''۔

علمائے علمِ اخلاق نے عفت کو شہوت پرستی اور خمود کے درمیان کی معتدل راہ قرار دیا ہے۔ مذکورہ بالا بیانات میں عفت کے عام اور وسیع مفہوم کو بیان کیا گیا ہے، اس لئے کہ بعض علمأ نے اسے ''تہتک'' یعنی پاکیزگی کی رِدا چاک کرنے کی ضد قرار دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر اس لفظ کا استعمال صرف جنسی شہوت کے مقابل ہوتا ہے۔

قرآن مجید اور احادیث کی روشنی میں یہ بات واضح ہے کہ عفت، خواہ عام معنی میں ہو یا خاص معنی میں، عظیم انسانی فضائل میں شمار ہوتی ہے۔ کوئی بھی شخص عفت کے بغیر قربِ الٰہی کے مقام کو حاصل نہیں کرسکتا۔ دُنیوی زندگی میں بھی انسان کی عزت وآبرو کا انحصار انسان کی عفت پر ہے۔

اس مختصر تمہیدی بیان کے بعد ہم مندرجہ ذیل آیات کی روشنی میں عفت کا جائزہ لیتے ہیں:

1۔ "لِلْفُقَرَآءِ الَّذِيْنَ اُحْصِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ضَرْبًا فِي الْاَرْضِ ۫ يَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ اَغْنِيَآءَ مِنَ التَّعَفُّفِ ۚ تَعْرِفُهُمْ بِسِيْمٰهُمْ ۚ لَا يَسْئَلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا ؕ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ"۔

"(تمہارا انفاق) اُن فقرأ کیلئے ہے جو اللہ کی راہ میں مشکلات کا شکار ہو گئے ہوں جو کہیں جا بھی نہیں سکتے۔ جہلاً اُن کی عفت کی وجہ سے ان کو غنی سمجھتے ہیں مگر تم ان کے چہرے سے ان کو پہچان سکتے ہو۔ وہ اصرار کر کے لوگوں سے کچھ نہیں مانگتے۔ تم جو بھی اچھی چیز اللہ کی راہ میں خرچ کرو، اللہ اسے بخوبی جانتا ہے"۔ (بقرہ:273)

2۔ "وَرَاوَدَتْهُ الَّتِيْ هُوَ فِيْ بَيْتِهَا عَنْ نَّفْسِهٖ وَغَلَّقَتِ الْاَبْوَابَ وَقَالَتْ هَيْتَ لَكَ ؕ قَالَ مَعَاذَ اللّٰهِ اِنَّهٗ رَبِّيْٓ اَحْسَنَ مَثْوَايَ ؕ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ"۔

"اس عورت نے، جس کے گھر میں وہ (یوسف) تھا، اس سے لطف اندوز ہونے کی خواہش کی اور سارے دروازے بند کر دیئے اور کہنے لگی: 'آ جاؤ'۔ یوسف نے کہا: میں اللہ کی پناہ طلب کرتا ہوں۔ وہ (عزیز مصر) میرا نعمت دینے والا ہے، اُس نے مجھے عزت کا مقام دیا ہے (کیا یہ ممکن ہے کہ میں اُس سے خیانت کروں؟) یقیناً ظالم فلاح نہیں پائیں گے"۔ (یوسف:23)

3۔ "وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ ۚ وَهَمَّ بِهَا لَوْلَآ اَنْ رَّاٰ بُرْهَانَ رَبِّهٖ ؕ كَذٰلِكَ لِنَصْرِفَ عَنْهُ السُّوْٓءَ وَالْفَحْشَآءَ ؕ اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِيْنَ○"

"اور اُس عورت نے اس (یوسف) کا ارادہ کر لیا اور اگر اُس نے اپنے رب کی برہان کو نہ دیکھ لیا ہوتا تو وہ بھی اس عورت کا ارادہ کر لیتا۔ ہم نے اس لئے ایسا کیا تا کہ برائی کو اس سے دور کر دیں کیونکہ وہ ہمارے خالص بندوں میں سے تھا"۔ (یوسف:24)

4۔ "قَالَتْ فَذٰلِكُنَّ الَّذِيْ لُمْتُنَّنِيْ فِيْهِ ؕ وَلَقَدْ رَاوَدْتُّهٗ عَنْ نَّفْسِهٖ فَاسْتَعْصَمَ ؕ وَلَئِنْ لَّمْ يَفْعَلْ مَآ اٰمُرُهٗ لَيُسْجَنَنَّ وَلَيَكُوْنًا مِّنَ الصّٰغِرِيْنَ○ قَالَ رَبِّ السِّجْنُ اَحَبُّ اِلَيَّ مِمَّا يَدْعُوْنَنِيْٓ اِلَيْهِ ۚ وَاِلَّا تَصْرِفْ عَنِّيْ كَيْدَهُنَّ اَصْبُ اِلَيْهِنَّ وَاَكُنْ مِّنَ الْجٰهِلِيْنَ○ فَاسْتَجَابَ لَهٗ رَبُّهٗ فَصَرَفَ عَنْهُ كَيْدَهُنَّ ؕ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ"۔

"عزیز مصر کی بیوی نے کہا: یہ وہی شخص ہے جس کے عشق کی وجہ سے تم مجھے ملامت کرتی تھیں، میں نے اسے اپنی طرف مائل کیا تھا مگر وہ بچ نکلا لیکن اگر اس نے میرے حکم کی اطاعت نہ کی تو ضرور زندان میں ڈال دیا جائے گا

اور ذلیل ہو کر رہے گا۔(یوسف نے کہا): اے میرے رب! زندان مجھے اس چیز سے زیادہ عزیز ہے جس کی طرف یہ عورتیں مجھے دعوت دیتی ہیں۔ اگر ان کی چالوں کو دُور نہ کر دے تو میں ان کی طرف مائل ہو جاؤں گا اور جاہلوں میں سے ہو جاؤں گا۔ اُس کے رب نے اس کی دعا قبول کر لی اور ان کی چالوں کو اس سے دور کر دیا۔ وہ یقیناً سننے اور جاننے والا ہے"۔(یوسف:32تا34)

5۔ "وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ ۝ اِلَّا عَلٰٓى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ ۝ فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ"۔

"اور وہ جو اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرتے ہیں اور صرف اپنی بیویوں اور کنیزوں تک محدود رہتے ہیں، ان پر کوئی ملامت نہیں ہے اور جو لوگ اس سے آگے کوئی چیز طلب کریں، وہ حد سے گزرنے والے ہیں"۔(مومنون:5تا7)

6۔ "وَالْحٰفِظِيْنَ فُرُوْجَهُمْ وَالْحٰفِظٰتِ"۔

"پاک دامن مرد اور پاک دامن عورتیں"۔(احزاب۔35)

تفسیر

آبرومند محتاج:۔

پہلی آیت میں انفاق کے بہترین مصرف کی نشاندہی کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ تمہارا انفاق خاص طور پر ان لوگوں کیلئے ہونا چاہئے جو اللہ کی راہ میں مشکلات میں گھر گئے ہوں (اور اپنے گھر اور کاروبار وغیرہ سے محروم ہو گئے ہوں، اللہ کی راہ میں جہاد میں شرکت کی وجہ سے وہ اپنی معاشی ضروریات کی تکمیل کیلئے کوشش نہیں کر سکتے)، نہ ہی سفر کر سکتے ہیں:

"لِلْفُقَرَآءِ الَّذِيْنَ اُحْصِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ضَرْبًا فِي الْاَرْضِ ۣ يَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ اَغْنِيَآءَ مِنَ التَّعَفُّفِ ۚ تَعْرِفُهُمْ بِسِيْمٰهُمْ ۚ لَا يَسْئَلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا ۭ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ"۔(بقرہ۔273)

اس کے بعد ان کی ایک اہم خصوصیت کا ذکر کیا گیا ہے کہ وہ عفت اور خودداری کی وجہ سے ایسی حالت میں ہوتے ہیں کہ بے خبر اور جاہل لوگ انہیں غنی سمجھتے ہیں مگر تم ان کے چہروں سے ان کو پہچان سکتے ہو۔

يَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ اَغْنِيَآءَ مِنَ التَّعَفُّفِ ۚ تَعْرِفُهُمْ بِسِيْمٰهُمْ۔

اس لئے کہ وہ اپنے دل کا حال لوگوں سے پوشیدہ رکھتے ہیں اور اپنی بدحالی کا ذکر کسی سے نہیں کرتے۔ضرورت مند ہونے کے باوجود بے نیازی کا مظاہرہ کرتے ہیں لیکن حقیقتِ حال سے واقف لوگ ان کے چہرے کی رنگت وغیرہ سے ان کو پہچان لیتے ہیں۔

اس کے بعد ان کی ایک اور خصوصیت کا ذکر اس طرح کیا گیا ہے کہ وہ کبھی اصرار کر کے لوگوں سے کوئی چیز نہیں مانگتے۔

"لَا يَسْئَلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا"۔

یعنی حتی الامکان کسی کے سامنے دستِ سوال دراز نہیں کرتے اور اگر کبھی ان کی ضرورت مندی بہت شدت اختیار کر لے اور انہیں کسی سے مدد یا قرض کی درخواست کرنی پڑ جائے تو ہرگز اصرار نہیں کرتے۔

آخر میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ تم جو بھی اچھی چیز اللہ کی راہ میں انفاق کرتے ہو، اللہ اس کو خوب جانتا ہے۔

وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ"۔ (بقرہ:273)

اس آیت سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اللہ کی راہ میں انفاق کرنا اچھا عمل ہے، خاص طور پر اگر ان لوگوں پر انفاق کیا جائے تو جو خوددار اور عفیف ہوں۔

ظاہر سی بات ہے کہ اس آیت میں جس عفت کا ذکر کیا گیا ہے، اُس کا تعلق مالی معاملات سے ہے، جنسی معاملات سے نہیں۔بعض مفسرین نے کہا ہے کہ یہ آیت اصحابِ صفہ کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ان کی تعداد چار سو کے لگ بھگ تھی۔ان کا تعلق مکہ اور مدینہ کے اردگرد سے تھا لیکن ان کے پاس رہنے کیلئے ٹھکانہ تھا نہ کوئی رشتہ دار تھا جس کے پاس جا کر وہ رہ سکتے، نہ ہی ان کے پاس کوئی ذریعہ معاش تھا۔وہ مسجدِ نبوی کے قریب ایک بڑے سے چبوترے پر گزر بسر کرتے تھے۔وہ رسول اللہ ﷺ کے حکم سے بڑے جوش وخروش سے جہاد میں شرکت کرتے تھے لیکن ضرورت مندی کی شدت کے باوجود اپنی عزتِ نفس اور عفت کی حفاظت کرتے تھے اور کسی کے سامنے دستِ سوال دراز نہیں کرتے تھے۔

بہرحال جیسا کہ ہم دیکھتے ہیں، قرآن مجید کی اس آیت میں مختلف الفاظ کی تعریف کیلئے استعمال ہوئے ہیں۔دوسری اور تیسری آیت میں حضرت یوسفؑ کی عفت اور پاک دامنی کا تذکرہ کیا گیا ہے جنہوں نے سخت ترین حالات میں، جہاں گناہ کے تمام اسباب فراہم تھے، اپنی عفت اور پاک دامنی کی حفاظت کی۔انہوں نے ان شدید حالات میں اللہ کے ہاں پناہ طلب کی اور اس عظیم امتحان میں سرخرو ہوئے۔

قرآن شریف کی آیات میں بیان ہوا ہے کہ وہ عورت جس کے گھر میں حضرت یوسفؑ رہتے تھے، ان کو ورغلانے لگی، اس نے ان سے لطف اندوز ہونے کی تمنا کا اظہار کیا اور تمام دروازے بند کر کے انہیں کہا کہ جلدی کرو! حضرت یوسفؑ نے کہا: میں اللہ کی پناہ طلب کرتا ہوں۔وہ (عزیزِ مصر) میرا نعمت دینے والا ہے۔اُس نے مجھے عزت کا مقام دیا ہے (کیا ممکن ہے کہ میں اُس کے ساتھ ظلم اور خیانت کروں) یقیناً ظالم (اور خائن) کبھی فلاح نہیں پاتے۔

"وَرَاوَدَتْهُ الَّتِیْ هُوَ فِیْ بَیْتِهَا عَنْ نَّفْسِهٖ وَغَلَّقَتِ الْاَبْوَابَ وَقَالَتْ هَیْتَ لَكَ ؕ قَالَ مَعَاذَ اللّٰهِ اِنَّهٗ رَبِّیْۤ اَحْسَنَ مَثْوَایَ ؕ اِنَّهٗ لَا یُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ"۔ (یوسف:23)

حضرت یوسفؑ کے حسن اور ملکوت نے نہ صرف یہ کہ عزیز مصر کو اپنی طرف جذب کر لیا تھا بلکہ اُس کی بیوی ان پر فریفتہ ہو گئی تھی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ عزیز مصر کی بیوی کے دل میں عشق کی حرارت تیز سے تیز تر ہوتی گئی مگر حضرت یوسفؑ، جو عفیف اور پاکباز تھے، اُن کا دل صرف عشقِ خدا سے پُر تھا۔

عزیز مصر کی جوان اور حسین بیوی نے اپنی آرزو کی تکمیل کیلئے تمام وسائل استعمال کئے جن میں سے کوئی ایک بھی کسی عام نوجوان کے جذبات و احساسات کو بھڑکانے کیلئے کافی ہو سکتا ہے۔ لیکن حضرت یوسفؑ نے شہوت کے اس طوفان کا مقابلہ کرنے کیلئے اپنی کشتی اللہ کے سپرد کر دی ورنہ یقیناً اُن کی کشتی اس طوفان میں غرق ہو جاتی۔

اگلی آیت میں اسی بات کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ اُس عورت نے (یوسفؑ) سے لطف اندوز ہونے کا ارادہ کر لیا تھا اور اگر اس نے اپنے رب کی برہان کو نہ دیکھ لیا ہوتا تو وہ بھی اس کا ارادہ کر لیتا (لیکن ہم نے اس طوفان میں یوسف کو اکیلا نہیں چھوڑا اور ہم نے ایسا اس لئے کیا) تا کہ بدکاری اور فحشا کو اس سے دور کر دیں، اس لئے وہ ہمارے خالص بندوں میں سے تھا۔

"وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ ۚ وَهَمَّ بِهَا لَوْلَاۤ اَنْ رَّاٰ بُرْهَانَ رَبِّهٖ ؕ كَذٰلِكَ لِنَصْرِفَ عَنْهُ السُّوْٓءَ وَالْفَحْشَآءَ ؕ اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِیْنَ○"(یوسف:24)

"مِنْ عِبَادِنَا" (ہمارے بندوں میں سے) اور "مُخْلَصِیْنَ" (جو خالص ہو چکے ہیں) کی اصطلاحات بہت پر معنی ہیں جنہیں حضرت یوسفؑ کے اعزاز کے طور پر بیان کیا گیا ہے۔

حضرت یوسفؑ اپنی عفت اور پاکیزگی کے باوجود عزیز مصر کی بیوی کی طرف سے ایسے الزام کا نشانہ بنے جو اُن کی زندگی کو بھی خطرے میں ڈال سکتا تھا۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے اہلِ ایمان کی مدد اور نصرت کا جو وعدہ کیا ہوا ہے، گہوارے کے ایک شیر خوار بچے کی گواہی کے ذریعے، اس پر عمل کرتے ہوئے معجزانہ طور پر حضرت یوسفؑ کو نجات دی۔

بعض بے علم افراد نے اس آیت کے ان الفاظ "هَمَّ بِهَا" سے یہ مفہوم اخذ کیا کہ "حضرت یوسفؑ نے بھی اس سے لطف اندوز ہونے کا ارادہ کر لیا تھا" لیکن یہ مفہوم انبیاؑ کی عصمت کے منافی ہونے کے ساتھ ساتھ آیت کے لب و لہجہ کے ساتھ بھی سازگار نہیں ہے بلکہ قرآن کہہ رہا ہے کہ "اگر برہانِ رب نے حضرت یوسفؑ کی مدد نہ کی ہوتی تو وہ بھی آمادہ ہو جاتے، لیکن چونکہ برہانِ رب نے ان کی مدد کی، لہٰذا وہ آمادہ بھی نہیں ہوئے"۔

فخر رازی نے اس آیت کی تفسیر میں بہت خوبصورت بات کی ہے، وہ کہتے ہیں کہ "سب نے، حتیٰ کہ شیطان نے بھی حضرت یوسفؑ کی پاکیزگی کی گواہی دی کیونکہ جب اُس نے راندۂ درگاہ خدا ہو جانے کے باوجود یہ کہا کہ میں سب کو گمراہ کروں گا لیکن تیرے خالص بندوں کو گمراہ نہ کر سکوں گا"۔

"قَالَ فَبِعِزَّتِكَ لَأُغْوِيَنَّهُمْ أَجْمَعِينَ ۔ إِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِينَ"۔ (ص: 82 اور 83)

فخر رازی اس کے بعد یہ کہتے ہیں کہ ''جو لوگ یہ بیہودہ اور بے بنیاد بات کرتے ہیں، اگر وہ اللہ کے پیروکار ہیں تو حضرت یوسفؑ کی پاکیزگی کے بارے میں اللہ کی گواہی مان لیں اور اگر شیطان کے پیروکار ہیں تو شیطان کی گواہی کو مان لیں''۔

(تفسیر کبیر، 117:18)

چوتھی آیت بھی، جو حضرت یوسفؑ کی کٹھن زندگی کے حالات اور اُن کی عفت و پارسائی کو بیان کر رہی ہے، ایک اور طوفان کا ذکر کر رہی ہے جو حضرت یوسفؑ کے سامنے نمودار ہوا۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ''جب عزیز مصر کی اپنے کنعانی غلام سے معاشقے کی داستان زبان زدِ عام و خاص ہو گئی تو زنانِ مصر عزیز مصر کی ملامت کرنے لگیں۔ اُس نے اپنی بے گناہی ثابت کرنے کیلئے ایک بڑی ضیافت کا اہتمام کیا اور معاشرے کی معزز خواتین کو مدعو کیا اور ایک حساس لمحے پر حضرت یوسفؑ کو اس محفل میں نمودار ہونے کا حکم دیا۔

جب ان عورتوں نے حضرت یوسفؑ کے جمالِ دل آرا کو دیکھا تو بے اختیار ہو گئیں اور پھلوں کی بجائے اُنہوں نے اپنے ہاتھ کاٹ لئے اور سب یک زباں ہو کر بول اُٹھیں کہ یہ جوانِ رعنا کوئی انسان نہیں بلکہ کوئی حسین فرشتہ ہے۔

اس وقت عزیز مصر کی بیوی نے ان عورتوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا: یہی وہ جوان ہے جس کی محبت کی وجہ سے تم مجھے سرزنش اور ملامت کرتی تھیں۔ ہاں! یہ بات صحیح ہے کہ میں نے اسے اپنی طرف دعوت دی لیکن اس نے اپنے آپ کو بچا لیا۔ لیکن اگر وہ میرے حکم کو نہیں مانے گا تو زندان میں ڈال دیا جائے گا اور یقیناً ذلیل و خوار ہو گا''۔

"قَالَتْ فَذٰلِكُنَّ الَّذِي لُمْتُنَّنِي فِيهِ ۖ وَلَقَدْ رَاوَدْتُّهُ عَنْ نَّفْسِهِ فَاسْتَعْصَمَ ۖ وَلَئِن لَّمْ يَفْعَلْ مَآ اٰمُرُهُ لَيُسْجَنَنَّ وَلَيَكُونًا مِّنَ الصّٰغِرِينَ ○"(یوسف: 32)

یہ حضرت یوسفؑ کیلئے ایک اور سخت امتحان تھا۔ وہ ایک دوراہے پر کھڑے تھے جہاں ایک طرف عزیز مصر کی بیوی کا مطالبہ پورا کر کے وہ ہر قسم کے آرام و سکون اور نعمتوں اور آسائشوں سے محفوظ ہو سکتے تھے جبکہ دُوسری طرف اگر وہ اس کا مطالبہ پورا نہ کرتے تو زندان اور زندان کی سختیاں اُن کا مقدر ٹھہرتیں۔ لیکن انہوں نے ایک لمحے کے توقف کے بغیر اپنی راہ کا انتخاب کیا اور اللہ تعالیٰ سے اس طرح دعا کی:

''اے میرے رب! زندان (اور اس کی ساری سختیاں) مجھے اس چیز سے زیادہ محبوب ہیں جس کی طرف یہ عورتیں مجھے بلا رہی ہیں۔ اگر ان کے مکر کو مجھ سے دور نہ کر دے تو میں ان کی طرف مائل ہو جاؤں گا اور جاہلوں میں سے ہو جاؤں''۔

قَالَ رَبِّ السِّجْنُ أَحَبُّ إِلَيَّ مِمَّا يَدْعُونَنِي إِلَيْهِ ۖ وَإِلَّا تَصْرِفْ عَنِّي كَيْدَهُنَّ أَصْبُ إِلَيْهِنَّ

وَاَكُنْ مِّنَ الْجٰهِلِيْنَ○(یوسف:33)

آیت کے الفاظ سے یہ بات اچھی طرح واضح ہوجاتی ہے کہ اس محفل میں شریک خواتین بھی عزیز مصر کی بیوی کی ہم نوا ہوکر حضرت یوسفؑ کو اس کا مطالبہ مان لینے کیلئے اصرار کرنے لگی تھیں۔ان میں سے کچھ حضرت یوسفؑ کو عزیز مصر کی بیوی کا مطالبہ مان لینے کے فوائد بتارہی تھیں اور کچھ اس کا مطالبہ نہ ماننے کے سنگین نتائج سے انہیں ڈرا رہی تھیں۔لیکن حضرت یوسفؑ نے جس راہ کا انتخاب کر لیا تھا،اُس کے نتیجہ میں وہ خود کو ذہنی اور قلبی طور پر زندان اور زندان کی سختیوں کیلئے آمادہ کر چکے تھے۔

یہ ایک سنجیدہ دھمکی تھی جس پر عمل بھی ہوگیا۔حضرت یوسفؑ زندان میں ڈال دیئے گئے لیکن ان کی عظیم روح عزیز مصر کے محل کے آلودہ ماحول سے رہا ہوگئی۔اگلی آیات سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس زندان کو ان کی ترقی کا زینہ بنادیا اور وہ اپنے تقویٰ اور پاکیزگی کو محفوظ رکھتے ہوئے مصر کے تختِ اقتدار تک پہنچ گئے جبکہ شہوت سے آلودہ افراد رُسوا اور الگ تھلگ ہوگئے۔یہ وہ بدلہ تھا جو اللہ نے دُنیا میں پاکیزہ خاندان کے اس چشم و چراغ کو عطا کیا۔

اگلی آیت میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

فَاسْتَجَابَ لَهٗ رَبُّهٗ فَصَرَفَ عَنْهُ كَيْدَهُنَّ ؕ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ "۔

''اس کے رب نے اس کی دُعا کو قبول کرلیا اور ان عورتوں کے شر کو ان سے دُور کردیا۔یقیناً وہ سننے والا اور جاننے والا ہے''۔(یوسف:34)

عفت:مومن کی نمایاں صفت:۔

مذکورہ بالا آیات میں سے پانچویں آیت میں مومنین کی نمایاں صفات کا ذکر کیا گیا ہے۔قرآن مجید ایک مختصر مگر پر معنی جملے میں عفت کو اہلِ ایمان کی نمایاں صفات میں سے ایک صفت کے طور پر بیان کرتے ہوئے کہتا ہے:

"وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ○ اِلَّا عَلٰٓى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ○ فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ"۔

''اور وہ اپنی شرم گاہوں کو آلودہ ہونے سے بچاتے ہیں اور صرف اپنی بیویوں اور کنیزوں تک محدود رہتے ہیں،ان سے لطف اندوز ہونے میں ان پر کوئی ملامت نہیں ہے اور جو لوگ اس سے آگے کوئی چیز طلب کریں،وہ حد سے گزرنے والے ہیں''۔(مومنون:5 تا 7)

یہ بات قابلِ ذکر ہے ان آیات میں قرآن مجید نے مومنین کی نمایاں صفات کا ذکر کرتے ہوئے نماز،لغو سے اجتناب اور ادائے زکوٰۃ کے بعد عفت کا ذکر کیا اور اسے امانت اور ایفائے عہد جیسی خوبیوں پر مقدم رکھا۔

عفت: فلاح کی کنجی:۔

آخری آیت میں اللہ تعالیٰ مردوں اور عورتوں کے دس نمایاں گروہوں کا ذکر کر رہا ہے جن کو وہ مغفرت اور اجرِ عظیم عطا کرے گا۔ ان دس گروہوں میں سے نواں گروہ وہ پاک دامن مرد اور عورتوں ہیں جنہوں نے اپنی عفت کی حفاظت کی۔

دسویں گروہ کا ذکر ان الفاظ میں ہے: ''اللہ کا کثرت سے ذکر کرنے والے مرد اور عورتیں''۔ اس بات سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ عفت کا اللہ کی یاد اور اس کے ذکر سے بہت گہرا تعلق ہے۔ اللہ تعالیٰ اُن لوگوں کو مغفرت اور اجرِ عظیم کی بشارت دے رہا ہے۔ ظاہری بات ہے کہ مغفرت اور اجر کی عظمت کو بھی اللہ کے سوا کوئی نہیں جان سکتا۔

ایک اور مقام پر اس بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ روزہ بھی جنسی شہوت پر قابو میں رکھنے کا ایک موثر ہتھیار ہے۔ اس طرح روزے اور عفت کے درمیان بھی گہرا تعلق موجود ہے۔ ایک حدیث میں رسولؐ اللہ فرماتے ہیں:

"یَامَعْشَرَ الشَّبَابِ اِنِ اسْتَطَاعَ مِنْکُمُ اَلْبَاءَۃَ فَلْیَتَزَوَّجْ فَاِنَّہٗ اَغَضُّ لِلْبَصَرِ وَاَحْصَنُ لِلْفَرْجِ وَمَنْ لَمْ یَسْتَطِعْ فَعَلَیْہِ بِالصَّوْمِ "(تفسیر مراغی، 10:22)

''اے گروہ جوانان! تم میں سے جو کوئی شادی کرنے کی استطاعت رکھتا ہو، وہ شادی کر لے، اس لئے کہ وہ آنکھوں کو لوگوں کی ناموس کی طرف اُٹھنے سے روکنے اور شرم گاہ کی حفاظت کیلئے دیگر چیزوں سے زیادہ موثر ہے اور جو شادی کرنے کی استطاعت نہ رکھتا ہو، وہ روزہ رکھے''۔

عفت احادیث کی روشنی میں

کتبِ حدیث میں بہت سی ایسی احادیث موجود ہیں جو عفت پر بہت زور دیتی ہیں۔ ہم نمونے کے طور پر چند احادیث کا ذکر کرتے ہیں:

1۔ حضرت امیر المومنین علیہ السلام عفت کو افضل ترین عبادت سمجھتے ہوئے فرماتے ہیں:

"اَفْضَلُ الْعِبَادَۃِ الْعِفَافُ"۔ (اصولِ کافی، 79:2)

''یہاں اس احتمال کو ہرگز نظر انداز نہیں کیا جاسکتا ہے کہ یہاں عفت سے اس کے وسیع معنی مراد ہوں۔ البتہ یہ بھی ممکن ہے کہ اسے شکم پرستی اور شہوت پرستی کے مقابل استعمال کیا گیا ہو۔

2۔ حضرت امام محمد باقر علیہ السلام فرماتے ہیں:

"مَاعُبِدَاللّٰہُ بِشَیْءٍ اَفْضَلَ مِنْ عِفَّۃِ بَطْنٍ وَفَرْجٍ"۔ (اصولِ کافی، 79:2)

''اللہ کے ہاں کوئی عبادت عفتِ شکم اور عفت فرج سے افضل نہیں ہے''۔

3۔ آپؑ ہی سے مروی ایک اور حدیث میں آیا ہے کہ ایک شخص آپؑ کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہنے لگا کہ میری عبادات کمزور اور روزے کم ہیں لیکن میں اُمید کرتا ہوں کہ میں نے مالِ حرام نہیں کھایا ہوگا۔ امامؑ نے اس کے جواب میں ارشاد فرمایا:

"اَیُّ الْاِجْتِهَادِ اَفْضَلُ مِنْ عِفَّةِ بَطْنٍ وَفَرْجٍ"۔ (اصولِ کافی، 79:2)

''کونسی کوشش اور جدوجہد عفتِ شکم اور عفتِ فرج سے افضل ہے''!

4۔ حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

"اِذَا اَرَادَ اللّٰهُ بِعَبْدٍ خَيْرًا اَعَفَّ بَطْنَهُ وَفَرْجَهُ"۔ (غرر الحکم، حدیث: 4114)

''جب اللہ کسی شخص سے بھلائی کا ارادہ کرتا ہے تو اُسے شکم اور شرم گاہ کی عفت عطا کر دیتا ہے''۔

5۔ ایک اور حدیث میں مفضل روایت کرتے ہیں کہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے اپنے حقیقی شیعوں کی صفات بیان کرتے ہوئے فرمایا:

"اِنَّمَا شِيْعَةُ جَعْفَرٍ مَنْ عَفَّ بَطْنَهُ وَفَرْجَهُ وَاشْتَدَّ جِهَادَهُ وَعَمِلَ لِخَالِقِهٖ وَرَجَا ثَوَابَهُ وَخَافَ عِقَابَهُ فَاِذَا رَاَيْتَ اُولٰٓئِكَ فَاُولٰٓئِكَ شِيْعَةُ جَعْفَرٍ"۔

''جعفرؑ (صادق) کے شیعہ وہ ہیں جو شکم پرستی اور جنسی شہوت کے معاملہ میں عفت اختیار کرتے ہیں، اپنے خالق کیلئے ان کی جدوجہد اور عمل میں شدت پائی جاتی ہے، وہ اس کے ثواب کے اُمیدوار اور اس کے عذاب سے خائف ہوتے ہیں۔ جب تم کسی کو ان صفات سے متصف پاؤ تو سمجھ لو کہ یہی جعفرؑ (صادق) کے شیعہ ہیں''۔ (وسائل الشیعہ، 199:11)

6۔ امیرالمومنین علیہ السلام فرماتے ہیں:

"قَدْرُ الرَّجُلِ عَلٰى قَدْرِ هِمَّتِهٖ، وَصِدْقُهٗ عَلٰى قَدْرِ مُرُوَّتِهٖ، وَشُجَاعَتُهٗ عَلٰى قَدْرِ اَنَفَتِهٖ وَعِفَّتُهٗ عَلٰى قَدْرِ غَيْرَتِهٖ"۔ (نہج البلاغہ، کلماتِ قصار: 47)

''کسی شخص کی قدر و منزلت اس کی ہمت کے برابر، اس کی صداقت اس کی جوانمردی کے برابر، اس کی شجاعت دُنیا سے اس کی بے رغبتی کے برابر اور اُس کی عفت اُس کی غیرت کے برابر ہوتی ہے''۔

ظاہر سی بات ہے کہ غیرت مند شخص یہ پسند نہیں کرتا کہ کوئی اس کی ناموس کو ناپاک نظروں سے دیکھے۔ لہٰذا وہ خود

بھی کسی کی ناموس پر بری نظر نہیں ڈالتا۔

7۔ ہم اس بحث کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اس حدیث پر ختم کرتے ہیں جس میں آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ میں اپنے بعد اپنی اُمت کے بارے میں تین چیزوں سے خائف ہوں۔ پھر آپؐ نے ان کا ذکر کرتے ہوئے تیسری چیز کا ذکر ان الفاظ میں فرمایا ہے:

شَهْوَةُ الْبَطْنِ وَالْفَرْجِ"(اصولِ کافی، 79:2)

''شکم اور شرم گاہ کی شہوت''۔

نتیجہ:۔

مندرجہ بالا آیات وروایات سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ اسلام نے شہوتِ شکم وفرج سے پاکیزگی حاصل کرنے کے معاملے کو غیر معمولی اہمیت دی ہے، یہاں تک کہ اسے انسان کی شخصیت، غیرت، ایمان اور شیعہ ہونے کی نشانی قرار دیا۔ تاریخ بھی اس بات کی گواہ ہے کہ انسانی معاشرے کی بہت سی مشکلات کا سبب شہوت شکم اور شہوت جنسی ہیں۔ شہوتِ شکم انسان کو صحیح غور وفکر سے محروم کردیتی ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان دوسروں کے حقوق کا خیال نہیں رکھتا اور نہ ہی معاشرے میں عدل کی راہ پر گامزن ہو سکتا ہے۔ یہی چیز اُسے انواع واقسام کے گناہوں کے ارتکاب کی طرف دھکیل دیتی ہے۔

اس کے علاوہ شہوتِ شکم اور بھی بہت سی جسمانی اور اخلاقی بیماریوں کی جڑ ہے۔ بعض اوقات تو یہ ایسے بت کی شکل اختیار کر لیتی ہے جو زندگی کے ہر میدان میں انسان سے اطاعت وبندگی کا مطالبہ کرتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے آخری زمانے کی تصویر کشی ان الفاظ میں فرمائی ہے:

"يَأْتِيْ عَلَى النَّاسِ زَمَانٌ بُطُوْنُهُمْ اِلٰهَتُهُمْ وَنِسَائُهُمْ قِبْلَتُهُمْ وَدَنَانِيْرُهُمْ دِيْنَهُمْ، وَشَرَفُهُمْ مَتَاعُهُمْ، لَايَبْغُوْنَ مِنَ الْاِيْمَانِ اِلَّااِسْمَهُ وَلَامِنَ الْاِسْلَامِ اِلَّا رَسْمَهُ وَلَامِنَ الْقُرْآنِ اِلَّادَرْسَهُ، مَسَاجِدُهُمْ مَعْمُوْرَةٌ مِنَ الْبَنَاءِ وَقُلُوْبُهُمْ خَرَابٌ عَلَى الْهُدٰى"۔(بحار الانوار، 453:22)

''لوگوں پر ایک وقت آئے گا اُن کا پیٹ اُن کا خدا ہوگا، اُن کی عورتیں اُن کا قبلہ ہوں گی، اُن کے دینار (یعنی مال ودولت) اُن کا دین ہونگے، اُن کے اموال اُن کی عزت ہوں گے، اُن کے پاس ایمان کا صرف نام اور اسلام صرف رسم اور قرآن صرف پڑھنے کی حد تک رہ جائے گا۔ عمارت کے لحاظ سے اُن کی مساجد آباد ہوں گی لیکن ہدایت کے لحاظ سے ان کے دل ویران ہوں گے''۔

آ گے چل کر اس حدیث میں کہا گیا ہے کہ اللہ اس دور کے لوگوں کو حکمران کے جور، قحط اور حکام کے مظالم میں مبتلا کر دے گا۔

احادیث میں بکثرت ظلم وجور کے الفاظ ساتھ ساتھ استعمال ہوئے ہیں۔ان کے معنی میں یہ فرق ہوسکتا ہے کہ ظلم کے معنی وسیع تر ہیں اور عدل کی راہ سے انحراف کو ظلم کہا جاتا ہے، خواہ ایسا کرنے والا کوئی حاکم ہو، یا عام شخص، جبکہ جور کا لفظ صرف حاکم کے ظلم کیلئے استعمال ہوتا ہے۔

ایک اور حدیث میں رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں:

"اِيَّاكَ وَاِدْمَانَ الشَّبَعِ فَاِنَّهُ يَهِيْجُ الْاَسْقَامَ وَيَشِيْرُ الْعِلَلَ"۔

''زیادہ کھانے سے احتراز کرو کیونکہ اس سے مختلف بیماریوں میں ہیجان پیدا ہوتا ہے اور بعض بیماریاں پیدا ہوتی ہیں''۔(شرح غرر الحکم، حدیث:2681)

ایک اور حدیث میں آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ جو کوئی اپنے پیٹ، زبان اور شرم گاہ کے شر سے محفوظ ہو گیا، وہ ہر برائی سے محفوظ ہو گیا۔(معراج السعادۃ:310)

بے عفّتی کے سدِّ باب کے طریقے

شہوت، خصوصاً شکم اور شہوت جنس کو قابو میں رکھنے کے بہت سے طریقے موجود ہیں۔ان میں سے بعض تو عام ہیں جنہیں ہر قسم کی اخلاقی برائی کا سدِ باب کرنے کیلئے استعمال کیا جا سکتا ہے جیسے اچھا ماحول، اچھی صحبت، اچھی خاندانی تربیت اور اخلاقی برائیوں کے برے نتائج سے آگاہی وغیرہ۔

ان مسائل پر ہم پہلی جلد میں مفصل بحث کر چکے ہیں۔لیکن کچھ ایسے بھی ہیں جو خاص کر جنس شہوت اور پیٹ کی شہوت کو قابو میں رکھنے کیلئے مؤثر اور مفید ہیں جن میں سے بعض کو ہم ذیل میں بیان کر رہے ہیں۔

1۔حجاب:۔

جنسی شہوت میں تحریک پیدا کرنے میں عورتوں کی بے حجابی اور بن سنور کر مردوں کے سامنے آنے کا بہت بڑا کردار ہے۔ خاص طور پر غیر شادی شدہ نوجوانوں پر ان کے منفی اثرات بہت گہرے اور مضر ہوتے ہیں۔ہم اس بات کو اس طرح بھی کہہ سکتے ہیں کہ بے عفتی اور بے پردگی کا آپس میں براہِ راست تعلق ہے۔جس قدر کسی معاشرے میں بے حجابی اور بے پردگی زیادہ ہوگی، اُسی قدر بے عفتی میں اضافہ ہوگا۔

دیکھا گیا ہے کہ گرمی کے موسم میں چونکہ خواتین کا لباس ہلکا پھلکا ہوتا ہے، لہٰذا اس موسم میں خواتین کو جنسی طور پر ہراساں

کرنے یا ان سے چھیڑ چھاڑ کے واقعات زیادہ ہوتے ہیں۔اس کے برعکس موسمِ سرما میں چونکہ زیادہ کپڑے پہنے جاتے ہیں اور برہنگی کم ہوتی ہے،لہٰذا ایسے واقعات بھی کم ہوجاتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ اسلام نے پردے کے معاملے پر بہت تاکید کی ہے۔سورۂ احزاب اور سورۂ نور کا مطالعہ کرنے سے یہ بات بخوبی واضح ہوجاتی ہے۔

اس بات میں کوئی شک وشبہ نہیں ہونا چاہئے کہ بے حجابی و بے پردگی جنسی بے راہ روی کا زینہ ہے اور اس سے پیدا ہونے والی معاشرتی برائیاں دورِ حاضر میں کسی پر پوشیدہ نہیں ہیں۔

بے پردگی کا ایک یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ عورتیں اظہارِ جمال کے ذریعے مردوں کی جنسی شہوت کو بیدار کر کے ایک دوسرے کے ساتھ مقابلے کی فضا پیدا کر دیتی ہیں۔اگرچہ اس کے منفی اثرات تو ہر دور میں معاشرے پر مرتب ہوتے رہے ہیں لیکن ہمارے دور میں،جبکہ نوجوان حصولِ تعلیم میں مصروف رہنے اور اقتصادی طور پر خود کفیل ہونے تک نسبتاً طویل عرصے تک غیر شادی شدہ رہتے ہیں، اس کے منفی اثرات بہت زیادہ ہوگئے ہیں۔

2۔مخلوط محافل کی روک تھام:۔

موجودہ معاشرتی صورتِ حال میں یہ تو ممکن نہیں رہا ہے کہ مردوں اور خواتین کے ایک دوسرے سے ملنے پر مکمل پابندی عائد کر دی جائے لیکن غیر ضروری میل جول کو بہر حال روکنا چاہئے۔ایسا کرنے سے عفت اور پاکیزگی کے ماحول کو تقویت ملے گی۔مغربی ممالک میں نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کے آزادانہ میل جول کے جو نتائج برآمد ہو رہے ہیں،ہمیں اُن سے عبرت حاصل کرنی چاہئے۔

3۔ذرائع ابلاغ کا کردار:۔

نوجوانوں میں جنسی شہوت کو تحریک دینے اور جنسی بے راہ روی پھیلانے میں ذرائع ابلاغ کا بھی اہم کردار ہے۔گندی فلمیں، برہنہ اور نیم برہنہ تصاویر پر مشتمل اشتہارات،عشقیہ افسانے اور ناول،اگرچہ کچھ لوگوں کیلئے مالی مفادات کے حصول کا ذریعہ ہیں لیکن ان سے معاشرتی عفت اور پاکیزگی کی روا تار تار ہوجاتی ہے۔یہ بات بھی صحیح ہے کہ دورِ حاضر میں ذرائع ابلاغ کا جال بہت وسیع ہوگیا ہے اور ان کو اخلاقی حدود میں محدود رکھنا کسی کے بس کی بات نہیں ہے،لیکن جس قدر بھی اس سلسلہ میں کوئی کوشش کی جائے، اُسی قدر بہتر نتائج حاصل ہونے کی توقع کی جاسکتی ہے۔

دَورِ حاضر میں آزادی اظہار کا مسئلہ بھی ایک نازک صورتِ حال اختیار کر گیا ہے جس کی آڑ لے کر ذرائع ابلاغ اپنے اُوپر لگائی جانے والی پابندیوں کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنے لگتے ہیں۔علاوہ ازیں اگر والدین نوجوانوں کو ذرائع ابلاگ سے

حاصل ہونے والی تفریح سے دُور رکھنا چاہیں تو ان کے اور نوجوان نسل کے درمیان فاصلے پیدا ہو جانے کا خوف بھی پیدا ہو جاتا ہے۔ اسی طرح بعض لوگ پسماندگی اور رجعت پسندی جیسے الزامات سے بچنے کی خاطر بھی کوئی قدم اُٹھانے سے گریز کرتے ہیں اور اس طرح سب کے سب ہاتھ پر ہاتھ دھرے اسلامی معاشرے میں رونما ہونے والی بے حیائی کے سیلاب کی بڑھتی ہوئی موجوں کو صرف مایوسی سے دیکھتے رہتے ہیں۔

تیرھواں باب

غفلت و بے خبری

تمہید:۔

غفلت ایک وسیع مفہوم کا حامل لفظ ہے جس میں زمان ومکان اور حالات وشرائط سے غفلت اور بے خبری سب داخل ہیں۔ اپنے اعمال وافعال کے نتائج سے بے خبری گزشتہ، موجودہ اور آئندہ رونما ہونے والے واقعات سے بے خبری، زندگی کے تلخ وشیریں واقعات میں پوشیدہ عبرتوں سے بے خبری، سب کے سب غفلت کے مفہوم میں داخل ہیں۔

غفلت انسان اور انسانی معاشرے کی فلاح اور سعادت کیلئے ایک بہت بڑا خطرہ ہے۔ یہ ایسا خطرہ ہے جو فرد یا معاشرے کی سالہا سال کی محنت کو چند لمحوں میں برباد کر دیتا ہے۔

ایسے واقعات بکثرت دیکھنے اور سننے میں آتے ہیں کہ کسی شخص نے سالہا سال محنت اور زحمت کر کے بہت سا مال جمع کیا لیکن ایک معمولی سی غفلت کی وجہ سے رونما ہونے والی آتش زدگی نے چند لمحوں میں سب کچھ خاکستر کر دیا۔ یہی وجہ ہے کہ علمائے اخلاق نے غفلت اور ذکر (جو کہ غفلت کا متضاد ہے) کے بارے میں اپنی کتب میں تفصیل سے بحث کی ہے اور غفلت کے اسباب وعوامل کو دور کرنے اور انسان کو خواب غفلت سے بیدار کرنے والے حقائق کو بیان کیا ہے۔

اس تمہید کے بعد ہم قرآن مجید کی طرف رجوع کرتے ہیں اور مندرجہ ذیل آیات کی روشنی میں اس اہم موضوع کا مطالعہ کرتے ہیں:

1۔ "وَلَقَدْ ذَرَاْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيْرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ ۖ لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا ۡ وَلَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا ۡ وَلَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا ؕ اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ"۔ (اعراف:179)

"اور یقیناً ہم نے جن وانس میں سے اکثر کو جہنم کیلئے پیدا کیا ہے۔ ان کے پاس دل ہیں مگر وہ ان سے سمجھتے نہیں، ان کے پاس آنکھیں ہیں مگر وہ ان سے دیکھتے نہیں اور ان کے پاس کان ہیں مگر وہ ان سے سنتے نہیں۔ یہ لوگ چوپایوں کی مانند بلکہ ان سے بھی گمراہ تر ہیں۔ یہی لوگ غافل ہیں"۔

2۔ "وَاقْتَرَبَ الْوَعْدُ الْحَقُّ فَاِذَا هِىَ شَاخِصَةٌ اَبْصَارُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ؕ يٰوَيْلَنَا قَدْ كُنَّا فِىْ غَفْلَةٍ مِّنْ هٰذَا بَلْ كُنَّا ظٰلِمِيْنَ○"(انبیأ:97)

''اور وعدۂ برحق (قیامت) قریب آچکا ہے، اس وقت کفار کی آنکھیں پتھرا جائیں گی اور وہ کہیں گے: ہائے! ہماری بدبختی، ہم تو اس سے غافل تھے بلکہ ہم تو ظالم تھے''۔

3۔ "وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ وَلَا تَعْدُ عَيْنٰكَ عَنْهُمْ ۚ تُرِيْدُ زِيْنَةَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَلَا تُطِعْ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ عَنْ ذِكْرِنَا وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ وَكَانَ اَمْرُهٗ فُرُطًا○(کھف:28)"

''اور ان لوگوں کے ساتھ رہو جو صبح وشام اپنے رب کا ذکر کرتے ہیں اور اس کی خوشنودی کے طالب ہیں اور دُنیوی خوبصورتی کی طلب میں اُن سے منہ نہ موڑو اور اس شخص کی اطاعت نہ کرو جس کے دل کو ہم نے اپنی یاد سے غافل کر دیا ہے اور وہ اپنی خواہشِ نفس کی پیروی کرتا ہے اور اس کا معاملہ حد سے گزر چکا ہے''۔

4۔ "اِنَّ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا وَرَضُوْا بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَاطْمَاَنُّوْا بِهَا وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنْ اٰيٰتِنَا غٰفِلُوْنَ○ اُولٰٓئِكَ مَاْوٰىهُمُ النَّارُ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ"۔(یونس:7اور8)

''جو لوگ ہماری ملاقات (قیامت) کی اُمید نہیں رکھتے اور دُنیوی زندگی پر خوش اور مطمئن ہیں اور ہماری آیات سے غافل ہیں، اُن کے کئے ہوئے اعمال کی پاداش میں ان کا ٹھکانہ جہنم ہے''۔

5۔ "يَعْلَمُوْنَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۖ وَهُمْ عَنِ الْاٰخِرَةِ هُمْ غٰفِلُوْنَ○"(روم:7)

''یہ صرف دُنیوی زندگی کے ظاہری پہلو کو جانتے ہیں اور آخرت سے غافل ہیں''۔

6۔ "سَاَصْرِفُ عَنْ اٰيٰتِيَ الَّذِيْنَ يَتَكَبَّرُوْنَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ ۭ وَاِنْ يَّرَوْا كُلَّ اٰيَةٍ لَّا يُؤْمِنُوْا بِهَا ۚ وَاِنْ يَّرَوْا سَبِيْلَ الرُّشْدِ لَا يَتَّخِذُوْهُ سَبِيْلًا ۚ وَاِنْ يَّرَوْا سَبِيْلَ الْغَيِّ يَتَّخِذُوْهُ سَبِيْلًا ۭ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَكَانُوْا عَنْهَا غٰفِلِيْنَ○"۔(اعراف:146)

''عنقریب میں اُن لوگوں کو، جو زمین میں ناحق تکبر کرتے تھے، اپنی آیات سے موڑ دوں گا، اگر یہ ساری آیات کو بھی دیکھ لیں، پھر بھی ایمان نہیں لائیں گے، اگر یہ ہدایت کا راستہ دیکھ لیں تو اسے نہیں اپناتے اور اگر گمراہی کا راستہ دیکھ لیں تو اسے اپنا لیتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے ہماری آیات کو جھٹلا دیا اور ان سے غافل تھے''۔

7۔ "فَانْتَقَمْنَا مِنْهُمْ فَاَغْرَقْنٰهُمْ فِي الْيَمِّ بِاَنَّهُمْ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَكَانُوْا عَنْهَا غٰفِلِيْنَ"۔(اعراف:136)

''پس ہم نے اُن سے انتقام لیا اور انہیں دریا میں غرق کر دیا، اس لئے کہ انہوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا اور ان سے غافل تھے''۔

8۔"فَاِذَا رَكِبُوْا فِي الْفُلْكِ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ۚ فَلَمَّا نَجّٰىهُمْ اِلَى الْبَرِّ اِذَا هُمْ يُشْرِكُوْنَ○"(عنکبوت: 65)

''جب وہ کشتی پر سوار ہوتے ہیں تو اخلاص کے ساتھ اللہ کو پکارتے ہیں اور جب وہ انہیں نجات دے کر خشکی تک لے جاتا ہے تو پھر مشرک ہو جاتے ہیں''۔

9۔ "وَمَنْ يَّعْشُ عَنْ ذِكْرِ الرَّحْمٰنِ نُقَيِّضْ لَهٗ شَيْطٰنًا فَهُوَ لَهٗ قَرِيْنٌ○"(زخرف:36)

''جو کوئی اللہ کی یاد سے رُوگردانی کرے، ہم ایک شیطان اُس کے ساتھ لگا دیتے ہیں جو ہمیشہ اُس کے ساتھ رہتا ہے''۔

10۔"اِنَّ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا اِذَا مَسَّهُمْ طٰٓئِفٌ مِّنَ الشَّيْطٰنِ تَذَكَّرُوْا فَاِذَا هُمْ مُّبْصِرُوْنَ○"(اعراف: 201)

''جو لوگ تقویٰ اختیار کرتے ہیں، جب کوئی شیطانی وسوسہ اُن کے دل میں پیدا ہوتا ہے تو وہ اللہ کو یاد کرنے لگتے ہیں اور ان کی بصیرت روشن ہو جاتی ہے''۔

11۔"لَقَدْ كُنْتَ فِيْ غَفْلَةٍ مِّنْ هٰذَا فَكَشَفْنَا عَنْكَ غِطَآءَكَ فَبَصَرُكَ الْيَوْمَ حَدِيْدٌ○"(ق: 22)

''تم اس (قیامت) سے غافل تھے۔ ہم نے تمہارے پردے برطرف کر دیئے ہیں اور اب تمہاری نظر تیز ہے''۔

12۔"وَاَنْذِرْهُمْ يَوْمَ الْحَسْرَةِ اِذْ قُضِيَ الْاَمْرُ ۘ وَهُمْ فِيْ غَفْلَةٍ وَّهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ○"(مریم: 39)

''انہیں حسرت کے دن سے ڈراؤ، اس دن جب سب کچھ ختم ہو جائے گا، مگر یہ غفلت میں پڑے ہوئے ہیں اور ایمان نہیں لاتے''۔

تفسیر

مذکورہ بالا آیات میں سے پہلی آیت میں بدترین انسانوں کا تعارف کروایا گیا ہے۔ایسے لوگ جن سے بدتر شاید کوئی اور نہ ہوگا۔ان کی صفات کا ذکر کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

''ہم نے جن وانس کی کثیر تعداد کو جہنم کیلئے پیدا کیا ہے۔ان کے پاس دل (عقل) ہیں مگر وہ ان کے ذریعے سمجھتے نہیں ہیں،ان کے پاس آنکھیں ہیں مگر وہ دیکھتے نہیں ہیں،ان کے پاس کان ہیں مگر وہ ان سے سنتے نہیں ہیں۔یہ چوپایوں کی مانند بلکہ اُن سے بھی گمراہ تر ہیں اور یہی غافل ہیں۔''

"وَلَقَدْ ذَرَاْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيْرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ ۖ لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا ۡ وَلَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا ۡ وَلَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا ؕ اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ○"(اعراف: 179)

اس آیت میں اس جہنمی گروہ کی بدبختی کی اصل اور بنیادی وجہ غفلت بتائی گئی ہے۔ایسی غفلت جو غور وفکر نہ کرنے اور چشم وگوش کو بروئے کار نہ لانے کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے اور انسان کو ایسے مقام تک پہنچا دیتی ہے کہ وہ چوپایوں سے بھی بدتر ہو جاتا ہے۔اگر چوپائے غفلت میں زندگی بسر کر دیتے ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ غفلت کو دور کرنے والے وسائل سے بے بہرہ ہیں۔لیکن اگر انسان علم وآگہی کے حصول کیلئے ضروری وسائل رکھتے ہوئے بھی غفلت میں ڈوبا رہے تو وہ چوپایوں سے بھی پست ہو جاتا ہے۔

اس آیت سے یہ نتیجہ اخذ کرنا صحیح نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کو جہنمی بننے پر مجبور کر رکھا ہے۔آیت واضح طور پر بتا رہی ہے کہ وہ اپنے اختیار سے جہنم کا انتخاب کرتے ہیں۔انہیں عقل دی گئی لیکن اُسے استعمال نہیں کرتے،اُنہیں آنکھیں اور کان بھی دیئے گئے ہیں مگر یہ ان کا بروئے کار نہیں لاتے اور ان سے حقائق کے ادراک کا کام نہیں لیتے۔

لہٰذا ان کے اس انجام کی وجہ ان کا اپنا طرزِ عمل ہے۔البتہ اللہ تعالیٰ نے ایک مشروط فیصلہ کر رکھا ہے کہ جو لوگ اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ ان صلاحیتوں کو بروئے کار نہیں لائیں گے،ان کا انجام جہنم ہوگا اور ایسا کرنا یا نہ کرنا انسان کے اپنے اختیار میں ہے۔

دوسری آیت میں قیامت کے دن کفار کی حالت کا ذکر کیا گیا ہے۔جب اللہ کا وعدہ قریب آ جائے گا تو کفار پر ایک وحشت طاری ہو جائے گی اور ان کی آنکھیں پتھرا جائیں گی۔ایسے میں وہ چیخ چیخ کر فریاد کریں گے:

ہائے ہماری بدبختی!ہم تو اس ہولناک حقیقت سے غافل تھے،ہم تو ظالم تھے۔

"وَاقْتَرَبَ الْوَعْدُ الْحَقُّ فَاِذَا هِيَ شَاخِصَةٌ اَبْصَارُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ؕ يٰوَيْلَنَا قَدْ كُنَّا فِيْ غَفْلَةٍ مِّنْ هٰذَا بَلْ كُنَّا ظٰلِمِيْنَ○"(انبیأ: 97)

اس آیت سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ یہ کافر بھی غفلت کو ہی اپنی بدبختی کا سبب قرار دیں گے۔ ایسی غفلت جس نے انہیں اپنے آپ پر ظلم کرنے پر لگا دیا، حتیٰ کہ انہوں نے اللہ کے رسولوں اور آسمانی کتب کے ساتھ بھی ظالمانہ رویہ اپنا لیا۔

کفار یہ بات اس وقت کہیں گے جب قیامت کا زلزلہ پوری کائنات کو ہلا کر رکھ دے گا اور غفلت کے پردے چاک ہونے لگیں گے۔ اس وقت توبہ کے دروازے بھی بند ہو چکے ہوں گے۔

آیت میں آنکھوں کیلئے "شَاخِصَة" کا لفظ استعمال ہوا ہے جس کا مصدر "شخوص" (بروزن خلوص) ہے اور یہ شدید حیرت اور ندامت کے وقت آنکھوں کی حرکت کے رک جانے کے معنی استعمال ہوتا ہے۔

تیسری آیت میں رسول ﷺ کو حکم دیا جا رہا ہے کہ کس قسم کے افراد کے ساتھ رہیں اور کس قسم کے افراد کو اپنے آپ سے دور کر دیں۔ رسولؐ اللہ کو حکم دیتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرما رہا ہے:۔

"اپنے آپ کو ان کے ساتھ رکھو جو صبح و شام اللہ کا ذکر کرتے رہتے ہیں اور صرف اس کی خوشنودی کے طالب ہیں، دُنیوی زینت کے حصول کی خاطر ان سے منہ نہ پھیرو اور جن کے دل کو ہم نے اپنی یاد سے غافل کر دیا ہے، ان کی اطاعت نہ کرو، جنہوں نے اپنی نفسانی خواہشات کی پیروی کی اور ان کا معاملہ حد سے گزر گیا"۔

"وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ وَلَا تَعْدُ عَيْنٰكَ عَنْهُمْ ۚ تُرِيْدُ زِيْنَةَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَلَا تُطِعْ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ عَنْ ذِكْرِنَا وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ وَكَانَ اَمْرُهٗ فُرُطًا ○ (کھف:28)"

اس آیت میں جن لوگوں کو رسولؐ اللہ کی صحبت اور ہم نشینی کا اہل قرار دیا گیا، ان کی صفات یہ بتائی گئی ہیں۔ کہ وہ ایمان رکھتے ہیں۔ اللہ کی عبادت کرتے ہیں اور صبح و شام اس کے ذکر میں مشغول رہتے ہیں۔ اس کے برعکس آپ کو ایسے لوگوں کی ہم نشینی اور ان کی بات ماننے سے منع کیا گیا ہے جس کے دل اللہ کی یاد سے غافل ہیں، جو خواہشاتِ نفسانی کی پیروی کرتے ہیں اور ان کا معاملہ حد سے بڑھا ہوا ہے۔

اس آیت سے خواہشاتِ نفسانی کی پیروی اور اس کام میں زیادہ روی کا غفات کے ساتھ باہمی تعلق بخوبی ظاہر ہو جاتا ہے۔ اس آیت کے یہ الفاظ کے "ہم نے ان کے دل کو اپنی یاد سے غافل کر دیا" قابل غور ہیں۔

ان الفاظ سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ جو لوگ خواہشات نفسانی کی پیروی میں حد سے بڑھ جاتے ہیں، اللہ تعالیٰ ان کو یہ سزا دیتا ہے کہ ان کے دل اللہ کی یاد سے غافل ہو جاتے ہیں۔

اس آیت کے شان نزول کے بارے میں ہے کہ رسولؐ اللہ کے دور کے چند دولت مند متکبر رسولؐ اللہ کے پاس آئے اور کہنے لگے: "اے محمد! اگر آپ صدرِ محفل ہوں اور ان لوگوں کو محفل سے دور کر دیں جن کے لباس اور جسم کی بدبو سے ہمارا دم گھٹنے لگتا ہے

اور جنہوں نے سخت اور کھردرا لباس پہنا ہوتا ہے تو پھر آپ کی محفل ہم جیسے اشراف کے شایانِ شان ہوگی۔ اس وقت ہم بھی آپ کی محفل میں شریک ہو کر آپؐ کے ارشادات سنیں گے، لیکن ان لوگوں کی موجودگی میں آپ کی محفل میں ہماری کوئی جگہ نہیں ہوگی۔

اللہ تعالیٰ ان لوگوں کی حقیقت کو جانتا تھا اور اسے معلوم تھا کہ یہ لوگ ایسے ہیں کہ صلح و جنگ، دونوں میں ان پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا اور نہ اُن کی سوچ ایسی ہے کہ اس سے استفادہ کیا جا سکے۔ لہٰذا اللہ نے جناب رسولِؐ خدا کو ان کے بارے میں خبردار کر دیا۔

چوتھی آیت میں اہلِ جہنم کی بعض صفات کا ذکر کیا گیا ہے:

''جو ہماری ملاقات کی اُمید نہیں رکھتے (قیامت پر ایمان نہیں رکھتے) بلکہ صرف دُنیوی زندگی پر راضی اور مطمئن ہیں اور جو ہماری آیات سے غافل ہیں، ان کے اعمال کی وجہ سے اُن کا ٹھکانہ جہنم ہے''۔

اس آیت میں جو بات سب سے آخر میں اور زور دے کر کہی گئی ہے، وہ ''اللہ تعالیٰ کی آیات سے غفلت'' ہے جو آخرت کے افکار اور دنیا پر اعتماد کی بنیادی وجہ ہے۔ اس کے برعکس اہلِ جنت کی خوش قسمتی اور سعادت کی بنیادی وجہ عرفان و آگہی اور اللہ کا ذکر ہے جس کا ذکر اگلی آیت میں کیا گیا ہے۔

تفسیر رُوح البیان میں اس آیت کے ذیل میں ایک حدیث قدسی میں ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

''میں تین قسم کے لوگوں پر حیران ہوں: ایک وہ جو دوزخ پر ایمان رکھتے ہیں اور پھر ہنستے ہیں، دوسرے وہ جو دُنیا سے دل لگائے ہوئے ہیں اور یہ بھی جانتے ہیں کہ انہیں اس سے جدا ہونا ہے، تیسرے وہ جو غافل ہیں مگر یہ جانتے ہیں کہ اللہ اور اس کے فرشتے ان سے غافل نہیں ہیں اور پھر بھی وہ لہو ولعب میں مصروف ہیں''۔

اسی کتاب میں اس حدیث کے ذیل میں نعمان بن منذر کا واقعہ بھی نقل کیا گیا ہے جو زمانہ جاہلیت میں حیرہ کا بادشاہ تھا۔ ایک دن اُس نے ایک درخت کے نیچے لہو ولعب کی محفل برپا کی۔ اُس کا ایک دوست جس کا نام عدی تھا، اُس سے بولا کہ اے بادشاہ! یہ درخت ایک آواز دے رہا ہے، کیا تم جانتے ہو کہ یہ کیا پکار رہا ہے؟ بادشاہ نے کہا: نہیں۔ تم ہی بتاؤ کہ یہ کیا کہہ رہا ہے؟ عدی نے جواب دیا کہ یہ درخت کہہ رہا ہے:

رُبَّ رَکبٍ قَدانَاخُوا حَولَنا
یَمزَجُون الخَمرَ بِالمَأ الزُّلالِ
ثُمَّ اَضقَحُوا اَسَفَ الدَّ هرِبِهِم
وَ کَذٰلِكَ الدَّهرُ حَالًا بَعد حالٍ

''کتنے ہی شہسوار ہماری طرف آ کر گھوڑوں سے اُترے اور انہوں نے عیش و عشرت کی محفل برپا کی اور شراب کو آبِ زلال میں ملا کر پیا لیکن جلد ہی زمانے کے طوفان نے ان کی بساط اُلٹ دی۔ یہ ہے دُنیا اور ہر زمانے کے

بعدآنے والے زمانے کا حال''۔(رُوح البیان:18:4)

پانچویں آیت میں اُن لوگوں کا ذکر ہے جو دُنیوی زندگی کے ظاہر پر قناعت کئے بیٹھے ہیں اور اس دُنیا کی حقیقت اور اس کے اسرار سے غافل ہیں۔اللہ تعالیٰ ان کے بارے میں فرماتا ہے:

''کفار کی یہ جماعت صرف دنیوی زندگی کے ظاہر کو جانتی ہے اور آخرت سے غافل ہے''۔

"يَعْلَمُوْنَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۖ وَهُمْ عَنِ الْاٰخِرَةِ هُمْ غٰفِلُوْنَ○"(روم:7)

اگر غفلت کا منحوس سایہ ان کے دِلوں پر پڑا ہوا نہ ہوتا تو دُنیوی زندگی میں بھی قدم قدم پر اور جگہ جگہ اللہ اور آخرت کی نشانیاں نظر آتیں۔قرآن مجید زمین وآسمان کی ہر چیز کو اور اس دُنیا پر حاکم نظام کو اللہ کی نشانیاں قرار دیتا ہے۔اسی دُنیا میں رونما ہونے والے حوادث میں آخرت کی نشاندہی کرنے والی نشانیاں بھی موجود ہیں۔بات صرف اتنی سی ہے کہ جن کے قلب زندہ اور دل کی آنکھیں اور کان زندہ ہیں، وہی اس نغمۂ توحید کو سن سکتے ہیں اور جن کے دلوں کو غفلت نے اندھا کر دیا ہے، وہ اسے نہیں سن سکتے۔

یہاں پر اس نکتہ کا ذکر بے جا نہ ہوگا کہ ''ھُم'' کی ضمیر کی تکرار اس بات پر زور دینے کیلئے ہے کہ ان کی یہ غفلت ہی ان کی ظاہر بینی اور حقیقت سے دوری کا سبب ہے۔

یہ بھی ضرور پیشِ نظر ہے کہ ''غفلت'' کا لفظ وہاں استعمال ہوتا ہے جہاں آگہی کے حصول کے ذرائع موجود ہوں لیکن انسان خواہشاتِ نفسانی کے غلبے یا ایمان کی کمزوری کی وجہ سے یا دیگر وجوہات کی بنیاد پر انہیں نظر انداز کر دے۔اس بات کی دلیل یہ ہے کہ سورۂ روم کی اس آیت کے بعد والی آیات میں، جن میں اللہ تعالیٰ نے ہمارے اندر اور کائنات میں پھیلی ہوئی توحید اور قیامت کی نشانیوں کا ذکر کر کے غافلوں کو خبردار کیا ہے۔

چھٹی آیت میں کفار کے خطرناک ترین گروہ کا ذکر کیا جا رہا ہے۔یہ ایسے کافر ہیں جو کفر سے آلودہ ہونے کے ساتھ ساتھ تکبر وتعصب اور لجاجت جیسی بیماریوں میں بھی مبتلا ہیں۔آیت کے اختتام پر ان کی بدبختی کی وجہ بھی غفلت بتائی گئی ہے۔

اللہ تعالیٰ فرما رہا ہے:''عنقریب میں ان لوگوں کو، جو زمین میں ناحق تکبر کرتے ہیں، اپنی آیات سے موڑ دوں گا۔اگر یہ ساری آیات کو بھی دیکھ لیں تو ایمان نہیں لائیں گے۔اگر یہ ہدایت کا راستہ دیکھ لیں تو اسے نہیں اپناتے اور اگر گمراہی کا راستہ دیکھ لیں تو اسے اپنا لیتے ہیں۔اس کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا اور ان سے غافل تھے''۔

"سَاَصْرِفُ عَنْ اٰيٰتِيَ الَّذِيْنَ يَتَكَبَّرُوْنَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ ۭ وَاِنْ يَّرَوْا كُلَّ اٰيَةٍ لَّا يُؤْمِنُوْا بِهَا ۚ وَاِنْ يَّرَوْا سَبِيْلَ الرُّشْدِ لَا يَتَّخِذُوْهُ سَبِيْلًا ۚ وَاِنْ يَّرَوْا سَبِيْلَ الْغَيِّ يَتَّخِذُوْهُ سَبِيْلًا ۭ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَكَانُوْا عَنْهَا غٰفِلِيْنَ○"۔(اعراف:146)

''سَاَصۡرِفُ عَنۡ اٰیٰتِیَ''، ''میں اپنی آیات سے موڑ دوں گا'' کے بارے میں مفسرین نے بہت زیادہ مباحث کی ہیں۔اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ کا کام تو آیات کی طرف ہدایت دینا ہے، تمام انبیاؑ واوصیاؑ، جو اس کی طرف سے آئے، اُن کی بھی یہی ذمہ داری تھی۔ پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ ایک خاص گروہ کو اپنی آیات سے موڑ دے اور ایمان لانے سے روک دے؟

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ قرآن شریف کی آیات میں غور وفکر کرنے سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ انسان کے بعض اعمال جیسے تکبر، تعصب اور لجاجت وغیرہ کے نتیجہ میں اس کے دل پر تاریکی کا ایک حجاب ڈال دیتے ہیں، جس کی وجہ سے وہ مشاہدۂ جمالِ حق کی نعمت سے محروم ہوجاتا ہے۔درحقیقت یہ ان کے اپنے برے اعمال ہیں جو حجاب بن جاتے ہیں۔اس کو اللہ تعالیٰ کیطرف نسبت دینے کی وجہ یہ ہے کہ ان اعمال کا یہ اثر اللہ تعالیٰ نے رکھا ہے۔ بالفاظِ دیگر اس طرح بھی کہا جاسکتا ہے کہ جو لوگ اس طرح کے اعمال انجام دیتے ہیں، قدرت اُنہیں اس کی یہ سزا دیتی ہے کہ ان کا رُخ اللہ کی آیات کی طرف سے مڑ جاتا ہے۔

آیت کے اختتام پر اس بات پر زور دیا جارہا ہے کہ ان کو آیاتِ الٰہی سے موڑنے کی وجہ ان کا اللہ کی آیات کو جھٹلانا اور اس کی نشانیوں سے غافل رہنا ہے۔

ساتویں آیت، قرآن شریف میں ان آیات کے بعد واقع ہے جن میں فرعون اور اس کے ساتھیوں کے حق کے خلاف سرکشی اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بددُعا کی وجہ سے ان پر مختلف قسم کی سزاؤں کے نزول کا ذکر ہے۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ فرمارہا ہے:

''ہم نے ان سے انتقام لیا اور انہیں دریا میں غرق کردیا، اس لئے کہ وہ ہماری آیات کو جھٹلاتے تھے اور ان سے غافل تھے''۔(اعراف:136)

''فَانۡتَقَمۡنَا مِنۡهُمۡ فَاَغۡرَقۡنٰهُمۡ فِی الۡیَمِّ بِاَنَّهُمۡ كَذَّبُوۡا بِاٰیٰتِنَا وَكَانُوۡا عَنۡهَا غٰفِلِیۡنَ''۔

اس آیت میں قومِ فرعون کی ہلاکت وبدبختی کی وجہ آیات الٰہی کی تکذیب اور ان کی غفلت بتائی گئی ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ تکذیبِ آیاتِ الٰہی کی وجہ بھی ان کی غفلت ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ انہوں نے بعض آیات کی تکذیب کی ہو اور بعض سے غفلت برتی ہو۔اس صورت میں تکذیب اور غفلت میں سے ہر ایک ان پر آنے والے عذاب کا ایک مستقل سبب قرار پائیں گی۔

بعض مفسرین نے کہا کہ ''عَنۡهَا'' میں ''هَا'' کی ضمیر عذاب اور انتقام کی طرف لوٹ رہی ہے۔اگر یہ بات صحیح ہو تو آیاتِ الٰہی کی تکذیب ہی انکی ہلاکت کا سبب قرار پاتی ہے۔لیکن یہ احتمال بہت کمزور ہے، اس لئے کہ یہ ضمیر آیاتِ الٰہی کے بعد بیان ہوئی ہے اور اس کا تعلق بھی آیات الٰہی سے بنتا ہے۔

آٹھویں آیت میں اگرچہ غفلت کا لفظ استعمال نہیں ہوا ہے لیکن اس کا مفہوم اس آیت میں جھلکتا دکھائی دیتا ہے۔ یہ آیت جنابِ رسولِ اللہ کے دَور کے مشرکین کے بارے میں ہے جو شدید غفلت میں مبتلا تھے۔کبھی کبھی وہ غفلت کی نیند سے بیدار ہوجاتے تھے اور کبھی کبھی مکمل طور پر اس میں غرق ہوجاتے تھے۔اللہ تعالیٰ ان کے بارے میں فرمارہا ہے۔

''جب یہ کشتی پر سوار ہوتے ہیں (طوفان کی لہریں ان کی کشتی کو چاروں طرف سے گھیر لیتی ہیں) تو وہ اخلاص کے ساتھ اللہ کو پکارنے لگتے ہیں لیکن جب اللہ انہیں نجات دے کر خشکی تک لے جاتا ہے تو وہ پھر مشرک بن جاتے ہیں''۔

"فَاِذَا رَكِبُوْا فِي الْفُلْكِ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ۚ فَلَمَّا نَجّٰىهُمْ اِلَى الْبَرِّ اِذَا هُمْ يُشْرِكُوْنَ○"(عنکبوت: 65)

خطرناک طوفان کی ہلاکت آفرینی کو دیکھ کر ان کے دل اور چشم وگوش پر پڑے ہوئے غفلت کے پردے برطرف ہوجاتے ہیں، ان کی عقل اور عقل کے چشم وگوش فعال ہوجاتے ہیں۔ بعض لوگ اس بیداری کو غنیمت جان کر اپنی گزشتہ روش کو ترک کر دیتے ہیں لیکن اکثر لوگ خطرہ ٹل جانے کے بعد دوبارہ شرک کی راہ پر چل پڑتے ہیں۔

بعض مفسرین نے اس آیت میں لکھا ہے کہ عرب کے مشرکین دریائی سفر میں اپنے بت بھی کشتی میں اپنے ساتھ رکھتے تھے تاکہ ان کی برکت سے وہ طوفان وغیرہ جیسے حوادث سے محفوظ رہیں۔ لیکن جب وہ اپنی کشتی کو طوفانی لہروں میں گھرا ہوا دیکھتے تھے تو بتوں کو دریا میں پھینک کر ''یا اللہ، یا اللہ'' کہنے لگتے تھے۔ (روح البیان ,493:6)

نویں آیت میں ایک عام ضابطہ بیان کیا جارہا ہے جو تمام اقوام پر صادق آتا ہے۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ یہ فرمارہا ہے:

''جو کوئی اللہ کے ذکر سے رُوگردانی کرتا ہے، ہم ایک شیطان اُس کے ساتھ لگا دیتے ہیں جو ہمیشہ اُس کے ساتھ رہتا ہے''۔

"وَمَنْ يَّعْشُ عَنْ ذِكْرِ الرَّحْمٰنِ نُقَيِّضْ لَهٗ شَيْطٰنًا فَهُوَ لَهٗ قَرِيْنٌ○"(زخرف: 36)

اس کے برعکس اللہ تعالیٰ کا ذکر فرشتوں کی ہم نشینی کا سبب بنتا ہے۔

"اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ....."۔

''جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ اللہ ہمارا رب ہے اور پھر اس پر ثابت قدم رہتے ہیں، اُن پر فرشتے نازل ہوتے ہیں''۔

ان دونوں آیات سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اللہ کی یاد سے رُوگردانی کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان پر شیطان مسلط ہو جاتا ہے جبکہ اللہ کی یاد کا اثر یہ ہوتا ہے کہ فرشتے انسان کی مدد کیلئے نازل ہوتے ہیں۔

جنابِ رسولؐ خدا سے مروی ایک حدیث میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا:

"اِذَا أَرَادَاللّٰهُ بِعَبْدٍشَرًّا قَيَّضَ لَهُ شَيْطَاناً قَبْلَ مَوْتِهٖ بِسَنَةٍ، فَلَايَرٰى حَسَنًا اِلَّاقَبَّحَهُ عِنْدَهٗ حَتّٰى لَايَعْمَلُ بِهٖ، وَلَايَرٰى قَبِيْحًا اِلَّاحَسَّنَهُ حَتّٰى يَعْمَلُ بِهٖ"۔

''جب اللہ تعالیٰ کسی بندے کے بارے میں شر کا ارادہ کرتا ہے تو اس کی موت سے ایک سال قبل ایک شیطان

اس کے ساتھ لگا دیتا ہے۔ اس کے بعد ہر اچھا عمل اسے برا نظر آنے لگتا ہے، یہاں تک کہ وہ اسے ترک کر دیتا ہے اور برا عمل اسے اچھا نظر آنے لگتا ہے، یہاں تک کہ وہ اسے کر گزرتا ہے"۔ (رُوح البیان، 369:8)

دسویں آیت میں ان متقی افراد کا ذکر ہے جو غفلت کا شکار ہو جانے یا شیطانی وسوسوں سے دوچار ہو جانے کی صورت میں فوراً اللہ کے ذکر کے ذریعے غفلت کے پردوں کو چاک کر دیتے ہیں، جس کے نتیجہ میں ان کی بصیرت روشن ہو جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

"جن لوگوں نے تقویٰ کی روِش اختیار کی، جب وہ شیطانی وسوسوں میں گرفتار ہوتے ہیں تو اللہ کو یاد کرتے ہیں اور فوراً ان کی بصیرت روشن ہو جاتی ہے۔" (اعراف:201)

"اِنَّ الَّذِیۡنَ اتَّقَوۡا اِذَا مَسَّهُمۡ طٰٓئِفٌ مِّنَ الشَّیۡطٰنِ تَذَکَّرُوۡا فَاِذَا هُمۡ مُّبۡصِرُوۡنَ ○"

اس آیت سے یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ اللہ کا ذکر انسان کے دل کی آنکھ کو بینا کر دیتا ہے جبکہ غفلت انسان کے دل پر شیطان کے تسلط کی راہ ہموار کر دیتی ہے۔

اس آیت میں لفظ "طٰٓئِف" استعمال ہوا ہے جس کے معنی ہیں "طواف کرنے والا"۔ اس سے مراد وہ وسوسے ہیں جو شیطان کی طرف سے آ کر انسان کے دل کا طواف کرنے لگتے ہیں تاکہ اس میں داخل ہونے کی راہ تلاش کریں اور اس کعبے کو بت خانے میں بدل دیں۔ جب انسان اللہ سے غافل ہوتا ہے تو ان وسوسوں کو دل میں داخل ہونے کی راہ مل جاتی ہے لیکن جیسے ہی انسان اللہ کا ذکر کرنے لگتا ہے تو یہ وسوسے انسان کے دل سے دور ہو جاتے ہیں اور اللہ کی رحمت کا نور اس میں چمکنے لگتا ہے۔

گیارھویں آیت میں اُن غافلوں کا ذکر ہے جو ساری زندگی غفلت میں گزار دیتے ہیں۔ جیسے ہی اجل کا طمانچہ ان کے منہ پر لگتا ہے اور ان کی زندگی کے سارے اعمال ان کی نظر کے سامنے آ جاتے ہیں تو ان پر شدید وحشت طاری ہو جاتی ہے۔ اس وقت ان سے کہا جاتا ہے:

"یہ وہی حقیقت ہے جس سے تم فرار کرتے تھے"۔

اس کے بعد قیامت کے منظر کا ذکر کیا گیا ہے کہ جب وہ میدانِ محشر میں لائے جائیں گئے اور ان کے اعمال کے گواہ اللہ کی عدالت میں ان کے اعمال کی گواہی دینے کیلئے آئیں گے تو ایک شدید وحشت ان کے سارے وجود پر مسلط ہو جائے گی۔ اس حالت میں ان سے یہ کہا جائے گا:

"تم اس حقیقت سے غافل تھے اور ہم نے تمہاری غفلت کا پردہ چاک کر دیا ہے، اب تمہاری نظر خوب تیز ہے"۔

"لَقَدۡ کُنۡتَ فِیۡ غَفۡلَةٍ مِّنۡ هٰذَا فَکَشَفۡنَا عَنۡکَ غِطَآءَکَ فَبَصَرُکَ الۡیَوۡمَ حَدِیۡدٌ ○" (ق:22)

قیامت کے دن اللہ کے دو کارندے اللہ کی عدالت میں انسان کے ساتھ ہوں گے۔ ان میں سے ایک اسے ہانکتا ہوا عدالت الٰہیہ میں لے کر آئے گا اور دوسرا اس عدالت میں اس کے اعمال کی گواہی دے گا۔

ممکن ہے یہ وہی دو فرشتے ہوں جو دُنیا میں انسان کے اچھے اور برے اعمال لکھنے کا فریضہ انجام دیتے ہیں۔ انسان اس دُنیا میں ان فرشتوں کو نہیں دیکھ سکتا اور کفار تو ان پر ایمان بھی نہیں رکھتے تھے لیکن قیامت کے دن جب غفلت کے حجاب اُٹھ جائیں گے تو ان کی آنکھیں سب کچھ دیکھنے لگیں گی۔

بارہویں اور آخری آیت میں قیامت کے دن غافلوں کی حالت بیان کی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

''انہیں حسرت کے دن سے ڈراؤ جس دن سب کچھ ختم ہو چکا ہوگا۔ انکی حالت یہ ہے کہ یہ غفلت میں پڑے ہوئے ہیں اور ایمان نہیں لاتے''۔ (مریم:39)

''وَاَنْذِرْهُمْ يَوْمَ الْحَسْرَةِ اِذْ قُضِيَ الْاَمْرُ ۘ وَهُمْ فِيْ غَفْلَةٍ وَّهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝''(مریم:39)

قیامت کے ناموں میں سے ایک نام ''یَوْمَ الْحَسْرَۃِ'' ہے، اس لئے کہ اس دن غافل اور بے خبر خوابِ غفلت سے بیدار ہوں گے اور اپنے اعمال کا مشاہدہ کریں گے۔ ایک طرف سے ان کا اعمال نامہ، دُوسری طرف سے گواہی دینے والے فرشتے، اور سب سے دردناک بات یہ کہ انسان کے اپنے اعضا بھی اس کے خلاف گواہی دیں گے۔ ایسے میں ندامت اور حسرت کی آگ میں جلنے کے سوا انسان کے پاس کوئی چارہ نہ ہوگا، تلافی کی بھی کوئی صورت ممکن نہ ہوگی۔ اس وقت فرشتے ان کی سرزنش کرتے ہوئے ان سے کہیں گے:

''یہ سب تمہاری غفلت کا پھل ہے''۔

نتیجہ:۔

مندرجہ بالا آیات سے ہم یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ اللہ کی یاد سے غفلت کے نتیجہ میں جو خطرہ ہماری فلاح وسعادت کو لاحق ہو سکتا ہے، وہ اس قدر بڑا ہے کہ غالباً اس کا تصور بھی ممکن نہیں۔ غفلت ہماری سعادت کی تمام بنیادوں کو منہدم کر دیتی ہے اور بھڑکتی ہوئی آگ کی طرح زندگی کو جلا کر راکھ کر دیتی ہے اور انسان کی تمام خداداد صلاحیتوں کو ناکارہ اور بے اثر کر دیتی ہے۔

غفلت، احادیث کی روشنی میں

کتبِ احادیث میں غفلت اور اس کے مہلک نتائج کے بارے میں بکثرت ایسی احادیث موجود ہیں جو انسان کو ہلا کر رکھ دیتی ہیں۔ ہم نمونے کے طور پر چند احادیث یہاں درج کرتے ہیں:

1۔ جب جنابِ رسولِ خدا معراج پر تشریف لے گئے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپؐ سے خطاب ہوا:

"يَاَحْمَدُ اَنْتَ لَا تَغْفَلْ اَبَدًا مَنْ غَفَلَ عَنِّیْ لَا اُبَالِیْ بِاَیِّ وَادٍ هَلَكَ"۔

''اے احمدؐ! مجھ سے کسی بھی لمحے غافل نہ ہونا، اس لئے کہ جو مجھ سے غافل ہوتا ہے، میں اُس کی پرواہ نہیں کرتا کہ وہ کس گڑھے میں گر کر ہلاک ہوتا ہے''۔(ارشاد القلوب، مطبوعہ بیروت، 214:1)

اس حدیث سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ غفلت کا انجام ہلاکت ہوتا ہے۔

2۔ امیر المومنین علیہ السلام ایک مختصر مگر پر معنی جملے میں فرماتے ہیں:

"اَلْغَفْلَةُ اَضَرُّ الْاَعْدَاءِ"۔ (شرح فارسی غرر الحکم، 128:1)

''غفلت سب سے زیادہ نقصان دہ دُشمن ہے''۔(کیونکہ یہی تمام گناہوں کی جڑ ہے)۔

3۔ ایک اور حدیث میں آپؑ فرماتے ہیں:

"اَلْغَفْلَةُ تَكْسِبُ الْاِغْتِرَارَ۔ وَتُدْنِیْ مِنَ الْبَوَارِ"۔ (شرح فارسی غرر الحکم، 295:7)

''غفلت انسان کو فریب دے کر ہلاکت کے قریب کر دیتی ہے''۔

4۔ آپؑ ہی سے مروی ہے:

"اَلْغَفْلَةُ ضَلَالُ النُّفُوْسِ وَعُنْوَانُ النُّحُوْسِ"۔ (شرح فارسی غرر الحکم، 369:1)

''غفلت دِلوں کی گمراہی اور نحوست کا عنوان ہے''۔

5۔ ایک اور حدیث میں آپؑ فرماتے ہیں:

"وَيْلٌ لِّمَنْ غَلَبَتْ عَلَيْهِ الْغَفْلَةُ فَنَسِيَ الرَّحْلَةَ وَلَمْ يَسْتَعِدَّ"۔

''ہلاکت ہے اُس شخص کیلئے جس پر غفلت غالب آجائے اور وہ اپنے سفر کو بھول جائے اور خود کو اس کیلئے آمادہ نہ کرے''۔(شرح فارسی غرر الحکم، 227:6)

6۔ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

"اِنْ كَانَ الشَّيْطَانُ عَدُوًّا فَالْغَفْلَةُ لِمَاذَا"۔ (بحار الانوار 190:75)

''جب شیطان انسان کا دُشمن ہو تو پھر غفلت کس لئے؟''

مندرجہ بالا احادیث میں جس غفلت کا ذکر کیا گیا ہے، اس سے ''اللہ سے غفلت''، ''قیامت سے غفلت'' اور ''شیطانی وسوسوں سے غفلت'' مراد ہے۔

7۔ ایک حدیث میں حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

"فَيَالَهَاحَسْرَةً عَلٰى كُلِّ ذِىْ غَفْلَةٍ اَنْ يَكُوْنَ عُمُرُهٗ عَلَيْهِ حُجَّةً وَاَنْ تُؤَدِّيَهُ اَيَّامُهٗ اِلَى الشَّقْوَةِ"(نہج البلاغہ، خطبہ:64)

''ہلاکت ہے ہر غافل کیلئے جس کی عمراس کے خلاف حجت ہے اوراس کی زندگی کے ایام اسے بدبختی تک لے جائیں''۔

یہاں غفلت سے مراد یہ ہے کہ انسان ساری زندگی اپنے انجام سے غافل رہے۔

8۔ غفلت کا مسئلہ اس قدر حساس ہے اوراہم ہے کہ انبیاؑ کی بعثت کا ایک مقصد غفلت کی بیماری کا علاج کرنا بیان کیا گیا ہے۔

نہج البلاغہ خطبہ 108 میں امیرالمومنینؑ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صفات کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"مُتَتَبِّعٌ بِدَوَائِهٖ مَوَاضِعَ الْغَفْلَةِ وَمَوَاطِنَ الْحَيْرَةِ"۔

''آپؐ ایسے طبیب تھے جوغفلت کی بیماری کی دوا تیار کر کے غفلت کے مریضوں کے پیچھے پھرتے تھے''۔

9۔ ایک اورحدیث میں غفلت کے برے نتائج کا ذکر کرتے ہوئے آپؐ فرماتے ہیں:

"بَيْنَكُمْ وَبَيْنَ الْمَوْعِظَةِ حِجَابٌ مِنَ الْغَفْلَةِ وَالْغِرَّةِ"۔

''غفلت اورغرور تمہارے اورنصیحت کے درمیان حجاب بن جاتے ہیں''۔(شرح فارسی غررالحکم، 296:7)۔

10۔ احادیث میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں آیا ہے کہ آپؑ ایک ایسی بستی کے پاس سے گزر رہے تھے جس کے سب باشندے اللہ کے غضب کا نشانہ بن کر ہلاک ہو گئے تھے۔آپؑ نے ان میں سے ایک کو زندہ کیا اوراس سے پوچھا کہ تم لوگ کیسے اعمال کرتے تھے جن کی وجہ سے عذابِ خدا کا نشانہ بنے ہو؟ اُس نے جواب دیا: ہمارے اعمال یہ تھے: بت پرستی، حُبِ دُنیا، خوف کی کمی، لمبی آرزوئیں اورغفلت کے ساتھ لہوولعب۔(سفینۃ البحار، مادہ غفل)۔

11۔ امیرالمومنین علیہ السلام غفلت کے اجتماعی پہلو کے بارے میں فرماتے ہیں:

"مِنْ دَلَائِلِ الدُّوْلَةِ قِلَّةُ الْغَفْلَةِ"۔(شرح فارسی غررالحکم، 296:7)

''حکومتوں کی ترقی کی وجہ غفلت کی کمی ہے''۔

بے شک معاشرتی اورقومی معاملات میں غفلت اور بے توجہی عظیم نقصان کا باعث ہوتی ہے۔

12۔ ہم اس بحث کو امیرالمومنینؑ کے اس ارشاد پر ختم کرتے ہیں جس میں آپؑ نے انتہائی بلیغ انداز میں لوگوں

کوخطاب کر کے فرمایا:

"اِتَّقِ اَیُّهَا السَّامِعُ مِنْ سَکْرَتِكَ وَاسْتَیْقِظْ مِنْ غَفْلَتِكَ، وَاخْتَصِرْ مِنْ عَجَلَتِكَ"۔ (شرح فارسی غرر الحکم، 296:7)

''اے سننے والے! اپنی بے ہوشی سے باز آ، اپنی غفلت سے بیدار ہو اور اپنی جلد بازی کو کم کر''۔

مولائے متقیان علیہ السلام کے اس ارشاد کی رُو سے تین چیزیں انسان کی بدبختی اور ہلاکت کا سبب ہیں:

''شہوت پرستی کی بے ہوشی و مستی، حقائق سے غفلت اور کاموں میں جلد بازی''۔

نتیجہ:۔

اگر چہ لوگوں کی اکثریت غفلت کے خطرناک نتائج سے بے خبر ہے لیکن عظیم الٰہی پیشوا ان نتائج اور المیوں کو دیکھتے تھے، لہٰذا اُنہوں نے مختلف اسالیب میں لوگوں کو خبردار کیا جس کی مثالیں ہم مذکورہ بالا احادیث میں دیکھ سکتے ہیں۔

ایک بار پھر اس نکتہ کی یاد آوری ضروری ہے کہ غفلت کا مفہوم بہت وسیع ہے۔ اللہ سے غفلت، آخرت سے غفلت، دُنیا کی ناپائیداری سے غفلت، شیطان کے مکر اور وسوسوں سے غفلت اور مختصر الفاظ میں وہ تمام اُمور جو انسان کی سعادت و ہلاکت میں مؤثر کردار ادا کرتے ہیں، ان سب سے غفلت، غفلت کے وسیع مفہوم میں داخل ہیں۔

غفلت کے بارے میں اہم نکات

اگر چہ غفلت انسان کی عاقبت پر غیر معمولی اثرات مرتب کرتی ہے اور اس کا شمار صفاتِ رذیلہ میں ہوتا ہے لیکن معلوم نہیں علمائے اخلاق نے اس کو کیوں اہمیت نہیں دی؟ اُنہوں نے یا تو اس کے بارے میں سرے سے کوئی بات نہیں کی یا بہت کم بات کی ہے۔ بہر حال اس بحث سے متعلق چند باتیں بہت اہم ہیں۔ ہم ایک ایک کر کے ان کا ذکر کرتے ہیں:

غفلت کے اسباب

الف۔ جہالت:۔

غفلت اور بے خبری کی ویسے تو بہت سی وجوہات ہیں لیکن ان میں سب سے پہلی وجہ جہالت اور لاعلمی ہے۔ اللہ کے مقام، قیامت، دنیوی مال و مقام کی ناپائیداری اور شیطانی وسوسوں اور فریب کاریوں سے لاعلمی غفلت کا سب سے اہم سبب ہے۔

امیر المومنین علیہ السلام فرماتے ہیں:

"اِنَّ مَنْ عَرَفَ الْاَیَّامَ لَمْ یَغْفَلْ عَنَ الْاِسْتِعْدَادِ"۔(میزان الحکمہ، 15189:3)

''جوشخص دُنیا کی حقیقت کو پہچان لے، وہ آخرت کی تیاری سے غافل نہیں ہوتا''۔

ب۔غروراورخود پسندی:۔

غرور اور خود پسندی بھی غفلت کا ایک اہم سبب ہے، اس لئے کہ مغرور اور خود پسند انسان صرف اپنی کامیابیوں پر نظر رکھتا ہے اوران پر خوشی سے پھولتا رہتا ہے۔وہ اپنی ان کامیابیوں کولازوال اوردائمی سمجھنا شروع کردیتا ہے اوریہی بات اس کی غفلت اورآگے چل کراس کی شکست اورناکامی کااہم سبب بن جاتی ہے۔

تاریخ میں ایسے افراد کی مثالیں بکثرت ملتی ہیں جوغرور اورخود پسندی کی وجہ سے غفلت کا شکار ہوگئے اورشکست وناکامی ان کامقدر بن گئی۔

ج۔نعمتوں کا نشہ:۔

نعمتوں کا نشہ بھی غرور اورخود پسندی کے نشے کی مانند ہوتا ہے اورانسان کوغفلت کے گرداب میں پھینک دیتا ہے۔جب کم ظرف افراد کے پاس نعمتوں کی فراوانی ہوجائے تووہ اپنے اردگردموجودحقائق سے بےخبراورغافل ہوجاتے ہیں، یہاں تک کہ جب موت کاطمانچہ اُن کے گال پر پڑتا ہے توانہیں ہوش آتی ہے۔اس بارے میں امیرالمومنین علیہ السلام فرماتے ہیں:

"مَنْ غَفَلَ عَنْ حَوَادِثِ الْاَیَّامِ اَیْقَظَهُ الْحِمَامُ"۔(شرح فارسی غررالحکم، 297:6)

''جوشخص حوادثِ زمانہ سے غافل ہوجائے،موت اُس کو بیدارکردیتی ہے''۔

اس بارے میں حضرت امام زین العابدین علیہ السلام فرماتے ہیں:

"اِنَّ قَسْوَةَ الْبَطْنَةِ وَ كَظَّةَ الْمَلَاهِوَسَكْرَ الشَّبَعِ، وَغَرَّةَ الْمِلْكِ مِمَّا يُشَبِّطُ وَيُبْطِئُ عَنِ الْعَمَلِ وَيَنْسِي الذِّكْرَ وَيُلْهِي عَنِ اقْتِرَابِ الْاَجَلِ حَتّٰى كَاَنَ الْمُبَلَّىَ بِحُبِّ الدُّنْيَابِهٖ خَبْلٌ مِنْ سُكْرِ الشَّرَابِ"۔(تحف العقول:311)

''شکم پرستی اورشکم سیری کی مستی اورحکومت کا نشہ انسان کومیدانِ عمل میں سست کردیتا ہے،اللہ کے ذکر سے غافل کردیتا ہے،موت کے قریب ہونے سے بےخبرکردیتا ہے، یہاں تک کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویاحُبِ دُنیا کے نشے میں مست انسان شراب کے نشے میں مست ہے''۔

د۔جسمانی صحت:۔

صحت اور تندرستی اللہ تعالیٰ کی عظیم نعمتوں میں سے ہے لیکن یہ بھی غفلت کے اسباب میں سے ایک سبب ہے۔لہٰذا یہ بھی اللہ تعالیٰ کا ایک پوشیدہ احسان ہے کہ وہ کبھی کبھی صحت اور تندرستی کی نعمت انسان سے لے لیتا ہے اور بیماری اور درد میں مبتلا کر دیتا ہے جس کی وجہ سے انسان کی عقل سے غفلت کے پردے برطرف ہو جاتے ہیں اور اُس کے دل کی آنکھیں حقائق کو دیکھنے کے قابل ہو جاتی ہیں اور وہ انکے مطابق زندگی میں مناسب رویہ اپنا لیتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ جنابِ رسولؐ خدا نے ایک مرتبہ سلمان فارسیؓ کی عیادت کرتے ہوئے فرمایا کہ بیماری کی حالت میں اللہ کی طرف سے انسان کو بہت سی نعمتیں عطا ہوتی ہیں،ان میں سے ایک یہ ہے کہ انسان اللہ کے ذکر کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے اور انسان کی دُعا قبول ہوتی ہے۔(بحار الانوار،74:60)

ھ۔لمبی آرزوئیں:۔

لمبی اور کبھی پوری نہ ہونے والی آرزوئیں بھی غفلت کا ایک سبب ہیں کیونکہ انسان کی ساری توجہ کو اپنی طرف جذب کر لیتی ہیں اور اسے دیگر تمام اُمور سے غافل کر دیتی ہیں۔امیر المومنین علیہ السلام اپنے ایک خطبہ میں،جو خطبہ دیباج کے نام سے مشہور ہے، فرماتے ہیں:

"وَاعْلَمُوْا عِبَادَاللهِ اِنَّ الْاَمَلَ يَذْهَبُ الْعَقْلَ وَيُكَذِّبُ الْوَعْدَ وَيَحِثُّ عَلَى الْغَفْلَةِ وَيُوْرِثُ الْحَسْرَةَ"۔(بحار الانوار، 74:293)

''اللہ کے بندو! جان لو کہ آرزوئیں عقل کو زائل کر دیتی ہیں،قیامت کے وعدے کو جھٹلاتی ہیں،غفلت کی طرف راغب کرتی ہیں اور آخر کار انسان کو حسرت میں مبتلا کر دیتی ہیں''۔

غفلت کے نتائج

اللہ،آخرت،دُنیا کی بے ثباتی و بے مہری اور اپنے اعمال اور گناہوں سے غفلت انسان کا سب کچھ تباہ و برباد کر دیتی ہے اور اسے ناقابلِ تلافی نقصان اور خسارے سے دوچار کر دیتی ہے۔احادیثِ معصومینؑ میں ان نقصانات سے اچھی طرح باخبر کیا گیا ہے۔ذیل میں ہم ان نقصانات کو ایک ایک کر کے بیان کرتے ہیں:

ا۔سنگدلی:۔

معارفِ الٰہی سے غفلت کا ایک نتیجہ سنگدلی کی صورت میں برآمد ہوتا ہے،اس لئے کہ انسان کی رُوح کی لطافت اور دل کی

نرمی اللہ کے ساتھ تعلق اور اس کے سامنے عاجزی وخاکساری کے نتیجہ میں پیدا ہوتی ہے۔ جب ذکرِ خدا کی بارانِ رحمت انسان کے دل کی سرزمین پر برسنا بند کردے تو انسان کا دل ایک سنگلاخ چٹان میں تبدیل ہوجاتا ہے۔ حضرت امام محمد باقر علیہ السلام فرماتے ہیں:

"اِیَّاکَ وَالْغَفْلَةَ فَفِیْهَا تَکُوْنُ قَسَاوَةُ الْقَلْبِ"۔ (بحار الانوار، 164:75)

''غفلت سے اجتناب کرو کیونکہ یہ سنگدلی کا سبب ہے''۔

ب۔ دل کی موت:۔

غفلت انسان کے قلب کو مردہ کردیتی ہے۔ قلب کی موت درحقیقت سنگدلی کے بعد انسان کے قلب پر طاری ہوتی ہے۔ جب دل کی موت واقع ہوجائے تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کوئی نصیحت انسان پر اثر نہیں کرتی اور سعادت ونیک بختی کی راہیں انسان پر بند ہوجاتی ہیں۔ امیر المومنین علیہ السلام فرماتے ہیں:

"مَنْ غَلَبَتْ عَلَیْهِ الْغَفْلَةُ مَاتَ قَلْبُهُ"(شرح فارسی غرر الحکم، 293:5)

''جس شخص پر غفلت آجائے، اُس کا دل مردہ ہوجاتا ہے'' ایک اور حدیث میں آپؑ فرماتے ہیں:

"بَیْنَکُمْ وَبَیْنَ الْمَوْعِظَةِ حِجَابٌ مِّنَ الْغَفْلَةِ وَالْغِرَّةِ"۔

''تمہارے اور نصیحت کے مابین غفلت اور غرور کا حجاب ہے''۔ (شرح فارسی غرر الحکم، 293:5)

ج۔ عقل کی خرابی:۔

غفلت کا ایک نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان کو اعمالِ صالح کی توفیق کم ہی نصیب ہوتی ہے اور وہ برے اعمال میں پھنس کر رہ جاتا ہے۔ ایسا شخص اگر کسی نیکی کا کوئی کام کر بھی لے تو غفلت کی وجہ سے اس میں اخلاص پیدا نہیں ہوسکے گا اور وہ اپنا عمل قبولیت کی شرائط کے ساتھ اللہ کی خوشنودی کیلئے انجام دے سکے گا۔

حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں: (شرح فارسی غرر الحکم، 293:5)

"اِیَّاکَ وَالْغَفْلَةَ وَالاِغْتِرَارَ بِالْمُهْلَةِ فَاِنَّ الْغَفْلَةَ تُفْسِدُ الْاَعْمَالَ"۔

''غفلت اور مہلت کے غرور سے بچو، اس لئے کہ غفلت انسان کے اعمال کو برباد کردیتی ہے''۔

اس حدیث کے معنی یہ بھی ہوسکتے ہیں کہ ماضی میں انسان نے جو نیک اعمال انجام دیئے ہوں، مستقبل کی غفلت اور غفلت کے نتیجہ میں ہونے والے گناہ انہیں بھی برباد کردیتے ہیں۔

د۔اللہ سے دُوری:۔

غفلت انسان کو اللہ کا قرب حاصل کرنے کی صلاحیت سے محروم کر دیتی ہے، اس لئے کہ قربِ الٰہی صرف معرفت اور ذکرِ الٰہی کی بدولت حاصل ہوسکتا ہے۔

امیر المومنین علیہ السلام ایک مناجات، جسے علامہ مجلسیؒ نے بحار الانوار میں نقل کیا ہے، فرماتے ہیں:

"اِلٰهِیْ اِنْ اَنَا مَتَّنِی الْغَفْلَةُ عَنِ الْاِسْتِعْدَادِ لِلِقَائِكَ فَقَدْ نَبَّهْتَنِی الْمَعْرَفَةُ بِكَرَمِ آلَائِكَ"۔ (بحار الانوار، 91:99-96)

''اے میرے معبود! اگر غفلت نے مجھے سلا دیا اور تیری ملاقات کی استعداد سے مجھے محروم کر دیا تو تیرے کرم اور تیری نعمتوں کی معرفت نے مجھے بیدار کر دیا''۔

حضرت علی علیہ السلام کی یہ مناجات، مناجاتِ شعبانیہ کے نام سے معروف ہے۔ علامہ مجلسیؒ کا کہنا ہے کہ امیر المومنینؑ اور آئمہ معصومینؑ ماہ شعبان میں اس مناجات کو پڑھا کرتے تھے اور اس کے ذریعے اللہ تعالیٰ سے راز و نیاز کیا کرتے تھے۔

ھ۔ہلاکت:۔

غفلت انسان کی دُنیوی اور اُخروی ہلاکت کا سبب ہے، اس لئے کہ یہ انسان کو معنوی اور مادی فوائد سے بے خبر کر دیتی ہے۔ غفلت میں مبتلا ہو کر انسان اپنی تمام صلاحیتوں کو کھو دیتا ہے۔ اپنے وسائل اور مواقع کو ضائع کر دیتا ہے اور اپنی استعداد کو برباد کر دیتا ہے۔ اس حقیقت کو امیر المومنین علیہ السلام نے ایک حدیث میں اس طرح بیان فرمایا ہے:

"مَنْ طَالَتْ غَفْلَتُهُ تَعَجَّلَتْ هَلَكَتُهُ"۔ (شرح فارسی غرر الحکم، 5:272)

''جس کی غفلت طویل ہو جائے، اس کی ہلاکت جلد واقع ہو جاتی ہے''۔

غفلت کی علامات

ممکن ہے بعض لوگوں کیلئے یہ بات مشکوک ہو کہ وہ غافل ہیں یا نہیں، لہٰذا غفلت کی علامات کو پہچاننا ضروری ہے تا کہ ہم غفلت سے محفوظ ہو کر سالکانِ راہِ خدا کی صف میں شامل ہو کر قربِ الٰہی کی منزل کی طرف قدم بڑھا سکیں۔ احادیث میں غفلت کی بہت سی علامات بیان کی گئی ہیں جن میں سے نمونے کے طور پر ہم چند علامات کا ذکر کرتے ہیں:

شمعون بن لاوی جنابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دور کا ایک مشہور مسیحی تھا۔ اُس نے آنحضرتؐ سے غافلوں کی علامات کے بارے سوال کیا۔ آپؐ نے اس کے جواب میں فرمایا:

"اَمَّا عَلَامَةُ الْغَافِلِ فَاَرْبَعَةٌ اَلْعَمٰی وَالسَّهْوَ وَاللَّهْوَ وَالنِّسْیَانُ"۔

''غافل کی چار نشانیاں ہیں: اندھا پن (یعنی حقائق سے آنکھیں بند کر لینا)، سہو، لہو اور نسیان (یعنی وہ اپنی شہوات میں اس طرح گم ہو جاتا ہے کہ ہر چیز کو بھول جاتا ہے)۔'' (بحار الانوار، 122:1)

یہی بات حضرت لقمان کی نصیحت میں بھی بیان ہوئی ہے۔ انہوں نے اپنے بیٹے کو نصیحت کرتے ہوئے کہا:

''ہر چیز اپنی علامات سے پہچانی جاتی ہے اور غافل کی تین علامات ہیں: سہو، لہو اور نسیان''۔ (خصال:138)

سہو اور نسیان میں یہ فرق ہے کہ جب انسان کسی چیز کو جانتا ہو اور بعد میں اسے بھول جائے تو اسے نسیان کہتے اور جن چیزوں کی طرف انسان کو متوجہ ہونا چاہئے، ان سے بے توجہی کو سہو کہتے ہیں۔

2۔ غفلت کی ایک علامت برے لوگوں کی صحبت ہے۔ حضرت امام حسن علیہ السلام فرماتے ہیں:

"اَلْغَفْلَةُ تَرْکُکَ الْمَسْجِدَ وَطَاعَتَکَ الْمُفْسِدَ" (بحار، 115:75)

''غفلت یہ ہے کہ تم مسجد کو ترک کر دو اور مفید (برے افراد) کی اطاعت کرنے لگو''۔

3۔ غفلت کی ایک علامت یہ ہے کہ انسان باخبر کرنے والے عوامل کی طرف توجہ نہ کرے، مثلاً قبرستان سے گزرتے وقت یہ نہ سوچے کہ کسی بھی وقت وہ بھی یہاں پہنچ سکتا ہے یا کسی کے نمازِ جنازہ میں شرکت کرتے وقت اُسے یہ خیال نہ آئے کہ ایک دن اُس کا جنازہ بھی اسی طرح لے جایا جا رہا ہوگا یا کسی کے سوئم یا چہلم میں شرکت کرتے ہوئے اسے یہ خیال نہ آئے کہ ایک دن لوگ اس کے سوئم یا چہلم میں بیٹھے ہوں گے۔

امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کسی کے جنازہ میں شریک تھے۔ اچانک کسی طرف سے کسی کے ہنسنے کی آواز آئی۔ آپؑ نے ناراضگی کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا:

"کَاَنَّ الْمَوْتَ فِیْهَا عَلٰی غَیْرِنَا کُتِبَ وَکَاَنَّ الْحَقَّ فِیْهَا عَلٰی غَیْرِنَا وَجَبَ وَکَاَنَّ الَّذِیْ نَرٰی مِنَ الْاَمْوَاتِ سَفْرٌ عَمَّا قَلِیْلٍ اِلَیْنَا رَاجِعُوْنَ"۔

''گویا موت دوسروں کے لئے مقرر ہوئی ہے، گویا مرنے والے ایسے مسافر ہیں جو ہمارے پاس لوٹ آئیں گے''۔ (نہج البلاغہ، کلماتِ قصار، حکمت:122)

پھر آپؑ نے فرمایا:

"نُبَوِّئُهُمْ اَجْدَاثَهُمْ وَنَاْکُلُ تُرَاثَهُمْ کَاَنَّا مُخَلَّدُوْنَ بَعْدَهُمْ"۔

''ہم انہیں قبروں میں دفن کر کے ان کی میراث کھانے میں اس طرح مشغول ہو جاتے ہیں جیسے ہمیں ہمیشہ یہاں

رہنا ہے''۔

4۔ غفلت کی ایک اور علامت یہ ہے کہ انسان اپنی عمر ایسے کاموں میں صرف کرے جن کا کوئی دُنیوی اور اُخروی فائدہ نہ ہو۔حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

''کَفٰی بِالرَّجُلِ غَفْلَةً اَنْ یُضِیْعَ عُمْرَهُ فِیْ مَالَا یُنْجِیهِ''۔

''کسی شخص کے غافل ہونے کیلئے اتنا ہی کافی ہے کہ وہ اپنی عمر ایسے کاموں میں ضائع کردے جو اسے نجات سے ہمکنار نہیں کرسکتے۔''(شرح فارسی غرر الحکم،585:4)

ایک اور حدیث میں آپؑ فرماتے ہیں:

کفی بالمرء غفلة ان یصرف همته فی مالا یعنیه

کسی انسان کے غافل ہونے کیلئے اتنا ہی کافی ہے کہ وہ اپنے ہمت بے معنی کاموں میں صرف کردے۔(شرح فارسی غرر الحکم۔585:4)

غفلت کا علاج

غفلت ایک خطرناک اخلاقی بیماری ہے جس کا علاج کرنے کیلئے اس بحث کے کلی اصول وضوابط کو بروئے کار لانا ضروری ہے۔سب سے پہلے یہ ضروری ہے کہ غفلت کے انجام کے بارے میں غور کیا جائے اور جو کچھ اس باب میں بیان ہوا ہے، خاص طور پر احادیث پر خوب توجہ کی جائے۔اس سے غفلت کو دور کرنے اور بیدار یعنی ''یقظہ'' کی حالت حاصل کرنے میں بہت مدد ملے گی،مثلاً جس طرح منشیات کے عادی شخص کو اُن لوگوں کے نمونے دکھائے جاتے ہیں جن کی زندگی نشہ کی لعنت کی وجہ سے برباد ہوگئی تا کہ وہ اس انجام سے دوچار ہونے سے پہلے نشے کی لعنت سے چھٹکارا حاصل کرسکے۔

اسی طرح غفلت کا علاج کرنے کیلئے بھی اس بیماری کی بنیادوں پر توجہ کرنا ہوگی۔غفلت کے اسباب اور بنیادوں کو ہم گزشتہ مباحث میں بیان کرچکے ہیں،لہٰذا اسے دوبارہ بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔اس کے علاوہ مندرجہ ذیل چیزیں بھی غفلت کی بیماری سے نجات حاصل کرنے میں مفید ثابت ہوسکتی ہیں:

1۔تاریخ سے عبرت:۔

ہمیں تاریخ کا غور سے مطالعہ کرنا چاہئے۔مدائن کے ایوان،کسریٰ کے محل،فراعنہ مصر کے اہرام،اپنے اندر عبرت کا بہت زیادہ سامان لئے ہوئے ہیں۔کل کے طاقتور حکمرانوں کی شکستہ قبریں یا کل کے طاقتور جوان جو اَب بوڑھے ہو چکے ہیں، جو چل

سکتے ہیں اور نہ بول اور سن سکتے ہیں، زبانِ حال سے ہمیں یہ پیغام دے رہے ہیں کہ ہم بھی اسی منزل کی طرف بڑھ رہے ہیں۔

یقیناً ان باتوں پر جس قدر زیادہ غور وفکر کیا جائے اور طاقتور حکومتوں کے ٹوٹنے اور بکھرنے کے واقعات پر جس قدر توجہ کی جائے، اسی قدر غفلت کی بیماری میں مبتلا ہونے کے امکانات کم ہوتے جائیں گے۔

حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

"اِنَّ مَنْ عَرَفَ الْاَیَّامَ لَمْ یَغْفَلْ عَنِ الْاِسْتِعْدَادِ"۔ (میزان الحکمہ، 3:15189)

''جو شخص گردشِ زمانہ کو پہچان لے، وہ آخرت کے سفر کی تیاری سے غافل نہیں رہ سکتا''۔

ایک اور حدیث میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

"اَغْفَلَ النَّاسِ مَنْ لَمْ یَتَّعِظْ بِتَغَیُّرِ الدُّنْیَا مِنْ حَالٍ اِلٰی حَالٍ"۔

''غافل ترین شخص وہ ہے جو دُنیا کے ایک حال سے دوسرے حال میں بدلنے سے نصیحت حاصل نہ کرے''۔ (بحار الانوار، 74:114)

2۔ ہمیشہ اللہ کا ذکر کرنا:۔

دوامِ ذکرِ الٰہی غفلت کی بیماری سے چھٹکارا حاصل کرنے کا ایک موثر ذریعہ ہے کیونکہ اللہ کا ذکر دل کو بیدار کرتا ہے، رُوح کو پاکیزگی بخشتا ہے، چشمِ بصیرت کو بینا کرتا ہے اور اس کی روشنی میں انسان حق کو حق اور باطل کو باطل سمجھتا ہے۔ حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

"بِدَوَامِ ذِکْرِ اللّٰہِ تَنْجَابُ الْغَفْلَۃُ"۔ (غرر الحکم، حدیث: 4269)

''اللہ تعالیٰ کو ہمیشہ یاد کرنے سے غفلت کے حجاب برطرف ہوجاتے ہیں''۔

3۔ قلبی توجہ کے ساتھ نماز پڑھنا:۔

مقررہ وقت پر معنی کی طرف توجہ رکھتے ہوئے، قلبی توجہ کے ساتھ نماز ادا کرنا، دل کو غفلت کے زنگ سے پاک کر کے اس میں چمک پیدا کر دیتا ہے۔

دُنیوی زندگی کی طبیعت ہی یہ ہے کہ وہ غفلت پیدا کرتی ہے اور بعض اوقات تو انسان کو اس قدر جذب کر لیتی ہے کہ وہ ہر چیز کو فراموش کر دیتا ہے، حتیٰ کہ اپنے آپ کو بھی۔ نماز انسان کو اپنے اعمال کے بارے میں غور کرنے اور اپنے آپ کو ڈھونڈنے اور غفلت کے شیطان سے نجات حاصل کرنے کا مؤثر ذریعہ ہے۔

اس بارے میں حضرت امام محمد باقر علیہ السلام فرماتے ہیں:

"اَیُّمَامُؤْمِنٍ حَافَظَ عَلَی الصَّلٰوتِ الْمَفْرُوْضَةِ فَصَلَّا هَالِوَ قْتِهَافَلَیْسَ هَذَا مِنَ الْغَافِلِیْنَ"۔(فروع کافی، 270:3)

''جوکوئی مومن مقررہ وقت پر صحیح طرح سے نماز ادا کرے، وہ غافل شمار نہیں ہوتا''۔

4۔غوروفکر:۔

غفلت کی بیماری کی روک تھام کا ایک اور موثر ذریعہ غوروفکر ہے۔اگر انسان اچھے اور برے کاموں کے انجام کے بارے میں غوروفکر کرنے کی عادت پیدا کرلے تو غفلت کی تاریکی اُس کی رُوح سے دُور ہو جاتی ہے۔

ایک دن جنابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت ابوذر غفاریؓ سے کہا:

یاابااذر اهم بالحسنه وام تعملها لکی لاتکتب من الغافلین

''یَاابَوذَرؓ! نیک کام کرنے کا ارادہ کرلو، خواہ انہیں انجام دینے کی توفیق تمہیں نہ ملے۔ایسا کرنے سے تم غفلین میں شمار نہیں ہوگے''۔(میزان الحکمہ: ج3۔حدیث:15188)

موت کے بارے میں غوروفکر کرنا انسان کی رُوح کے آئینے کو غفلت کے زنگ سے صاف کرنے میں موثر کردار ادا کرتا ہے، خاص طور پر اگر انسان قبرستان سے گزرتے وقت یہ شعر پڑھا کرے:

هر که باشی وبه هر جابرسی
آخرین منزل هستی این است

''تم جو کچھ بھی ہو اور جس مقام تک جا پہنچو، تمہاری زندگی کی آخری منزل یہی ہے''۔

یہ غوروفکر یقیناً غفلت کے بنیادی اسباب یعنی شہوت پرستی، خود پسندی اور زیادہ طلبی کے رجحانات کو ختم کر دیتا ہے۔ایک حدیث میں حضرت علی السلام امام حسینؑ سے فرماتے ہیں:

"اَیْ بُنَیَّ اَلْفِکْرَةُ تُوْرِثُ نُوْرًا وَّالْغَفْلَةُ ظُلْمَةً"۔

''اے میرے فرزندِ عزیز! غوروفکر کے نتیجہ میں نور پیدا ہوتا ہے اور غفلت کے نتیجہ میں ظلمت اور تاریکی ہی پیدا ہوتی ہے''۔(بحارالانوار، 237:74)

5۔ماحول کی تبدیلی:۔

بعض ماحول قدرتی طور پر غفلت پیدا کرنے والے ہوتے ہیں۔غافلوں کی محفل، لہوولعب کی تقریبات، امیرانہ شان کے گھر خود بخود انسان کو غفلت کی طرف کھینچنے کا کام کرتے ہیں، یہاں تک کہ دُنیا کے بہت سے شہر غفلت کے مراکز میں تبدیل ہو

چکے ہیں۔غفلت کے پنجے سے نجات حاصل کرنے کا ایک طریقہ یہ ہے کہ انسان ایسی محافل وتقریبات سے اور ایسی جگہوں سے دور رہے اور برائی اور گناہ کے ماحول سے آلودہ شہروں سے ہجرت کرلے ورنہ غفلت کے شیطان سے چھٹکارا مشکل ہوگا۔

حضرت امام زین العابدین علیہ السلام مناجاتِ ابوحمزہ ثمالی میں اللہ تعالیٰ سے راز ونیاز کرتے ہوئے سلبِ توفیق کے اسباب کو بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"اَوَلَعَلَّكَ رَأَيْتَنِيْ اَلِفُ مَجَالِسَ الْبَطَّالِيْنَ فَبَيْنِيْ وَبَيْنَهُمْ خَلَّيْتَنِيْ"۔

''شاید تو نے مجھے غافلین کی محافل کا دلدادہ پا کر مجھے ان کے درمیان چھوڑ دیا''۔

ہم اس بحث کو امیر المومنین علیہ السلام کی ایک حدیث پر ختم کرتے ہیں جس میں آپؑ فرماتے ہیں:

"اَحْذَرْ مَنَازِلَ الْغَفْلَةِ وَالْجَفَاءِ وَقِلَّةَ الْاَعْوَانِ عَلٰى طَاعَةِ اللّٰهِ"۔

''غفلت اور جفا کے مقامات سے اور ان مقامات سے اجتناب کرو جہاں اللہ کی اطاعت میں مدد کرنے والوں کی کمی ہو''۔(غرر الحکم، حدیث:2600)

یقظہ اور بیداری

یقظہ غفلت کی ضد ہے جس کے معنی خود آگاہی کے ہیں۔بعض عرفا اس کو سیر وسلوک کا پہلا قدم قرار دیتے ہیں۔اہلِ عرفان کی اصطلاح میں خوابِ غفلت سے بیداری، گزشتہ اعمال پر توجہ، غلطیوں کی اصلاح اور مستقبل میں صحیح روش اختیار کرنے کو یقظہ کہتے ہیں۔

امام خمینیؒ اپنی کتاب ''جہادِ اکبر یا مبارزۂ نفس'' میں یقظہ کو تزکیہ نفس کا پہلا قدم قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''کب تک خوابِ غفلت میں پڑے رہنا چاہتے ہو؟ کب تک فساد اور تباہی میں غوطہ ور رہنا چاہتے ہو؟ خدا سے ڈرو اور اپنے انجام پر غور کرو۔خوابِ غفلت سے بیدار ہو جاؤ۔ابھی تم بیدار نہیں ہوئے ہو، ابھی تم نے پہلا قدم بھی نہیں اٹھایا ہے۔راہِ سلوک میں پہلا قدم یقظہ ہے لیکن تم ابھی سوئے ہوئے ہو۔تمہاری آنکھیں کھلی اور دِل سوئے ہوئے ہیں۔اگر دل خوابِ غفلت میں سوئے ہوئے نہ ہوتے تو اور گناہ کی وجہ سے سیاہ اور زنگ آلودہ نہ ہوتے تو تم اس بے فکری سے اپنے برے اعمال اور بری باتوں کو جاری رکھے ہوئے نہ ہوتے۔اگر تم آخرت اور اس کی ہولناک منازل کے بارے میں سوچتے تو ان سنگین ذمہ داریوں کو، جو تمہارے کندھوں پر ہیں، زیادہ اہمیت دیتے''۔(صفحہ:151)

قرآن شریف کی بہت سی آیات اور جنابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بہت سے ارشادات بھی اس طرف رہنمائی کرتے ہیں۔بنیادی طور پر انذار (ڈرانا، خبردار کرنا) اور تبشیر (بشارت، خوشخبری دینا) کی سب آیات کا بھی یہی مقصد ہے یعنی خوابِ غفلت سے

بیدار کرنا۔ قرآن شریف میں استعمال ہونے والے یہ الفاظ ''اَفَلَا تَعْقِلُوْن''، ''کیا عقل کو بروئے کار نہیں لاتے؟''، ''اَوَلَمْ یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْآن''، ''کیا یہ قرآن میں غور وفکر وتدبر نہیں کرتے؟'' جیسی عبارات درحقیقت ایسی صدائیں ہیں جو ایک بیدار دل رہنما گہری نیند سوئے ہوئے پیروکاروں کو جگانے کیلئے لگاتا ہے تاکہ وہ جاگ کر منزل کیطرف گامزن ہوجائیں۔

اسی طرح جو آیات اللہ کے ذکر کی تاکید کرتی ہیں اور اللہ کی یاد سے رُوگردانی کو زندگی کی تنگی کا سبب قرار دیتی ہیں اور انسان کو آخرت میں نابینا محشور ہونے سے ڈراتی ہیں، ان سب کا مقصد غفلت سے نکال کر یقظہ کی حالت میں لانا ہے۔

احادیث میں بھی وسیع پیمانے پر یقظہ کے بارے میں رہنمائی پائی جاتی ہے۔ ان میں سے چند احادیث ذیل میں درج کی جارہی ہیں:

1۔ امیر المومنینؑ ایک خطبہ میں رسول اللہ ﷺ کی بعثت کا مقصد بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"اَیُّھَاالنَّاسُ اِنَّ اللہَ اَرْسَلَ اِلَیْکُمْ رَسُوْلًا لِیُزِیْحَ بِہٖ عِلَّتَکُمْ وَیُوْقِظَ بِھَا غَفْلَتَکُمْ"۔ (بحار الانوار، 296:74)

''اے لوگو! اللہ نے تمہاری طرف ایک رسول بھیجا تاکہ تمہاری بیماریوں کو برطرف کرے اور تمہیں خواب غفلت سے بیدار کرے''۔

صرف رسول اللہ ﷺ ہی نہیں بلکہ تمام انبیاؑ اسی مقصد کے لئے مبعوث ہوئے ہیں یا کم از کم ان کا ایک مقصد یقظہ کی حالت پیدا کرنا ہوتا ہے۔

2۔ امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام نے کوفہ کے لوگوں کو خطبہ دیتے ہوئے فرمایا:

"اَیُّھَاالنَّاسُ تَیَقَّظُوْا مِنْ رَقْدَۃِ الْغَفْلَۃِ وَمِنْ تَکَاشُفِ الظُّلْمَۃِ،فَوَالَّذِیْ خَلَقَ الْحَبَّۃَ وَبَرَءَ النَّسَمَۃَ وَتَرَدّٰی بِالْعَظَمَۃِ، لَئِنْ قَامَ اِلَیَّ مِنْکُمْ عُصْبَۃٌ بِقُلُوْبٍ صَافِیَۃٍ وَنِیَّاتٍ مُخْلِصَۃٍ، لَایَکُوْنَ فِیْھَاشَوْبُ نِفَاقٍ وَلَانِیَّۃُ اِفْتِرَاقٍ لَاُجَاھِدَنَّ السَّیْفَ قَدَمًاقَدَمًاوَلَاُضَیِّقَنَّ مِنَ السُّوْفِ جَوَانِبَھَاوَمِنَ الرِّمَاحِ اَطْرَافَھَاوَمِنَ سَنَابِکَھَافَتَکَلَّمُوْا رَحِمَکُمُ اللہُ"۔

''اے لوگو! خوابِ غفلت سے بیدار ہوجاؤ اور تاریکیوں سے اجتناب کرو۔ اُس ذات کی قسم جس نے دانے کو شگافتہ کیا اور جانوں کو پیدا کیا اور عظمت کی ردا پہنی! جب بھی تم میں سے کچھ لوگ پاکیزہ دل اور صاف نیتیں لے کر، جن میں نفاق کی آلائش اور تفرقہ کا ارادہ نہ ہو، میری نصرت کیلئے شمشیر اُٹھائیں تو میں اُنہیں ساتھ لے کر قدم بقدم جہاد کروں گا اور اپنی شمشیر کی ضربات اور نیزے سے زمین دُشمن پر تنگ کردوں گا اور گھوڑے کے سم

گھسا دوں گا۔ پس بولو! خدا تم پر رحم کرے۔'' (بحار الانوار، 67:44)

امام حسن علیہ السلام نے یہ خطبہ ایسے حالات میں ارشاد فرمایا جب غفلت اہلِ کوفہ پر غالب آ چکی تھی اور آپؑ جس قدر بھی لشکرِ امیرِ شام کے خلاف لڑنے کیلئے ان کو متحرک کرنے کی کوشش کرتے، ان میں کوئی حرکت پیدا نہیں ہوتی تھی۔

3۔ کتاب ''فلاح السائل'' میں ایک دُعا ہے جسے امام جعفر صادق علیہ السلام کی طرف سے تائید حاصل ہے۔ اس دُعا میں نماز کی کوتاہیوں کے بارے میں یہ جملے قابلِ غور ہیں:

"فَصَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّآلِهٖ وَاجْعَلْ مَكَانَ نُقْصَانِهَا تَمَامًا وَعَجِّلْنِيْ تَشَبُّثًا وَ تَمَكُّنًا وَسَهْوِي تَيَقُّظًا وَغَفْلَتِيْ تَذَكُّرًا وَ كَسَلِيْ نَشَاطًا"۔ (بحار الانوار، 14:82)

''پس اے اللہ! محمدؐ و آلِ محمدؐ پر اپنی رحمتیں نازل فرما، اس نماز کے نقائص کو برطرف کر کے اسے کامل بنا دے اور مجھے ثابت قدمی اور توانائی عطا فرما تا کہ میں ان نقائص کی تلافی کر سکوں اور میرے سہو کو بیداری میں اور غفلت کو ذکر میں اور میری سستی و کاہلی کو نشاط اور چستی میں بدل دے''۔

4۔ نہج البلاغہ کے ایک خطبہ میں امیر المومنین علیہ السلام بیدرد انسانوں کو خطاب کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"اَمَّا مِنْ دَائِكَ بُلُوْلٌ اَمْ لَيْسَ مِنْ نَوْمِكَ يَقْظَةٌ"۔

''آیا تمہارے درد کا کوئی علاج اور تمہاری نیند کی کوئی بیداری نہیں ہے؟'' (نہج البلاغہ، خطبہ: 222)

5۔ ایک اور حدیث میں آپؑ فرماتے ہیں:

"اِلَّا مُسْتَبْقِظٌ مِنْ غَفْلَتِهٖ قَبْلَ نَفَادِ مُدَّتِهٖ"۔ (غرر الحکم: 2752)

''آیا کوئی ہے جو اپنی مدت پوری ہونے سے قبل خوابِ غفلت سے بیدار ہو جائے؟''

ان تمام روایات میں کبھی غفلت کو نیند اور کبھی نشے سے تعبیر کیا گیا ہے جبکہ غفلت کے برعکس ''تذکّر'' کو بیداری اور ہوشیاری سے تشبیہ دی گئی ہے۔ اس سلسلہ میں حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

"سُكْرُ الْغَفْلَةِ وَالْغُرُوْرِ اَبْعَدُ اِفَاقَةً مِّنْ سُكْرِ الْخُمُوْرِ"۔ (غرر الحکم: 5651)

''غفلت اور غرور کے نشے سے افاقہ شراب کے نشے سے زیادہ دُور ہوتا ہے''۔

6۔ اس بحث کو ہم امیر المومنین علیہ السلام کے اس ارشاد پر ختم کرتے ہیں جس میں آپؑ نے یقظہ کو ایک نورانی چراغ سے تعبیر فرمایا ہے:

"فَاسْتَصْبِحُوْا بِنُوْرِ يَقْظَةٍ فِي الْاَبْصَارِ وَالْاَسْمَاعِ وَالْاَفْئِدَةِ"۔

''یقظہ کے نور سے اپنی آنکھوں، کانوں اور دلوں کو منور کرو''۔(نہج البلاغہ، خطبہ:222)

مثبت تغافل

جس طرح زندگی کے معاملات سے غفلت بدبختی کا سبب ہے، تغافل کا بھی یہی نتیجہ برآمد ہوتا ہے۔تغافل یہ ہے کہ انسان حقائق کو دیکھ کر ان سے نظریں چرالے۔انسان یہ جانتا ہو اور مانتا ہو کہ یہ زندگی عارضی اور ناپائیدار ہے، یہ دُنیا ایک گزرگاہ ہے جہاں سے انسان کو جہانِ آخرت کی طرف جانا ہے۔موت ایک اٹل حقیقت ہے جس سے بچنا ممکن نہیں ہے، دُنیوی مال و دولت اور مقام و مرتبہ کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔لیکن اس کے باوجود ان تمام حقائق کو اس طرح نظرانداز کرے جیسے انہیں جانتا ہی نہیں۔

اس تغافل کو منفی تغافل کہیں گے جس کے نتائج غفلت کے نتائج سے بھی زیادہ سنگین ہیں۔اس کی وجہ یہ ہے کہ غفلت میں انسان حقائق سے بےخبر ہونے کی وجہ سے چاہ ہلاکت میں گر جاتا ہے جبکہ تغافل میں انسان سب کچھ جانتے ہوئے انجان بنا رہتا ہے۔ ظاہری بات ہے کہ اللہ کے ہاں ایسے شخص کا گناہ اور جرم زیادہ سنگین ہے۔

اس منفی تغافل کے برعکس ایک مثبت تغافل بھی ہے۔اس کے معنی یہ ہیں کہ انسان بعض چیزوں کا علم تو رکھتا ہے لیکن انہیں نظرانداز کر دینا اور ان سے بےخبر رہنا ضروری یا پسندیدہ ہو۔ بالفاظِ دیگر انسان کسی چیز کو جانتا ہو مگر صرف اس لئے کہ اُسے ظاہر کرنے یا اُس پر عمل کرنے کے منفی نتائج برآمد ہوں گے، اُسے نظرانداز کردے تاکہ دُوسروں کی عزت و آبرو محفوظ رہ جائے۔

جن اُمور میں تغافل پسندیدہ ہے، ان میں سے ایک یہ ہے کہ انسان دُوسروں کے عیوب کو چھپائے۔ ہر انسان میں کمزوریوں اور عیب ہوتے ہیں اور وہ کوشش کرتا ہے کہ اُس کے عیب کسی کو معلوم نہ ہوں۔لیکن بعض اوقات کوئی شخص کسی کے عیب سے باخبر ہوجاتا ہے، ایسے معاملات میں تغافل کے معنی کسی کے عیب پر پردہ ڈالنے کے ہیں، جن کو صرف خاص حالات میں، مخصوص دائرے کے اندر انتہائی لطافت کے ساتھ ظاہر کرنا ضروری ہوتا ہے۔

اگر کسی انسان کے عیوب پر پڑا ہوا پردہ اُٹھ جائے اور اس کی عزت خاک میں مل جائے تو ایسا شخص گناہ اور برے کاموں کے انجام دینے میں بےجھجک ہوجاتا ہے۔ایسے معاملات میں تغافل سے کام لے کر معاشرے کو برائیوں کی دلدل بنانے سے روکا جاسکتا ہے۔

بالفاظِ دیگر ہم یہ کہتے ہیں کہ پرسکون اور مطمئن زندگی اہم اصول تغافل ہے۔ خاص طور پر اداروں کے سربراہان و مدیران، اپنی مشکلات اور مسائل کے حل کیلئے اس اصول سے ضرور فائدہ اٹھائیں۔ جہاں کسی کو ٹوکنا اور سرزنش ضروری ہو، وہاں ایسا کریں اور جہاں تغافل سے مسئلہ حل ہوسکتا ہو، وہ تغافل سے کام لیں۔اگر انسان زندگی میں اس اصول کو اپنالے تو بہت سے مسائل اور پریشانیوں سے محفوظ ہوجاتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ معصومین علیہم السلام اجمعین کی تعلیمات میں تغافل کے معاملہ پر کوکافی توجہ دی گئی ہے۔

تغافل، اقوالِ معصومینؑ کی روشنی میں

ایک مشہور حدیث جسے امام زین العابدین، حضرت امام محمد باقر اور حضرت امام جعفر صادقؑ سے نقل، کیا گیا ہے، آیا ہے:

"صَلَاحُ حَالِ التَّعَايُشِ التَّعَاشُرِ مِلْأُ مِكْيَالٍ ثُلُثَاهُ فِطَنَةٌ وَثُلُثُهُ تَغَافُلٌ"۔

''معاشرتی زندگی کی صلاح وسلامتی ایک ایسا پیمانہ ہے جس کے دو تہائی ذہانت اور ایک تہائی تغافل ہے''۔(تحف العقول:264)

اس روایت میں جہاں مثبت کی حوصلہ افزائی کی گئی ہے، منفی تغافل کی مذمت بھی نظر آتی ہے۔ پہلے اس میں ذہانت کا ذکر کیا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ ذہانت اور ہوشیاری غفلت کی ضد ہیں۔ اس حدیث میں ذہانت کا کردار تغافل کے کردار سے دوگنا بتایا گیا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ انسان کو زندگی کے اہم معاملات سے بے خبر نہیں رہنا چاہئے بلکہ مکمل بیداری اور احتیاط کے ساتھ ان چیزوں پر کاربند رہے تو جو معاشرتی زندگی کی فضا کو بہتر بنانے کیلئے ضروری ہیں۔

دُوسری طرف سے انسان تمام چیزوں کو نظر انداز کرتا رہے جن کے پیچھے پڑنے سے معاشرتی زندگی کی فضا خراب ہوتی ہو۔ وہ چھوٹے چھوٹے مسائل جن میں اُلجھ کر انسان زندگی کے اصل اور اہم معاملات سے دُور ہو جائے۔ اُنہیں نظر انداز کرنا اور ان سے تغافل برتنا ہی بہتر اور پسندیدہ عمل ہے۔ دُوسروں کے عیوب کو تلاش کر کے انہیں اچھالنا اور معاشرے میں ایک دوسرے کی عزت کو داغدار کرنے کی بجائے ایک دوسرے کے عیوب کو نظر انداز کرنا اور ان سے تغافل برتنا ہی بہتر اور پسندیدہ عمل ہے۔

اس سلسلہ میں امیر المومنین علیہ السلام فرماتے ہیں:

"مِنْ اَشْرَفِ اَعْمَالِ الْكَرِيْمِ غَفْلَتُهُ عَمَّا يَعْلَمُ"۔(نہج البلاغہ، کلماتِ قصار:222)

''کریم انسان کا سب سے بہتر عمل یہ ہے کہ وہ ان چیزوں سے تغافل کرتا ہے جو اُس کے علم میں آجائیں''۔

ایک اور حدیث میں آپؑ فرماتے ہیں:

"مَنْ لَمْ يَتَغَافَلْ وَلَا يَغُضَّ عَنْ كَثِيْرٍ مِّنَ الْاُمُوْرِ تَنَغَّصَتْ عِيْشَتُهُ"۔

''جو شخص بہت سی باتوں سے تغافل نہیں کرتا، اس کی زندگی میں تلخیاں پیدا ہو جاتی ہیں''۔(غرر الحکم:9149)

ظاہر سی بات ہے کہ ہر انسان کی زندگی میں خلافِ توقع ناخوش آئندہ باتیں رونما ہوتی رہتی ہیں۔ اگر انسان انہی کے بارے میں سوچنا شروع کر دے اور ان پر وضاحتیں طلب کرنے بیٹھ جائے تو نہ صرف یہ کہ اُس کی زندگی تلخیوں کا شکار ہو جائے گی بلکہ اس کے دوست بھی اس سے دُور ہو جائیں گے۔

ہم اس بحث کو امیر المومنین علیہ السلام کے اس ارشاد پر ختم کرتے ہیں:

"وَعَظِّمُوْا اَقْدَارَكُمْ بِالتَّغَافُلِ عَنِ الدَّنِّ مِنَ الْاُمُوْرِ..... وَلَاتَكُوْنُوْا بِحَّاثِيْنَ عَمَّاغَابَ عَنْكُمْ، فَيَكْثُرُعَائِبُكُمْ..... وَتَكَرَّمُوْا بِالتَّعَامِيْ عَنَ الْاِسْتِقْصَاءِ"۔

''پست چیزوں سے تغافل کے ذریعے اپنی قدرو قیمت میں اضافہ کرو۔۔۔جو چیزیں تم سے پوشیدہ ہیں،اُن کی جستجو نہ کرو ورنہ تمہاری عیب جوئی کرنے والے زیادہ ہو جائیں گے۔۔۔۔اور چھوٹی چھوٹی باتوں کی تفصیل جاننے سے چشم پوشی کر کے اپنے کریم ہونے کا ثبوت دو''۔(بحارالانوار،64:75)

اس حدیث اور ایسی ہی دیگر احادیث کی روشنی میں یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ کن معاملات میں تغافل سے کام لینا ضروری ہے اور کن باتوں سے غفلت نقصان دہ ہے۔

البتہ یہ یاد رکھنا بھی ضروری ہے کہ تغافل کے یہ معنی نہیں ہیں کہ انسان امر بالمعروف اور نہی ازمنکر کو ترک کر دے،اس لئے کہ امر بالمعروف اور نہی ازمنکر دینی فریضہ ہے اور اس سے غفلت یا تغافل نہیں کیا جاسکتا۔اسی طرح اُن اُمور کی اصلاح کیلئے، جو معاشرے کی بہتری کے لئے ضروری ہیں،مثبت تنقید کرنا بھی تغافل کے منافی نہیں ہے۔تغافل صرف اُن چیزوں کیلئے ہے جو چھوٹی چھوٹی ہیں یا ان عیوب کیلئے ہے جن کی پردہ پوشی ضروری ہے۔

چودھواں باب

بُخل

تمہید:۔

اللہ تعالیٰ نے ہمیں بہت سی نعمتیں اتنی مقدار میں دے رکھی ہیں جو ہماری ضرورت سے زیادہ ہیں اور ہم دُوسروں کو ان سے فائدہ پہنچا سکتے ہیں۔لیکن بعض لوگ بخل جیسی صفتِ رذیلہ کی وجہ سے ایسا نہیں کرتے اور اللہ کی عطا کردہ نعمتوں میں کسی کو شریک نہیں کرتے۔بعض لوگ اپنی دولت وثروت کی نمود ونمائش کے ذریعے غریبوں اور ناداروں کے زخموں پر نمک چھڑکتے ہیں اور اس غیر انسانی حرکت سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔

بعض اوقات انحصار طلبی (monopoly) یعنی کسی چیز کو اپنے تک محدود رکھنے کی خواہش، احساسِ برتری اور لالچ وطمع جیسی صفاتِ رذیلہ بھی بخل کے ساتھ مل جاتی ہیں اور اس کے قبح کو کئی گنا کر دیتی ہیں۔

ہم اپنے اردگرد اور ساری کائنات میں جہاں بھی نظر کرتے ہیں، ہر جگہ سخاوت اور بخشش کے مظاہر ہمیں دکھائی دیتے ہیں۔ سورج مسلسل جلتا ہے اور اپنے وجود کے ایک حصے کو روشنی اور حرارت میں تبدیل کر کے سارے نظامِ شمسی کو نور اور حرارت سے بہرہ مند کرتا ہے اور تمام زندہ موجودات کو زندگی بخشتا ہے۔

زمین کے شکم کو اللہ نے بہت سی نعمتوں سے بھر رکھا ہے جن میں پانی، قیمتی پتھروں اور دھاتوں کی کانیں اور ہماری زندگی کیلئے ضروری غذائی مواد وغیرہ شامل ہیں۔زمین بڑی سخاوت اور فراخ دلی کے ساتھ انسان کو ان تمام خزانوں سے فائدہ اٹھانے کی اجازت دیتی ہے۔

اس عالمِ کبیر کے علاوہ عالمِ صغیر یعنی خود انسان کے اندر بھی فطرت کی فیاضی کے بہت سے مظاہر موجود ہیں۔ہمارا دل، نظامِ تنفس، معدہ، ہاتھ پاؤں، آنکھیں اور کان وغیرہ میں سے ایک بھی ایسا نہیں ہے جو صرف اپنے لئے کام کرتا ہو اور جسم کے دُوسرے حصوں کو فائدہ پہچانے میں بخل سے کام لیتا ہو۔

اب اس کائنات میں، جہاں ہر طرف فیاضی اور سخاوت نظر آتی ہے، بخیل انسان کی کوئی جگہ ہوسکتی ہے؟ کیا نظامِ کائنات سے عدم ہم آہنگی اسے ہلاکت کی طرف نہیں لے جائے گی؟

یہ وجہ ہے کہ آیات وروایات میں وسیع سطح پر بخل کی مذمت اور جود وسخا کی تعریف وستائش نظر آتی ہے۔یہ صفت اللہ تعالیٰ کی صفات اور معصومینؑ کی صفات میں بھی نمایاں ترین مقام رکھتی ہے۔

اس تمہید کے بعد اب ہم اس موضوع سے متعلق چند قرآنی آیات کو زیر بحث لاتے ہیں:

1۔ "اِنَّ قَارُوْنَ كَانَ مِنْ قَوْمِ مُوْسٰى فَبَغٰى عَلَيْهِمْ ۠ وَاٰتَيْنٰهُ مِنَ الْكُنُوْزِ مَآ اِنَّ مَفَاتِحَهٗ لَتَنُوْٓاُ بِالْعُصْبَةِ اُولِي الْقُوَّةِ ۤ اِذْ قَالَ لَهٗ قَوْمُهٗ لَا تَفْرَحْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْفَرِحِيْنَ ○ وَابْتَغِ فِيْمَآ اٰتٰىكَ اللّٰهُ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ وَلَا تَنْسَ نَصِيْبَكَ مِنَ الدُّنْيَا وَاَحْسِنْ كَمَآ اَحْسَنَ اللّٰهُ اِلَيْكَ وَلَا تَبْغِ الْفَسَادَ فِي الْاَرْضِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُفْسِدِيْنَ"۔ (قصص: 76اور 77)

''قارون موسیٰ علیہ السلام کی قوم میں سے تھا لیکن اُن کے اُوپر ظلم کرتا تھا۔ ہم نے اُسے اتنے خزانے عطا کئے جس کی چابیاں ایک طاقتور جتھہ اُٹھاتا تھا، اس کی قوم نے اُس سے کہا کہ اِتراؤ نہیں! اللہ اِترانے والوں کو پسند نہیں کرتا اور جو کچھ اللہ نے تمہیں عطا کیا ہے، اُس میں آخرت کو تلاش کرو اور دُنیا سے اپنے حصے کو فراموش نہ کرو اور جس طرح اللہ نے تم پر احسان کیا ہے، تم بھی احسان کرو اور زمین میں فساد نہ کرو، اللہ فساد کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا''۔

2۔ "اِنَّا بَلَوْنٰهُمْ كَمَا بَلَوْنَآ اَصْحٰبَ الْجَنَّةِ ۚ اِذْ اَقْسَمُوْا لَيَصْرِمُنَّهَا مُصْبِحِيْنَ ۙ○ وَلَا يَسْتَثْنُوْنَ ○ فَطَافَ عَلَيْهَا طَاۗىِٕفٌ مِّنْ رَّبِّكَ وَهُمْ نَاۗىِٕمُوْنَ ○ فَاَصْبَحَتْ كَالصَّرِيْمِ"(قلم: 17تا20)

''اور ہم نے انہیں آزمایا، جس طرح ہم نے باغ والوں کو آزمایا تھا، جب اُنہوں نے قسم کھائی کہ اپنے باغ کا پھل صبح صبح چن لیں اور انہوں نے انشاءاللہ نہیں کہا۔ جب وہ سوئے ہوئے تھے تو تمہارے رب کی طرف سے ایک عذاب اُن کے باغ پر آرہا اور اسے تاریک سیاہ رات کی طرح کر دیا''۔

3۔ "وَمِنْهُمْ مَّنْ عٰهَدَ اللّٰهَ لَىِٕنْ اٰتٰىنَا مِنْ فَضْلِهٖ لَنَصَّدَّقَنَّ وَلَنَكُوْنَنَّ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ○ فَلَمَّآ اٰتٰىهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ بَخِلُوْا بِهٖ وَتَوَلَّوْا وَّهُمْ مُّعْرِضُوْنَ ○ فَاَعْقَبَهُمْ نِفَاقًا فِيْ قُلُوْبِهِمْ اِلٰى يَوْمِ يَلْقَوْنَهٗ بِمَآ اَخْلَفُوا اللّٰهَ مَا وَعَدُوْهُ وَبِمَا كَانُوْا يَكْذِبُوْنَ ○"(توبہ: 75تا77)

''ان میں سے بعض نے اللہ سے عہد کیا تھا کہ اگر اُس نے اپنے فضل سے ہمیں عطا کیا تو ہم صدقہ دیں گے اور صالحین میں سے ہوں گے۔ لیکن جب اللہ نے انہیں اپنے فضل سے عطا کیا تو وہ بخل کرنے لگے اور وعدہ خلافی کرتے ہوئے رُوگرداں ہو گئے۔ اس عمل کی وجہ سے اُن کے دل میں نفاق پیدا ہو گیا، اس لئے کہ اُنہوں نے اللہ سے وعدہ خلافی کی اور جھوٹ بولتے تھے۔''

4۔ "وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ بِمَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ هُوَ خَيْرًا لَّهُمْ ؕ بَلْ هُوَ شَرٌّ لَّهُمْ ؕ سَيُطَوَّقُوْنَ مَا بَخِلُوْا بِهٖ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ وَلِلّٰهِ مِيْرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ○"(آل عمران:180)

''جولوگ بخل سے کام لیتے ہیں اور جو کچھ اللہ نے اپنے فضل سے انہیں دیا ہے، اس میں سے انفاق نہیں کرتے، وہ یہ نہ سمجھیں کہ ان کیلئے فائدہ مند ہے بلکہ یہ ان کیلئے شر ہے۔ جس دولت کے بارے میں یہ بخل سے کام لیتے تھے، عنقریب قیامت کے دن وہ طوق بن کر ان کے گلے میں ڈال دی جائے گی۔ زمین وآسمان کی میراث اللہ کے لئے ہے اور وہ تمہارے کاموں سے باخبر ہے۔''

5۔ "اَلَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ وَيَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبُخْلِ وَيَكْتُمُوْنَ مَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ؕ وَاَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا مُّهِيْنًا"۔(النسأ:37)

''یہ وہ لوگ ہیں جو بخل سے کام لیتے ہیں اور دُوسروں کو بھی بخل کی ترغیب دلاتے ہیں اور اللہ نے اپنے فضل سے جو کچھ انہیں عطا کر رکھا ہے، اُسے چھپاتے ہیں، ہم نے ایسے کافروں کیلئے رُسوا کن عذاب تیار کر رکھا ہے''۔

6۔ "وَاَمَّا مَنْۢ بَخِلَ وَاسْتَغْنٰى○وَكَذَّبَ بِالْحُسْنٰى○فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْعُسْرٰى"

''جو کوئی بخل سے کام لیتا ہے اور اس طرح غنی ہونا چاہتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے دی جانے والی نیک جزا کو جھٹلاتا ہے، جلد ہی ہم اُسے مشکل میں گرفتار کر دیں گے''۔(اللیل:8تا10)

7۔ "هٰٓاَنْتُمْ هٰٓؤُلَآءِ تُدْعَوْنَ لِتُنْفِقُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۚ فَمِنْكُمْ مَّنْ يَّبْخَلُ ۚ وَمَنْ يَّبْخَلْ فَاِنَّمَا يَبْخَلُ عَنْ نَّفْسِهٖ ؕ وَاللّٰهُ الْغَنِيُّ وَاَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ ۚ وَاِنْ تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ۙ ثُمَّ لَا يَكُوْنُوْٓا اَمْثَالَكُمْ"۔(محمد:38)

''تم وہی لوگ ہو جن کو اللہ کی راہ میں انفاق کی دعوت دی جاتی ہے اور تم میں سے کچھ تو بخل سے کام لیتے ہیں، حالانکہ جو بخل سے کام لیتا ہے، وہ اپنے بارے میں بخل کرتا ہے اور اللہ غنی ہے اور تم فقیر ہو، اگر تم رُوگردانی کرو تو وہ تمہاری جگہ دُوسروں کو لے آئے گا جو تم جیسے نہیں ہوں گے (بلکہ سخی ہوں گے اور اللہ کی راہ میں انفاق کریں گے)۔''

8۔ "وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ"(تغابن:16و حشر:9)

''جو اپنے نفس کے بخل سے بچالیا گیا تو ایسے ہی لوگ فلاح پانے والے ہیں''۔

9۔ "وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَنْفَقُوْا لَمْ يُسْرِفُوْا وَلَمْ يَقْتُرُوْا وَكَانَ بَيْنَ ذٰلِكَ قَوَامًا"(فرقان: 67)

''جو انفاق کرتے ہیں تو اسراف کرتے ہیں نہ سخت، بلکہ درمیان کی راہ اختیار کرتے ہیں''۔

10۔ "قُلْ لَّوْ اَنْتُمْ تَمْلِكُوْنَ خَزَآىِٕنَ رَحْمَةِ رَبِّيْٓ اِذًا لَّاَمْسَكْتُمْ خَشْيَةَ الْاِنْفَاقِ ؕ وَكَانَ الْاِنْسَانُ قَتُوْرًا"(بنی اسرائیل۔ 100)

''کہہ دو کہ اگر تم میرے رب کی رحمت کے خزانوں کے مالک ہوتے تو بخل سے کام لیتے کہ انفاق کی وجہ سے تنگدستی کا شکار ہو جاؤ، بے شک انسان تنگ نظر ہے''۔

تفسیر

مذکورہ بالا آیات میں سے پہلی آیت بنی اسرائیل کے ایک بڑے دولت مند کا ذکر کر رہی ہے جو اپنے بخل کی وجہ سے بہت برے انجام سے دوچار ہوا۔

قارون حضرت موسیٰ علیہ السلام کا رشتہ دار تھا اور بنی اسرائیل کی مشہور اور دولت مند شخصیت تھا اور بظاہر اُن لوگوں میں سے تھا جو تورات کا کافی علم رکھتے تھے۔ لیکن اکثر دولت مندوں کی طرح اللہ سے غافل تھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ غریب بنی اسرائیل کے سامنے اپنی دولت کی نمود و نمائش کرتا تھا اور اُس کی ان حرکتوں سے اُن کے دل میں بھی یہ خواہش جنم لیتی تھی کہ کاش! وہ بھی قارون کی طرح دولت مند ہوتے!

قرآن شریف اس بارے میں فرماتا ہے:

''قارون حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم میں سے تھا لیکن اس نے ان پر ظلم کیا''۔

اپنی قوم پر اس کے ظلم کی وجہ اس کا بخل تھا۔ وہ اس بات پر تیار نہ تھا کہ اپنی دولت سے اپنی قوم کو کوئی فائدہ پہنچائے۔ وہ اپنی دولت سے اپنی قوم کو کوئی فائدہ پہنچائے۔ وہ اپنی دولت کی نمود و نمائش کے ذریعے بھی اپنی قوم پر ظلم کرتا تھا۔ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس سے زکوٰۃ ادا کرنے کو کہا تو وہ ان کا مخالف ہو گیا اور فرعون کے ساتھ مل گیا۔

عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ دُنیا پرست دولت مندوں کی خواہش ہوتی ہے کہ زیادہ معاشرتی قوت حاصل کریں۔ شاید اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو کہ وہ اپنے جیسے دیگر افراد کی سیاسی اور معاشرتی طاقت سے خوفزدہ ہوتے ہیں اور اسی وجہ سے وہ انبیاؑ کی بھی مخالفت کرتے ہیں۔

قرآن شریف میں قارون کے واقعہ میں آگے چل کر یہ بیان کیا گیا ہے:

''ہم نے اسے اس قدر دولت بخشی کہ اُس کی چابیاں اُٹھانے کیلئے طاقتور افراد کی ایک جماعت مامور تھی''۔

"وَاٰتَيْنٰهُ مِنَ الْكُنُوْزِ مَآ اِنَّ مَفَاتِحَهٗ لَتَنُوْٓاُ بِالْعُصْبَةِ اُولِي الْقُوَّةِ"۔ (قصص۔ 76)

قارون اپنی زندگی سے بہت خوش تھا۔عیش پرستی میں اس قدر ڈوبا ہوا تھا کہ اُسے غریبوں اور فقیروں کے دُکھ کا کچھ احساس نہ تھا۔اس کی قوم کے کچھ باشعور افراد اسے سمجھاتے ہوئے کہتے تھے:

اس طرح اترا ؤنہیں کیونکہ اللہ اترانے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ جو کچھ اللہ نے تمہیں دے رکھا ہے، اس میں آخرت کو تلاش کرو اور دنیا سے اپنا حصہ فراموش نہ کرو اور جس طرح اللہ نے تم پر احسان کیا ہے تم بھی اس کے بندوں کے ساتھ احسان کرو اور زمین میں فساد نہ کرو کیونکہ اللہ فساد کروالوں کو پسند نہیں کرتا۔

اِذْ قَالَ لَهٗ قَوْمُهٗ لَا تَفْرَحْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْفَرِحِيْنَ ○ وَابْتَغِ فِيْمَآ اٰتٰىكَ اللّٰهُ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ وَلَا تَنْسَ نَصِيْبَكَ مِنَ الدُّنْيَا وَاَحْسِنْ كَمَآ اَحْسَنَ اللّٰهُ اِلَيْكَ وَلَا تَبْغِ الْفَسَادَ فِي الْاَرْضِ ط اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُفْسِدِيْنَ"۔ (قصص 76اور 77)

ان پانچ ناصحانہ اور مشفقانہ باتوں کا قارون کے تاریک دل پر کوئی اثر نہ ہوا بلکہ اُس کی سرکشی بڑھتی چلی گئی، یہاں تک کہ اُس نے کھلم کھلا توحیدِ افعالی کا انکار کر دیا اور کہنے لگا کہ یہ دولت صرف میری اپنی کمائی کا نتیجہ ہے۔

اس سورت میں ایک اور مقام پر اللہ تعالیٰ نے قارون کی ایک اور اخلاقی رذیلت کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:

''اس نے اپنی قوم کے سامنے اپنی دولت کی نمائش کی اور اس جنون آمیز نمائش میں اس قدر آگے بڑھ گیا کہ اپنے قیمتی گھوڑے، جن پر سنہری زینیں تھیں اور مختلف قسم کے ملبوسات اور زیورات پہنے ہوئے کنیزیں اور دیگر مال و دولت کی اپنی قوم کے غریب اور مسکین افراد کے سامنے نمائش لگائی۔اس طرح اُس نے مذکور بالا ناصحانہ اور مشفقانہ مشوروں پر عمل کرنے کی بجائے اس ردِعمل کا مظاہرہ کیا اور قوم کے غریب اور نادار افراد کے زخموں پر مرہم رکھنے کی بجائے اُن پر نمک چھڑکنے لگا''

جب اس کی سرکشی حد سے بڑھ گئی تو اللہ نے اسے اور مہلت نہ دی۔ایک زلزلہ آیا جس کی وجہ سے صرف قارون اپنے محل اور ساری دولت سمیت زمین میں دھنس گیا اور اس کا ذکر تاریخ میں درسِ عبرت بن کر رہ گیا۔

قارون کی بدبختی کی اصل وجہ اُس کا بخل تھا جس کی وجہ سے اس نے عملی طور پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی نبوت اور اللہ کی توحید کا انکار کر دیا۔صرف یہی نہیں بلکہ اس نے ایک بدکار عورت کے ساتھ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ناجائز تعلقات کا افسانہ گھڑ کر اُنؑ کے خلاف ایک سازش کھڑی کرنے کی بھی کوشش کی لیکن اللہ نے اسے مہلت نہ دی اور رُسوا کر دیا۔

وہ یہ سمجھتا تھا کہ اس عظیم دولت کی وجہ سے وہ اس قدر طاقتور ہو چکا ہے کہ کوئی طاقت اُسے نقصان نہیں پہنچا سکتی۔اسی گھمنڈ

میں وہ اپنی قوم کے ساتھ ظلم اور تعدی کے ساتھ پیش آتا تھا اور آخر کار اپنے اعمال کے انجام کو پہنچ گیا۔

دُوسرے پیرا گراف کی آیات بخیلوں کے ایک گروہ کی عبرت ناک داستان بیان کر رہی ہیں۔قرآن مجید نے ان کو ''اَصۡحٰبَ الۡجَنَّۃِ'' (باغ والوں) کا نام دیا ہے۔بعض مفسرین کا خیال ہے کہ ان کا تعلق بنی اسرائیل سے تھا اور وہ یمن کے قریب صنعا نامی ایک شہر میں رہتے تھے۔

ان کی تعداد دس تھی۔ان کا باپ ایک نیک اور سخی انسان تھا جس نے ایک باغ میراث میں چھوڑا تھا۔باپ کے بعد اولاد نے سخاوت کی بجائے بخل کی روِش اپنائی اور فیصلہ کیا کہ باغ سے پھل چنتے وقت کسی فقیر کو خبر تک نہ ہونے دی جائے اور صبح کے اندھیرے میں باغ میں جا کر پھل چننے کا کام شروع کر دیا جائے۔

تفسیر رُوح البیان میں ان کا واقعہ اس طرح بیان ہوا ہے:

''یہ واقعہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دور کے کچھ بعد کا ہے۔ان کا باپ بہت سخی تھا جو اپنے باغ کے محصول میں سے اپنے سال بھر کی ضرورت رکھ لیتا تھا اور باقی سارا ضرورت مندوں کو تقسیم کر دیتا تھا جو بہت زیادہ ہوتا تھا۔ اس سے اُنکے کافی دن گزر جاتے تھے۔لیکن باپ کے مرجانے کے بعد اُس کے بیٹوں نے کہا کہ اگر ہم باپ کے نقشِ قدم پر چلیں تو ہماری گزر بسر مشکل ہو جائے گی، اس لئے کہ ہم سب بال بچوں والے ہیں۔لہٰذا انہوں نے قسم کھائی کہ صبح سویرے، جبکہ ابھی اندھیرا باقی ہو، باغ میں جا کر پھل چن لیں اور انہوں نے اس ساری منصوبہ بندی میں انشاءاللہ نہیں کہا''۔(رُوح البیان، 10:114)

اللہ نے بھی انہیں ان کے عمل کی عبرت ناک سزا دی۔رات کو جب وہ سوئے تو اللہ کی طرف سے ایک عذاب نے سارے باغ کو اپنی لپیٹ میں لے لیا جس میں ایسی آگ تھی جس نے اُن کے سرسبز باغ کو جلا کر راکھ کر دیا۔اس کیلئے آیت میں یہ الفاظ استعمال ہوئے: ''فَاَصۡبَحَتۡ کَالصَّرِیۡمِ''۔

''صریم'' سیاہ راکھ کو کہتے ہیں۔لیکن یہ احتمال بھی موجود ہے کہ ''صریم'' سے مراد ایسے درخت ہوں جن پر پھل نہ ہو۔اگر یہ معنی مراد لئے جائیں تو آیت کے معنی یہ ہوں گے؛ ''آسمان سے گرنے والی بجلی نے ان کے درختوں کے پھلوں کو جلا دیا جبکہ درخت اپنی جگہ قائم رہے''

اگلے روز جب وہ اپنے منصوبے کے مطابق صبح سویرے باغ میں پہنچے اور باغ کا وحشت ناک منظر دیکھا تو چیخ اُٹھے: ''ہم راستہ بھول گئے ہیں، بلکہ ہم تو بالکل محروم ہو گئے ہیں''۔

''فَلَمَّا رَاَوۡہَا قَالُوۡۤا اِنَّا لَضَآلُّوۡنَ ۙ﴿۲۶﴾ بَلۡ نَحۡنُ مَحۡرُوۡمُوۡنَ ﴿۲۷﴾''(قلم: 26اور 27)

ان آیات میں ''ضَآلُّوۡنَ'' کا لفظ استعمال ہوا ہے جس کے دو معنی ہو سکتے ہیں: ایک یہ کہ جب اُنہوں نے دیکھا کہ وہ اپنے

سرسبز باغ کی بجائے ایک جلے ہوئے باغ میں کھڑے ہیں تو انہوں نے سمجھا کہ ہم راستہ بھول کر اپنے باغ کی بجائے کسی اور جگہ آ گئے ہیں۔ پھر جب اُنہوں نے غور سے دیکھا اور انہیں یقین ہو گیا کہ یہ ان کا اپنا باغ ہے جس کا یہ حال ہو چکا ہے تو وہ کہنے لگے کہ ہم تو محروم ہو گئے ہیں۔

دُوسرے یہ کہ چونکہ وہ اپنے باپ کی روش کی بجائے بخل کو اپنی بہتری اور سعادت کا راستہ سمجھتے تھے لیکن جب انہوں نے دیکھا کہ ان کا راستہ انہیں تباہی کی طرف لے آیا تو وہ بول اُٹھے کہ ہم بھٹک گئے ہیں، صحیح راستہ وہی ہے جو ہمارے باپ کا تھا۔

آگے چل کر آیات میں بیان کیا گیا ہے کہ بخیلوں کا یہ ٹولہ خواب غفلت سے بیدار ہو کر ایک دوسرے کو ملامت اور سرزنش کرنے لگا اور انہوں نے فیصلہ کر لیا کہ آئندہ ایسی حرکت نہیں کریں گے اور انہوں نے اللہ سے دُعا کی کہ وہ انہیں اس سے بہتر باغ عطا فرمائے۔

بعض روایات میں ہے کہ اللہ نے اُن کی توبہ قبول کر لی اور انہیں اس سے بہتر باغ عطا فرمایا۔

بہرحال یہ آیت بخل کے دردناک انجام کو بیان کرتے ہوئے اس حقیقت پر بھی روشنی ڈالیں کہ مادی دُنیا میں بھی بخل انسان کے کام نہیں آ سکتا۔

یہ نکتہ بھی قابلِ توجہ ہے کہ قرآن مجید ان آیات کے آغاز میں فرماتا ہے کہ ''ہم نے مکہ والوں کو بھی اسی طرح آزمایا جس طرح ہم نے اصحاب الجنۃ کو آزمایا''۔ گویا یہ عبارت اس قحط اور خشک سالی کی طرف اشارہ کر رہی ہے جو مکہ کے دولت مندوں کے بخل کی وجہ سے اُن پر آئی تھی۔

تیسری آیت میں جنابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دور کے ایک بخیل شخص کا ذکر ہے۔ بہت سی تفاسیر کے مطابق ایک انصاری تھا جس کا نام ثعلبہ بن حاطب تھا۔ ابتدأ میں وہ بہت غریب تھا اور اس کی شدید خواہش تھی کہ وہ دولت مند ہو جائے۔ لہٰذا وہ بار بار جنابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے درخواست کرتا کہ یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ! دعا فرمایئے کہ میں دولت مند ہو جاؤں۔ آپؐ اس کے جواب میں فرماتے کہ ''تھوڑا سا مال جس کا حق تم ادا کر سکو، اُس بہت زیادہ مال سے بہتر ہے جس کا حق تم ادا نہ کر سکو''۔

آپ کا مطلب یہ تھا کہ کم پر راضی اور شاکر ہو لیکن اس نے کہا کہ میں اللہ تعالیٰ سے عہد کرتا ہوں کہ اگر وہ اپنے فضل سے مجھے بہرہ مند کرے تو میں صدقہ بھی دیا کروں گا اور صالحین یعنی شاکرین میں سے ہوں گا۔

"وَمِنْهُمْ مَّنْ عٰهَدَ اللّٰهَ لَئِنْ اٰتٰنَا مِنْ فَضْلِهٖ لَنَصَّدَّقَنَّ وَلَنَكُوْنَنَّ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ"۔ (توبہ: 75)

جنابِ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بلند و بانگ دعوے کرنے والے اس کم ظرف شخص کیلئے دعا کی تا کہ اس کے اور دوسرے لوگوں کیلئے بھی آزمائش ہو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعا کی برکت سے اللہ نے اس کو اس کی توقع سے بھی بڑھ کر مال و دولت سے نوازا۔ جب زکوٰۃ کی آیت نازل ہوئی اور زکوٰۃ کا حکم اس شخص تک پہنچایا گیا تو اس کم ظرف شخص نے اللہ سے کیا ہوا وعدہ بھلا دیا اور معمولی

مقدار میں زکوٰۃ دینے سے انکار کر دیا۔

ایک مختصر جملے میں قرآن مجید فرماتا ہے: ''جب اللہ نے اپنے فضل اور اپنی رحمت سے انہیں عطا فرمایا تو انہوں نے بخل سے کام لیا، وہ روگردانی کرتے ہوئے پھر گئے''۔

اگرچہ ثعلبہ ایک شخص تھا لیکن جب اس کی دولت بہت زیادہ ہوگئی تو وہ اس کا انتظام کرنے کیلئے بہت سے افراد سے مدد لینے لگا، لہٰذا ممکن ہے کہ آیت میں جمع کا صغیہ اسی لئے استعمال ہوا ہو۔

ایک احتمال یہ بھی ہے کہ ثعلبہ جیسے کچھ اور افراد نے بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ایسی ہی درخواست کی ہو اور پھر اُس الٰہی آزمائش میں کامیاب نہ ہو سکے ہوں۔

بہرحال اللہ سے کئے ہوئے اس عہد کی مخالفت کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے دل میں نفاق کی مستقل بیماری پیدا ہوگئی، حالانکہ یہ وہ شخص تھا جو کثرتِ عبادت کی وجہ سے ''حمامۃ المسجد'' یعنی مسجد کا کبوتر کہلاتا تھا مگر بخل کی وجہ سے اور اللہ اور رسولؐ سے کئے ہوئے وعدے کی خلاف ورزی کی وجہ سے مسلمانوں کے زمرے سے نکل کر منافقین کی صف میں کھڑا ہو گیا۔

چوتھی آیت میں اللہ تعالیٰ نے بخیلوں کی سخت سزا کا ذکر فرمایا ہے۔ یہ وہ سزا ہے جس کا ذکر پورے قرآن میں اس برائی کے علاوہ کسی اور برائی کیلئے نہیں کیا گیا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

''جو لوگ بخل کرتے ہیں اور جو کچھ اللہ نے اپنے فضل سے انہیں عطا کیا ہے، اس میں سے انفاق نہیں کرتے، وہ یہ نہ سمجھیں کہ یہ اُن کے حق میں اچھا ہے بلکہ یہ اُن کیلئے شر ہے''۔

''وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ بِمَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ هُوَ خَيْرًا لَّهُمْ ؕ بَلْ هُوَ شَرٌّ لَّهُمْ ؕ سَيُطَوَّقُوْنَ مَا بَخِلُوْا بِهٖ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ وَلِلّٰهِ مِيْرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ''۔ (آل عمران: 180)

آیت کے اختتام پر اللہ تعالیٰ فرما رہا ہے کہ زمین و آسمان کی میراث اللہ ہی کیلئے ہے اور اللہ تمہارے اعمال سے باخبر ہے۔

''وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْر''

اس جملے میں اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا جا رہا ہے کہ جب تم نے سب کچھ چھوڑ کر چلے جانا ہے تو پھر بخل کا فائدہ؟

اگرچہ بعض روایات میں آیا ہے کہ یہ آیت اُن لوگوں کے بارے میں جو زکوٰۃ ادا نہیں کرتے لیکن اگر غور کیا جائے تو آیت کا مفہوم عام ہے اور بخل کی تمام اقسام اس کے ذیل میں آ جاتی ہیں۔ بعض مفسرین نے تو یہ بھی کہا ہے کہ مال کے بخل کے علاوہ علم کا بخل بھی اس میں داخل ہے۔

اب یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ مال کس طرح طوق بنا کر ان کے گلے میں ڈالا جائے گا؟

حضرت امام محمد باقر علیہ السلام فرماتے ہیں کہ جو کوئی اپنے مال کی زکوٰۃ ادا نہ کرے۔ اللہ اُس مال کو ایک آتشیں اژدھے میں تبدیل کر کے اس کی گردن میں ڈال دے گا جو اسے مسلسل ڈستا رہے گا (تفسیر برہان، 1:327۔ عیاسی 1:207

یہ نکتہ بھی قابل غور ہے کہ بخیلوں کے اموال صرف آخرت میں ہی نہیں بلکہ دُنیا میں بھی ان کے گلے کا طوق بن جاتے ہیں۔ دُنیا میں ان اموال کی حفاظت، ان کا حساب رکھنا اور پھر ان سب کو چھوڑ کر مر جانا بھی گلے میں طوق ہونے کی ہی ایک قسم ہے۔

پانچویں آیت میں اللہ تعالیٰ ایسے بخیلوں کی مذمت کر رہا ہے جو خود بھی بخل کرتے ہیں اور دوسروں کو بخل کی ترغیب دلاتے ہیں، اس لئے کہ ان کا تعارف ''مختال فخور'' کے طور پر کروایا گیا ہے اور قرآن مجید میں متعدد مقامات پر آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ ''مختال فخور'' کو پسند نہیں کرتا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ''مختال فخور'' وہی لوگ ہیں جو خود بھی بخل کرتے ہیں اور دوسروں کو بھی بخل کی ترغیب دلاتے ہیں اور جو کوئی اس حکم کی نافرمانی کرے، وہ اللہ کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا، اس لئے کہ اللہ غنی اور حمید ہے۔

"الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ وَيَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبُخْلِ وَيَكْتُمُوْنَ مَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ۭ وَاَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا مُّهِيْنًا ۝" (نسأ: 37)

ظاہری بات ہے کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کی صفاتِ جلال و جمال کے ساتھ مکمل تضاد کی حالت میں ہو، اللہ تعالیٰ اُسے پسند نہیں کرتا اور ایسا شخص اللہ تعالیٰ کی عنایات سے بہرہ مند نہیں ہو سکتا۔

یہ نکتہ بھی قابلِ ذکر ہے کہ ان آیات سے پچھلی آیات میں انسان کی زندگی میں آنے والے مختلف مصائب کا ذکر کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ مادی زندگی سے انسان کو دل نہیں لگانا چاہئے۔ انسان کو مادی وسائل پر گھمنڈ نہیں کرنا چاہئے اور اسے معلوم ہونا چاہئے کہ بخل انسان کو امیر نہیں کر سکتا بلکہ حالات میں ذرا سا اُتار چڑھاؤ راتوں رات ایک دولت مند شخص کو کنگال کر سکتا ہے۔ لہٰذا دولت پر فخر کرنا بے معنی ہے اور بخل بھی کسی مشکل کو حل نہیں کرتا۔

یہاں پر یہ بات بھی قابل توجہ ہے بخیل شخص دوسروں کو بخل کی دعوت اس لئے دیتا ہے کہ وہ چاہتا ہے کہ سب لوگ اس جیسے ہو جائیں۔ اس کے علاوہ ایک اور بات یہ بھی ہو سکتی ہے کہ چونکہ بخل کی وجہ سے انسانی ہمدردی کے جذبات ان میں باقی نہیں رہتے اور یہ سنگدل اور بے رحم ہو جاتے ہیں، اب اگر کسی اور کو بھی فقراً اور ضرورت مندوں پر سخاوت کرتے ہوئے دیکھتے ہیں تو انہیں تکلیف ہوتی ہے۔

اس سلسلہ میں امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں کہ ایک بار امیر المومنین علیہ السلام نے حکم دیا کہ ایک شخص کو، جو سخی تھا اور فقراً کی مدد کرتا تھا، پانچ وسق کھجور بھیجی جائے (ایک وسق = 80 کلوگرام)۔ اُس شخص نے حضرت علی علیہ السلام یا کسی اور سے اس کی درخواست بھی نہیں کی تھی۔ جب امیر المومنین علیہ السلام نے یہ حکم دیا تو وہاں ایک بخیل شخص موجود تھا۔ اُس نے امیر المومنینؑ سے کہا یا امیر المومنینؑ! اس شخص نے آپ سے مدد کیلئے درخواست بھی نہیں کی، اگر آپؑ اسے ایک وسق بھی بھجوا دیتے تو کافی تھا!''

امیر المومنین علیہ السلام نے اس شخص کی سرزنش کی اور فرمایا:

"لَا كَثَّرَ اللّٰهُ فِي الْمُؤْمِنِيْنَ ضَرَبَكَ، أُعْطِيَ أَنَا وَتَبْخَلُ أَنْتَ"۔

''اللہ مسلمانوں کے معاشرے میں تجھ جیسے افراد کی تعداد میں اضافہ نہ کرے، دے مَیں رہا ہوں اور بخل تم کر رہے ہو؟''

''اگر میں کسی کی درخواست پر اس کی مدد کروں تو گویا اسے ایسی چیز کی قیمت ادا کر رہا ہوں جو میں نے اس سے لی ہے، اس لئے کہ مدد کی درخواست کر کے اس نے میری نظر میں اپنی عزت کو داغدار کیا ہے''۔(وسائل الشیعہ ، 6:318)۔

چھٹی آیت میں بخیلوں کی سخت سزا کا ذکر کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

''''جو کوئی بخل سے کام لیتا ہے اور اس طرح غنی ہونا چاہتا ہے اور اللہ تعالیٰ کیطرف سے دی جانے والی نیک جزا کو جھٹلاتا ہے، جلد ہی ہم اُسے مشکل میں گرفتار کر دیں گے''۔(اللیل:8تا10)

"وَاَمَّا مَنْۢ بَخِلَ وَاسْتَغْنٰى ۝ وَكَذَّبَ بِالْحُسْنٰى ۝ فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْعُسْرٰى"

اس آیت سے مندرجہ ذیل نکات بخوبی واضح ہوتے ہیں:

1۔ بخل بے نیازی کا سبب نہیں بن سکتا بلکہ بخل کی راہ اختیار کرنے والے انسان پر دُنیا اور آخرت دونوں کی راہیں دُشوار ہوجاتی ہیں، اس لئے کہ آیت میں ''لِلْعُسْرٰى'' کا لفظ مطلق ہے اور ہر قسم کی مشکل اس میں آجاتی ہے، خواہ دُنیوی ہو یا اُخروی۔

2۔ اگر کوئی شخص اپنی ساری دولت اپنے ساتھ قبر میں اور آخرت میں لے بھی جائے تو جب وہ جہنم میں گرے گا، اس کا مال اسے کیا فائدہ دے گا؟

3۔ ان آیات میں ''یُسر'' کا لفظ بھی استعمال ہوا ہے جو ''عسر'' کا متضاد ہے۔مفسرین نے اس بارے میں بہت سے احتمالات دیئے ہیں جو ''عسر'' پر بھی صادق آتے ہیں۔ایک یہ کہ ''یُسر'' سے مراد یہ ہے کہ انسان پر اللہ کی اطاعت آسان ہوجاتی ہے جبکہ ''عسر'' کے معنی یہ ہوں گے کہ انسان سے اطاعت کی توفیق سلب ہوجائے اور نیکی کرنا اس کے لئے مشکل ہو جاتا ہے۔

بعض نے کہا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ آسان زندگی کی راہ ہے۔بعض نے اس سے جنت کی راہ، بعض نے اللہ کے اجر وثواب کی راہ اور بعض نے غیبی امداد کی راہیں مراد لی ہیں۔لیکن جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں کہ ''عسر'' اور ''یسر'' دونوں کے معنی وسیع ہیں جن میں دُنیا اور آخرت دونوں کی تمام مشکلات اور آسانیاں شامل ہیں۔

ساتویں آیت میں اللہ تعالیٰ اصحابِ رسولؐ کو مخاطب قرار دے کر بخیلوں کی مذمت کرتے ہوئے فرماتا ہے:

''تم وہی لوگ ہو جنہیں کو اللہ کی راہ میں انفاق کی دعوت دی جاتی ہے اور تم میں سے کچھ تو بخل سے کام لیتے ہیں، حالانکہ جو بخل سے کام لیتا ہے، وہ اپنے بارے میں بخل کرتا ہے۔'') محمد: 38)

"هَاَنْتُمْ هٰٓؤُلَآءِ تُدْعَوْنَ لِتُنْفِقُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۚ فَمِنْكُمْ مَّنْ يَّبْخَلُ ۚ وَمَنْ يَّبْخَلْ فَاِنَّمَا يَبْخَلُ عَنْ نَّفْسِهٖ ۭ (محمد: 38)

آیت کے اختتام اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

"وَاللّٰهُ الْغَنِيُّ وَاَنْتُمُ الْفُقَرَاۗءُ"۔

''یعنی اللہ بے نیاز ہے اور تم فقر ہو''۔

اس جملے کا مقصد یہ ہے کہ کہیں نادان افراد یہ سمجھنے لگ جائیں کہ اللہ ہمارے انفاق کا محتاج ہے۔

لہٰذا جو کچھ تم انفاق کرتے ہو درحقیقت یہ اللہ کی امانتیں ہیں جو چند روز تمہارے ہاتھ میں ہیں جو تمہاری تربیت اور تمہاری آزمائش کیلئے تمہیں سونپی گئی ہیں اور اللہ نے تمہیں حکم دیا ہے کہ ان امانتوں کا کچھ حصہ اس کے فقیر اور نادار بندوں میں تقسیم کردو اور کچھ جہاد پر صرف کردو۔

آیت کے اختتام پر بخیل کو تنبیہ کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ''اگر تم اللہ کے حکم سے رُوگردانی کروگے تو وہ تمہاری جگہ پر کچھ اور لوگوں کو لے آئے گا جو تم جیسے نہ ہوں گے''۔

"اِنْ تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ۙ ثُمَّ لَا يَكُوْنُوْٓا اَمْثَالَكُمْ"۔ (محمد: 38)

اس طرح اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے بخیلوں کو نیست و نابود اور ہلاک کرنے کی وعید سنادی ہے اور یہ شدید ترین وعید ہے جو بخیلوں کیلئے آئی ہے۔

بہت سے شیعہ اور سنی مفسرین نے لکھا ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو اصحاب نے عرض کیا: یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! وہ لوگ کون ہیں جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے قرآن میں فرمایا ہے کہ انہیں تمہارا جانشین بنادے گا؟

جنابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنا ہاتھ سلمان کے کندھے پر رکھا۔ ایک روایت میں ہے کہ سلمان کے پاؤں پر رکھا اور فرمایا:

"هٰذَا وَقَوْمُهُ وَالَّذِيْ نَفْسِيْ بِيَدِهٖ لَوْ كَانَ الْاِيْمَانُ مَنُوْطًا بِالثُّرَيَّا لَتَنَاوَلَهُ رِجَالٌ مِنْ فَارِسٍ"۔

''اللہ کی مراد اس کی قوم ہے، قسم ہے اللہ کی جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے، اگر ایمان ثریا پر بھی ہو تو اہلِ فارس کے کچھ افراد اُسے حاصل کرکے رہیں گے''۔

(تفسیر قرطبی،تفسیر رُوح البیان،تفسیر کبیر،تفسیر مراغی،تفسیر مجمع البیان اورتفسیر الدرالمنثور میں اسی آیت کے ذیل میں یہ بات دیکھی جاسکتی ہے)۔

آٹھویں آیت میں انفاق کا حکم دینے اوراس بات پر تاکید کرنے کے بعد کہ انفاق تمہارے لئے باعثِ خیروبرکت ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جولوگ اپنے نفس کے بخل سے محفوظ رہتے ہیں،وہی فلاح پانے والے ہیں۔

8۔ "وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ"(تغابن:16و حشر:9)

راغب اصفہانی اپنی کتاب ''المفردات'' میں کہتے ہیں کہ ''شُحّ'' اُس شخص کو کہتے ہیں جس میں حرص بھی پائی جاتی ہواور یہ انسان کی مستقل عادت بن جائے۔

لفظ ''فلاح'' جو بنیادی طور پر شگافتہ کرنے اور کاٹنے کے معنی رکھتا ہے،اس کا اطلاق ہر قسم کی خوش بختی اور کامیابی پر کیا جاتا ہے،اس لئے کہ انسان ہر رُکاوٹ کو شگافتہ کرتے ہوئے اوراپنے راستے سے اُسے کاٹتے ہوئے کامیابی کی منزل تک پہنچتا ہے۔فلاح کو مادی اورمعنوی فلاح میں تقسیم بھی کیا گیا ہے۔

اس آیت سے پہلے اللہ تعالیٰ خبردار کررہا ہے کہ مال اور اولاد فتنہ وآمائش ہیں۔گویا اللہ تعالیٰ ان دو چیزوں کی حد سے بڑھی ہوئی محبت کو انفاق کی راہ میں رُکاوٹ قرار دے رہا ہے کیونکہ انہی کی حد سے بڑھی ہوئی محبت انسان کو بخل کی بیماری میں مبتلا کردیتی ہے۔

ایک حدیث میں ہے کہ ایک بار حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام تمام رات بیت اللہ کا طواف کرتے رہے اوراس دوران یہ دعا مانگے جارہے تھے:

"اَللّٰهُمَّ قِنِی شُحَّ نَفْسِیْ"۔

یااللہ! مجھے میرے نفس کے بخل سے بچالے''۔

راوی کہتا ہے کہ میں نے عرض کیا:''یابن رسولؐ اللہ! آج رات آپؑ نے اس دعا کے علاوہ کوئی اوردُعانہیں مانگی؟''

آپؑ نے فرمایا:

"وَاَیُّ شَیْءٍ اَشَدُّ مِنْ شُحِّ النَّفْسِ اِنَّ اللّٰهَ یَقُوْلُ وَمَنْ یُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ"۔

''نفس کے بخل سے بڑھ کرکونسی چیز بری ہوسکتی ہے؟اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:جواپنے نفس کے بخل سے بچالیا گیا،وہ فلاح پاگیا''۔(نورالثقلین:ج5۔ص346)

انفاق کا حکم دینے کے بعد ''خَیْرًا لِاَنْفُسِكُمْ'' کے الفاظ اس لطیف نکتہ کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ اللہ کی راہ میں انفاق اور سخاوت کا فائدہ خود انسان کو ہوتا ہے۔اس سے انسان کی روحانی نشوونما ہوتی ہے۔انسان کا نفس بخل کی تاریکی سے پاک ہوتا ہے اور

بہت سی معنوی اور مادی برکات انسان پر نازل ہوتی ہیں۔

ہم اس بحث کو حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کی اس حدیث پر ختم کرتے ہیں جس میں ''شُحّ'' کے معنی بیان کیے گئے ہیں۔آپؑ نے فضیل ابن عیاض سے پوچھا:

''جانتے ہو کہ 'شحیح' کون ہوتا ہے؟''

اُس نے جواب دیا:''شحیح بخیل ہی کو کہتے ہیں''۔

امام علیہ السلام نے فرمایا:

"اَلشُّحُ اَشَدُّ مِنَ الْبُخلِ اِنَّ الْبَخِیْلَ یَبْخَلَ بِمَا فِیْ یَدِہٖ وَالشَّحِیْحُ یَشُحُّ عَلٰی مَافِیْ اَیْدِی النَّاسِ وَعَلٰی مَافِیْ یَدِہٖ حَتّٰی لَایَرٰی فِیْ اَیْدِی النَّاسَ شَیْئًا اِلَّاتَمَنّٰی اَنْ یَکُوْنَ لَہٗ بِالْحِلِّ وَالْحَرَامِ، لَایَشْبَعُ وَلَاعَقْنَفْعُ بِمَارَزَقَہُ اللّٰہُ عَزَّوَجَلَّ"۔ (نور الثقلین: ج 5،ص 291)

''شُحُّ''، بخل سے بدتر ہے۔بخیل اُس مال کے بارے میں بخل کرتا ہے جو اس کے اپنے ہاتھ میں ہو اور ''شحیح'' اُس مال کے بارے میں بخل کرتا ہے جو دوسروں کے ہاتھ میں ہو، یہاں تک کہ وہ لوگوں کے ہاتھ میں کوئی چیز نہیں دیکھنا چاہتا مگر یہ کہ وہ چاہتا ہے کہ وہ چیز اسے مل جائے، خواہ حلال طریقے سے ہو یا حرام طریقے سے۔جو کچھ اللہ نے اُسے دیا ہے، اُس سے اُس کا پیٹ نہیں بھرتا اور وہ اس پر قناعت نہیں کرتا''۔

نویں آیت میں اللہ تعالیٰ 'بخل تفقیر'' کے عنوان کے تحت بیان کرتے ہوئے فرماتا ہے:

رحمٰن کے بندوں کی ایک خاصیت یہ ہے کہ انفاق کرتے وقت وہ اسراف کرتے ہیں نہ سخت گیری بلکہ ان دولوں کے مابین اعتدال کی راہ اختیار کرتے ہیں۔

"وَالَّذِیْنَ اِذَآ اَنْفَقُوْا لَمْ یُسْرِفُوْا وَلَمْ یَقْتُرُوْا وَکَانَ بَیْنَ ذٰلِکَ قَوَامًا"(فرقان: 67)

''یَقْتُرُوْا'' کا مصدر ''قتر'' ہے جو اسراف کا نکتہ مقابل ہے۔اسراف اور اقتار ایک دُوسرے کے متضاد کے طور پر استعمال ہوتے ہیں۔اسراف کے معنی ہیں حد سے زیادہ انفاق کرنا اور اقتار کے معنی ہیں ضروری حد سے کم انفاق کرنا۔

درحقیقت اقتار بخل کی کمزور شکل ہے، اس لئے کہ اس میں کچھ نہ کچھ انفاق تو انجام پا رہا ہوتا ہے، اگرچہ ضرورت سے کم ہوتا ہے۔لیکن بخل میں تو کوئی انفاق انجام نہیں پاتا۔اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو بخل تو درکنار، اقتار سے بھی پاک اور منزہ قرار دے رہا ہے۔

دسویں اور آخری آیت میں اللہ تعالیٰ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے خطاب کرتے ہوئے فرما رہا ہے:

ان (مشرکوں) سے کہو کہ اگر تم میرے رب کی رحمت کے خزانوں کے مالک ہوتے تو تم تنگدستی کے خوف سے

بخل سے کام لیتے۔

قُلْ لَّوْ اَنْتُمْ تَمْلِكُوْنَ خَزَآىِٕنَ رَحْمَةِ رَبِّيْۤ اِذًا لَّاَمْسَكْتُمْ خَشْيَةَ الْاِنْفَاقِ ؕ (بنی اسرائیل:100)

آیت کے اختتام پر اللہ تعالیٰ فرمارہا ہے:

وَكَانَ الْاِنْسَانُ قَتُوْرًا "(بنی اسرائیل:100)

''اور انسان ایک بخیل مخلوق ہے''۔

یہاں انسان سے مراد غیر تربیت یافتہ انسان ہیں جو بخل کی روش پر چلتے ہیں۔ البتہ وہ انسان جو اولیاً اللہ کے زیر تربیت رہے ہوں بلکہ وہ انسان بھی جنہوں نے اپنی فطری پاکیزگی کو محفوظ رکھا ہو، بخیل اور طاقتور نہیں ہو سکتے۔

اس آیت کے الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ بخل ہمیشہ ذاتی یا گروہی مفادات کیلئے نہیں ہوتا بلکہ یہ صفتِ رذیلہ انسان کو اس حد تک گرا دیتی ہے کہ اگر اللہ کی رحمت کے خزانوں کی چابیاں بھی اسے دے دی جائیں تو وہ فقر اور تنگدستی کے خوف سے بخل کر راہ کو ترک نہیں کرتا۔

اس آیت میں ایک عام ضابطے کے طور پر اللہ تعالیٰ فرمارہا ہے: ''وَكَانَ الْاِنْسَانُ قَتُوْرًا''۔ ایسی مثالیں قرآن مجید میں اور بھی ہیں جیسے:

"اِنَّ الْاِنْسَانَ لِرَبِّهٖ لَكَنُوْدٌ"۔ (عادات:6)

''انسان اپنے رب کا بڑا ناشکرا ہے''۔

"اِنَّ الْاِنْسَانَ لَكَفُوْرٌ" (حج:66)

''انسان بہت بڑا کفرانِ نعمت کرنے والا ہے''۔

"اِنَّ الْاِنْسَانَ لَكَفُوْرٌ مُّبِيْنٌ" (زخرف:15)

''انسان بطور آشکار بہت بڑا کفرانِ نعمت کرنے والا ہے''۔

اِنَّ الْاِنْسَانَ لَظَلُوْمٌ كَفَّارٌ"۔ (ابراھیم:34)

''انسان بہت بڑا ظالم اور بہت بڑا کفرانِ نعمت کرنے والا ہے''۔

یہ تمام بیانات ایسے انسانوں کیلئے ہیں جو اپنی فطری پاکیزگی کی دولت کو کھو چکے ہیں اور انبیاً و اولیاً کی تربیت کے فیض سے محروم رہے ہیں ورنہ پیدائشی طور پر کوئی انسان ایسے نقائص کے ساتھ دنیا میں نہیں آتا۔ اللہ نے انسان کی تخلیق کی بنیاد پاکیزگی پر رکھی ہے، ناپاکی پر نہیں۔

نتیجہ:

مندرجہ بالا آیات کی روشنی میں بخل کے بارے میں اسلام کا مؤقف اچھی طرح واضح ہوجاتا ہے۔ان آیات میں بخیلوں کے طرزِ عمل اوران کی مادی ومعنوی زندگی پر اس کے منفی اثرات وضاحت کے ساتھ بیان ہوئے ہیں،اوراس بات کوکھول کر بیان کردیا گیا ہے کہ بخل ایک صفت رذیلہ ہے جوانسان کی فلاح کے ساتھ سازگار نہیں ہے۔

بُخل احادیث کے آئینے میں

کتب احادیث میں بخل کے بارے میں ایسی احادیث بکثرت پائی جاتی ہیں جو انسان کو جھنجھوڑ کر رکھ دیتی ہیں۔نمونے کے طور پر ذیل میں چند احادیث بیان کی جارہی ہیں:

1. جنابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک حدیث میں فرماتے ہیں:

"اَلْبَخِيْلُ بَعِيْدٌ مِّنَ اللهِ بَعِيْدٌ النَّاسِ، قَرِيْبٌ مِنَ النَّارِ"۔ (بحار، 308:73)

''بخیل اللہ سے دُور ہوتا ہے،لوگوں سے بھی دُور ہوتا ہے اورجہنم کے نزدیک ہوتا ہے''۔

2۔ایک حدیث میں امیر المومنین علیہ السلام فرماتے ہیں:

"اَلنَّظَرُ اِلَى الْبَخِيْلِ يُقْسِي الْقَلْب"۔ (تحف العقول:214)

''بخیل شخص کو دیکھنے سے دل سخت ہوجاتا ہے''۔

اس حدیث سے یہ بات بخوبی واضح ہوجاتی ہے کہ بخیل انسان کا دل اس قدر تاریک ہوتا ہے کہ اس کو دیکھنے والے بھی اس تاریکی سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔

3۔ایک اورحدیث میں ہے کہ جنابِ رسولؐ خدا بیت اللہ کے طواف میں مشغول تھے۔آپؐ نے ایک شخص کو دیکھا جو بیت اللہ کے غلاف سے چمٹا ہوا تھا اور کہہ رہا تھا: یا اللہ! تجھے اس گھر کی حرمت کا واسطہ! میرے گناہوں کو معاف فرمادے۔

جنابِ رسولِ خدا نے اُس سے کہا: تمہارا گناہ کیا ہے؟ ذرا بیان کرو۔

اُس نے کہا: یارسولؐ اللہ: میرا گناہ اس سے کہیں بڑا ہے کہ میں اُسے بیان کرسکوں۔

آپؐ نے فرمایا: تم پر افسوس ہے،تمہارا گناہ بڑا ہے یا زمین؟

اس نے کہا: یارسولؐ اللہ! میرا گناہ بڑا ہے۔

آپؐ نے فرمایا: تمہارا گناہ بڑا ہے یا سمندر؟

اس نے کہا: میرا گناہ

آپؐ نے فرمایا: تمہارا گناہ بڑا ہے یا آسمان؟

اس نے کہا: میرا گناہ۔

آپؐ نے فرمایا: تمہارا گناہ بڑا ہے یا اللہ کا عرش؟

اس نے کہا: میرا گناہ۔

آپؐ نے فرمایا: تمہارا گناہ بڑا ہے یا اللہ؟

اس نے کہا: یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! اللہ ہر چیز سے بڑا ہے۔

آپؐ نے فرمایا: افسوس ہے تم پر! بتاؤ تم نے کونسا گناہ کیا ہے جسے اس قدر برا سمجھ رہے ہو؟

اس نے کہا: یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! میں ایک دولت مند شخص ہوں لیکن جس کوئی حاجت مند میرے پاس آتا ہے تو مجھے ایسا لگتا ہے جیسے آگ کا شعلہ میرے سامنے بھڑکا دیا گیا ہو۔

آپؐ نے فرمایا: مجھ سے دور ہو جاؤ اور مجھے اپنی آگ میں نہ جلاؤ۔ قسم ہے اس اللہ کی جس نے مجھے مبعوث فرمایا۔ اگر تو دو ہزار سال تک رکن اور مقام ابراہیم کے درمیان عبادت کرتا رہے، روتا رہے، یہاں تک کہ تیری آنکھوں سے بہنے والے آنسو ایک دریا کی صورت میں بہہ کر باغوں اور درختوں کو سیراب کرنے لگیں لیکن اگر تو بخیل اور لئیم ہو تو اللہ تعالیٰ منہ کے بل تجھے جہنم میں ڈال دے گا۔ کیا تو نے اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان نہیں پڑا کہ جو کوئی بخل کرتا ہے، اپنی ذات کے بارے میں بخل کرتا ہے اور جو اپنے بخل سے محفوظ ہو، وہی فلاح پانے والا ہے؟ (جامع السعادات، 111:2)

4۔ ایک اور حدیث میں جنابِ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

"یَقُوْلُ قَائِلُکُمْ اَلشَّحِیْحُ اَعْذَرپ مِنَ الظَّالِمِ وَأَیُّ ظُلْمٍ اَظْلَمُ عِنْدَاللّٰہِ مِنَ الشُّحِّ حَلَفَ اللّٰہُ بِعِزَّتِہٖ وَعَظَمَتِہٖ وَجَلَالِہٖ لَایَدْخُلُ الْجَنَّۃَ شَحِیْحٌ وَلَا بَخِیْلٌ"۔ (جامع السعادات، 111:2)

''تم میں سے بعض لوگ کہتے ہیں کہ بخیل ظالم کی نسبت معذور ہے، حالانکہ اللہ کے ہاں کونسا ظلم بخل سے بڑھ کر ہے؟ جبکہ اُس نے اپنی عزت، عظمت اور جلال کی قسم کھا کر کہا ہے کہ حریص اور بخیل کسی صورت میں جنت میں داخل نہ ہوں گے''۔

5۔ ایک اور حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

"اَلشُّحُّ وَالْاِیْمَانُ لَایَجْتَمِعَانِ فِیْ قَلْبٍ وَاحِدٍ"۔ (جامع السعادات، 110:2)

''حرص اور بخل اور ایمان ایک دل میں جمع نہیں ہو سکتے''۔

6۔ ایک اور مقام پر آپؐ کا فرمان ہے:

"اَلْبُخْلُ شَجَرَۃٌ تَنْبُتُ فِی النَّارِ اِلَّا بَخِیْلٌ"۔

''بخل ایک درخت ہے جو جہنم کی آگ میں اُگتا ہے، یہی وجہ ہے کہ بخیل کے سوا کوئی شخص جہنم میں نہیں جائے گا۔'' (جامع السعادات، 110:2)

7۔ روایات میں آیا ہے کہ جنابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ایک صحابی ایک جنگ میں شہید ہو گئے۔ اُس کی رشتہ دار خواتین میں سے ایک ''واشہیدا'' کہہ کر اس پر رو رہی تھی۔ آپؐ نے اس عورت سے فرمایا: ''تمہیں کیا معلوم کہ وہ شہید ہو کر اس دنیا سے گیا ہے؟''

"فَلَعَلَّہٗ کَانَ یَتَکَلَّمُ بِمَا لَایَعْنِیْہِ اَوْ یَبْخَلُ بِمَا لَایَنْقُصُہٗ"۔

''شاید وہ ایسی چیزوں کے بارے میں باتیں کرتا ہو جن کا اُس سے کوئی تعلق نہ تھا یا اُس چیز کے بارے میں بخل کرتا تھا جسے دینے سے اُس کے مال میں کوئی کمی نہ آتی''۔ (جامع السعادات، 111:2)

اس حدیث سے یہ بات روشن ہو جاتی ہے کہ بیہودہ گفتگو اور بخل، خاص طور پر ایسی چیزوں کے بارے میں بخل جن کے دینے سے انسان کے مال میں کوئی کمی نہیں آیت، شہادت جیسے عظیم اعزار کو بھی بے رن یا کم رنگ کر دیتی ہے۔

8۔ آنحضرتؐ سے منقول ہے کہ آپؐ نے فرمایا:

"جَاھِلٌ سَخِیٌّ اَحَبُّ اِلَی اللّٰہِ مِنْ عَابِدٍ بَخِیْلٍ وَاَدْوَی الدَّاءِ الْبُخْلُ"۔

''جاہل سخی اللہ کی نظر میں بخیل عبادت گزار سے بہتر ہے اور بدترین بیماری بخل ہے''۔ (جامع السعادات، 110:2)

اس حدیث سے یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ بخل عبادت آثار کو محو کر دیتا ہے۔

9۔ جنابِ رسولؐ خدا سے منقول ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"اَلْمُوْبِقَاتُ ثَلَاثٌ شُحٌّ مُطَاعٌ وَھَوًی مُتَّبَعٌ وَاِعْجَابُ الْمَرْءِ بِنَفْسِہٖ"۔

''تین چیزیں باعثِ ہلاکت ہیں: وہ شح (بخل) جس کی انسان طلب کرے، وہ ہوائے نفس جس کی انسان

پیروی کرے اور خود پسندی''۔(جامع السعادات،110:2)

اگر چہ اس موضوع پر احادیث بہت زیادہ ہیں لیکن ہم اس بحث کو اس حدیث پر ختم کرتے ہیں:

ایک مرتبہ خطرناک قیدیوں کا ایک گروہ جنابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں لایا گیا۔آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علیؑ کو حکم دیا کہ ان سب کو قتل کر دیں مگر ایک کو مستثنیٰ کر دیا۔اس شخص نے پوچھا کہ آپؐ نے مجھے میرے ساتھیوں سے الگ کیوں کر دیا، حالانکہ ہم سب کا جرم ایک ہے؟

آپؐ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے بذریعہ وحی مجھے خبر دی ہے کہ تم اپنی قوم کے سب سے زیادہ سخی انسان ہو، اس لئے میں نے تمہیں معاف کر دیا۔یہ سنتے ہی وہ شخص بھی مسلمان ہو گیا۔(میزان الحکمہ ،1277:2)

بہت سے دوسرے اخلاقی رذائل کی طرح اس صفتِ رذیلہ کا سبب ایمان کی کمزوری اور اللہ کی ناقص معرفت ہے۔جو شخص اللہ تعالیٰ کو ہر چیز پر قادر سمجھتا ہے، اسے خیر و برکت کا سرچشمہ مانتا ہے، اُس کے تمام وعدوں کو سچا جانتا ہے اور انفاق فی سبیل اللہ کے معنوی اور مادی فوائد اور برکات پر یقین رکھتا ہے، اس کیلئے ممکن ہی نہیں ہے کہ اس صفتِ رذیلہ میں گرفتار ہو جائے۔حضرت علی علیہ السلام نے کیا خوب فرمایا ہے:

"اَلْبُخْلُ بِالْمَوْجُوْدِ سُوْءُ الظَّنِ بِالْمَعْبُوْدِ"۔(غرر الحکم: 1258)

''جو چیز انسان کے پاس موجود ہے، اُس کے بارے میں بخل سے کام لینا معبود کے بارے میں بدگمانی اور سوءظن ہے''۔

ایک اور حدیث میں امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

"اِنْ كَانَ الْخَلَفُ مِنَ اللهِ عَزَّوَجَلَّ حَقًّا فَالْبُخْلُ لِمَاذَا"۔

''اگر یہ بات حق ہے کہ جو مال اللہ کی راہ میں دے دیا جائے، اللہ اس مال کا جانشین ضرور بناتا ہے تو پھر بخل کیوں؟''(بحار الانوار،300:70)

فقہ الرضا میں ہے:

"اِيَّاكُمْ وَالْبُخْلَ فَاِنَّهَا عَاهَةٌ لَا تَكُوْنُ فِيْ حُرٍّ وَلَا مُؤْمِنٍ اِنَّهَا خِلَافُ الْاِيْمَانِ"۔

''بخل سے بچو کیونکہ یہ ایسی برائی ہے جو کسی آزاد یا مومن انسان میں نہیں پائی جاسکتی، یہ تو ایمان کے ہی خلاف ہے''۔(بحار الانوار،364:75)

ایک حدیثِ قدسی میں ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

"يَاعَبْدِيْ اَتَبْخَلُنِيْ اَمْ تَتَّهِمُنِيْ اَمْ تَظُنُّ اَنِّيْ عَاجِزٌ غَيْرُ قَادِرٍ عَلٰى اِثَابَتِكَ"۔

''اے میرے بندے! کیا تو میرے بارے میں بخل سے کام لیتا ہے یا مجھے جھوٹا سمجھتا ہے یا میرے بارے میں یہ خیال رکھتا ہے کہ میں کمزور ہوں اور تجھے اجروثواب دینے کی قدرت نہیں رکھتا؟''(بحار،10:93)

یقیناً جولوگ آزاد انسان جیسی نفسیات رکھتے ہیں اور وہ جو ایمان سے سرشار ہیں اور وہ جو اللہ تعالیٰ کے وعدوں کو سچ جانتے ہیں اور اس بات پر ایمان رکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے وعدے پورے کرنے اور بندوں کو اجروثواب عطا کرنے پر قادر ہے، اللہ کی راہ میں انفاق کرتے وقت اُن کا ہاتھ نہیں کانپتا بلکہ جہاں تک اُن کیلئے ممکن ہوتا ہے، وہ اللہ کے بندوں کے ساتھ سخاوت اور بخشش کے ساتھ پیش آتے ہیں اور اجروثواب کی توقع صرف اللہ سے رکھتے ہیں جو عالم اور قادر ہے۔

بخل کی ایک علامت یہ ہے کہ انسان دوسروں کی مدد سے بچنے کیلئے بہانہ جوئی کرتا ہے۔ بخیل انسان اپنے بخل کو چھپانے کیلئے بے بنیاد اور بیہودہ عذر اور بہانے تلاش کرتا ہے اور ایسے ہی طریقوں سے اپنے آپ کو بھی فریب دیتا رہتا ہے، مثلاً ممکن ہے کہ کسی شخص کے پاس کافی مقدار میں روپیہ موجود ہو لیکن اس کے باوجود کسی کی مدد کرنے کو تیار نہ ہو بلکہ اس قسم کے بہانوں کا سہارا لینے لگے کہ ہوسکتا ہے کہ خود مجھے اس کی ضرورت پڑ جائے، ممکن ہے میری بیوی کا بچہ بیمار ہوجائے، یا ہوسکتا ہے کہ میرے گھر مہمان آجائیں یا ہوسکتا ہے کہ کاروبار میں نقصان وغیرہ جیسی صورت پیدا ہوجائے۔ امیرالمومنین علیہ السلام فرماتے ہیں:

"اَلْبَخِیْلُ مُتَحَجِّجٌ بِالْمَعَاذِیْرِ وَالتَّعَالِیْلِ"۔

''بخیل انسان بیہودہ بہانے اور دلیلیں تلاش کرتا ہے''۔(غررالحکم:1275)

ایک اور مقام پر آپؑ فرماتے ہیں:

"کَثْرَةُ الْعِلَلِ آیَةُ الْبُخْلِ"۔

''بہانوں کی کثرت بخل کی علامت ہے''۔(بحارالانوار،209:74)

بخل کی ایک علامت یہ ہے کہ انسان اللہ کی دی ہوئی نعمتوں کو چھپاتا ہے تاکہ لوگ اس سے کچھ مانگ نہ لیں اور اس کیلئے بھی اس قسم کے بہانے بنانے لگتا ہے کہ میں اپنی حقیقت اس لئے چھپاتا ہوں کہ نظر نہ لگ جائے، لوگ مجھ سے حسد نہ کرنے لگیں یا کوئی مجھے نقصان نہ پہنچادے۔

بخل کی ایک علامت یہ ہے کہ انسان اللہ کی راہ میں کوئی چیز دے کر آزردہ خاطر ہوجاتا ہے، گویا کوئی بہت بڑا بوجھ اس کے کاندھے پر رکھ دیا گیا ہے یا اس کا کوئی عزیز داغِ مفارقت دے گیا ہے۔

بخل کے نتائج:۔

تمام صفاتِ رذیلہ میں بخل ایسی صفت ہے جو سب سے زیادہ مشکلات اور برے نتائج کی حامل ہوتی ہے۔ بخیل شخص اگرچہ اپنا مال بچالیتا ہے مگر اپنی عزت کھودیتا ہے۔ یہ بات احادیث میں بھی وسیع پیمانے پر بیان ہوئی ہے۔ چند احادیث ملاحظہ ہوں:

1۔ حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

"اَلْبَخِیْلُ یَسْمَحُ مِنْ عِرْضِہٖ بِاَکْثَرِ مِمَّا اَمْسَکَ مِنْ عِرْضِہٖ"۔

''بخیل جتنا مال بچاتا ہے، اس سے زیادہ اپنی عزت کھو دیتا ہے''۔(شرح فارسی غرر الحکم، 130:2)

2۔ بخیل اپنے دوستوں کو کھو دیتا ہے اور مشکلات میں اکیلا رہ جاتا ہے۔ امیر المومنین علیہ السلام فرماتے ہیں:

"لَیْسَ لِبَخِیْلٍ حَبِیْبٌ"

''بخیل کا کوئی دوست نہیں ہوتا''۔(شرح فارسی غرر الحکم، 27:5)

اگر کوئی شخص اس کا دوست بن بھی جائے تو اُس کا بخل اس کے دوستوں کی بھی ذِلت اور رُسوائی کا اور اس کے دُشمنوں کی عزت کا سبب بن جاتا ہے جیسا کہ امیر المومنین علیہ السلام فرماتے ہیں:

"اَلْبُخْلُ (اَلْبَخِیْلُ) یُذِلُّ مُصَاحِبَہٗ وَیُعِزُّ مُجَانِبُہٗ"۔ (شرح فارسی غرر الحکم، 370:1)

3۔ بخیل ہمیشہ محنت ومشقت کرتا ہے اور اس کی محنت ومشقت کا ثمر اس کے وارثوں کو مل جاتا ہے۔ دُنیا میں وہ فقیروں جیسی زندگی گزارتا ہے اور آخرت میں مال جمع کرنے اور انفاق نہ کرنے کا عذاب جھیلتا ہے۔

امیر المومنین علیہ السلام فرماتے ہیں:

"اَلْبَخِیْلُ خَازِنٌ لِوَرَثَتِہٖ"۔ (شرح فارسی غرر الحکم، 127:1)

''بخیل اپنے وارثوں کا خزانچی ہوتا ہے'' (اور ہوسکتا ہے کہ اس کے وارث اس کے ایصال ثواب کیلئے ایک روپیہ بھی خرچ نہ کریں)۔

4۔ بخیل فقیرانہ زندگی گزارتا ہے، اس لئے کہ جب انسان کے بخل میں شدت آجائے تو وہ اپنے بارے میں بھی بخل سے کام لینے لگتا ہے اور آرام وآسائش کی زندگی سے محروم ہوجاتا ہے۔ بعض اوقات وہ بخل کی وجہ سے نفسیاتی بیماریوں میں بھی مبتلا ہوجاتا ہے۔ وہ سمجھنے لگتا ہے کہ لوگ اس کے مال کی طمع کرنے لگے ہیں، اُس سے حسد کرتے ہیں اور اُس کے دُشمن ہوگئے ہیں۔

امیر المومنین علیہ السلام نے بخیل کی حالت کا نقشہ کس خوبصورتی سے کھینچا ہے!

"عَجِبْتُ لِشَقِیِّ الْبَخِیْلِ یَتَعَجَّلُ الْفَقْرَ الَّذِیْ مِنْہُ ھَرَبَ وَیَفُوْتُہُ الْغِنَی الَّذِیْ اِیَّاہُ طَلَبَ فَیَعِیْشُ فِی الدُّنْیَا عَیْشَ الْفُقَرَاءِ وَیُحَاسَبُ فِی الْاٰخِرَۃِ حِسَابَ الْاَغْنِیَاءِ"۔ (شرح فارسی غرر الحکم، 346:4)

''مجھے بدبخت بخیل پر تعجب ہوتا ہے کہ جس فقر سے وہ ڈرتا ہے، یہی تیزی سے اُس کو آلیتا ہے اور جس بے نیازی اور تونگری کی وہ آرزو کرتا ہے، وہی اُس سے رُخصت ہوجاتی ہے۔ دُنیا میں وہ فقیروں کی طرح زندگی بسر کرتا ہے اور آخرت میں حساب اغنیا جیسا دے گا''۔

5۔ بخل بدنامی اور لوگوں کی طرف سے لعنت ونفرین کی کثرت کا سبب بنتا ہے۔ امیر المومنین فرماتے ہیں:

"بِالْبُخْلِ تَكْثُرُ الْمَسَبَّةَ"۔ (شرح فارسی غرر الحکم، 200:3)

''بخل کی وجہ سے لوگوں کی دشنام طرازیاں بڑھ جاتی ہیں''۔

6۔ بخل بہت سی صفاتِ رذیلہ کا مجموعہ اور سرچشمہ ہے: جیسے سوءظن، حسد، خوف، بزدلی، اخلاصِ نیت سے محرومی، باطنی پاکیزگی کا کھوجانا، سنگدلی وغیرہ۔ ایک حدیث میں حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

"اَلْبُخْلُ جَامِعٌ لِمَسَاوِئِ الْعُيُوْبِ وَهُوَ زِمَامٌ يُقَادُ بِهٖ اِلٰى كُلِّ سُوْءٍ"۔

''بخل تمام عیوب کا مجموعہ ہے اور ایسی لگام ہے جو انسان کو ہر برائی کی طرف لے جاتی ہے''۔

(بحار الانوار، 307:70)

بخل کے درجات:۔

تمام صفاتِ رذیلہ کی طرح بخل کے بھی مختلف درجات ہیں۔ ان میں سے بعض تو بہت ہی ضعیف ہوتے ہیں جو اکثر لوگوں کو نظر ہی نہیں آتے جبکہ بعض اتنے طاقتور ہوتے ہیں جو بچوں کو بھی نظر آجاتے ہیں۔

بعض لوگ صرف اپنے اموال کے بارے میں بخل سے کام لیتے ہیں اور اس بات پر آمادہ نہیں ہوتے کہ اپنے اموال سے کسی کو تھوڑا سا بھی فائدہ پہنچائیں۔ بعض لوگ دُوسروں کے مال کے بارے میں بھی بخل کا رویہ رکھتے ہیں۔ ایسے لوگ جب دیکھتے ہیں کہ کوئی اور شخص اپنے مال سے کسی کو فائدہ پہنچا رہا ہے تو انہیں تکلیف پہنچتی ہے۔ بعض اس سے بھی آگے بڑھ جاتے ہیں اور ان کی حالت یہ ہوجاتی ہے کہ کسی کو اپنے مال ودولت سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے بھی نہیں دیکھ سکتے۔ یہ بخل کا بدترین اور عجیب ترین نمونہ ہے۔

اس کے علاوہ بعض لوگ مادی اُمور میں بخیل ہوتے ہیں اور بعض معنوی اُمور میں، جیسے کسی کو اپنے علم سے نفع پہنچانے میں بخل سے کام لینا۔ بعض لوگ بڑے معاملات میں بخیل واقع ہوتے ہیں اور بعض لوگ چھوٹے چھوٹے مسائل میں۔ بعض لوگ واجبات میں بخل سے کام لیتے ہیں اور خمس وزکوۃ کی ادائیگی نہیں کرتے جبکہ بعض لوگ مستحبات میں بخل سے کام لیتے ہیں۔

بعض لوگ کھلم کھلا بخیل ہوتے ہیں جبکہ بعض لوگ اپنے بخل کی مختلف توجیہات پیش کرتے ہیں مثلاً یہ کہیں گے کہ ''ہمیں اسراف پسند نہیں ہے، بچوں کے اخراجات بڑھ گئے ہیں، کیا کریں، کوئی حقیقی مستحق ہی نہیں ملتا، وغیرہ۔

مختصر یہ کہ بخل کی مختلف صورتوں کے بارے میں لطیف نکات بیان کئے گئے ہیں جن میں سے چندنمونے ذیل میں درج کئے جاتے ہیں:

1۔ امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

"اَلْبُخْلُ بِاِخْرَاجِ مَا افْتَرَضَهُ اللهُ سُبْحَانَهُ مِنَ الْاَمْوَالِ اَقْبَحُ الْبُخْلِ"۔

''جن چیزوں کا ادا کرنا اللہ نے فرض قرار دیا ہے، اُن کی عدم ادائیگی بدترین بخل ہے''۔(غرر الحکم، 2038)

2۔ گزشتہ صفحات میں یہ واقعہ بیان ہو چکا ہے کہ امیر المومنین علیہ السلام نے ایک شخص کو کچھ کھجوریں بھجوائیں۔ پاس بیٹھے ہوئے ایک بخیل نے کہا کہ اگر آپؑ اس کا پانچواں حصہ بھی بھجوا دیتے تو کافی ہوتا۔ آپؑ نے اس کی سرزنش کی اور فرمایا: اللہ تجھ جیسے لوگوں کی تعداد زیادہ نہ کرے، دے میں رہا ہوں اور بخل تو کر رہا ہے۔

3۔ ایک حدیث میں جنابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

"اِنَّ اَبْخَلَ النَّاسِ مَنْ بَخِلَ بِالسَّلَامِ"۔ (بحار الانوار، 4:73)

''سب سے بخیل شخص وہ ہے جو سلام کرنے میں بھی بخل کرے''۔

4۔ ایک اور حدیث میں آپؐ کا فرمان ہے:

"اَلْبَخِيْلُ حَقًّا مَنْ ذُكِرْتُ عِنْدَهُ فَلَمْ يُصَلِّ عَلَيَّ" (بحار الانوار، 306:70)

''بخیل ترین شخص وہ ہے جس کے سامنے میرا ذکر کیا جائے اور وہ مجھ پر صلوات نہ بھیجے''۔

5۔ بعض روایات میں بخل کے درجات کو ''لئیم'' کے عنوان کے تحت بیان کیا گیا ہے جو کہ بخل کا شدید ترین درجہ ہے۔ جنابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

"اَلرِّجَالُ اَرْبَعَةٌ سَخِيٌّ وَ كَرِيْمٌ وَبَخِيْلٌ وَلَئِيْمٌ فَالسَّخِيُّ الَّذِيْ يَأْكُلُ وَيُعْطِيْ وَالْكَرِيْمُ الَّذِيْ لَايَأْكُلُ وَيُعْطِيْ وَالْبَخِيْلُ الَّذِيْ يَأْكُلُ وَلَايُعْطِيْ وَاللَّئِيْمُ الَّذِيْ لَايَأْكُلُ وَلَايُعْطِيْ"۔ (بحار الانوار، 356:68)

''لوگوں کی چار اقسام ہیں: سخی، کریم، بخیل اور لئیم۔ سخی وہ ہے جو خود بھی کھاتا ہے اور دوسروں کو بھی دیتا ہے، کریم وہ ہے جو خود نہیں کھاتا اور دوسروں کو دے دیتا ہے، بخیل وہ ہے جو خود کھاتا ہے اور دُوسروں کو نہیں دیتا جبکہ لئیم وہ ہے جو خود کھاتا ہے نہ دُوسروں کو دیتا ہے''۔

بُخل کی روک تھام اور علاج

جسمانی امراض کی طرح رُوحانی امراض کے علاج کا پہلا قدم بھی یہ ہے کہ بیماری کی وجہ کو تلاش کر کے اُس کا خاتمہ کیا جائے، اس لئے کہ جب تک بیماری کی جڑ ختم نہ ہوگی، اُس کا علاج مستقل نہ ہوگا۔

بخل کی بہت سی وجوہات ہیں، لہٰذا اس کا علاج کرنے کیلئے اس کی صحیح وجہ کو تلاش کرنا ضروری ہے۔ بعض لوگ شہوت پرستی کے دلدادہ ہوتے ہیں، لہٰذا مال سے بہت زیادہ محبت کرتے ہیں کیونکہ مال اُن کی شہوت پرستی کی تسکین کا ذریعہ ہوتا ہے۔ وہ اپنے مال کا تھوڑا سا حصہ بھی کسی فائدہ پہنچانے میں صرف نہیں کرتے۔ ایسے افراد کو بخل کا علاج کرنا چاہئے اور ان لوگوں کے حالات پر غور کرنا چاہئے جنہوں نے زندگی شہوت پرستی میں گزاری ہو اور آخر کار عبرت ناک انجام سے دوچار ہوئے۔

بخل کا ایک اور سبب لمبی آرزوئیں ہیں جو انسان کو مال جمع کرنے اور بخل پر مائل کرتی ہیں۔ ایسے افراد دُنیا کی ناپائیداری کے بارے میں غور کریں اور ان لوگوں کے انجام کا مشاہدہ کریں جو لمبی آرزوؤں کی وجہ سے مختلف حوادث اور بیماریوں کا شکار ہو کر برباد ہو گئے، اس سے انہیں اپنی روِش کے غلط ہونے کا احساس ہو جائے گا اور وہ بخل جیسی بری صفت سے چھٹکارا پالینے میں کامیاب ہو جائیں گے۔

بخل کی ایک اور وجہ مال واولاد کی محبت ہے۔ لیکن اگر انسان اس بات پر توجہ رکھے کہ اللہ نے اُن کی روزی بھی اپنے ذمہ لی ہوئی ہے، اس کے علاوہ اگر انسان یہ سوچے کہ اگر اسکی اولاد اللہ کی فرمانبردار ہو تو اللہ انہیں ہرگز تنہا نہیں چھوڑے گا اور اگر اللہ کی نافرمان اور اس کی دشمن ہو تو ایسے افراد کیلئے مال ودولت جمع کرنے کی زحمت کرنا کوئی عقل مندانہ کام نہیں ہے۔ اس طرح غور وفکر کرنے سے بخل کا خاتمہ ہوسکتا ہے۔

اسی طرح یہ سوچنا بھی بخل کے خاتمہ کیلئے مفید ہوسکتا ہے کہ بہت سے لوگ اس دُنیا میں ایسے ہیں جنہیں ماں باپ کی طرف سے کوئی میراث نہیں ملی مگر اپنی ذاتی لیاقت اور محنت کی وجہ سے وہ ان لوگوں سے بہتر حالت میں ہیں جنہیں والدین کی طرف سے بہت کچھ ورثہ میں ملا۔

بعض لوگ مال ودولت کو صرف مال ودولت ہونے کی حیثیت سے ہی قابلِ محبت سمجھتے ہیں اور اس کی محبت میں گرفتار ہو کر بخل میں گرفتار ہو جاتے ہیں۔ مال جمع کرنے میں انتھک محنت کرتے ہیں مگر خرچ کرنے سے وحشت زدہ ہوتے ہیں۔ ایسے لوگ اس حقیقت کو نظر انداز کئے ہوئے ہیں کہ مال مادی اور معنوی مقاصد کے حصول کا ذریعہ ہے۔ اگر اس سے صحیح استفادہ نہ کیا جائے تو اس میں اور پتھر اور لکڑی وغیرہ میں کوئی فرق نہیں ہے۔

بخل کا مقابلہ کرنے کا ایک اور ذریعہ یہ ہے کہ بخیل انسان دل کڑا کر کے تھوڑی تھوڑی سخاوت شروع کر دے۔ آہستہ آہستہ اسکے اندر سخاوت کی صفت مستحکم ہونا شروع ہو جائے گی اور بخل کا زور ٹوٹتا چلا جائے گا۔

بخیل افراد کے بارے میں لوگوں کی نفرت اور سخی افراد کے بارے میں لوگوں کے احترام اور تعریف کو مدِ نظر رکھا جائے تو یہ بھی بخل سے نجات حاصل کرنے کا ایک موثر طریقہ ہوسکتا ہے۔ اسی طرح بخل کے دیگر برے آثار و نتائج کے بارے میں غور و فکر کرنا بھی انسان کو بخل کی زنجیروں سے آزاد کرسکتا ہے۔

اس سلسلہ میں حضرت علیؑ فرماتے ہیں:

"اَلْبَخِیْلُ عَلٰی نَفْسِہٖ بِالْیَسِیْرِ مِنْ دُنْیَاہُ وَیَسْمَحُ لِوُرَّاثِہٖ بِکُلِّھَا"۔

''بخیل اپنے اُوپر تھوڑا سا خرچ کرنے میں تو بخل کرتا ہے مگر اپنا سب کچھ اپنے وارثوں کیلئے چھوڑ جاتا ہے''۔(غرر الحکم:1884)

ایک حدیث میں امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

"مَنْ بَرِءَ مِنَ الْبُخْلِ نَالَ الشَّرَفَ"۔(بحار الانوار، 229:70)

''جس نے بخل سے آزادی حاصل کرلی، وہ عزت و شرافت کے مقام پر پہنچ گیا''۔

ان تمام اُمور میں غور و فکر سے انسان بخل سے نجات پاسکتا ہے۔ خاص طور پر اگر انسان ان احادیث کو سامنے رکھے جن میں یہ بیان ہوا ہے کہ بخل اور ایمان ایک دل میں جمع نہیں ہوسکتے۔

پندرھواں باب

جُود وسخاوت

تمہید:۔

یہ دو الفاظ جو بخل کے متضاد کے طور پر معروف ہیں، عام طور پر ایک معنی میں استعمال ہوتے ہیں لیکن بعض کلمات سے معلوم ہوتا ہے کہ جود کا مرتبہ سخاوت سے افضل ہے، اس لئے کہ جود کی تعریف میں کہا گیا ہے کہ ''جود یہ ہے کہ انسان کسی کی طرف سے درخواست کے بغیر اُسے عطا کرے اور اپنے دیئے ہوئے کو کم جانے''۔ جود کی تعریف میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ ''انسان لوگوں کی درخواست سے خوش ہو اور انہیں دیتے ہوئے بھی خوش ہو''۔

جود کی ایک اور تعریف اس طرح کی گئی ہے:

''انسان مال کو اللہ کا مال سمجھ کر اور سائل کو اللہ کا بندہ سمجھ کر اور اپنے آپ کو اللہ اور بندے کے درمیان واسطہ سمجھ کر کسی کو کچھ دے''۔

البتہ سخاوت کا دائرہ وسیع تر ہے اور ہر قسم کی بخشش اس کے اندر آتی ہے۔

سخاوت اور جود کا فرق اس طرح بھی بیان کیا گیا ہے کہ جو شخص اپنے مال کا ایک حصہ دوسروں کو دے دے اور دوسرا حصہ اپنے پاس رکھے، اس کا عمل سخاوت ہے اور جو شخص تھوڑا مال اپنے لئے رکھے اور زیادہ حصہ دوسروں کو بخش دے، اس کا عمل جود ہے۔

ان تمام تعریفوں کی روشنی میں جود کا مرتبہ سخاوت کے مرتبے سے افضل ہے۔ بہرحال جود اور سخاوت اہم اخلاقی اقدار میں سے ہیں۔ جس قدر بخل انسان کی شخصیت کی عظمت اور اس کے ایمان کے اعلیٰ درجات کی علامت ہیں۔

قرآن مجید میں اگرچہ جود اور سخاوت کے الفاظ استعمال نہیں ہوئے ہیں لیکن ایسی تعبیرات ضرور استعمال ہوئی ہیں جو ان دونوں مفاہیم پر پوری طرح چسپاں ہوتی ہیں اور قرآن نے اس کی بہت فضیلت بیان کی ہے۔

نمونے کے طور پر مندرجہ ذیل آیات میں غور فرمایئے:

1۔ ''يُحِبُّوْنَ مَنْ هَاجَرَ اِلَيْهِمْ وَلَا يَجِدُوْنَ فِيْ صُدُوْرِهِمْ حَاجَةً مِّمَّآ اُوْتُوْا وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ''۔ (حشر: 9)

''جو ہجرت کر کے ان کی طرف آتے ہیں، یہ انہیں پسند کرتے ہیں اور جو کچھ انہیں دیا جاتا ہے، اپنے دلوں میں اس کی حاجت محسوس نہیں کرتے اور خود ضرورت مند ہونے کے باوجود انہیں اپنے اوپر ترجیح دیتے ہیں''۔

2۔ وَيُطْعِمُونَ الطَّعَامَ عَلٰى حُبِّهٖ مِسْكِيْنًا وَّيَتِيْمًا وَّاَسِيْرًا ۝ اِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللّٰهِ لَا نُرِيْدُ مِنْكُمْ جَزَآءً وَّلَا شُكُوْرًا ۝

''کھانے کی محبت کے باوجود وہ اپنا کھانا یتیم، مسکین اور اسیر کو کھلا دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم تو تمہیں اللہ کی خوشنودی کیلئے کھلاتے ہیں اور تم سے کوئی بدلہ اور شکریہ نہیں چاہتے''۔

3۔ ''مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْۢبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِيْ كُلِّ سُنْۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ ۭ وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ''۔ (بقرہ: 261)

''جولوگ اپنے اموال اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں، ان کی مثال اُس بیج جیسی ہے جس میں سے سات خوشے اُگیں اور ہر خوشے میں سو دانے ہوں۔ اللہ تعالیٰ جس کیلئے چاہے، اسے دوگنا یا چند گنا کر دیتا ہے اور اللہ وسعت والا اور جاننے والا ہے۔''

4۔ ''اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ بِالَّيْلِ وَالنَّهَارِ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ''۔ (بقرہ: 274)

''وہ اپنے اموال شب و روز، پوشیدہ و آشکار انفاق کرتے ہیں، ان کا اجر اُن کے رب کے پاس ہے اور ان پر کوئی خوف اور غم نہیں ہے''۔

5۔ ''لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ ۭ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَيْءٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ''۔ (آل عمران: 92)

''تم ہرگز نیکی کی حقیقت کو نہ جان سکو گے جب تک کہ اپنی پسندیدہ چیزوں میں سے اللہ کی راہ پر انفاق نہ کرو اور جو انفاق تم کرتے ہو، اللہ اُس کا خوب علم رکھتا ہے''۔

6۔ ''اَلَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ''۔ (بقرہ: 3)

''(متقین وہ ہیں) جو غیب پر ایمان رکھتے ہیں، نماز قائم کرتے ہیں اور جو رزق ہم نے انہیں دے رکھا ہے، اس میں سے انفاق کرتے ہیں''۔

7۔ ''وَلَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُوْلَةً اِلٰى عُنُقِكَ وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ فَتَقْعُدَ مَلُوْمًا مَّحْسُوْرًا''۔

''اور اپنا ہاتھ اپنی گردن کے ساتھ نہ باندھ لو اور نہ ہی اسے مکمل کھلا چھوڑ دو کہ ملامت کا نشانہ بنو اور حسرت زدہ ہو کر بیٹھ رہو''۔ (بنی اسرائیل: 29)

تفسیر

پہلی آیت میں مدینہ کے اُن سخاوت منداانصار کا ذکر ہے جنہوں نے کھلے دل سے مکہ سے آنے والے مہاجرین کوقبول کیا اورانہیں اپنے اُوپر ترجیح دی اور کہا کہ ہم اپنا مال اوراپنے گھر کا تمہارے ساتھ مساوی طور پر بانٹ لیتے ہیں اور مالِ غنیمت میں سے کچھ حصہ نہیں لیں گے۔

مندرجہ بالا آیات میں اللہ تعالیٰ اُن کا ذکراس طرح فرماتا ہے:

یہ لوگ ہیں جو اپنے طرف ہجرت کر کے آنے والوں کو پسند کرتے ہیں اور جو کچھ ان مہاجرین کو دیا جاتا ہے ،اپنے دل میں اس کی حاجت محسوس نہیں کرتے اورخود ضرورت مند ہوتے ہوئے انہیں اپنے اُوپر ترجیح دیتے ہیں۔

"یُحِبُّوْنَ مَنْ هَاجَرَ اِلَیْهِمْ وَلَا یَجِدُوْنَ فِیْ صُدُوْرِهِمْ حَاجَةً مِّمَّاۤ اُوْتُوْا وَیُؤْثِرُوْنَ عَلٰۤی اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ"۔ (حشر:9)

بعض مفسرین نے لکھا ہے:''تاریخ ایسے استقبال کی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے کہ کچھ مہاجر ایک شہر میں داخل ہوں اوراس شہر کے اہلِ ایمان اسطرح ان کا استقبال کریں کہ انہیں اپنے اوپر مقدم رکھیں اوراپنی زندگی کے تمام وسائل ان کے ساتھ برابر تقسیم کرلیں۔ یہاں تک کہ بعض روایات میں یہ بھی ملتا ہے کہ چونکہ مہاجرین کی تعداد کم تھی اوران کے میزبان انصار کی تعداد زیادہ تھی لہٰذا بعض اوقات مہاجرین کی میزبانی پر انصار آپس میں لڑ پڑتے تھے اور پھر قرعہ اندازی کے ذریعے مسئلہ حل ہوتا تھا۔(فی ظلال: جلد 7)

بہرحال ہم دیکھتے ہیں کہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ انصار کی محبت، وسیع النظری اورسخاوت کی تعریف فرمارہا ہے۔

دوسری آیت میں ان عظیم الشان شخصیات کا ذکر ہے جوخود کھانے کی شدید ضرورت ہونے کے باوجود اپنا کھانا، یتیم، مسکین اوراسیر کو دیتے ہیں اوران سے بدلے اورشکریے کی توقع تک نہیں رکھتے۔

وَیُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰی حُبِّهٖ مِسْكِیْنًا وَّیَتِیْمًا وَّاَسِیْرًا ۝ اِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللّٰهِ لَا نُرِیْدُ مِنْكُمْ جَزَآءً وَّلَا شُكُوْرًا ۝(دھر:8اور9)

شیعہ اورسنی دونوں کی کتب میں بکثرت روایات پائی جاتی ہیں کہ سورہ دہر کی آیات 8اور9 اہلِ بیت کی شان میں نازل ہوئی ہیں۔علامہ امینی نے''الغدیر'' میں اہلِ سنت کے 36علماً اوران کی کتب کے نام درج کئے ہیں جنہوں نے اپنی کتب میں لکھا ہے کہ یہ آیات علیؑ، فاطمہؑ،حسن،اورحسین علیہم السلام کی شان میں نازل ہوئی ہیں جبکہ اہلِ تشیع میں تو سب اس بات پر متفق ہیں کہ پوری

سورۂ دہر یا اس کا اچھا خاصہ حصہ انؑ کی شان میں نازل ہوا ہے۔

ان آیات میں غور کرنے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ کس طرح اللہ تعالیٰ ان سخی ہستیوں کی سخاوت کا ذکر اور انکی تعریف کر رہا ہے اور انکو عمدہ ترین اجر کی بشارت دے رہا ہے۔ ایک جگہ وہ انہیں ابرار کے نام سے یاد کر رہا ہے تو دوسری جگہ انہیں عباد اللہ (اللہ کے خاص بندے) کہہ رہا ہے۔

تیسری آیت میں انفاق کرنے والے سخی افراد کی زبردست حوصلہ افزائی کی جارہی ہے اور جو تعبیرات اس آیت میں استعمال کی گئی ہیں، ان کی نظیر نہیں ملتی۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

''جو لوگ اپنے اموال اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں، ان کی مثال اُس بیج جیسی ہے جس میں سے سات خوشے اُگیں اور ہر خوشے میں سو دانے ہوں اور اللہ تعالیٰ جس کیلئے چاہتا ہے، اسے دوگنا یا چند گنا کر دیتا ہے اور اللہ وسعت والا اور جاننے والا ہے۔''

"مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْۢبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِيْ كُلِّ سُنْۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ ۭ وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ"۔ (بقرہ: 261)

یہ آیت واضح طور پر اس بات پر دلالت کر رہی ہے کہ انفاق کا عمل انفاق کرنے والے نیک افراد کی رُوحانی نشوونما کا ذریعہ بنتا ہے۔ ان کے اموال بھی انفاق کی برکت سے کئی گنا ہوجاتے ہیں اور وہ خود بھی تیزی سے رُوحانی کمال کے مدارج طے کرتے ہیں۔ اس سلسلہ میں چھوٹے چھوٹے قدم بھی عظیم نتائج کے حامل ہوتے ہیں۔

ایک روایت میں ہے کہ امام سجاد علیہ السلام جب بھی کسی کو کوئی چیز دیتے تو سائل سے لے کر اُسے چومتے تھے۔ جب انؑ سے اس کی وجہ پوچھی جاتی تو فرماتے تھے:

"لِاَنَّهَا تَقَعُ فِيْ يَدِ اللّٰهِ قَبْلَ يَدِ الْعَبْدِ"۔ (بحار الانوار، 129:93)

''اس لئے کہ بندے کے ہاتھ میں جانے سے قبل یہ اللہ کے ہاتھ میں جاتا ہے''۔

چوتھی آیت میں انفاق کے بارے میں ایک اہم نکتہ بیان کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

''وہ اپنے اموال شب و روز، پوشیدہ و آشکار انفاق کرتے ہیں، ان کا اجر اُن کے رب کے پاس ہے اور ان پر کوئی خوف اور غم نہیں ہے''۔

"اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ بِالَّيْلِ وَالنَّهَارِ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ"۔ (بقرہ: 274)

بنابرایں، سخاوت اور انفاق جس شکل میں بھی ہو، اللہ کے ہاں پسندیدہ ہے۔ دُوسری طرف سے انفاق اللہ کے عذاب کے

خوف کو برطرف کر دیتا ہے اور غم واندوہ کو انسان کی زندگی سے دُور کر دیتا ہے، مستقبل کا کوئی اندیشہ باقی نہیں رہتا، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے اُن کی زندگی کی کفالت کی ضمانت دے رکھی ہے۔ لہٰذا اپنے اموال کا کچھ حصہ اللہ کی راہ میں دے دینے سے وہ غمگین نہیں ہوتے، اس لئے کہ وہ یقین رکھتے ہیں کہ اُن کے رب کے فضل سے جو کچھ انہیں ملتا ہے، وہ اس سے کہیں زیادہ ہے جو انہوں نے دیا ہے۔

پانچویں آیت میں انفاق کے بارے میں ایک نئے انداز میں بات کی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

''تم ہرگز نیکی کی حقیقت کو نہ جان سکو گے جب تک کہ اپنی پسندیدہ چیزوں میں سے اللہ کی راہ پر انفاق نہ کرو اور جو انفاق تم کرتے ہو، اللہ اُس کا خوب باخبر ہے''۔

"لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ ۬ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَيْءٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ"۔ (آل عمران:92)

عربی زبان میں 'بِرّ' اُس نیکی کو کہا جاتا ہے جو پوری توجہ کے ساتھ ارادہ واختیار سے کی جائے اور یہ انسان کی شخصیت اور رُوحانیت کی علامت سمجھی جاتی ہے۔ یہ بات بھی قابلِ توجہ ہے کہ آیت میں ''بِرّ'' مطلق ہے، اس کے ساتھ کسی قید یا شرط کا ذکر نہیں ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ جب تک انسان انفاق کو خوگر نہیں ہو جاتا، وہ نیکوکاری کی حقیقت کو نہیں چھو سکتا۔ اگرچہ بعض مفسرین نے ''بِرّ'' سے بہشت، بعض نے تقویٰ اور بعض نے اچھا اجر مراد لیا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ ''بِرّ'' کا لفظ وسیع معنی رکھتا ہے اور یہ سارے معنی اس کے اندر آجاتے ہیں۔

چھٹی آیت میں اللہ تعالیٰ انفاق کو تقویٰ کا ایک اہم رُکن قرار دیتے ہوئے فرماتا ہے:

''(متقین وہ ہیں) جو غیب پر ایمان رکھتے ہیں، نماز قائم کرتے ہیں اور جو رزق ہم نے انہیں دے رکھا ہے، اس میں سے انفاق کرتے ہیں''۔

"الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ"۔ (بقرہ:3)

اس آیت میں ''يُنْفِقُوْنَ'' فعل مضارع کی صورت میں مذکور ہوا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ وہ اللہ کی نعمتوں میں سے مسلسل انفاق کرتے رہتے ہیں۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ سخاوت اُن کی رُوح میں رچ بس چکی ہے اور اُن کی ایک نمایاں صفت بن چکی ہے۔

''مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ'' (جو رزق ہم نے انہیں دیا ہے، اس میں سے) کے الفاظ ایک انتہائی لطیف نکتے کی طرف اشارہ کر رہے ہیں کہ متقین اپنے اموال کو اللہ کی عطا اور اس کی بخشش سمجھتے ہیں، لہٰذا کوئی وجہ نہیں ہے کہ اس کا کچھ حصہ اللہ کی راہ میں دیتے وقت انہیں کوئی دشواری پیش آئے اور وہ بخل سے کام لیں۔ اس بات کا ذکر بھی ضروری ہے کہ انفاق صرف زکوٰۃ تک محدود نہیں ہے بلکہ تمام واجب اور مستحب صدقات اس میں داخل ہیں۔

ساتویں اور آخری آیت میں انفاق میں اعتدال کی راہ اپنانے اور افراط وتفریط سے اجتناب کا حکم دیتے ہوئے اللہ تعالیٰ

فرماتا ہے:

''اور اپنا ہاتھ اپنی گردن کے ساتھ نہ باندھ لو اور نہ ہی اسے مکمل کھلا چھوڑ دو کہ ملامت زدہ اور حسرت زدہ ہو کر بیٹھ رہ''۔ (بنی اسرائیل:29)

"وَلَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُوْلَةً اِلٰى عُنُقِكَ وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ فَتَقْعُدَ مَلُوْمًا مَّحْسُوْرًا"۔

اس آیت میں سخاوت کی واضح تعریف کر دی گئی ہے۔

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے ایک عملی مثال کے ذریعے سخاوت کی وضاحت اس طرح فرمائی کہ آپؑ نے زمین سے مٹی کی ایک مٹھی اُٹھائی اور مٹھی بند کر لی۔ پھر آپؑ نے فرمایا کہ یہ بخل ہے۔ پھر آپؑ نے مٹی کی ایک مٹھی لی اور اس طرح کھولی کہ ساری مٹی زمین پر گر گئی۔ آپؑ نے فرمایا کہ یہ اسراف ہے۔ پھر آپؑ نے مٹی کی ایک مٹھی لی اور اسے اس طرح کھولا کہ آپؑ کی ہتھیلی کا رُخ آسمان کی طرف تھا اور آپؑ نے انگلیاں بھی کھولی ہوئی تھیں۔ اس طرح کچھ مٹی زمین پر گر گئی اور کچھ آپؑ کی ہتھیلی پر باقی رہ گئی۔ آپؑ نے فرمایا کہ یہ اعتدال ہے (اور یہی سخاوت کی حقیقت ہے)۔ (نور الثقلین، 158:3)

ان آیات کی روشنی میں سخاوت کی عظمت اور اہمیت اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے اور یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ عظیم انسانی صفت صرف انسانی معاشرے کے نظم اور سعادت کیلئے اور اس فقر و ناداری کے خلاف جہاد کے طور پر ہی ضروری نہیں ہے، جو کہ معاشرے میں انواع و اقسام کے گناہوں کا سبب بنتی ہے بلکہ انسان کے رُوحانی ارتقا میں بھی اہم کردار ادا کرتی ہے۔

سخاوت، احادیث کی روشنی میں

احادیث میں جود و سخاوت کی فضیلت انتہائی حسین اور عمدہ پیرائے میں بیان کی گئی ہے جس کی مثال کم ملتی ہے۔ ذیل میں ہم نمونے کے طور پر چند احادیث کا ذکر کرتے ہیں:

1۔ جنابِ رسولؐ خدا کی ایک حدیث میں ہے:

"اَلسَّخَاءُ خُلُقُ اللهِ الْاَعْظَمُ" (کنز العمال، 337:6)

''سخاوت اللہ تعالیٰ کا سب سے عظیم اخلاق ہے''۔

درحقیقت تمام سخاوتیں اللہ تعالیٰ کی تجلی ہیں، اس لئے کہ ہمارے پاس جو کچھ ہے، سب اُسی کی طرف سے ہے۔ مختلف اقسام کی نعمتیں، زمین و آسمان، ہمارا وجود، ہماری زندگی اور ہمارا سب کچھ اُسی کی طرف سے ہے۔ جہاں کہیں کوئی سخاوت نظر آتی ہے، اُسی کی سخاوت کا پرتو ہے۔ اگر وہ ہمیں یہ نعمتیں عطا نہ کرتا تو ہم بھی سخاوت کی طاقت نہ رکھتے، حتیٰ کہ سخاوت کی صفت اگر کسی میں پائی جاتی ہے تو وہ بھی اس کی سخاوت ہے۔

2۔ امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

"اَلسَّخَاءُ مِنْ اَخْلَاقِ الْاَنْبِیَاءِ وَهُوَ عِمَادُ الْاِیْمَانِ وَلَا تَکُوْنُ الْمُؤْمِنُ اِلَّا سَخِیًّا قَالَ اِلَّا ذُوْ یَقِیْنٍ وَهَمَّهُ عَالِیَةٌ لِاَنَّ السَّخَاءَ شُعَاعُ نُوْرِ الْیَقِیْنِ، وَمَنْ عَرَفَ مَاقَصَدَهَانَ عَلَیْهِ مَابَذَلَ"۔(بحار الانوار،68:355)

''سخاوت انبیاؑ کا اخلاق اور ایمان کا ستون ہے۔مومن سخی ہی ہوتا ہے اور سخی وہی ہوتا ہے جو یقین کی منزل پر فائز ہو اور بلند ہمت ہو،اس لئے کہ سخاوت یقین کے نور کی شعاع ہے اور جو شخص یہ جانتا ہو کہ اُسے کیا ملنے والا ہے تو جو کچھ وہ دیتا ہے،وہ اس پر آسان ہو جاتا ہے''۔

اس حدیث سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے بعد سخاوت انبیاؑ میں پائی جاتی ہے اور ان کے یقین اور ایمان کی علامت ہے۔

3۔ ایک حدیث میں حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:(غرر الحکم:4511)

"تَحَلَّ بِالسَّخَاءِ وَالْوَرَعِ فَهُمَا حُلْیَةُ الْاِیْمَانِ وَاَشْرَفُ خَلَالِكَ"

''اپنے آپ کو سخاوت اور ورع کے ساتھ زینت دو کیونکہ یہ دونوں ایمان کا زیور اور تمہاری زینت ہیں''۔

4۔ ایک اور حدیث میں آپؑ فرماتے ہیں:

"اَلسَّخَاءُ ثَمَرَةُ الْعَقْلِ وَالْقَنَاعَةُ بُرْهَانُ النَّبَلِ"۔(غرر الحکم:2145)

''سخاوت عقل کا پھل اور قناعت شرافت کی دلیل ہے''۔

جو لوگ بخل سے کام لیتے ہیں اور محنت و مشقت سے کمائے ہوئے اموال دوسروں کیلئے چھوڑ کر چلے جاتے ہیں،درحقیقت ایسے لوگ عاقل نہیں ہوتے،اس لیے کہ مال جمع کرنے کی زحمت انہوں نے اٹھائی اور اس کا پھل اور فائدہ دوسروں کو پہنچا۔آیا کوئی عقل مند ایسا کام کرسکتا ہے؟

5۔ ایک اور حدیث میں آپؑ سخاوت کے بارے میں ایک لطیف نکتہ اس طرح بیان فرماتے ہیں:

"غَطُّوا مَعَایِبَکُمْ بِالسَّخَاءِ فَاِنَّهُ سَتْرُ الْعُیُوْبِ"۔(غرر الحکم:6440)

''سخاوت کے ذریعے اپنے عیبوں کو چھپاؤ کیونکہ سخاوت عیبوں کا پردہ ہے''۔

حضرت علی علیہ السلام کے اس فرمان کی صداقت تجربہ سے ثابت ہے۔ہم میں سے ہر شخص کسی نہ کسی ایسے شخص کو جانتا ہے جس میں مختلف قسم کے عیب پائے جاتے ہیں لیکن چونکہ وہ سخی ہوتے ہیں،لہٰذا لوگ اُن کا

احترام کرتے ہیں۔

6۔ ایک اورحدیث میں امیرالمومنین علیہ السلام فرماتے ہیں:

"اَلسَّخَاءُ يَمْحَصُ الذُّنُوْبِ وَيَجْلُبُ مَحَبَّةَ الْقُلُوْبِ"۔(غرر الحکم: 1738)

''سخاوت گناہوں کودھودیتی ہےاور دِلوں کی محبت کوجذب کرتی ہے۔''

اس حدیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ سخاوت گناہوں کا کفارہ ہے۔

7۔ امیرالمومنین علیہ السلام دِلوں کوجذب کرنے کیلئے محبت کی گہری تاثیر کا ذکران الفاظ میں فرماتے ہیں:

"مَا اسْتَجْلَبَتِ الْمَحَبَّةُ بِمِثْلِ السَّخَاءِ وَالرِّفْقِ وَحُسْنُ الْخُلُقِ"۔

''سخاوت، رفاقت اورحسنِ اخلاق کی طرح کوئی چیزمحبت کوجذب نہیں کرتی''۔(غررالحکم: 9561)

8۔ جناب رسولؐ خدااس بارے میں فرماتے ہیں:(بحارالانوار، 380:70)

"اَلسَّخِيُّ قَرِيْبٌ مِّنَ اللهِ قَرِيْبٌ مِّنَ النَّاسِ قَرِيْبٌ مِّنَ الْجَنَّةِ"۔

''سخی انسان اللہ کے قریب ہوتا ہے،لوگوں کے قریب ہوتا ہےاور جنت کے قریب ہوتا ہے''۔

9۔ حضرت امام جعفرصادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

"شَابٌّ سَخِيٌّ مَرْهَقٌ فِي الذُّنُوْبِ اَحَبُّ اِلَى اللهِ عَزَّوَجَلَّ مِنْ شَيْخٍ عَابِدٍ بَخِيْلٍ"۔(بحارالانوار، 307:70)

''گناہگارسخی جوان، بوڑھےاوربخیل عابد سے بہتر ہے''۔

10۔ہم اس بحث کوجنابِ رسولِؐ خدکی اس حدیث پرختم کرتے ہیں:(کنزالعمال، 392:6)

"تَجَافُوْا عَنْ ذَنْبِ السَّخِيِّ فَاِنَّ اللهَ آخِذٌ بِيَدِهٖ كُلَّمَا عَثُرَ"۔

''سخی کے گناہ کونظرانداز کرو کیونکہ جب بھی وہ ڈگمگاتا ہے،اللہ اس کا ہاتھ پکڑ لیتا ہے''۔

مندرجہ بالا احادیث سے سخاوت کی غیرمعمولی فضیلت اچھی طرح واضح ہوجاتی ہےاور یہ بات بھی آشکار ہوجاتی ہے کہ کم ہی کوئی دُوسری فضیلت اس کے ہم پایہ ہوسکتی ہے۔

سخاوت کے آثارونتائج

انسان کی فردی اورمعاشرتی زندگی پرسخاوت کے مثبت اثرات بہت زیادہ ہیں۔جوتجربے سے بھی ثابت ہیں اوراحادیث

میں بھی ان کی طرف رہنمائی ملتی ہے، بطورِمثال:

1۔ متعددروایات سے یہ بات ثابت ہےاورتجربہ بھی اسکی تائید کرتا ہے کہ سخاوت دولت اوردُشمنی دونوں کی محبت کو جذب کرتی ہے، دوستوں کی تعداد میں اضافہ اوردُشمنوں کی تعداد میں کمی کرتی ہے۔

2۔ سخاوت انسان کے عیوب کی پردہ پوشی کرنے والا ایک پردہ ہےجس سے انسان کی عزت وآبرومحفوظ رہتی ہے۔

3۔ سخاوت عقل کاثمر ہونے کےساتھ ساتھ انسان کی عقل وخردکونکھارتی چلی جاتی ہے۔عقل کہتی ہے کہ کوئی وجہ نہیں ہے کہ انسان بہت محنت اورزحمت سے مال ودولت کمائے اوراُس سے دُنیوی فوائداوراُخروی ثواب کمائے بغیرورثاً کیلئے چھوڑ کر چلا جائے۔علاوہ ازیں سخاوت کےنتیجہ میں انسان کے دوستوں میں اضافہ ہوتا ہےجن میں کچھ ذہین اورعقل مندافرادبھی ہوتے ہیں جن کی عقل وفکرسے استفادہ کرکےانسان اپنی عقل وفکرکو پختہ اورمستحکم کرسکتا ہے۔

4۔سخاوت کےنتیجہ میں معاشرے سےطبقاتی اونچ نیچ کا فرق کم ہوجاتا ہے۔اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ طبقاتی اختلاف کی وجہ سے پیدا ہونے والی کشمکش اورجھگڑے یاتوسرے سےختم ہوجاتے ہیں یاکم ہوجاتے ہیں۔غریب اورپس ماندہ لوگوں کے دلوں میں دولت مندوں کے بارے میں نفرت اورکینہ ختم ہوجاتا ہے اوران کے خلاف جذبہ انتقام کمزور پڑ جاتا ہےجس کے نتیجہ میں معاشرتی تعلقات میں استحکام پیدا ہوجاتا ہے۔

5۔سخاوت انسان کےساتھیوں کی تعدادمیں اضافہ کرتی ہے،اس کی آبرومحفوظ کرتی ہےاوراس کےدشمنوں اور بدخواہوں کو پسپا کردیتی ہے۔امیرالمومنین علیہ السلام اس بارے میں فرماتے ہیں:۔

"اَلجودحَارِس الأَعْرَاضِ"(غرر الحکم، حدیث:333)

''سخاوت عزتوں کی محافظ ہے''۔

6۔ جودوسخاوت معنوی اورروحانی اثرات بھی رکھتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ انہیں انبیاؑ کی نمایاں صفت میں شمار کیا گیاہے۔گزشتہ روایات میں ہم پڑھ چکے ہیں کہ سخاوت یقین کےنورکی شعاع ہے،حتیٰ کہ اگربےایمان افرادمیں بھی یہ صفت پائی جائےتوان کیلئے بھی فائدہ مندہوتی ہے۔

ایک حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کوحکم دیا کہ سامری کوقتل نہ کروکیونکہ وہ سخی ہے(کافی،1:41)

سامری وہ شخص تھاجس نے بنی اسرائیل کو بت پرستی پرلگا کران میں بہت بڑی گمراہی پیدا کی اورزندگی کےآخری ایام میں اس کی حالت اتنی بری اورعبرت ناک ہوگئی کہ شایدوہ موت کواس پرترجیح دیتالیکن اسکے باوجوداللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کوحکم دیا کہ چونکہ یہ سخی ہے،لہٰذااسے قتل نہ کیا جائے۔

ہم گزشتہ صفحات میں پڑھ چکے ہیں کہ جنابِ رسولِؐ اللہ نے چندمجرموں کوسزائے موت سنائی لیکن ان میں سے ایک شخص کو

صرف سخاوت کی وجہ سے مستثنیٰ کر دیا۔اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ سخی شخص مسلمان ہو گیا۔

جنابِ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں کہ سخی انسان سے اہلِ آسمان بھی محبت کرتے ہیں اور اہلِ زمین بھی جبکہ بخیل سے اہلِ آسمان بھی نفرت کرتے ہیں اور اہلِ زمین بھی۔(وسائل الشیعہ ،252:15)

سخاوت کی حدود

تمام نیک اعمال اور اچھی صفات کی طرح سخاوت کی بھی کچھ حدود ہیں جن کا خیال رکھنا ضروری ہے۔سخاوت میں افراط اور زیادہ روی نہیں ہونا چاہئے۔ایسا ہرگز نہیں ہونا چاہئے کہ انسان اس حد تک سخاوت کرنے لگ جائے کہ اس کے زیر کفالت افراد کی زندگی مشکلات کا شکار ہو جائے۔

سخاوت حلال سے کمائے گئے مال سے کی جانی چاہئے۔حرام اور ظلم وستم سے حاصل ہونے والی آمدنی سے کی جانے والی سخاوت کی کوئی فضیلت نہیں ہے،جس طرح بہت سے ظالم بادشاہ کرتے ہیں۔

اسی طرح بیت المال یعنی حکومتی اور سرکاری اموال سے سخاوت کرنا درست نہیں ہے،اس لئے کہ بیت المال اور قومی دولت کو عدل وانصاف اور قوم ومعاشرے کے اجتماعی فائدے کے تقاضوں کے مطابق صرف کرنا ضروری ہے۔

سخاوت کی صفت کیسے حاصل کی جائے:۔

دیگر تمام اخلاقی صفات کی طرح یہ صفت بھی تعلیم وتربیت،غور وفکر اور مشق وعمل کے نتیجہ میں حاصل کی جاسکتی ہے۔اگر انسان یہ سوچے کہ جو مال ودولت اس کے ہاتھ میں ہے،وہ ہمارے پاس اللہ کی امانت ہے اور اسے دوام وبقا بھی حاصل نہیں ہے تو یہ بات اسے اس پر مائل کرے گی کہ وہ اس مال ودولت کو اس طرح اپنے لئے محفوظ کرلے کہ جس دن اس کے ہاتھ خالی ہوں (قیامت کے دن) یہ دولت اس کے کام آئے۔اس طرح لامحالہ انسان اپنا مال اور اپنی دولت سخاوت کے ساتھ فقراً اور ضرورت مندوں کے فائدے کیلئے خرچ کرنے لگے گا۔

اس طرح سخاوت کے آثار ونتائج ،جن کا ذکر ہو چکا ہے، ان کے بارے میں غور وفکر کرنے سے بھی سخاوت کرنے میں انسان کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے۔

سخی اور بخیل افراد کی تاریخ کا مطالعہ کرنے اور ان کی عزت واحترام کا موازنہ کرنے سے جب انسان سخی افراد کی عزت واحترام اور بخیل افراد کی ذِلت اور بدنامی کو دیکھتا ہے تو اس کے اندر سخاوت کا جذبہ بیدار ہو جاتا ہے۔اس کے علاوہ عملی طور پر انسان سخاوت کی راہ چھوٹے چھوٹے قدم اُٹھانا شروع کر دے تو یہ صفت بتدریج اُس کے اندر پیدا ہونا شروع ہو جائے گی۔البتہ یہ بھی ضرور یاد رہے کہ ہوسکتا ہے کہ بخیل شخص کے لئے ابتدائی قدم اُٹھانا بھی خاصا دُشوار ہو لیکن مسلسل عمل کرتے رہنے کے نتیجہ میں یہ صفت انسان

کے اندر پختہ ہو جائے گی۔

علاوہ ازیں والدین اور اساتذہ کی تربیت بھی اس اخلاقی صفت اور دیگر اخلاقی صفات کے حصول میں مؤثر واقع ہوتی ہے۔ اگر والدین اور اساتذہ بچپن میں بچے کو اس صفت کی تعلیم دیں اور اس کی مشق کروائیں تو آگے چل کر یہ صفت اس میں پختہ ہو جائے گی۔

صاحب بن عباد کے حالات میں ہے کہ بچپن میں جب اسے مدرسہ میں داخل کروایا گیا تو ہر روز اُس کی ماں اُسے ایک دینار اور ایک درہم دیتی تھی اور اُسے کہتی کہ جو فقیر تمہیں سب سے پہلے نظر آئے، یہ اُسے دے دینا۔ آہستہ آہستہ یہ صفت اُس میں پختہ ہوتی چلی گئی اور بڑا ہو کر وہ ایسا سخی ہوا کہ سب اس کی سخاوت کی تعریف کرتے تھے۔ اگر رمضان المبارک میں ظہر کے بعد کوئی شخص اس کے گھر آ جاتا تو وہ اسے افطار تک اپنے پاس روک لیتا۔ ہر روز اس کے دسترخوان پر ایک ہزار آدمی کھانا کھاتے۔ ماہ رمضان میں اس کی سخاوت سال کے دیگر مہینوں کی مجموعی سخاوت کے برابر ہوتی تھی۔ (سفینۃ البحار: صحب)

اس کی زندگی کا ایک دلچسپ واقعہ یہ بھی نقل کیا گیا ہے کہ ایک روز خادم نے اسے شربت پیش کیا اس کے عزیزوں میں سے کسی کو شک گزرا کہ شربت زہر آلود ہے۔ صاحب بن عباد نے اُسے کہا کہ تمہارے پاس کیا ثبوت ہے کہ شربت زہر آلود ہے؟ اس نے کہا کہ یہ شربت خادم کو دو اور اسے کہو کہ اسے پی لے۔ صاحب بن عباد نے کہا کہ مجھے یہ پسند نہیں ہے۔

اُس شخص نے کہا کہ پھر یہ شربت کسی مرغ وغیرہ کو پلا کر دیکھ لو۔ صاحب نے کہا کہ میں نہیں چاہتا کہ کسی مرغ کی زندگی اس طرح ختم ہو جائے۔ بالآخر اس نے شربت زمین پر اُنڈیل دیا اور خادم کو ملازمت سے برطرف کر دیا۔ اس کے باوجود خادم کو پوری تنخواہ دے کر رُخصت کیا۔ پھر اس نے کہا کہ یقین کو ہرگز شک کی وجہ سے نہیں توڑنا چاہئے اور سزا کے طور پر تنخواہ میں کٹوتی کرنا پست انسانوں کا شیوہ ہے۔ (سفینۃ البحار: صحب)

ہم اس بحث کو چند احادیث پر ختم کرتے ہیں:

جناب رسولِ خدا نے فرمایا:

"اَلْجَنَّةُ دَارُ الْاَسْخِيَاءِ"۔ (المحجة البيضاء، 62:6)

''جنت سخی لوگوں کا گھر ہے''۔

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

"اِنِّیْ جَوَّادٌ کَرِیْمٌ لَا یُجَاوِرُنِیْ لَئِیْمٌ"۔ (المحجة البيضاء، 62:6)

''میں سخی اور کریم ہوں، بخیل اور پست افراد میرے نزدیک (جنت میں) نہیں آ سکتے''۔

ایک حدیث میں جنابِ رسولِ خدا فرماتے ہیں:

"طَعَامُ الْجَوَّادِ دَوَاءٌ وَطَعَامُ الْبَخِيلِ دَاءٌ" (المحجة البیضاء،62:6)

''سخی کا کھانا شفااور بخیل کا کھانا بیماری ہے''۔

ابن سماک ایک مشہور عارف گزرے ہیں۔ان کا قول ہے:

"عَجِبْتُ لِمَنْ يَشْتَرِي الْمَمَالِيكَ بِمَالِهِ وَلَا يَشْتَرِي الْأَحْرَارَ بِمَعْرُوفِهِ"۔

''میں اُن لوگوں پر تعجب کرتا ہوں جو مال دے کر غلاموں کو خریدتے ہیں لیکن نیکی کر کے آزاد لوگوں کو نہیں خریدتے''۔(سفینۃ البحار: سمک)[1]

کسی نے ایک عرب سے پوچھا: تمہارا سردار کون ہوتا ہے؟ اُس نے جواب دیا:

"مَنِ احْتَمَلَ شَتْمَنَا وَأَعْطَى سَائِلَنَا وَاغْضَى جَاهِلَنَا"۔

''جو ہمارے بدتمیزیوں کو برداشت کرے، ہمارے سائلوں کو عطا کرے اور ہمارے جاہلوں کو معاف کرے''۔(سفینۃ البحار)

---

[1] ابن سماک دوسری صدی ہجری میں ہارون رشید کے ہم عصر تھے۔انتہائی خوش بیان واعظ تھے۔ 183 ہجری میں کوفہ میں فوت ہوئے۔

محدث قمی نے ''سفینۃ البحار'' میں ان کا واقعہ نقل کیا ہے کہ ایک روز وہ ہارون رشید کے پاس گئے۔ ہارون نے انہیں دیکھتے ہی کہا کہ حضور! مجھے کچھ نصیحت فرمائیں۔عین اُسی وقت ہارون کیلئے پانی کا پیالہ لایا گیا۔ابن سماک نے کہا: تمہیں اللہ کی قسم دے کر پوچھتا ہوں کہ اگر تمہیں ایسی بیماری لگ جائے جس کی وجہ سے یہ پانی نہ پی سکو تو کیا کرو گے؟

ہارون نے کہا: میں اپنی آدھی دولت اور آدھی حکومت دے کر اس بیماری کا علاج کرنے پر آمادہ ہوں۔

ابن سماک نے کہا: پانی پی لو۔

جب ہارون پانی پی چکا تو ابن سماک نے پھر کہا: تمہیں اللہ قسم دے کر پوچھتا ہوں کہ اگر تمہیں کوئی ایسی بیماری لگ جائے جس کی وجہ سے یہ پانی جو تم نے پیا ہے، باہر نہ آئے تو کیا کرو گے؟

اس نے کہا: باقی ماندہ دولت اور حکومت بھی اس کے علاج کے عوض دینے کو تیار ہوں۔

ابن سماک نے کہا: جس حکومت کا نصف پانی پینے پر اور نصف پانی کے باہر آنے پر قربان کیا جاسکتا ہے، وہ اتنی بھی قیمتی نہیں ہے کہ اس کیلئے جنگیں کی جائیں اور خون بہایا جائے۔

سولھواں باب

عجلت اور جلد بازی

تمہید:۔

ہر کام کو انجام دینے کیلئے مخصوص حالات اور شرائط کی ضرورت ہوتی ہے جن کے بغیر یا تو سرے سے وہ کام کیا ہی نہیں جا سکتا اور اگر کر لیا جائے تو اس کے خاطر خواہ نتائج حاصل نہیں ہوتے۔ عقل مند افراد کسی بھی کام کو انجام دینے کے لئے مناسب حالات وشرائط کے پیدا ہو جانے کا انتظار کرتے ہیں۔ جب مناسب حالات فراہم ہو جائیں تو میدان عمل میں کود پڑتے ہیں اور گوہر مقصود ہاتھ آنے تک مصروف عمل رہتے ہیں۔

اسی لئے عجلت، جلد بازی اور شتاب زدگی یعنی مناسب حالات فراہم ہونے سے قبل کسی کام کے شروع کرنے کو مذموم صفات رذیلہ میں شمار کیا گیا ہے۔ اس کے برعکس صبر وتحمل اور بردباری کو اخلاقی فضائل میں شمار کیا جاتا ہے (البتہ صبر کی بہت سی شاخیں ہیں جن کا ذکر مناسب موقع پر آئے گا)

جلد بازی اور شتاب زدگی فرد اور معاشرے کو ناقابلِ تلافی نقصان سے دوچار کرتی ہے۔ قرآن مجید جو ہمیں زندگی کا ایک جامع لائحہ عمل دیتا ہے، انسان کو صبر وتحمل کے ساتھ عمل کرنے اور جلد بازی اور عجلت سے اجتناب کا حکم دیتا ہے اور انبیاؑ کے واقعات میں ہمیں جلد بازی کے تلخ اور صبر وتحمل کے شیریں پھل سے آشنا کرتا ہے۔

اس تمہید کے بعد اب ہم قرآنی آیات کی طرف رجوع کرتے ہیں اور انبیاؑ کی زندگی میں اس مسئلہ کی اہمیت کا مطالعہ کرتے ہیں:

1 "قَالَ لَهٗ مُوْسٰى هَلْ اَتَّبِعُكَ عَلٰٓى اَنْ تُعَلِّمَنِ مِمَّا عُلِّمْتَ رُشْدًا ○ قَالَ اِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِيْعَ مَعِيَ صَبْرًا ○ وَ كَيْفَ تَصْبِرُ عَلٰى مَا لَمْ تُحِطْ بِهٖ خُبْرًا ○ قَالَ سَتَجِدُنِيْٓ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ صَابِرًا وَّلَآ اَعْصِيْ لَكَ اَمْرًا"۔ (کھف: 66تا69)

''حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس سے کہا: کیا میں آپ کی پیروی کروں تا کہ جو رُشد وآگہی آپ کو دی گئی ہے، آپ مجھے اُس کی تعلیم دیں؟ اُس نے کہا: تم میرے ساتھ صبر نہیں کر سکو گے اور کیسے ممکن ہے کہ تم اس بات پر صبر کرو جس کا علم تمہیں حاصل نہیں ہے۔ موسیٰ ؑ نے کہا: انشاءاللہ آپ مجھے صابر پائیں گے اور میں کسی معاملے میں آپ کی نافرمانی نہیں کروں گا۔''

2۔ "وَهَلْ اَتٰىكَ نَبَؤُا الْخَصْمِ ۘ اِذْ تَسَوَّرُوا الْمِحْرَابَ ۝ اِذْ دَخَلُوْا عَلٰى دَاوٗدَ فَفَزِعَ مِنْهُمْ قَالُوْا لَا تَخَفْ ۚ خَصْمٰنِ بَغٰى بَعْضُنَا عَلٰى بَعْضٍ فَاحْكُمْ بَيْنَنَا بِالْحَقِّ وَلَا تُشْطِطْ وَاهْدِنَآ اِلٰى سَوَآءِ الصِّرَاطِ ۔ اِنَّ هٰذَآ اَخِيْ لَهٗ تِسْعٌ وَّتِسْعُوْنَ نَعْجَةً وَّلِيَ نَعْجَةٌ وَّاحِدَةٌ فَقَالَ اَكْفِلْنِيْهَا وَعَزَّنِيْ فِي الْخِطَابِ ۝ قَالَ لَقَدْ ظَلَمَكَ بِسُؤَالِ نَعْجَتِكَ اِلٰى نِعَاجِهٖ ۭ وَاِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ الْخُلَطَآءِ لَيَبْغِيْ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَقَلِيْلٌ مَّا هُمْ ۭ وَظَنَّ دَاوٗدُ اَنَّمَا فَتَنّٰهُ فَاسْتَغْفَرَ رَبَّهٗ وَخَرَّ رَاكِعًا وَّاَنَابَ ۝"(ص: 21تا24)

''کیا شکایت کرنے والوں کی خبر آپ کے پاس آئی ہے، جب وہ (داؤد) کی محراب سے اُوپر چڑھ آئے اور وہ انہیں دیکھ کر خوفزدہ ہو گیا؟ وہ بولے: ڈرو نہیں، ہم دونوں ایک مقدمہ لے کر آئے ہیں۔ ہم میں سے ایک نے دُوسرے پر ظلم کیا ہے اور تم ہمارے درمیان حق کی روشنی میں فیصلہ کرو اور ظلم نہ کرو اور ہمیں سیدھی راہ کی ہدایت کرو۔ یہ میرا بھائی ہے، اس کے پاس ننانوے بھیڑیں ہیں اور میرے پاس صرف ایک بھیڑ ہے اور یہ مجھ سے اصرار کرتا ہے کہ میں اپنی بھیڑ اسے دے دوں اور بحث میں یہ مجھ پر غالب آ گیا ہے۔ داؤد نے کہا: یقیناً اس نے تیری بھیڑ تجھ سے مانگ کر تجھ پر ظلم کیا ہے اور بہت سے شریک ایک دُوسرے پر ظلم کرتے ہیں، سوائے اُن کے جو ایمان لائے اور عملِ صالح کرتے ہیں، لیکن ان کی تعداد بہت کم ہے۔ یکا یک داؤد کو ایسا لگا کہ (اس واقعہ کے ذریعے) ہم نے اسے آزمایا ہے۔ اس نے فوراً اللہ سے مغفرت طلب کی، سجدے میں گر گیا اور توبہ کی''۔

3۔ "فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ وَلَا تَكُنْ كَصَاحِبِ الْحُوْتِ ۘ اِذْ نَادٰى وَهُوَ مَكْظُوْمٌ ۝ لَوْلَآ اَنْ تَدٰرَكَهٗ نِعْمَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ لَنُبِذَ بِالْعَرَآءِ وَهُوَ مَذْمُوْمٌ ۝ فَاجْتَبٰىهُ رَبُّهٗ فَجَعَلَهٗ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ"۔(قلم: 48تا50)

''پس اپنے رب کے حکم کے آ جانے تک صبر کرو اور مچھلی والے (یعنی حضرت یونسؑ) کی طرح نہ ہو جاؤ، جب اُس نے حالتِ غم میں اپنے رب کو پکارا اور اگر اُس کے رب کی نعمت اُس کی دستگیری نہ کرتی تو وہ صحرا میں پھینک دیا جاتا، اس حال میں کہ وہ مذموم ہوتا۔ پس اُس کے رب نے اُسے چن لیا اور اُسے صالحین میں شامل کر لیا''۔

4۔ "فَتَعٰلَى اللّٰهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ ۚ وَلَا تَعْجَلْ بِالْقُرْاٰنِ مِنْ قَبْلِ اَنْ يُّقْضٰٓى اِلَيْكَ وَحْيُهٗ ۡ وَقُلْ رَّبِّ زِدْنِيْ عِلْمًا"۔(طٰہٰ: 114)

''اور اس سے پہلے کہ قرآن کی وحی آپ کی طرف پوری ہو جائے، قرآن پڑھنے میں جلدی نہ کرو اور کہو: اے

میرے رب! میرے علم میں اضافہ فرما''۔

5۔ "خُلِقَ الْاِنْسَانُ مِنْ عَجَلٍ ؕ سَاُورِیْکُمْ اٰیٰتِیْ فَلَا تَسْتَعْجِلُوْنِ"۔

''انسان عجلت میں سے پیدا کیا گیا ہے لیکن تم عجلت سے کام نہ لو، عنقریب میں اپنی نشانیاں تمہیں دِکھاؤں گا''۔(انبیاء:37)

6۔ "وَیَدْعُ الْاِنْسَانُ بِالشَّرِّ دُعَآءَهٗ بِالْخَیْرِ ؕ وَکَانَ الْاِنْسَانُ عَجُوْلًا"۔(اسرأ:11)

''اور انسان جلد بازی کی وجہ سے شر کو بھی خیر کی طرح سے پکارتا ہے اور انسان ہمیشہ جلد باز رہا ہے''۔

7۔ "وَیَسْتَعْجِلُوْنَکَ بِالسَّیِّئَةِ قَبْلَ الْحَسَنَةِ وَقَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِمُ الْمَثُلٰتُ ؕ وَاِنَّ رَبَّکَ لَذُوْ مَغْفِرَةٍ لِّلنَّاسِ عَلٰی ظُلْمِهِمْ ۚ وَاِنَّ رَبَّکَ لَشَدِیْدُ الْعِقَابِ"۔

''یہ لوگ اچھائی (رحمت) سے پہلے آپ سے برائی (عذاب) کا مطالبہ کرتے ہیں، حالانکہ ان سے پہلے مثالیں گزر چکی ہیں اور تمہارا رب لوگوں کے ظلم کے باوجود ان کیلئے مغفرت والا ہے اور تمہارا رب شدید عقاب والا ہے''۔(رعد:6)

8۔ "وَلَوْ یُعَجِّلُ اللّٰهُ لِلنَّاسِ الشَّرَّ اسْتِعْجَالَهُمْ بِالْخَیْرِ لَقُضِیَ اِلَیْهِمْ اَجَلُهُمْ ؕ فَنَذَرُ الَّذِیْنَ لَا یَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا فِیْ طُغْیَانِهِمْ یَعْمَهُوْنَ"۔(یونس:11)

''جس طرح لوگ خیر کے حصول کیلئے جلد بازی کرتے ہیں، اسی طرح اگر تمہارا رب انہیں سزا دینے میں جلدی کرتا تو ان کا کام تمام ہو چکا ہوتا۔ لیکن جو لوگ ہماری ملاقات پر ایمان نہیں رکھتے، ہم اُنہیں اُن کے حال پر چھوڑ دیتے ہیں تاکہ اپنی سرکشی میں سرگرداں رہیں''۔

9۔ "وَیَقُوْلُوْنَ مَتٰی هٰذَا الْفَتْحُ اِنْ کُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ○ قُلْ یَوْمَ الْفَتْحِ لَا یَنْفَعُ الَّذِیْنَ کَفَرُوْٓا اِیْمَانُهُمْ وَلَا هُمْ یُنْظَرُوْنَ○ فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ وَانْتَظِرْ اِنَّهُمْ مُّنْتَظِرُوْنَ"۔

''وہ کہتے ہیں کہ اگر تم سچے ہو تو تمہاری یہ کامیابی کب آئے گی۔۔۔۔اب جبکہ یہ صورت حال ہے تو ان سے منہ موڑ لو اور انتظار کرو، وہ بھی منتظر ہیں، تم رحمت کے منتظر ہو اور وہ عذاب کے منتظر ہیں''۔(سجدہ:28 تا 30)

10۔ "فَاصْبِرْ کَمَا صَبَرَ اُولُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ وَلَا تَسْتَعْجِلْ لَّهُمْ ؕ کَاَنَّهُمْ یَوْمَ یَرَوْنَ مَا یُوْعَدُوْنَ ۙ لَمْ یَلْبَثُوْٓا اِلَّا سَاعَةً مِّنْ نَّهَارٍ ؕ بَلٰغٌ ۚ فَهَلْ یُهْلَکُ اِلَّا الْقَوْمُ الْفٰسِقُوْنَ"۔

''پس تم صبر کرو جیسے اولوالعزم رسولوں نے صبر کیا اور ان پر عذاب نازل ہونے کی جلدی نہ کرو، جب یہ ان

وعدوں کو دیکھیں گے جوان سے کئے جارہے ہیں تو انہیں ایسا لگے گا گویا صرف گھڑی بھر دُنیا میں رہے تھے۔ یہ ایک پیغام ہے جو پہنچایا جارہا ہے اور ہلاکت صرف فاسقوں کے حصے میں آتی ہے''۔(احقاق۔35)

تفسیر

پہلے پیراگراف کی آیات حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت خضر علیہ السلام کے واقعہ کے بارے میں ہیں۔ البتہ قرآن مجید میں حضرت خضر علیہ السلام کا نام نہیں لیا گیا ہے بلکہ ان کا ذکر ''عبدمن عبادنا'' یعنی ''ہمارے بندوں میں سے ایک بندہ'' کہہ کر کیا گیا ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت خضر علیہ السلام کا واقعہ کم وبیش سب جانتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حکم دیا کہ ایک خاص قسم کے علوم کو جاننے کیلئے حضرت خضر علیہ السلام کے پاس جائیں۔ یہ علوم وحی کے ذریعے حضرت موسیٰ ؑ کے پاس آنے والے علوم سے مختلف تھے اور ان کا تعلق کائنات اور انسانوں کی زندگی کے مخفی اسرار سے تھا۔

حضرت خضرؑ نے حضرت موسیٰ ؑ سے کہا: تمہارا علم ظاہر سے تعلق رکھتا ہے اور تم میرے کاموں پر صبر نہیں کرسکو گے۔ لیکن حضرت موسیٰ ؑ نے عہد کیا کہ میں صبر وتحمل سے کام لوں گا۔ حضرت خضرؑ نے ان سے کہا کہ اگر میرے ساتھ چلنا ہے تو میرے ہر کام کو خاموشی سے دیکھتے رہنا، خواہ تمہاری نظر میں وہ کتنا ہی نامناسب ہو۔ میرے ہر کام میں ایک حکمت ہے، مناسب موقع پر میں خود ہی تم کو بتادوں گا۔

درحقیقت حضرت خضرؑ چاہتے تھے کہ اہم معاملات کے بارے میں حضرت موسیٰ ؑ کے اندر صبر وتحمل کی رُوح پیدا کریں اور عجلت اور شتاب زدگی کی منفی صفت کو ان سے دور کردیں۔

حضرت خضرؑ کی شرط اور حضرت موسیٰ ؑ کے وعدے کے بعد دونوں چل پڑے۔ راستے میں اُنہیں کچھ فاصلہ کشتی کے ذریعے طے کرنا تھا۔ دونوں کشتی پر سوار ہوئے۔ کشتی چل پڑی اور حضرت خضر نے چپکے سے کشتی میں سوراخ کردیا۔ حضرت موسیٰ ؑ سے رہا نہ گیا اور اُنہوں نے اعتراض کردیا۔ مگر حضرت خضرؑ نے انہیں ان کا وعدہ یاد دلایا تو خاموش ہوگئے اور معذرت بھی کرلی۔

کشتی سے اُتر کر تھوڑی دُور گئے تھے کہ حضرت خضرؑ نے ایک نوجوان کو دیکھا اور اُسے قتل کردیا۔ حضرت موسیٰ ؑ ایک بار پھر بول پڑے کہ آپؑ نے ایک بے گناہ انسان کو کیوں قتل کردیا؟ آپؑ نے کس قدر برا کام کیا؟

حضرت خضرؑ نے ایک بار پھر انہیں ان کا وعدہ یاد دلایا۔ حضرت موسیٰ ؑ نے ایک بار پھر معذرت کی اور کہا کہ اگر اس کے بعد میں نے وعدہ خلافی کی تو آپ کو حق ہوگا کہ آپ مجھے الگ کردیں۔

دونوں ایک بار پھر چلے اور شہر میں آپہنچے جہاں کے لوگ بڑے بخیل اور خصیص تھے جنہوں نے ان مسافروں کی درخواست کے باوجود انہیں کھانا کھلانے سے انکار کردیا۔ اسی شہر میں حضرت خضرؑ نے ایک بوسیدہ دیوار دیکھی جو کسی بھی لمحے گرسکتی تھی۔ حضرت خضرؑ

نے دیوار کو مرمت کر دی۔ حضرت موسیٰ ؑ کو انؑ کا یہ کام بھی نہایت عجیب لگا۔ ان سے رہا نہ گیا اور ایک بار پھر انہوں نے اپنے عہد و پیمان کو فراموش کرتے ہوئے اعتراض کر دیا۔

اس موقع پر حضرت خضرؑ نے اپنے تینوں کاموں کے اسرار حضرت موسیٰ ؑ کو بتائے اور حضرت موسیٰ ؑ کو کائنات کے حقائق کی ایک اور دُنیا کی جھلک دکھائی۔ پھر حضرت موسیٰ ؑ ان علوم و معارف کا توشہ لے کر حضرت خضرؑ سے الگ ہو گئے۔

حضرت خضرؑ نے حضرت موسیٰ ؑ کو بتایا کہ انہوں نے کشتی میں سوراخ اس لئے کیا کہ اس میں نقص پیدا ہو جائے کیونکہ وہاں کا ظالم بادشاہ ہر اچھی کشتی کو اپنے قبضے میں لے لیتا تھا۔ میں نے ان مسکین افراد کی کشتی اس کے ہاتھ جانے سے روکنے کیلئے اس میں سوراخ کر دیا۔

اُس نوجوان کو اس لئے قتل کیا کہ وہ خطرناک حد تک بے ایمان اور سرکش تھا اور اس بات کا خوف تھا کہ اسکی یہ حالت اس کے نیک والدین کو نقصان نہ پہنچا دے۔ اللہ نے یہ چاہا کہ یہ لڑکا اُن سے لے کر اس بدلے میں ایک نیک اور مہربان بیٹا انہیں عطا کرے۔

جہاں تک گرتی ہوئی دیوار کی مرمت کا تعلق ہے تو اس کے نیچے دو یتیم بچوں کا خزانہ پوشیدہ تھا جو ان کے نیک اور صالح باپ نے وہاں دفن کر دیا تھا اللہ نے چاہا کہ ان کا یہ خزانہ محفوظ رہے اور جب یہ بڑے ہوں تو اسے نکال لیں۔ میں نے ان کاموں میں سے کوئی اپنی مرضی سے نہیں کیا بلکہ یہ سارے کام اللہ کے حکم سے کئے ہیں۔ (سورۂ کہف: 60 تا 82)

اگر حضرت موسیٰ علیہ السلام جلد بازی سے کام نہ لیتے اور صبر و حوصلے سے مناسب موقع کا انتظار کرتے تو ان تین واقعات کے بعد انہیں حضرت خضرؑ سے جدا نہ ہونا پڑتا اور انہیں علم و معرفت کے مزید گوہر نصیب ہوتے۔

دوسرے پیراگراف کی آیات میں حضرت داؤدؑ کا ذکر ہے جنہیں فیصلہ کرنے میں جلد بازی پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے مؤاخذہ کا سامنا کرنا پڑا۔

واقعہ یہ تھا کہ ایک روز دو آدمی حضرت داؤدؑ کے پاس آئے۔ ان میں سے ایک نے دوسرے کے خلاف شکایت کرتے ہوئے کہا کہ یہ میرا بھائی ہے اور اس کے پاس ننانوے بھیڑیں ہیں جبکہ میرے پاس صرف ایک بھیڑ ہے اور یہ چاہتا ہے کہ میری بھیڑ بھی مجھ سے لے لے اور بحث میں مجھ پر غالب آ گیا ہے۔

"اِنَّ هٰذَآ اَخِیْ لَهٗ تِسْعٌ وَّتِسْعُوْنَ نَعْجَةً وَّلِیَ نَعْجَةٌ وَّاحِدَةٌ فَقَالَ اَكْفِلْنِیْهَا وَعَزَّنِیْ فِی الْخِطَابِ"۔

حضرت داؤدؑ نے تحقیق کئے بغیر فیصلہ سنا دیا کہ اس نے یہ مطالبہ کر کے تم پر ظلم کیا ہے۔ لیکن فوراً ہی انہیں اپنی خطا کا احساس ہو گیا اور وہ جان گئے کہ ہم نے ان کا امتحان لیا، لہٰذا انہوں نے استغفار کی اور سجدے میں گر کر توبہ کرنے لگے۔

اس واقعہ کی تمام تفصیلات کا ذکر کرنے کی یہاں گنجائش نہیں ہے (تفسیر نمونہ میں ہم نے تفصیلات بیان کر دی ہیں)۔ اس واقعہ سے یہ بات بہرحال واضح ہو جاتی ہے کہ کسی بھی کام، خاص طور پر عدالتی فیصلہ کرتے وقت جلد بازی شرمندگی کا سبب ہوتی ہے اور

انفرادی اور معاشرتی سطح پر مشکلات بھی پیدا کرتی ہے۔

تیسری آیت ایک اور پیغمبر کے بارے میں ہے جنہوں نے اپنی عظیم ذمہ داری کی انجام دہی میں کوتاہی کی اور اللہ تعالیٰ نے ان کا مؤاخذہ کیا۔

واقعہ یہ ہے کہ حضرت یونسؑ ایک طویل عرصہ تک ایک مہربان باپ کی طرح اپنی قوم کو تبلیغ وہدایت کا فریضہ انجام دیتے رہے لیکن انؑ کی سب کوششوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ صرف دو افراد ان پر ایمان لائے جن میں سے ایک عالم اور ایک عابد تھا۔

آخر کار حضرت یونسؑ اپنی قوم سے مایوس ہو گئے اور عابد کے مشورے پر اپنی قوم کے خلاف بددُعا کی۔ ان کی بددُعا قبول ہوگئی اور اللہ تعالیٰ نے بذریعہ وحی خبر دی کہ فلاں دن ان کی قوم پر عذاب آنے والا ہے۔ حضرت یونسؑ نے بجائے اس کے کہ ایک بار پھر اپنی قوم پر حجت تمام کرتے، اس عابد کے ہمراہ اپنی قوم کو چھوڑ کر چلے گئے لیکن وہ عالم قوم میں رہا اور تبلیغ کرتا رہا۔

عذاب کا وقت قریب آنے کے ساتھ ساتھ عالم کی تبلیغ بھی مؤثر واقع ہوئی اور اس قوم میں نمایاں بنیادی تبدیلی پیدا ہوگئی۔ عالم کی ہمراہی میں وہ سب توبہ میں مصروف ہو گئے اور اللہ تعالیٰ نے ان کی توبہ قبول کر لی۔ لیکن حضرت یونسؑ کو اس نے ان کی اس عجلت اور جلد بازی کی وجہ سے سرزنش کی اور سزا دی۔

ان آیات میں اللہ تعالیٰ جناب رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مخاطب قرار دے کر کہہ رہا ہے:

''(آپ اس قوم پر عذاب کی دُعا کرنے میں جلدی نہ کریں) اور مچھلی والے (یعنی حضرت یونسؑ) کی طرح نہ ہو جائیں (جنہوں نے اپنی قوم پر عذاب آنے میں جلد بازی کی اور خود اپنے عمل کی سزا میں گرفتار ہو گئے) جب انہوں نے اللہ کو پکارا تو اس وقت ان کی حالت یہ تھی کہ وہ غم واندوہ سے بھرے ہوئے تھے اور اگر اللہ کی رحمت ان کی دستگیری نہ کرتی تو وہ مچھلی کے پیٹ سے باہر پھینک دیئے جاتے اور سخت مذمت کے سزاوار ٹھہرے''۔ (قلم: 48 اور 49)

''فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ وَلَا تَكُنْ كَصَاحِبِ الْحُوتِ ۘ إِذْ نَادَىٰ وَهُوَ مَكْظُومٌ ○ لَوْلَا أَنْ تَدَارَكَهُ نِعْمَةٌ مِنْ رَبِّهِ لَنُبِذَ بِالْعَرَاءِ وَهُوَ مَذْمُومٌ ○

لیکن اللہ نے ان کی توبہ قبول کر لی اور جب مچھلی کے پیٹ سے باہر آئے تو ہر خطا سے پاک تھے، جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ یہ فرما رہا ہے:

''اُس کے رب نے اُس کی توبہ قبول کی اور انہیں صالحین میں شامل کر لیا''۔

''فَاجْتَبَاهُ رَبُّهُ فَجَعَلَهُ مِنَ الصَّالِحِينَ ○'' (قلم: 50)

اگرچہ حضرت یونسؑ نے کافی حد تک اپنی قوم پر حجت تمام کر دی تھی لیکن اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ اس کے انبیاؑ اس سے بڑھ کر صبر اور حوصلے والے ہوں، لہٰذا اللہ تعالیٰ نے ان کی تھوڑی سی جلد بازی کو بھی نظر انداز نہیں کیا۔

چوتھی آیت میں جناب رسولِ خداؐ کو جلد بازی اور عجلت سے منع کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرما رہا ہے:

''اوراس سے پہلے کہ قرآن کی وحی آپ کی طرف پوری ہوجائے،قرآن پڑھنے میں جلدی نہ کرواور کہو: اے میرے رب! میرے علم میں اضافہ فرما''۔

"فَتَعٰلَى اللّٰهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ ۚ وَلَا تَعْجَلْ بِالْقُرْاٰنِ مِنْ قَبْلِ اَنْ يُّقْضٰٓى اِلَيْكَ وَحْيُهٗ ۡ وَقُلْ رَّبِّ زِدْنِيْ عِلْمًا"۔(طٰہٰ:114)

بعض دیگر آیات سے بھی یہ بات واضح ہوتی ہے کہ جنابِ رسولؐ خدا قرآن کے شدید اشتیاق کی وجہ سے وحی کو دریافت کرنے میں جلدی کرتے تھے اور اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس عمل سے روک دیا۔

لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ ﴿۱۶﴾ اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ ﴿۱۷﴾ فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ ﴿۱۸﴾ (قیامت:16تا18)

''اگرچہ اس آیت کی تفسیر میں مفسرین نے متعدد احتمال بیان کئے ہیں لیکن ان سب کا ماحصل یہ ہے کہ رسول کیلئے یہ مناسب نہیں ہے کہ وہ اپنے کام میں جلد بازی کرے،خواہ وہ کام اس کی الٰہی ذمہ داری ہو اور اس کا تعلق لوگوں کو ہدایت دینے سے ہو۔

پانچویں آیت میں انسان کے بارے میں کہا جارہا ہے:

''انسان جلد بازی سے پیدا ہوا گیا ہے(یعنی جلد بازی اس کی سرشت میں اس قدر زیادہ ہے کہ گویا اس کی طبیعت ہی بن گئی ہے)لیکن میرے سامنے جلد بازی نہ کرو۔عنقریب میں اپنی آیات تمہیں دکھادوں گا۔

"خُلِقَ الْاِنْسَانُ مِنْ عَجَلٍ ۭ سَاُورِيْكُمْ اٰيٰتِيْ فَلَا تَسْتَعْجِلُوْنِ"۔(انبیاء:37)

یہ آیت اس حقیقت کی طرف اشارہ کررہی ہے کہ جلد بازی انسان کی فطرت میں رکھ دی گئی ہے لیکن اسے وہاں بروئے کار لانا چاہئے جہاں حالات مناسب ہوں۔یہاں''اٰیٰتِی''یعنی''میری آیات''سے ممکن ہے جنابِ رسولؐ خدا کے معجزات،قرآن کی آیات یا عذاب کی نشانیاں مراد ہوں یا یہ سب مراد ہوں،اس لئے کہ ان میں سے ہر ایک اپنے مخصوص وقت پر ہی ظاہر ہونے والے حقائق ہیں اور ان کے قبل از وقت ظاہر ہونے کی جلدی کرنا صحیح نہیں ہے،اس لئے کہ اللہ تعالیٰ حکیم ہے اور کوئی کام خلاف حکمت انجام نہیں دیتا۔لہٰذا اس کے کاموں کے بارے میں بندوں کو عجلت سے کام نہیں لینا چاہئے۔

اس آیت میں انسان کے بارے میں جو یہ کہا گیا ہے کہ انسان عجلت میں پیدا کیا گیا ہے،اس سے مراد وہ انسان ہیں جن کی الٰہی تربیت نہیں ہوئی ہے۔لہٰذا بعض آیات،جن میں انسان کے عجول یعنی جلد باز ہونے کا ذکر کیا گیا ہے،اس سے پہلے انسانوں کی ہدایت کا ذکر کیا گیا ہے،جیسے سورۂ بنی اسرائیل کی گیارہویں آیت،جس کے بارے میں عنقریب ہم گفتگو کریں گے۔

انسان کی یہ صفت بھی اس کے دیگر فطری میلانات کی طرح ایک مثبت اور تعمیری طاقت ہے۔اگر اسے حدِ اعتدال پر

رکھا جائے تو انسان کو فلاح اور سعادت کی راہ پر ڈال دیتی ہے۔

چھٹی آیت کا مفہوم بھی وہی ہے جو ہم ابھی بیان کر چکے ہیں۔ مگر اس میں عجلت اور جلد بازی کے ایک منفی اثر کا بھی ذکر کیا گیا ہے کہ انسان جلد بازی کی وجہ سے شر کی طلب بھی اسی طرح کرنے لگتا ہے جیسے خیر کی طلب کرتا ہے اور انسان ہمیشہ سے جلد باز رہا ہے۔

"وَيَدْعُ الْاِنْسَانُ بِالشَّرِّ دُعَآءَهٗ بِالْخَيْرِ ؕ وَكَانَ الْاِنْسَانُ عَجُوْلًا"۔ (اسرأ: 11)

اس آیت میں ''دُعا'' کا لفظ استعمال ہوا ہے جو طلب کرنے اور چاہنے کے معنی دیتا ہے، خواہ یہ طلب اور چاہت زبان سے ہو یا عمل سے۔ یہ آیت اس نکتے کی طرف اشارہ کر رہی ہے کہ چونکہ انسان عجول ہے، لہٰذا حصولِ منفعت کے اشتیاق میں بعض اوقات جلد بازی کی وجہ سے معاملے کے تمام پہلوؤں پر نظر کئے بغیر آگے بڑھنے لگتا ہے اور فائدے کی بجائے نقصان سے دوچار ہو جاتا ہے۔

یہ دُعا بعض اوقات لفظی صورت میں ہوتی ہے اور انسان اصرار کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے کسی ایسی چیز کیلئے دُعا مانگ رہا ہوتا ہے جو اُس کیلئے خیر و سعادت نہیں بلکہ بدبختی و ہلاکت کا سبب ہوتی ہے۔

امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

"وَاَعْرِفْ طَرِيْقَ نَجَاتِكَ وَهَلَاكِكَ كَيْ لَا تَدْعُوا اللّٰهَ بِشَيْءٍ عَسٰى فِيْهِ هَلَاكُكَ وَاَنْتَ تَظُنُّ اَنَّ فِيْهِ نَجَاتُكَ قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى "وَيَدْعُ الْاِنْسَانُ بِالشَّرِّ دُعَآءَهٗ بِالْخَيْرِ وَكَانَ الْاِنْسَانُ عَجُوْلًا"۔ (نور الثقلین، 1:141)

''اپنی نجات اور ہلاکت کے راستوں کو پہچانو، کہیں ایسا نہ ہو کہ تم اللہ سے کوئی ایسی چیز مانگو جس میں تمہاری ہلاکت ہو اور تم سمجھو کہ اس میں تمہاری نجات ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: 'انسان جلد بازی کی وجہ سے شر بھی اسی طرح طلب کرنے لگتا ہے جیسے خیر کی طلب کرتا ہے''۔

بعض اوقات یہ دُعا عملی صورت میں ہوتی ہے جس میں انسان ایسے کاموں کے کرنے پر مصر ہوتا ہے جن کی بنیاد شہوت پرستی اور نتیجہ بدبختی ہوتا ہے لیکن انسان شیطان کی وسوسہ اندازی اور نفس کی زینت کاری کی وجہ سے انہیں اپنے لئے باعثِ خیر و سعادت سمجھتا ہے اور اس کے عدم حصول پر غمگین اور ملول ہوتا ہے۔

بعض اوقات مستقبل میں یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ اگر اس وقت اس کی یہ آرزو پوری ہو جاتی تو وہ ساری عمر کیلئے ہلاکت اور بدبختی کے گڑھے میں گر گیا ہوتا۔

ساتویں آیت میں انسان کے عجول ہونے کے بارے میں ایک نئی بات کی گئی ہے، وہ یہ کہ عجول انسان نیکی میں عجلت اور

جلد بازی کی بجائے ہمیشہ شر وفساد کی راہ میں جلد بازی کرتا ہے۔ جنابِ رسولؐ خدا کے مخالف کفار عذاب الٰہی کی وعید سن کر خوفزدہ ہونے کی بجائے اصرار کرنے لگتے تھے کہ جس عذاب سے آپ ہمیں ڈرا رہے ہیں، وہ آ کیوں نہیں جاتا؟ درحقیقت یہ بدبخت اپنی ہلاکت اور بربادی کیلئے عجلت اور جلد بازی کر رہے ہوتے تھے۔ آیت میں اللہ تعالیٰ فرما رہا ہے:

''یہ لوگ حسنہ (بھلائی اور رحمت) سے پہلے آپ سے بدی (عذاب اور بربادی) میں جلدی کا مطالبہ کرتے ہیں، حالانکہ ان سے پہلے عبرت انگیز عذاب نازل ہو چکے ہیں (انہوں نے ان کا ذکر سن رکھا ہے اور جانتے ہیں کہ یہ مذاق نہیں ہے، لہٰذا ان پر عذاب میں تاخیر صرف اللہ کی رحمت کیوجہ سے ہے کہ شاید یہ بیدار ہو کر راہ راست پر آ جائیں) اور آپ کا پروردگار لوگوں کے ظلم کے باوجود ان کیلئے مغفرت والا ہے اور آپ کے رب کا عقاب بھی شدید (لہٰذا انہیں اللہ کی مغفرت اور ڈھیل کا دھوکا نہیں کھانا چاہئے)''۔ (رعد:6)

"وَيَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالسَّيِّئَةِ قَبْلَ الْحَسَنَةِ وَقَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِمُ الْمَثُلٰتُ ؕ وَاِنَّ رَبَّكَ لَذُوْ مَغْفِرَةٍ لِّلنَّاسِ عَلٰى ظُلْمِهِمْ ۚ وَاِنَّ رَبَّكَ لَشَدِيْدُ الْعِقَابِ"۔

یقیناً اگر انسان کی عجلت اور شتاب زدگی میں تعصب اور لجاجت بھی شامل ہو جائے تو اس کا نتیجہ وہی ہوگا جو اس آیت میں بیان ہوا ہے یعنی وہ نیکی کی بجائے برائی کی طرف جلد بازی کرتا ہے اور بدبختی کی موجوں کی لپیٹ میں آ جاتا ہے۔ ایسی ہی ایک مثال سورۂ معارج میں آئی ہے:

"سَاَلَ سَآئِلٌۢ بِعَذَابٍ وَّاقِعٍ ۙ لِّلْكٰفِرِيْنَ لَيْسَ لَهٗ دَافِعٌ"۔ (معارج: 1 و 2)

''ایک سوال کرنے والے نے ایک واقع ہو جانے والے عذاب کا سوال کیا جو کافروں کیلئے ہے اور کوئی اُس کو دُور کرنے والا نہیں ہے''۔

بہت سے مفسرین اور محدثین نے لکھا ہے کہ یہ آیت نعمان بن حارث فہری کے بارے میں نازل ہوئی ہے جو غدیر خم پر جنابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف سے ''مَن کُنتُ مَولَاہُ فَھٰذَا عَلِیٌّ مَولَاہُ'' کا اعلان سن کر آگ بگولا ہو گیا اور جب جنابِ رسولؐ خدا نے اسے بتایا کہ یہ اعلان اللہ کے حکم سے کیا گیا ہے تو اس کی آگ اور بھی بھڑک اُٹھی اور وہ کہنے لگا کہ یا اللہ! اگر یہ تیری طرف سے حق ہے تو آسمان سے مجھ پر پتھر برسا۔ چند ہی لمحوں میں ایک پتھر آسمان سے آ کر اس پر گرا اور اسے ہلاک کر دیا اور اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ (مجمع البیان، 352:10)

کیا بہتر نہ ہوتا کہ اس قسم کے افراد حق کے سامنے عناد اور تعصب کی بنیاد پر اللہ تعالیٰ سے عذاب مانگنے کی بجائے اس سے ہدایت طلب کرتے؟ لیکن کیا کیا جائے کہ ایسے خیرہ سر افراد عجلت زدہ ہو کر اللہ تعالیٰ کی رحمت اور مغفرت کی بجائے اُس کے عذاب کا مطالبہ کرنے بیٹھ جاتے ہیں۔

آٹھویں آیت میں انسان کے عجول ہونے کے ایک اور پہلو کو اُجاگر کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

''اگر اللہ تعالیٰ بدکار لوگوں کو سزا دینے میں جلدی کرتا، جس طرح وہ خیر اور بھلائی کیلئے جلدی کرتے ہیں تو سب کی موت واقع ہوجاتی (اور ان کا نام ونشان تک باقی نہ رہتا)''۔ (یونس:11)

"وَلَوْ يُعَجِّلُ اللّٰهُ لِلنَّاسِ الشَّرَّ اسْتِعْجَالَهُمْ بِالْخَيْرِ لَقُضِيَ اِلَيْهِمْ اَجَلُهُمْ ؕ

لیکن چونکہ اللہ تعالیٰ غفور ورحیم ہے، لہٰذا وہ گناہگاروں کو سزا دینے میں جلدی نہیں کرتا بلکہ اپنی رحمت سے اُنہیں مہلت دیتا رہتا ہے کہ ہوسکتا ہے کہ وہ بیدار ہوجائیں اور ہدایت پاجائیں۔

آیت کے اختتام پر اللہ تعالیٰ مزید فرماتا ہے:

''جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے، ہم انہیں ان کے حال پر چھوڑ دیتے ہیں تاکہ وہ اپنی گمراہی میں سرگرداں رہیں''۔

"فَنَذَرُ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ"۔ (یونس:11)

بنابرایں اللہ تعالیٰ تمہاری طرح عمل نہیں کرتا تم خیر اور بھلائی حاصل کرنے میں عجول ہو مگر اللہ تمہیں سزا دینے میں عجول نہیں ہے، اس لئے کہ بنیادی طور پر اللہ یہ چاہتا ہے کہ تم ہدایت پاؤ، نہ یہ کہ عذاب کا نشانہ بنو۔

قرآن شریف کی بعض دوسری آیات کی روشنی میں اس آیت کی تفسیر میں ایک احتمال یہ بھی دیا گیا ہے کہ اس آیت کے معنی یہ ہیں کہ وہ جلد بازی کی وجہ سے اللہ سے عذاب کا مطالبہ کررہے تھے، اُسی طرح جس طرح خیر اور بھلائی کے بارے میں جلد بازی کرتے ہیں۔ قرآن فرمارہا ہے کہ اگر اللہ عذاب کے بارے میں تمہاری درخواست جلدی سے قبول کرلیتا ہے تو تم میں سے کوئی زندہ باقی نہ رہتا۔ لیکن پہلے معنی آیت کے ساتھ زیادہ ہم آہنگ ہیں۔

نویں آیت میں اللہ تعالیٰ مسلمانوں کی فتح اور دُشمنوں کی شکست کے وعدوں پر کفار کی جلد بازی اور اضطراب کا ذکر کرتے ہوئے فرماتا ہے:

''یہ کہتے ہیں کہ اگر تم سچے ہو تو تمہاری فتح اور کامیابی کب وقوع پذیر ہوگی؟ (یہ وعدہ پورا کیوں نہیں ہورہا؟ کیا یہ اس بات کا ثبوت نہیں ہے کہ تم جھوٹے ہو اور اپنے آپ کو فریب دے رہے ہو؟)''۔

"وَيَقُوْلُوْنَ مَتٰى هٰذَا الْفَتْحُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ"۔ (سجدہ:28)

قرآن مجید ان کے جواب میں جنابِ رسولِ خدا کو حکم دے رہا ہے: ''ان سے کہو (جلدی نہ کرو) یہ کامیابی آکر رہے گی اور اس روز کافروں کو ایمان لانے کا کوئی فائدہ نہ ہوگا اور انہیں کوئی مہلت نہیں دی جائے گی''۔

قُلْ يَوْمَ الْفَتْحِ لَا يَنْفَعُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِيْمَانُهُمْ وَلَا هُمْ يُنْظَرُوْنَ۔ (سجدہ:29)

اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل اور اپنے لطف وکرم سے آج تمہیں مہلت دی ہوئی ہے تا کہ تم آنکھیں کھولو اور ہدایت کی راہ اپنالو لیکن جس روز اللہ کا عذاب نازل ہوگا تو توبہ کے دروازے بند ہوجائیں گے اور واپسی کا کوئی راستہ باقی نہ رہے گا۔ لہٰذا جلد بازی اور شتاب زدگی کر کے اپنی تباہی و بربادی کو دعوت نہ دو بلکہ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی مہلت سے فائدہ اٹھا کر اپنی اصلاح کرو۔

اسکے بعد جنابِ رسولؐ خدا کو حکم دیا جارہا ہے: ''ان حالات میں آپ ان سے منہ موڑ لیں اور انتظار کریں، یہ بھی منتظر ہیں۔ (آپؐ اللہ کی رحمت اور حق کی کامیابی کا انتظار کریں گے اور یہ شکست اور عذاب کا)''۔

فَاَعۡرِضۡ عَنۡهُمۡ وَانۡتَظِرۡ اِنَّهُمۡ مُّنۡتَظِرُوۡنَ''۔ (سجدہ:30)

دسویں آیت میں جنابِ رسولؐ خدا سے خطاب کیا جارہا ہے۔ اگرچہ تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ جنابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کبھی جلد بازی میں کوئی عمل نہیں کیا بلکہ ہمیشہ صبر وتحمل سے کام لیا، اس کے باوجود صبر کی اہمیت کو اُجاگر کرنے کیلئے آپ کو مخاطب کر کے یہ حکم دیا جارہا ہے کہ جس طرح اولوالعزم رسولوں نے صبر کیا، اسی طرح آپ بھی صبر کریں اور ان کے عذاب کیلئے جلد بازی نہ کریں۔ جب یہ ہمارے عذاب کے وعدوں کو پورا ہوتا ہوا دیکھیں گے تو انہیں ایسا محسوس ہوگا کہ دن کی ایک گھڑی کے برابر دُنیا میں رہے تھے۔

''فَاصۡبِرۡ كَمَا صَبَرَ اُولُوا الۡعَزۡمِ مِنَ الرُّسُلِ وَلَا تَسۡتَعۡجِلۡ لَّهُمۡ ؕ كَاَنَّهُمۡ يَوۡمَ يَرَوۡنَ مَا يُوۡعَدُوۡنَ ۙ لَمۡ يَلۡبَثُوۡۤا اِلَّا سَاعَةً مِّنۡ نَّهَارٍ ؕ بَلٰغٌ ۚ (احقاف:35)

اس آیت میں اس نکتے کو بیان کیا گیا ہے کہ آخرت کے سامنے دُنیا کی ساری عمر ایک گھڑی سے زیادہ نہیں ہے۔ لہٰذا اے رسولؐ! آپؐ ان کیلئے عذاب کے بارے میں جلدی نہ کریں۔

اس آیت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ تمام انبیاؑ اپنی اُمتوں کی خیرہ سری اور ان کے تعصب اور نادانی کے سامنے صبر وتحمل سے کام لیتے رہے اور انہیں اپنی اصلاح کی مہلت دیتے رہے۔

جنابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا رویہ بھی ایسا ہی تھا اور اس آیت میں آپ کو صبر کا جو حکم دیا گیا ہے، اس کی حیثیت تاکید کی سی ہے یا یہ کہ اس کا مقصد دُوسروں کیلئے صبر وتحمل کی اہمیت کو اُجاگر کرنا ہے۔ اس کا ایک مقصد کفار کو خبردار کرنا بھی ہوسکتا ہے کہ اللہ کی دی ہوئی مہلت کا ناجائز فائدہ نہ اُٹھائیں۔

یہ آیت اس بات کی گواہ ہے کہ صبر وتحمل کو اختیار کرنا اور عجلت وشتاب زدگی سے اجتناب کرنا ایسی اخلاقی فضیلت ہے جو سب انبیاؑ میں پائی جاتی تھی۔

نتیجہ:۔

مندرجہ بالا آیات سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ عجلت اور جلد بازی سب اقوام میں پائی جاتی تھی اور پائی جاتی ہے،

اسلام کی نظر میں کس قدر ناپسندیدہ ہے۔اس کے برعکس صبر وتحمل اور حوصلہ وبردباری اہم ترین اخلاقی اور انسانی فضیلت ہے جس سے سب انبیاؑ آراستہ تھے۔

عجلت اور جلد بازی احادیث کی روشنی میں

احادیث میں عجلت وجلد بازی کی مذمت میں بہت زیادہ بحث کی گئی ہے۔ احادیث میں اس کے متضاد کے طور پر ''اَناۃ''اور''تَاَنِّی'' کے الفاظ بھی استعمال ہوئے جن کے معنی آہستگی اور دھیرے پن کے ہیں۔

1۔ جنابِ رسولؐ خدا فرماتے ہیں:

"اَلْاَنَاۃُ مِنَ اللہِ وَالْعَجَلَۃُ مِنَ الشَّیْطَانِ"۔(بحار الانوار، 340:68)

''تانی اور آہستگی اللہ کی طرف سے ہے اور عجلت شیطان کی طرف سے''۔

2۔ ایک اور حدیث میں آپؐ نے فرمایا:

"اِنَّمَا اَھْلَکَ النَّاسَ اَلْعَجَلَۃَ وَلَوْ اَنَّ النَّاسَ تَثَبَّتُوْا لَمْ یُھْلِکْ اَحَدٌ"۔

''عجلت اور شتاب زدگی نے لوگوں کو ہلاک کر دیا۔ اگر لوگ تانی اور آہستگی اختیار کرتے تو کوئی ہلاک نہ ہوتا''۔(بحار الانوار، 340:68)

یہاں ہلاکت سے مراد وہ ہلاکت ہے جو سوچے سمجھے بغیر جلد بازی میں کئے گئے کاموں کی وجہ سے رونما ہوتی ہے۔

3۔ آنحضرتؐ سے منقول ایک اور حدیث میں ہے:

"اِیَّاکَ وَالْعَجَلَۃَ فَاِنَّکَ اِنْ عَجَّلْتَ اَخْطَاتَ حَظَّکَ"۔(مجموعہ ورام: 255)

''عجلت سے پرہیز کرو کیونکہ جب بھی تم عجلت سے کام لوگے، اپنا نصیب کھودوگے''۔

4۔ حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

"مَعَ الْعَجَلِ یَکْثُرُ الزَّلَلُ"۔(غرر الحکم، حدیث: 9740)

''عجلت کی وجہ سے انسان کی غلطیاں زیادہ ہوجاتی ہیں''۔

5۔ حضرت علی علیہ السلام نے اپنی شہادت کے قریب امام حسن علیہ السلام کے نام اپنی وصیت میں فرمایا:

"اَنْھَاکَ عَنِ التَّسَرُّعِ بِالْقَوْلِ وَالْفِعْلِ"۔(بحار الانوار، 339:67)

''میں تمہیں قول وفعل میں جلد بازی سے منع کرتا ہوں''۔

6۔ ایک اور حدیث میں آپؑ ارشاد فرماتے ہیں:

"اَلْعَجَلُ قَبْلَ الْاِمْكَانِ يُوْجِبُ الْغُصَّةَ"۔(غرر الحکم، حدیث:1333)

''مناسب حالات فراہم ہونے سے قبل عجلت غم وغصے کا باعث ہوتی ہے''۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ ایسے حالات میں انسان کی محنت اور کوشش برباد ہوجاتی ہے۔

7۔ نیز آپؑ ہی سے مروی ہے:

"مَنْ رَكِبَ الْعَجَلَ رَكِبَتْهُ الْمَلَامَةُ"۔(غرر الحکم، حدیث:9095)

''جو کوئی جلد بازی کی سواری پر سوار ہوگا، ملامت اس پر سوار ہوجائے گی''۔

8۔ امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

"مَعَ التَّثَبُّتِ تَكُوْنُ السَّلَامَةُ وَمَعَ الْعَجَلَةِ تَكُوْنُ النَّدَامَةُ"۔

''تانی اور آہستگی سلامتی کے ساتھ ہوتی ہے جبکہ عجلت ندامت کے ساتھ ہوتی ہے''۔(بحار، 338:68)

9۔ امیر المومنین علیہ السلام فرماتے ہیں:

"اَلْعَجَلَةُ مَذْمُوْمَةٌ فِيْ كُلِّ اَمْرٍ اِلَّا فِيْ مَا يَدْفَعُ الشَّرَّ"۔(غرر الحکم، حدیث:1950)

''شر کو دُور کرنے کے علاوہ عجلت ہر کام میں مذموم ہے''۔

10۔ اس بحث کو امیر المومنینؑ کی اس حدیث پر ختم کرتے ہیں:

"مَنِ اسْتَطَاعَ اَنْ يَمْنَعَ نَفْسَهُ مِنْ اَرْبَعَةِ اَشْيَاءَ فَهُوَ خَلِيْقٌ بِاَنْ لَا يَنْزِلَ بِهٖ مَكْرُوْهٌ اَبَدًا قِيْلَ وَمَا هِيَ؟ قَالَ: اَلْعَجَلَةُ وَاللَّجَاجَةُ وَالْعُجْبُ وَالنَّوَانِيْ"۔

''جو شخص چار چیزوں سے اپنے آپ کو بچالے تو وہ اس قابل ہے کہ کوئی برائی اُس پر نازل نہ ہو۔ پوچھا گیا کہ وہ چار چیزیں کونسی ہیں؟ آپؑ نے فرمایا: عجلت، لجاجت، خود پسندی اور کاہلی''۔(بحار، 43:75)

ان احادیث میں ''تَاَنّی'' کو ایک الٰہی عطیہ اور ''عجلت'' کو ایک شیطانی صفت کہا گیا ہے جو انسان کو زندگی میں ناکام بناتی ہے، اس سے مواقع کو چھین لیتی ہے، اس کی لغزشوں کو زیادہ کردیتی ہے جس کی وجہ سے انسان پشیمانی اور ہلاکت میں پڑ جاتا ہے۔ اس کے برعکس تانی اور آہستگی حالات ومواقع سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اُٹھانے اور کامیاب وکامران ہونے میں مدد دیتی ہے۔

چند اہم نکات

1۔عجلت اور شتاب زدگی کا مفہوم:۔

عجلت اور شتاب زدگی کے معنی یہ ہیں کہ انسان مناسب حالات وشرائط پیدا ہونے سے قبل کسی کام کو انجام دینے کیلئے میدان عمل میں کود پڑے۔ایسی صورت میں انسان کی تمام کوششیں برباد اور بے اثر ہو جائیں گی یا یہ کہ زیادہ سے زیادہ ایک ناقص نتیجہ انسان کے ہاتھ آ جائے گا۔یہ بالکل ایسا ہی ہے کہ پھل کے پکنے سے پہلے اسے درخت سے توڑ لیا جائے۔اس صورت میں یا تو پھل بالکل بے فائدہ ہو جاتا ہے یا اس کا فائدہ نہایت ہی ناقص ہوتا ہے۔اس کی ایک اور مثال اس طرح سے دی جا سکتی ہے کہ کوئی کسان زمین میں مکمل طور پر تیار ہونے سے قبل اس میں بیج بو کر، بیج اور اپنی ساری محنت، دونوں کو برباد کر دے گا۔اگر اس صورت میں کوئی فصل پیدا ہو بھی جائے تو بہت کم ہو گی۔

حضرت علی علیہ السلام نہج البلاغہ میں خطبہ 5 میں ارشاد فرماتے ہیں:

"وَهَجَّنَنِي الثَّمَرَةِ لِغَيْرِ وَقْتِ إِيْنَاعِهَا كَالزَّارِعِ لِغَيْرِ أَرْضِهِ"۔

''وقت سے پہلے پھل توڑنے والا اس شخص کی مانند ہے جو غیر مناسب زمین میں بیج بوتا ہے''۔

عجول ایسے افراد کو کہا جاتا ہے جو اپنے اعمال واقوال میں صبر وتحمل کے بغیر جلد بازی اور گھبراہٹ میں عمل کرتے ہیں اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مشکلات اور ناکامیوں کا شکار ہو جاتے ہیں۔عجلت اور شتاب زدگی کا نقطہ مقابل تانی، صبر تحمل، بردباری، حوصلہ مندی، اطمینان اور وقار ہے۔

البتہ عجلت اور سرعت کو آپس میں ملانا نہیں چاہئے۔سرعت یعنی تیزی ایک مثبت صفت ہے اور اس کے معنی یہ ہیں کہ مناسب حالات وشرائط فراہم ہو جانے کے بعد انسان وقت اور توانائیوں کو ضائع کیے بغیر فوراً عمل شروع کر دے اور تیزی سے اپنے مقصد کی طرف حرکت کرے۔یہ یقیناً کامیابی کا ذریعہ ہے۔

اکثر دیکھا گیا ہے کہ لوگ عجلت اور سرعت کے مفہوم کو آپس میں گڈمڈ کر دیتے ہیں۔بعض اوقات دیکھا گیا ہے کہ جب سست اور کاہل افراد کو تیزی سے کام کرنے کو کہا جاتا ہے تو وہ کہتے ہیں کہ عجلت ایک ناپسندیدہ عمل ہے، حالانکہ ان دونوں کا فرق نمایاں ہے۔

ہم اس بات کو حضرت علیؑ کی اس حدیث پر ختم کرتے ہیں:

"إِيَّاكَ وَالْعَجَلَةَ بِالْأُمُوْرِ قَبْلَ أَوَانِهَا، وَالتَّسَاقُطَ فِيْهَا عِنْدَ إِمْكَانِهَا"۔

''کسی کام کا وقت آنے سے پہلے عجلت میں اسے انجام دینے سے اجتناب کرو اور اس کا وقت آ جانے پر اسے انجام دینے میں سستی وکاہلی سے اجتناب کرو''۔(نہج البلاغہ، مکتوب:53)

2۔نیکی میں سرعت

قرآن مجید میں متعدد مقامات پر اہلِ ایمان کو نیکی کے کاموں میں سرعت کا حکم دیا گیا ہے۔سورۂ آلِ عمران کی آیت 114 میں اہل ایمان کا ذکر کرتے ہوئے اُن کی یہ صفت بیان کی گئی ہے۔

"وَيُسَارِعُوْنَ فِي الْخَيْرٰتِ ۭ وَاُولٰۗىِٕكَ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ"۔

''اعمال خیر میں تیزی سے عمل کرتے ہیں اور وہی صالحین میں سے ہیں۔''

سورۂ انبیاٗ، آیت 90 میں مؤمنین کی نمایاں صفات کا ذکر کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

".....اِنَّهُمْ كَانُوْا يُسٰرِعُوْنَ فِي الْخَيْرٰتِ ....."۔

''یہ نیک کاموں میں سرعت کے ساتھ عمل کرتے ہیں''۔

سورۂ مؤمنون کی آیت 61 میں مؤمنین کی نمایاں صفات کے ذکر میں آیا ہے:

"اُولٰۗىِٕكَ يُسٰرِعُوْنَ فِي الْخَيْرٰتِ وَهُمْ لَهَا سٰبِقُوْنَ"۔

''یہ نیک کاموں میں سرعت کے ساتھ عمل کرتے ہیں اور ان میں دوسروں پر سبقت لے جاتے ہیں''۔

سورۂ آلِ عمران کی آیت 133 میں اہلِ ایمان کو ایک عمومی فرمان سنایا جارہا ہے:

"وَسَارِعُوْٓا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ ۙ اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِيْنَ"۔

''اپنے رب کی مغفرت کی طرف اور اس جنت کی طرف تیزی سے آگے بڑھو جس کا عرض آسمانوں اور زمین کے برابر ہے جو متقین کیلئے تیار کی گئی ہے۔''

سورۂ بقرہ کی آیت 148 میں یہ بات اس طرح بیان کی گئی ہے:

".....فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ....."۔

یعنی ''اعمالِ خیر میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کرو''۔

ظاہر سی بات ہے کہ نیکی کے کاموں میں مسارعت اور مسابقت ایک ہی حقیقت کو بیان کرتے ہیں اور درحقیقت آپس میں لازم وملزوم ہیں، اس لئے کہ سرعت کے بغیر سبقت ممکن نہیں ہے اور جو سرعت سے عمل کرتا ہے، وہ دوسروں سے پہلے منزل پر پہنچتا ہے۔

اس سلسلہ میں بہت سی روایات بھی کتبِ حدیث میں موجود ہیں۔ ہم نمونے کے طور پر چند احادیث یہاں بیان کرتے ہیں:

1۔ جنابِ رسولِ خدا نے فرمایا:

"اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ مِنَ الْخَیْرِ مَا یُعَجَّلُ"۔ (اصولِ کافی، 142:2)

''اللہ تعالیٰ اس نیک عمل کو پسند کرتا ہے جسے انجام دینے میں جلدی کی جائے''۔

2۔ حضرت علیؑ فرماتے ہیں:

"بَادِرُوْا بِعَمَلِ الْخَیْرِ قَبْلَ اَنْ تُشْغَلُوْا عَنْہُ بِغَیْرِہٖ"۔ (میزان الحکمہ، 5381:1)

''نیک کام کو انجام دینے میں جلدی کرو، اس سے پہلے کہ کوئی اور کام تمہیں مصروف کر دے''۔

3۔ امام جعفر صادقؑ کی متعدد احادیث میں یہ مضمون پایا جاتا ہے:

"مَنْ ھَمَّ بِخَیْرٍ فَلْیُعَجِّلْہُ وَلَا یُؤَخِّرْہُ"۔ (کافی، 142:2)

''جو کوئی کسی نیکی کا ارادہ کرے، اسے جلدی انجام دے اور اس میں تاخیر نہ کرے''۔

4۔ ایک اور حدیث میں آپؑ نے یہی بات ذرا تفصیل سے بیان فرمائی ہے:

اِذَا ھَمَّ اَحَدُکُمْ بِخَیْرٍ اَوْ صِلَۃٍ فَاِنَّ عَنْ یَمِیْنِہٖ وَشِمَالِہٖ شَیْطَانَیْنِ فَلْیُبَادِرْ لَا یَکُفَّاہُ عَنْ ذٰلِکَ"۔

''جب تم سے کوئی شخص کسی عملِ خیر کو انجام دینے یا کسی کو کچھ دینے کا ارادہ کرے تو اسے یہ معلوم ہونا چاہئے کہ اس کے دائیں اور بائیں دو شیطان ہیں، لہٰذا اُسے چاہئے کہ فوراً عمل کر لے تاکہ شیطان اپنے وسوسوں کے ذریعے اُسے روک نہ دیں''۔

5۔ امیر المومنین علیہ السلام فرماتے ہیں:

"لَیْسَ مِنْ عَادَۃِ الْکِرَامِ تَاخِیْرُ الْاَنْعَامِ"۔ (غرر الحکم، حدیث: 7489)

''انعام میں تاخیر کرنا اہلِ کرم کا شیوہ نہیں ہے''۔

6۔ حضرت امام محمد باقرؑ فرماتے ہیں:

"مَنْ ھَمَّ بِشَیْءٍ مِّنَ الْخَیْرِ فَلْیُعَجِّلْہُ فَاِنَّ کُلَّ شَیْءٍ فِیْہِ تَاخِیْرٌ فَاِنَّ لِلشَّیْطَانِ فِیْہِ نَظْرَۃً"

''جو کوئی کسی کارِ خیر کی نیت کرے، اسے انجام دینے میں جلدی کرے، اس لئے کہ جس کام میں تاخیر ہو جائے، اس پر شیطان کی نظر لگ جاتی ہے (اور وہ کوشش کرتا ہے کہ اپنے وسوسوں کے ذریعے انسان کی نیت اور ارادے کو کمزور کر دے)''۔

مختصر یہ کہ کارہائے خیر کی انجام دہی میں شیاطین جن وانس کی طرف سے ہمیشہ وسوسہ اندازی اور رُکاوٹ پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے، لہٰذا جیسے ہی کوئی شخص کوئی کارِ خیر انجام دینے کی نیت کرتا ہے، یہ شیاطین اپنی کاروائیاں شروع کر دیتے ہیں۔ بنابرایں ضروری ہے کہ کارہائے خیر کو انجام دینے میں تاخیر نہ کی جائے۔ البتہ سرعت اور عجلت کے فرق کو مدِ نظر رکھا جانا چاہئے۔

ہم اس بات کو امیر المومنین حضرت علیؑ کی اس حدیث پر ختم کرتے ہیں:

"لَاتُؤَخِّرْ اِنَالَةَ الْمُحْتَاجِ اِلٰى غَدٍ، فَاِنَّكَ لَاتَدْرِىْ مَايَعْرِضُ لَكَ وَلَهُ فِىْ غَدٍ"۔ (غرر الحکم ،حدیث: 10364)

''ضرورت مند کی مدد کرنے میں کل تک تاخیر نہ کرو، تمہیں کیا معلوم کہ کل تمہارے حالات کیا ہوں اور اس کے حالات کیا ہوں (ہوسکتا ہے کہ تم دینے پر قادر نہ رہو یا اس کی ضرورت ہی باقی نہ رہے)''

عجلت اور شتاب زدگی کے منفی اثرات

1۔ وقت اور توانائی کا ضیاع:۔

عجلت اور شتاب زدگی کے فردی اور اجتماعی زندگی پر بہت سے منفی اثرات مرتب ہوتے ہیں اور اس سے ہونے والے نقصانات کی فہرست بھی بہت طویل ہے۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ یہ صفتِ رذیلہ انسان کے وقت اور توانائیوں کو ضائع کر دیتی ہے، مثلاً اگر دُشمن کسی ملک پر حملہ کر دے اور اس ملک کی مسلح افواج مناسب تیاری اور منصوبہ بندی کے بغیر جلد بازی اور عجلت میں دُشمن پر حملہ کر دیں تو نتیجہ شکست اور ناکامی کے سوا کچھ نہیں ہوگا اور اس کی توانائیوں، وقت، وسائل اور افرادی قوت کا ضیاع بھی ہوگا۔

ذاتی معاملات میں بھی یہ بات پوری طرح صادق آتی ہے، اس لئے کہ جلد بازی اور شتاب زدگی پر مبنی حرکت کا یہی نتیجہ ہوتا ہے۔

''الحجۃ البیضا'' میں ایک دلچسپ حدیث بیان ہوئی ہے جو اس بات کی تصدیق کرتی ہے۔ اس حدیث میں ہے کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام پیدا ہوئے تو سب شیاطین ابلیس کے پاس جمع ہوئے اور کہنے لگے کہ آج سارے بت سرنگوں ہوگئے ہیں، کیا کوئی خاص بات ہوئی ہے؟

ابلیس نے کہا: ضرور کچھ ہوا ہے۔ تم لوگ یہاں رہو، میں تحقیق کرتا ہوں۔

ابلیس نے اُڑان بھری اور ساری دُنیا کا چکر لگایا اور دیکھا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت کے علاوہ کوئی واقعہ رونما نہیں ہوا اور اس نے دیکھا کہ فرشتوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو گھیرے میں لیا ہوا ہے۔ ابلیس نے واپس آکر انہیں اطلاع دی کہ

گزشتہ رات ایک رسول کی ولادت ہوئی ہے۔

اس نے مزید کہا کہ جو حاملہ عورت بچہ جنتی ہے، میں وہاں موجود ہوتا ہوں، سوائے اس بچے کی ولادت کے۔ پس اب تم اس بات سے مایوس ہو جاؤ کہ اس کے بعد بت پرستی کو فروغ حاصل ہوگا۔ لیکن تم اولادِ آدمؑ کو گمراہ کرنے کیلئے عجلت اور جلد بازی کے اعمال کو ذریعہ بنا سکتے ہو۔ (الحجۃ البیضا، 61:5)

2۔ یاس و نا اُمیدی:۔

عجلت اور جلد بازی کا ایک اور منفی نتیجہ مایوسی اور نا اُمیدی کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے اور ممکن ہے کہ ایسی صورتِ حال میں بعض اوقات انسان کی حالت یہ بھی ہو جاتی ہے کہ وہ ہر چیز حتیٰ کہ اللہ کی تقدیر سے بھی مکمل طور پر مایوس ہو جاتا ہے۔ ایک حدیث میں حضرت امام حسن عسکریؑ فرماتے ہیں:

"لَاتَعْجَلْ عَلٰی ثَمَرَةٍ لَاتَدْرِك وَاِنَّمَا تَنَالُهَافِیْ اَوَانِهَا وَاَعْلَمُ اَنَّاالْمُدَبِّرَ لَكَ اَعْلَمُ بِالْوَقْتِ الَّذِیْ یُصْلِحُ حَالُكَ فِیْهِ، فَشِقُ بِخَیْرَتِهٖ فِیْ جَمِیْعِ اُمُوْرِكَ، یُصْلِحُ حَالُكَ، وَلَاتَعْجَلْ بِحَوَائِجِكَ قَبْلَ وَقْتِهَافَیَضِیْقُ قَلْبُكَ وَصَدْرُكَ وَیَغْشَاكَ(یَغْشَاكَ) الْقُنُوْط"۔ (بحار الانوار، 379:75)

''وقت سے پہلے کوئی بھی پھل توڑنے میں جلدی نہ کرو۔ تم مناسب موقع پر ہی اسے حاصل کر سکتے ہو۔ یاد رکھو تمہارے اُمور کی تدبیر کرنے والا بہتر جانتا ہے کہ کس وقت کوئی چیز تمہارے لئے مفید ہے۔ لہٰذا ہر کام میں اس کے انتخاب پر بھروسہ کرو تا کہ تمہارے معاملات کی اصلاح ہو سکے اور اپنی ضروریات کی تکمیل کیلئے کبھی بھی جلد بازی کرتے ہوئے قبل از وقت قدم نہ اُٹھاؤ کیونکہ اس سے تم پر افسردگی، تنگدلی اور مایوسی چھا جائے گی''۔

3۔ ندامت اور پشیمانی:۔

عجلت اور جلد بازی کا ایک اور برا نتیجہ ندامت اور پشیمانی ہے، جیسا کہ گزشتہ احادیث میں یہ بات بیان ہو چکی ہے، بہت سے لوگ مناسب تیاری کے بغیر مناسب وقت سے پہلے عجلت اور جلد بازی میں کوئی قدم اُٹھاتے ہیں جس کا نتیجہ ان کی توانائیوں اور وسائل کے ضیاع کی صورت میں برآمد ہوتا ہے اور انہیں اس کا کوئی پھل نہیں ملتا۔ ایسی صورت میں انسان ندامت اور پشیمانی کا شکار ہو جاتا ہے کہ کاش! میں نے ایسا نہ کیا ہوتا۔

امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

"فَكَمْ مِنْ مُسْتَعْجِلٍ بِمَااِنْ اَدْرَكَهٗ وَدَّاَنَّهٗ لَمْ یُدْرِكْهُ"۔

''بہت سے لوگ جلد بازی میں ایسی چیز حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ اگر اُسے حاصل کرلیں تو یہ چاہیں گے کہ کاش! انہیں یہ چیز نہ ملی ہوتی''۔(نہج البلاغہ، خطبہ:150)

4۔غم واندوہ:۔

عجلت اور جلد بازی کا ایک اور منفی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ شکست اور ناکامی کے بعد انسان غم واندوہ میں گرفتار ہو جاتا ہے۔

حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

"اَلْعَجَلُ قَبْلَ الْاِمْكَانَ يُوْجِبُ الْغُصَّةَ"۔(غرر الحکم، حدیث:1333)

''مناسب حالات سے قبل جلد بازی میں اقدام کرنے کا نتیجہ غم وغصہ ہوتا ہے''۔

5۔اغلاط کی کثرت:۔

عجلت اور شتاب زدگی کا ایک اور منفی اثر یہ ہوتا ہے کہ انسان بکثرت غلطیاں کرتا ہے۔صحیح فیصلے صحیح اقدام کرنے کیلئے ضروری ہے کہ پہلے انسان معاملے کے تمام پہلوؤں پر مکمل غور وفکر کرے۔ظاہری بات ہے کہ جلد بازی اور عجلت میں کئے گئے فیصلوں اور اقدامات میں ایسا ممکن نہیں ہوتا۔نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ عام طور پر جلد باز افراد مختلف غلطیوں کا شکار ہوجاتے ہیں، جو ہدف اور مقصد کی تشخیص میں بھی ہوسکتی ہیں اور ہدف تک پہنچنے کے طریقوں میں بھی۔

حضرت علیؑ فرماتے ہیں:

"مَعَ الْعَجَلِ يَكْثُرُ الزَّلَلُ"۔(غرر الحکم، حدیث:9740)

''عجلت اور جلد بازی میں کثرت سے غلطیاں سرزد ہوتی ہیں''۔

نیز آپؑ ہی سے منقول ہے:

"مَنْ عَجِلَ كَثُرَ عِثَارُهُ"۔(غرر الحکم، حدیث:7838)

''جو جلد بازی کرتا ہے، اس کی غلطیاں بھی زیادہ ہوتی ہیں''۔

ایک اور حدیث میں آپؑ فرماتے ہیں:

"اَصَابَ مُتَأَنٍّ اَوْ كَادَ. اَخْطَأَ مُسْتَعْجِلٌ اَوْ كَادَ"۔

''آرام وسکون کرنے والے افراد کامیاب ہوجاتے ہیں، یا کامیابی کے قریب ہوجاتے ہیں جبکہ جلد باز افراد خطا کے مرتکب ہوتے ہیں یا خطا کے قریب ہوجاتے ہیں''۔(غرر الحکم، حدیث:1290)

بہر حال عجلت، جلد بازی اور گھبراہٹ میں کئے گئے کاموں کے نقصانات اس سے کہیں زیادہ ہیں جتنا ایک عام آدمی سوچ سکتا ہے۔جلد باز انسان اپنی جلد بازی کی جو قیمت ادا کرتا ہے، اُس کا اندازہ لگانا ممکن نہیں ہے۔

عجلت کے اسباب

1۔نفس پرستی:۔

بہت سے دیگر رذائلِ اخلاقی کی مانند اس صفتِ رذیلہ کا بنیادی سبب بھی ہوائے نفسانی کی پرستش ہے۔نفس پرست انسان عام طور پر اپنی نفسانی خواہشات کے حصول کیلئے، غور وفکر کیے بغیر، جلد بازی سے عمل کرتا ہے، اس لئے کہ اس کی نفسانی خواہشات اس قدر طاقتور ہوتی ہیں کہ اُسے غور وفکر کی اجازت نہیں دیتی ہیں۔

2۔حُبِ دُنیا:۔

حُبِ دُنیا جو تمام برائیوں کا سرچشمہ ہے، عجلت اور شتاب زدگی کی ایک اور وجہ ہے۔حُبِ دُنیا میں گرفتار شخص حُبِ دُنیا کے ہاتھوں اندھا اور بہرہ ہو جاتا ہے، دُنیا کی محبت ایک آگ کی طرح اس کے دل میں شعلہ ور ہوتی ہے اور اسے ناپختہ خیالات کی پیروی پر مائل یا مجبور کر دیتی ہے جس کی وجہ سے وہ مشکلات اور مواقع کو دیکھ سکتا ہے نہ ان کا مقابلہ کرنے کی تیاری کر سکتا ہے۔نتیجہ شکست اور ناکامی کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔

3۔کم ظرفی:۔

عجلت اور شتاب زدگی کا ایک سبب کم ظرفی بھی ہے۔کم ظرف افراد عام طور پر جلد باز ہوتے ہیں جبکہ کھلے دل اور زیادہ حوصلے والے افراد عموماً صبر وتحمل اور بردباری سے کام لیتے ہیں۔یہ افراد تمام معاملات کا ٹھنڈے دل اور دماغ سے جائزہ لے کر قدم اُٹھاتے ہیں۔اسی وجہ سے ان کی ناکامیوں کی شرح بھی کم ہوتی ہے۔

شیطانی وسوسہ اندازی، نادان اور جاہل دوستوں کی باتیں، خوشامدی، جھوٹے اور حاسد افراد کی فریب کاریاں بھی شتاب زدگی اور عجلت کا اہم سبب ہوتی ہیں۔

حضرت علیؑ فرماتے ہیں:

"وَلَا تَعْجَلَنَّ اِلٰی تَصْدِیْقِ سَاعٍ فَاِنَّ السَّاعِیَ غَاشٌ وَاِنْ تَشَبَّهُ بِالنَّاصِحِیْنَ"۔

"چغل خوری کرنے والوں کی باتوں کی تصدیق نہ کرو کیونکہ وہ خائن ہوتے ہیں، اگرچہ بظاہر اُنہوں نے

خیر خواہی کا لباس پہنا ہوا ہو''۔(نہج البلاغہ:53)

4۔ جہالت اور نادانی:۔

جلد بازی اور شتاب زدگی کی ایک اور وجہ جہالت، نادانی اور کم عقلی ہے۔ جاہل افراد عام طور پر توہمات اور غلط افکار میں مبتلا ہوتے ہیں۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ کسی کام کے مناسب حالات وشرائط پیدا ہو چکے ہیں، حالانکہ ایسا ہوتا نہیں ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ حوادث اور ناکامیوں کے گرداب میں پھنس جاتے ہیں۔ اس کے برعکس ہوشیار اور آگاہ افراد معاملات کے تمام اطراف وجوانب کا غور سے جائزہ لے کر احتیاط اور دُور اندیشی سے کام لیتے ہیں۔ وہ ہر قسم کی جلد بازی سے دُور رہتے ہوئے منصوبہ بندی کرتے ہیں اور یقیناً کامیابی سے ہمکنار ہوتے ہیں۔

امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

"مِنَ الْحُمْقِ اَلْعَجَلَةُ قَبْلَ الْاِمْكَان"۔(غرر الحکم، حدیث:9394)

''امکانات فراہم ہونے سے قبل جلد بازی حماقت کی ایک قسم ہے''۔

راہِ علاج

اس صفت رذیلہ کے علاج کا پہلا قدم یہ ہے کہ انسان اس کے دردناک نتائج پر توجہ کرے اور جن لوگوں کی زندگی میں اس کے تلخ نتائج اور دردناک حوادث رُونما ہوئے ہیں، اُن کو یاد کرے۔ تاریخ میں ہمیں بہت سے ایسے نمونے اور مثالیں مل سکتی ہیں، جو اس سلسلہ میں ہماری چشم کشائی کر سکتی ہیں۔ جو کوئی ان امور میں غور وفکر کرے، وہ اس حقیقت کو پا سکتا ہے کہ جلد بازی سے نہ صرف یہ کہ انسان جلدی اپنے مقصد کو حاصل نہیں کر سکتا بلکہ بعض اوقات تو یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جلد بازی کی وجہ سے کبھی بھی اپنی منزل تک نہ پہنچ سکے۔

"اَلْعَجَلَةُ مِنَ الشَّيْطَانِ" اور "وَالقعَجَلَةُ الْاِمْكَانِ يُوْجِبُ الْغُصَّةَ وَمَعَ الْعَجَلَةِ تكُوْنَ النَّدَامَةُ"

جیسے جملوں کو اگر فردی اور معاشرتی زندگی کا اصول بنا لیا جائے تو انسان عجلت اور شتاب زدگی کی بیماری سے نجات پا سکتا ہے۔ انسان کو چاہئے کہ جنابِ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اس حدیث کو ہمیشہ مدِ نظر رکھے:

''جلد بازی انسان کو ہلاکت میں ڈال دیتی ہے اور اگر صبر وتحمل سے کام لیں تو کوئی شخص خطرے میں گرفتار نہ ہو''۔(بحار الانوار، 340:68)

سترھواں باب

صبر وشکیبائی

تمہید:۔

انسان کو زندگی میں عجیب وغریب مشکلات سے واسطہ پڑتا ہے رہتا ہے۔ اگر ان مشکلات کا مقابلہ صبر اور حوصلے سے کیا جائے تو انسان یقیناً کامیاب ہوجاتا ہے۔ اس کے برعکس اگر انسان صبر وشکیبائی سے کام نہ لے اور مسائل ومشکلات کے سامنے گھٹنے ٹیک دے تو کبھی اپنی منزل تک نہیں پہنچ پائے گا۔

یہاں صبر کے معنی یہ ہیں کہ انسان مشکلات اور حوادث کے سامنے ثابت قدمی سے اپنی منزل کی طرف گامزن رہے۔ اس کا نقطہ مقابل ''جزع'' ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ انسان مشکلات وحوادث کے سامنے صبر وحوصلہ ہار کر اپنی شکست تسلیم کرلے۔ یہ مسئلہ مادی زندگی کے علاوہ معنوی اور رُوحانی زندگی میں بھی صادق آتا ہے۔ اگر انسان اپنے سرکش نفس، دُنیا کی پرفریب سنگینی اور گناہوں کی کشش کے سامنے صبر واستقلال کا مظاہرہ نہ کرے اور معرفتِ خدا اور اطاعت خدا کی راہ میں مشکلات کا مقابلہ نہ کرسکے تو وہ اپنی منزل تک نہیں پہنچ سکے گا۔ اس لحاظ سے علمائے علمِ اخلاق نے صبر کی تین اقسام بیان کی ہیں:

1۔صبر براطاعت:۔

یعنی اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور بندگی کی راہ میں پیش آنے والی مشکلات کے سامنے صبر واستقامت۔

2۔صبر برمعصیت:۔

یعنی گناہ کی کشش کے سامنے صبر واستقامت۔

3۔صبر برمصیبت:۔

تلخ اور ناگوار حوادث کے سامنے ثابت قدم رہنا۔ ان کے سامنے انفعالی (passive) طرز عمل نہ اپنانا اور جزع وبیتابی نہ کرنا۔

''صبر'' ایمان کے اہم ترین ارکان میں سے ایک ہے۔ امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کے فرمان کے مطابق صبر کا ایمان سے وہی تعلق ہے جو سر کا جسم سے ہوتا ہے۔ قرآن مجید میں بھی کسی اور موضوع پر ایسی تاکید کم ہی ملتی ہے جیسے صبر کے بارے میں۔ تقریباً ستر

آیات میں صبر کے بارے میں بات کی گئی ہے جن میں سے دس سے زائد جنابِ رسولِ خدا کے بارے میں ہیں۔

قرآن مجید میں صابرین کیلئے اجرِ عظیم کا وعدہ کیا گیا ہے۔ چنانچہ سورۂ زمر، آیت 10 میں آیا ہے۔

"اِنَّمَا یُوَفَّی الصّٰبِرُوْنَ اَجْرَهُمْ بِغَیْرِ حِسَابٍ"۔

''صابروں کو ان کا اجر بغیر کسی حساب کے پورا پورا دے دیا جائے گا''۔

اسی طرح صبر کو جنت میں داخل ہونے کی کنجی قرار دیا گیا ہے:

"سَلٰمٌ عَلَیْكُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ فَنِعْمَ عُقْبَى الدَّارِ"۔ (رعد:24)

''تم پر سلامتی ہو، اس سبب کہ تم نے صبر کیا، کس قدر عمدہ ہے عاقبت کا گھر''۔

جنابِ رسولِ خدا کی ایک حدیث میں ہے، جو آئندہ صفحات میں بیان ہوگی کہ صبر کو نصف ایمان قرار دیا گیا ہے۔ اس تمہید کے بعد اُن قرآنی آیات پر ایک نظر ڈالتے ہیں جن میں مختلف اسالیب میں صبر کے بارے میں تاکید کی گئی ہے:

1۔ اِنَّا وَجَدْنٰهُ صَابِرًا ؕ نِعْمَ الْعَبْدُ ؕ اِنَّهٗۤ اَوَّابٌ"۔ (ص:44)

''ہم نے اُسے (ایوبؑ کو) صابر پایا، وہ کیا خوب بندہ تھا جو (اپنے رب کی طرف) بہت رجوع کرنے والا تھا''۔

2۔ "وَجَآءُوْ عَلٰى قَمِیْصِهٖ بِدَمٍ كَذِبٍ ؕ قَالَ بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ اَنْفُسُكُمْ اَمْرًا ؕ فَصَبْرٌ جَمِیْلٌ ؕ وَاللّٰهُ الْمُسْتَعَانُ عَلٰى مَا تَصِفُوْنَ۔" (یوسف:18)

''وہ یوسف کے کرتے پر جھوٹا خون مل کر لے آئے تو (ان کے والد نے) کہا: تمہاری ہوائے نفس نے ایک برے کام کو تمہاری نظر میں خوبصورت بنا دیا، پس میں صبر جمیل اختیار کرتا ہوں اور جو کچھ تم کہہ رہے ہو، اُس پر اللہ سے مدد مانگتا ہوں''۔

3۔ "وَاِسْمٰعِیْلَ وَاِدْرِیْسَ وَذَا الْكِفْلِ ؕ كُلٌّ مِّنَ الصّٰبِرِیْنَ"۔ (انبیاء:85)

''اور اسماعیل اور ادریس اور ذوالکفل کا ذکر کرو، یہ سب صابرین میں سے تھے''۔

4۔ "قَالَ اِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِیْعَ مَعِیَ صَبْرًا"۔ (کہف:67)

''خضرؑ نے کہا: تم ہرگز میرے ساتھ صبر نہ کر سکو گے لیکن موسیٰؑ نے صبر کرنے کا وعدہ کر لیا)''۔

5۔ "قَالَ الَّذِیْنَ یَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوا اللّٰهِ ۙ كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِیْلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِیْرَةًۢ بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِیْنَ"۔ (بقرہ:249)

''جو لوگ آخرت پر پختہ ایمان رکھتے تھے، اُنہوں نے کہا: اکثر ایسا بھی ہوتا رہا ہے کہ ایک چھوٹی جماعت اللہ

کے حکم سے بڑی جماعت پر غالب آ گئی اور اللہ صابروں کے ساتھ ہوتا ہے"۔

6۔ "فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ أُولُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ وَلَا تَسْتَعْجِلْ لَّهُمْ ۚ كَأَنَّهُمْ يَوْمَ يَرَوْنَ مَا يُوعَدُونَ ۙ لَمْ يَلْبَثُوٓا إِلَّا سَاعَةً مِّن نَّهَارٍ"۔(احقاف:35)

"اے رسولؐ! صبر کیجئے، جس طرح اولوالعزم رسول صبر کرتے رہے اور (ان کے عذاب کیلئے) جلد بازی نہ کیجئے۔ جس دن یہ اس عذاب کو دیکھیں گے جس کا ان سے وعدہ کیا جا رہا ہے تو انہیں ایسا محسوس ہوگا گویا وہ ایک گھڑی بھر دُنیا میں رہے"۔

7۔ "فَاصْبِرْ صَبْرًا جَمِيلًا"۔(معارج:5)

"پس صبر کرو، ایسا صبر جو خوبصورت ہو" (یعنی ہر قسم کی ناشکری سے پاک ہو)۔

8۔ "يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اصْبِرُوا وَصَابِرُوا وَرَابِطُوا ۖ وَاتَّقُوا اللَّهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ"۔(آلِ عمران:200)

"اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو! (مشکلات، مصائب اور نفسانی خواہشات کے مقابلے میں) صبر و استقامت سے کام لو، نیز دُشمنوں کے مقابلہ میں ثابت قدم رہو اور اپنی سرحدوں کی حفاظت کرو اور اللہ کے معاملہ میں تقویٰ اختیار کرو، شاید تم فلاح پا جاؤ"۔

9۔ "يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اسْتَعِينُوا بِالصَّبْرِ وَالصَّلَاةِ ۚ إِنَّ اللَّهَ مَعَ الصَّابِرِينَ"۔(بقرہ:153)

"اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو! صبر اور نماز کے ذریعے مدد طلب کرو، بے شک اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے"۔

10۔ "قُلْ يَا عِبَادِ الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا رَبَّكُمْ ۚ لِلَّذِينَ أَحْسَنُوا فِي هَٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةٌ ۚ وَأَرْضُ اللَّهِ وَاسِعَةٌ ۗ إِنَّمَا يُوَفَّى الصَّابِرُونَ أَجْرَهُم بِغَيْرِ حِسَابٍ"۔(زمر:10)

"کہہ دو کہ اے میرے بندو، جو مجھ پر ایمان لائے ہو! اپنے رب کی نافرمانی سے بچو، جن لوگوں نے اِس دُنیا میں نیکی کی، اُن کیلئے نیک صلہ ہے۔ اللہ کی زمین وسیع ہے (لہٰذا اگر کفار کے سرغنوں کی طرف سے تم پر ہاتھ ڈالا جائے تو ہجرت کر جاؤ) اس لئے کہ صابروں کو اُن کا اجر و ثواب بغیر حساب کے ملے گا"

11۔ "سَلَامٌ عَلَيْكُم بِمَا صَبَرْتُمْ ۚ فَنِعْمَ عُقْبَى الدَّارِ"۔(رعد:24)

"(قیامت کے فرشتے اہلِ ایمان سے کہیں گے) تمہارے صبر و استقامت کی وجہ سے تم پر سلامتی ہو، آخرت کا

گھر کیا اچھا گھر ہے''۔

12۔ "أُولَٰئِكَ يُجْزَوْنَ الْغُرْفَةَ بِمَا صَبَرُوا وَيُلَقَّوْنَ فِيهَا تَحِيَّةً وَسَلَامًا"۔(فرقان:75)

''(رحمٰن کے ان بندوں کو) ان کے صبر کی وجہ سے جنت کے بلند درجات دیئے جائیں گے اور انہیں ان کے صبر کا اجر عطا کیا جائے گا اور وہاں ان کا استقبال تحیہ اور سلام سے ہوگا''۔

13۔ "وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْأَمْوَالِ وَالْأَنفُسِ وَالثَّمَرَاتِ ۗ وَبَشِّرِ الصَّابِرِينَ"۔(بقرہ:155)

''اور یقیناً ہم تمہیں کچھ خوف، بھوک، مال وجان اور پھلوں کے نقصان سے آزمائیں گے۔ جو لوگ ان آزمائشوں کے سامنے صبر واستقامت کریں، انہیں (کامیابی اور اجرِ عظیم) کی بشارت دے دیں''۔

14۔ "وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ ۙ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ"۔(والعصر:3)

''اور وہ ایک دوسرے کو حق کی تلقین کرتے ہیں اور ایک دوسرے کو صبر کی تلقین کرتے ہیں''۔

تفسیر

اللہ کے رسولوں میں سے ہر ایک کو کوئی نہ کوئی نمایاں اخلاقی فضیلت حاصل تھی۔ حضرت ایوبؑ ایک بہت زیادہ صبر کرنے والے پیغمبر کی حیثیت سے معروف ہیں۔ وہ مشکلات کے سامنے صبر واستقامت کا ایک نمونہ تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اُنؑ کے حالات، سورۂ ص میں اس وقت بیان کئے گئے جب مکہ کے مسلمانوں پر سخت مصائب ڈھائے جا رہے تھے۔ یہ سورۃ ان کیلئے صبر واستقامت کی ایک عملی مثال کی حیثیت سے نازل ہوئی اور مسلمانوں کیلئے صبر واستقامت کا درس بھی۔

یہ بات صحیح ہے کہ حضرت ایوبؑ کا نام یا انؑ کا واقعہ قرآن مجید کی متعدد سورتوں میں بیان ہوا ہے لیکن سورۂ ص میں اس کا ذکر بہت تفصیل سے کیا گیا ہے۔ مذکورہ بالا آیات میں سے پہلی آیت سورۂ ص ہی کی آیت 44 ہے جس میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

''اور ہم نے ایوبؑ کو صابر پایا۔ وہ کیا خوب بندہ اور (اپنے رب کی طرف) رجوع کرنے والا تھا''۔

حضرت ایوب علیہ السلام آزمائش کے طور پر کئی بڑے مصائب میں گرفتار ہوئے تاکہ انؑ کی شکر گزاری کا درجہ بھی نمایاں ہو جائے اور وہ اپنے رب کے قریب بھی ہو جائیں۔ انؑ کا مال، کھیتی باڑی، بہت سے جانور اور لائق وہونہار بیٹے، سب کچھ ہلاک وبرباد ہو گیا اور وہ خود بھی شدید بیمار ہو گئے۔ انؑ کی بیماری اس قدر شدید تھی کہ وہ شدتِ درد سے تڑپنے لگتے۔ لیکن ان سب باتوں میں سے کوئی بھی اللہ کے حضور میں انؑ کی شکر گزاری کو کم نہ کر سکی۔

انہوں نے دوستوں اور دُشمنوں کے طعنے برداشت کئے جو شاید ہر مصیبت سے بڑی مصیبت تھے۔ بعض اوقات بنی

اسرائیل کے عبادت گزار اور راہب انؑ سے ملنے آتے تو صاف الفاظ میں کہتے کہ آپؑ نے کونسا اتنا بڑا گناہ کیا ہے جس کی پاداش میں آپؑ اس دردناک عذاب میں مبتلا ہو گئے ہیں؟

لیکن اس پر بھی حضرت ایوبؑ صبر کا دامن ہاتھ سے نہ جانے دیتے اور اپنے شکر کے صاف وشفاف چشمے کو ناشکری سے آلودہ نہ ہونے دیتے۔ اس سلسلہ میں انہوں نے صرف یہ کام کیا کہ طویل عرصے کی پریشانی اور مصیبت کے بعد ایک دن اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں عرض کیا:

''اے میرے رب! شیطان نے مجھے دُکھوں اور عذاب میں ڈال دیا ہے (اور میں صرف تجھ سے اس مصیبت سے نجات کی اُمید رکھتا ہوں)'' (ص:41)

"وَاذْكُرْ عَبْدَنَآ اَيُّوْبَ ۘ اِذْ نَادٰى رَبَّهٗٓ اَنِّيْ مَسَّنِيَ الشَّيْطٰنُ بِنُصْبٍ وَّعَذَابٍ"۔

جب اللہ تعالیٰ کے اس عظیم الشان پیغمبر نے مصیبت اور آزمائش کے سارے مراحل طے کر لئے اور ان کے سامنے صبر واستقامت کا پہاڑ بن کر ڈٹے رہے اور شیطان کو شرمندہ اور مایوس کر دیا تو اللہ نے اپنی رحمت کے دروازے انؑ پر کھول دیئے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے مال ودولت سے زیادہ مال ودولت انہیں عطا کیا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں ''نِعْمَ الْعَبْدُ اِنَّهٗ اَوَّابٌ'' کا اعزاز بھی عطا فرمایا۔

ابن مسعود، جو ایک معروف مفسر اور قاری تھے، ان کا کہنا ہے کہ حضرت ایوب علیہ السلام نے انسانی تاریخ میں اعزاز اپنے نام کر لیا اور قیامت تک اہلِ صبر کے قافلہ سالار بن گئے۔

"رَاسُ الصَّابِرِيْنَ اِلٰى يَوْمِ الْقِيَامَه"۔ (تفسیر رُوح البیان، 45:2)

اس بات کو معمولی اور سادہ سی بات نہ سمجھا جائے کہ ایک شخص جس کے پاس وسیع پیمانے پر سب کچھ ہو اور اس کا سب کچھ یکا یک برباد ہو جائے، دوستوں اور دُشمنوں کے طعنے سننے کو ملیں، جن کا زخم تلوار کے زخم سے بھی زیادہ تکلیف دہ ہوتا ہے اور پھر اس کی زبان پر اللہ کی رضا کے خلاف کوئی کلمہ جاری نہ ہو بلکہ اُس کی زبان ان تمام حالات میں بھی ذکر وشکرِ الٰہی میں مصروف رہے اور آخر کار صرف اللہ تعالیٰ سے اپنی حالت بیان کرے۔

بعض لوگوں نے کہا ہے کہ اس جملے میں حضرت ایوبؑ نے اللہ سے شکایت کی ہے۔ لیکن ان لوگوں کی بات قطعی غلط ہے، اس لئے کہ حضرت ایوبؑ کی اس بات میں شکایت کا ذرا سا بھی رنگ نہیں ہے، بقولِ شاعر:

چار چیز آوردہ ام شاہا کہ درگنج تو نیست
نیستی وحاجت وعجز ونیاز آوردہ ام

''اے بادشاہِ حقیقی! میں چار چیزیں لے کر تیری بارگاہ میں آیا ہوں جو تیرے خزانے میں نہیں ہیں: نیستی،

حاجت مندی، عاجزی اور نیاز مندی لے کر آیا ہوں''۔

ان آیات میں سے دوسری آیت حضرت یعقوب علیہ السلام کے صبر کے بارے میں ہے۔ وہ بھی صبر وشکیبائی میں ایک قابلِ تقلید نمونہ ہیں۔ وہ اپنے انتہائی عزیز بیٹے کے فراق اور جدائی میں مبتلا ہو گئے۔ سالہا سال تک اشکبار آنکھوں سے اپنے عزیز فرزند کی جدائی پر صبر کرتے رہے، یہاں تک کہ نابینا ہو گئے مگر اللہ کی رضا کے خلاف ایک لفظ بھی اپنی زبان پر نہیں لائے بلکہ مسلسل صبر وشکر کی روش پر گامزن رہے۔ ایسا صبر جس کو خود انہوں نے صبر جمیل کا نام دیا، جیسا کہ زیر بحث آیت میں آیا ہے۔

برادرانِ یوسفؑ اپنے بھائی کی قمیص پر جھوٹا خون لگا کر باپ کے پاس آئے۔ (حضرت یعقوبؑ نے ان کے جواب میں) کہا: تمہارے نفس نے یہ کام تمہاری نظروں میں خوبصورت بنا کر دکھا دیا، میں صبر جمیل کروں گا اور جو کچھ تم کہہ رہے ہو، اس پر اللہ کی مدد کا طالب ہوں۔

"وَجَآءُوْ عَلٰى قَمِيْصِهٖ بِدَمٍ كَذِبٍ ؕ قَالَ بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ اَنْفُسُكُمْ اَمْرًا ؕ فَصَبْرٌ جَمِيْلٌ ؕ وَاللّٰهُ الْمُسْتَعَانُ عَلٰى مَا تَصِفُوْنَ۔"(یوسف:18)

حضرت یوسف علیہ السلام کے چھوٹے اور نادان بھائی اس بات سے غافل تھے کہ اگر انہوں نے حضرت یوسفؑ کی قمیص کو خون آلود کر لیا تھا تو چند جگہوں سے اس قمیص کو پھاڑ بھی ڈالتے تا کہ بھیڑیئے کے حملے کا کوئی ثبوت بھی پیدا ہو جاتا۔ ان کی اسی کمزوری نے ان کے جھوٹ کو ظاہر کر دیا اور حضرت یعقوبؑ ان کے فریب سے باخبر ہو گئے جس کا اظہار انہوں نے اس طرح کیا:

"بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ اَنْفُسُكُمْ اَمْرًا"۔

لیکن چونکہ اس وقت وہ بے بس تھے، بے ساختہ انہوں نے کہا: "فَصَبْرٌ جَمِيْلٌ" (صبر جمیل سے مراد وہ صبر ہے شکر کے ساتھ ہو، ایسا صبر جس کے ساتھ کسی قسم کی بے صبری اور بیتابی کی آلائش نہ ہو)۔

صبر جمیل کے بارے میں مفسرین نے مختلف تشریحات بیان کی ہیں۔ بعض مفسرین نے کہا ہے کہ صبر جمیل سے مراد ایسا صبر ہے جس میں بیتابی اور لوگوں کے سامنے اپنے حالات کی شکایت نہ پائی جائے۔ بعض نے یہ کہا ہے کہ صبر جمیل سے مراد وہ صبر ہے جو اللہ کیلئے ہو۔

جنابِ رسولِ خداؐ سے پوچھا گیا کہ صبر جمیل سے کیا مراد ہے؟ آپؐ نے فرمایا:

"هُوَ الَّذِيْ لِاَشْكُوى مَعَهٗ"۔

''یہ وہ صبر ہے جس کے ساتھ شکوہ نہ پایا جائے''۔ (تفسیر قرطبی، 338:5)

بعض نے کہا ہے کہ صبر جمیل وہ صبر ہے جس میں انسان اپنے حالات کی شکایت بندوں کے سامنے نہ کرے۔ اس سے بہتر یہ ہے کہ بندگی کا حق ادا کرتے ہوئے صرف اپنے رب کے سامنے اپنے حالات کی شکایت کرے۔ یہی وجہ ہے کہ جب حضرت یوسفؑ

کو بکثرت یاد کرنے پر حضرت یعقوبؑ کے بیٹوں نے ان پر تنقید کی تو انہوں نے جو جواب دیا، قرآن میں اسے اس طرح بیان کیا گیا ہے:

"قَالَ اِنَّمَآ اَشۡكُوۡا بَثِّىۡ وَحُزۡنِىۡۤ اِلَى اللّٰهِ وَاَعۡلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعۡلَمُوۡنَ"۔

''انہوں نے جواب دیا کہ میں صرف اللہ کے حضور اپنے غم واندوہ کی شکایت کرتا ہوں اور میں اللہ کی طرف سے ان باتوں کا علم رکھتا ہوں جو تم نہیں جانتے''۔(یوسف:86)

تیسری آیت میں چند اور انبیاؑ کا ذکر ہے جنہوں نے صبر واستقامت کے ساتھ حالات کا مقابلہ کیا اور اللہ نے ان کے صبر ہی کی بدولت انہیں اپنی خصوصی رحمت سے نوازا اور انہیں اپنے صالح بندوں کے زمرے میں شمار فرمایا۔

"وَاِسۡمٰعِيۡلَ وَاِدۡرِيۡسَ وَذَا الۡكِفۡلِ ؕ كُلٌّ مِّنَ الصّٰبِرِيۡنَ ۖ وَاَدۡخَلۡنٰهُمۡ فِىۡ رَحۡمَتِنَا ؕ اِنَّهُمۡ مِّنَ الصّٰلِحِيۡنَ"۔

(انبیاء:85اور 86)

''اور اسماعیلؑ، ادریسؑ او ذوالکفل کا ذکر کریں، یہ سب صبر کرنے والوں میں سے تھے اور ہم نے انہیں اپنی رحمت میں داخل کیا۔ وہ یقیناً ہمارے صالح بندوں میں سے تھے۔''

حضرت اسماعیل علیہ السلام کا صبر بالکل واضح ہے۔ جب ان کے والدؑ نے ان کو اللہ کی راہ میں قربان کرنا چاہا تو وہ اس کیلئے آمادہ ہوگئے۔ یہاں تک کہ حضرت ابراہیمؑ نے چھری انؑ کے گلے پر پھیر دی۔ اگرچہ اللہ تعالیٰ نے ان پر کرم کیا اور ایک دنبہ بھیج دیا جو حضرت اسماعیلؑ کی جگہ قربان ہوگیا۔

اس کے علاوہ وہ مکہ کی تپتی ہوئی بے آب وگیاہ سرزمین پر اللہ کے گھر کے قریب رہے، یہاں تک کہ بتدریج وہ جگہ آباد ہوگئی۔

حضرت ادریسؑ کے صبر کے بارے میں بھی کہا جاتا ہے کہ وہ اپنی قوم میں مبعوث ہونے والے سب سے پہلے نبی تھے۔ اگرچہ اس راہ میں اُنہوں نے بہت تلخیاں برداشت کیں اور اپنی قوم کو دعوت دی مگر انہوں نے ان کی دعوت قبول نہ کی۔

حضرت ذوالکفل کو یہ نام دینے اور پہلے سے مبعوثِ صبر کرنے والے انبیاؑ کے زمرے میں ان کا شمار کرنے کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک نبی کو، جو بنی اسرائیل پر حکومت کرتے تھے، وحی کی کہ میں تمہاری روح قبض کرنا چاہتا ہوں۔ تم حکومت کسی ایسے شخص کے سپرد کردو جو اس بات کا عہد کرے کہ ہر رات اللہ کی عبادت کیلئے شب بیداری کرے، ہر روز روزہ رکھے اور غضب ناک ہوئے بغیر لوگوں کے درمیان عدل کرے۔

ایک جوان نے کہا کہ میں ان سب باتوں کا وعدہ کرتا ہوں اور پھر (ہر قسم کی مشکلات کے باوجود) ساری زندگی ان تین

باتوں پر قائم رہا۔اللہ نے اس نوجوان کو مقامِ نبوت پر فائز کیا اور اسے ذوالکفل کا نام دیا (رُوح البیان،515:5)

یہ تین شخصیات صبر واستقامت کے ان قابلِ تقلید نمونوں میں سے ہیں جن کا ذکر اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کیلئے اُسوۂ عمل کے طور پر کیا ہے۔

چوتھی آیت میں حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت خضر علیہما السلام کے واقعہ کا ذکر ہے۔اس درس آموز نکات سے بھرپور، انسان ساز واقعہ میں بیان کیا گیا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام چند نئے علوم سیکھنے کیلئے حضرت خضرؑ کے پاس گئے اور انؑ سے درخواست کی کہ جو علوم اللہ تعالیٰ نے آپؑ کو سکھائے ہیں، ان میں سے مجھے بھی کچھ سکھا دیں۔

یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام شریعت کا مکمل علم رکھتے تھے لیکن حضرت خضرؑ دنیا میں ہونے والے مختلف حوادث کے سربستہ رازوں کا علم رکھتے تھے۔حضرت خضرؑ کو اندیشہ تھا کہ حضرت موسیٰؑ بے صبری کا شکار ہو جائیں گے۔لہٰذا انہوں نے حضرت موسیٰؑ سے کہا:

"قَالَ اِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِيْعَ مَعِيَ صَبْرًا۔ وَكَيْفَ تَصْبِرُ عَلٰى مَا لَمْ تُحِطْ بِهٖ خُبْرًا"۔(کھف: 67اور 68)

''تم ہرگز میرے ساتھ صبر نہیں کر سکو گے اور یہ کیسے ممکن ہے کہ تم ان باتوں پر صبر کرو جن کی تم پوری خبر نہیں رکھتے''۔

حضرت موسیٰؑ نے حضرت خضرؑ سے وعدہ کیا کہ وہ صبر کا مظاہرہ کریں گے۔لیکن بعد میں ایسے حوادث وواقعات پیش آئے جن کے اسرار سے ناواقفیت کی وجہ سے حضرت موسیٰؑ کا پیمانہ صبر لبریز ہو گیا۔دو مواقع پر تو حضرت خضرؑ نے انؑ کا اعتراض سننے کے بعد ان کی معذرت قبول کر لی لیکن تیسرے واقعہ کے بعد ان دونوں کی راہیں جدا ہو گئیں۔

اس داستان میں ہمارے لئے بہت سے درس ہیں لیکن ان میں سے ایک ہمارے موجودہ موضوع سے تعلق رکھتا ہے اور وہ یہ کہ اگر حضرت موسیٰؑ میں کچھ زیادہ صبر ہوتا تو وہ مزید بہت سے اسرار سے آگاہ ہو سکتے تھے لیکن انؑ کی بے صبری اور ناشکیبائی آڑے آ گئی اور وہ صرف تین واقعات کے اسرار جان سکے۔

ایک مشہور مفسر کا کہنا ہے کہ اگر حضرت موسیٰؑ میں زیادہ صبر ہوتا تو اسرار وعلوم کے ہزاروں نکتے ان پر کھل جاتے۔اس سے یہ نتیجہ حاصل ہوتا ہے کہ صبر وشکیبائی، علم وآگہی کے خزانے کی چابی ہے۔

ممکن ہے یہ سوال کیا جائے کہ آیا انبیاؑ اپنے زمانے کے عالم ترین افراد نہیں ہوتے تھے؟ پھر یہ کیسے ممکن ہوا کہ حضرت موسیٰؑ بعض علوم سیکھنے کیلئے حضرت خضرؑ کے پاس گئے اور صرف چند نکات سیکھنے کے بعد حضرت خضرؑ نے انہیں جدا کر دیا؟

اس سوال کا جواب بالکل واضح ہے۔ ہر نبی کو اپنے دائرہ کار میں اور احکامِ شریعت میں سب لوگوں سے زیادہ عالم ہونا چاہئے اور بے شک حضرت موسیٰؑ ایسے ہی تھے۔لیکن حضرت خضرؑ کا دائرہ کار تدبیرِ اُمور کرنے والے فرشتوں (مدبرات

امرًا) کی طرح دنیا میں پیش آنے والے حوادث وواقعات سے تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے کام بظاہر شریعت کے مطابق نہیں تھے اور حضرت موسیٰؑ انؑ پر اعتراض کرتے تھے لیکن جب حضرت خضرؑ نے ان واقعات کے پسِ پردہ حقیقی اسرار کو بیان کیا تو حضرت موسیٰؑ سمجھ گئے۔

اگرچہ نظامِ تکوِین پر حاکم قوانین اور نظامِ تشریع کے احکام ایک دوسرے کے ساتھ مکمل طور پر ہم آہنگ ہیں اور ان کا نتیجہ اور انجام ایک ہی ہوتا ہے لیکن بظاہر ان میں اختلاف نظر آتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت موسیٰؑ اور حضرت خضرؑ کی رفاقت زیادہ دیر قائم نہ رہ سکی۔

ممکن ہے بعض انبیاؑ اور آئمہ بھی نظامِ تکوین کے اسرار سے آگاہی رکھتے ہوں (بعض روایات کے مطابق جنابِ رسولِؐ خدا اور آئمہ علیہم السلام یہ علم رکھتے تھے) لیکن انبیاؑ کی نبوت ورسالت اور آئمہ کی امامت کیلئے یہ ضروری نہیں ہیں، اس لئے کہ یہ فضیلت تو ضرور ہے لیکن رسالت وامامت کی شرط نہیں ہے۔

پانچویں آیت میں بنی اسرائیل کے ایک نبی کے واقعہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جس کا نام تفسیر اور تاریخ کی کتب میں سموئیل بیان ہوا ہے۔ جب بنی اسرائیل جالوت نامی حکمران کے ظلم وجور سے تنگ آ گئے تو وہ حضرت سموئیل کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان سے درخواست کی کہ جالوت کے خلاف جنگ کیلئے کسی کو ان کا قائد مقرر کریں۔ حضرت سموئیل نے بھی طالوت نامی ایک جوان کو ان کا قائد وپیشوا مقرر کر دیا۔

جب طالوت نے جالوت کا مقابلہ کرنے کیلئے بنی اسرائیل کا ایک بڑا لشکر تیار کر لیا تو اللہ کی عطا کردہ بصیرت وفراست کے ذریعے طالوت نے یہ دیکھ لیا کہ ان کی فوج کے زیادہ تر سپاہی کم ہمت اور بزدل ہیں اور لشکر میں ان کے ہونے کا کوئی فائدہ نہ ہوگا بلکہ وہ دوسروں کے حوصلوں کو بھی پست کرنے کا باعث بنیں گے۔ لہٰذا طالوت نے ان کو آزمانے کا ارادہ کیا جس کے بعد تھوڑے سے افراد ان کے ساتھ رہ گئے۔

باقی ماندہ تھوڑے سے افراد اپنی تعداد میں کمی کی وجہ سے پریشان ہو گئے اور کہنے لگے کہ ہم طالوت کی بڑی فوج کا مقابلہ کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ لیکن قرآن مجید میں ہے:

> ''جو لوگ اس بات کا علم رکھتے تھے کہ انہیں اللہ سے ملاقات کرنا ہے (اور آخرت پر ایمان رکھتے تھے) انہوں نے کہا کہ اکثر اوقات اللہ کے حکم سے ایک چھوٹی جماعت بڑے لشکر پر غالب آئی ہے اور اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے''

''قَالَ الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوا اللّٰهِ ۙ كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيْلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيْرَةًۢ بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ۔ وَلَمَّا بَرَزُوْا لِجَالُوْتَ وَجُنُوْدِهٖ قَالُوْا رَبَّنَاۤ اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَّثَبِّتْ

اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَّثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ۔ (بقرہ:249اور250)

''پھر جب جالوت کے لشکر کے سامنے آئے تو انہوں نے دُعا کی کہ اے ہمارے رب! ہمیں صبر عطا فرما، ہمیں ثابت قدمی عطا فرما اور ہمیں کافروں پر فتح عطا فرما''۔

اس طرح انہوں نے یہ بات واضح کر دی کہ جذبے اور صبر واستقامت سے خالی بڑا لشکر میدانِ جنگ میں کامیاب نہیں ہوتا جبکہ چھوٹا لیکن پختہ عزم وارادے اور صبر وثابت قدمی کی صفات آراستہ لشکر بڑی فوج پر غالب آ سکتا ہے۔ آخر کار طالوت کی کمان میں اس چھوٹے سے لشکر نے جالوت کی بہت بڑی فوج کو شکست سے دوچار کر دیا۔ جالوت حضرت داؤد علیہ السلام کے ہاتھ قتل ہو گیا، جو اس وقت طالوت کے لشکر کے ایک طاقتور نوجوان سپاہی تھے۔ اس طرح بنی اسرائیل نے اپنی سرزمین اور اپنی قوم کو دشمن کی غلامی سے آزاد کروالیا اور تاریخ میں صبر واستقامت کی اہمیت کا ایک اہم باب رقم کر دیا۔

ان آیات سے یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ اس صبر واستقامت کی بنیاد اللہ پر توکل اور آخرت پر پختہ ایمان تھا۔ بعض روایات کے مطابق طالوت کے لشکر کی تعداد تین سو تیرہ تھی (جنگ بدر میں جنابِ رسولِ خدا کے اصحاب کی تعداد کے برابر)۔ حضرت داؤد نے پتھر سے جالوت کی پیشانی کا نشانہ لیا اور پتھر نے جالوت کی پیشانی کو توڑ دیا جس سے وہ ہلاک ہو گیا۔

اس کی ہلاکت سے اس کی فوج کے حوصلے ٹوٹ گئے اور وہ وحشت زدہ ہو کر بھاگ کھڑی ہوئی۔ بعض روایات کے مطابق جالوت کی فوج ایک لاکھ تجربہ کار سپاہیوں پر مشتمل تھی۔

چھٹی آیت میں جنابِ رسولِ خدا کو خطاب کر کے انہیں اولوالعزم رسولوں کی زندگی سے صبر واستقامت کا درس لینے کا حکم دیا گیا ہے۔

''فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ اُولُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ وَلَا تَسْتَعْجِلْ لَّهُمْ۔''

''جس طرح اولوالعزم رسولوں نے صبر کیا، آپ بھی صبر کریں اور ان (مخالفوں) پر عذاب کیلئے جلد بازی نہ کریں''۔ (احقاف:35)

اگرچہ بنیادی طور پر اس آیت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مخالفانِ اسلام پر عذاب کی بددعا کرنے سے منع کیا گیا ہے تاکہ ان پر حجت تمام ہو جائے اور اگر ان میں سے کچھ لوگوں میں راہِ حق پر آنے کا رجحان ہو تو وہ اس راہ پر گامزن ہو جائیں اور اہلِ سعادت کے ساتھ ملحق ہو جائیں۔ لیکن یہ ایک کلی ضابطہ بھی ہے اور اس بات کی روشن دلیل ہے کہ صبر ایک ایسی فضیلت ہے جو سب اولوالعزم رسولوں کے لائحہ عمل کا جزو ہے۔

جی ہاں! تمام بڑے اور صاحبِ شریعت رسولوں کا جاہل، ضدی اور سخت دُشمنوں سے واسطہ رہا ہے لیکن انہوں نے زیادہ سے زیادہ صبر واستقامت سے کام لیا تاکہ اپنی اُمت کی ہدایت کے کام کو بہترین انداز میں انجام دے سکیں۔

حضرت نوحؑ نے 950 سال اپنی قوم کو اللہ کی طرف دعوت دی، شب و روز محنت اور زحمت کی، خلوت اور جلوت میں انہیں نصیحت کی مگر ان میں سے ایک قلیل تعداد ہی انؑ پر ایمان لائی۔

حضرت ابراہیمؑ کو آگ میں پھینکا گیا۔ حضرت موسیٰؑ اور انؑ پر ایمان لانے والوں کو بدترین مصائب کا نشانہ بنایا گیا۔ حضرت عیسیٰؑ کو بے حد ستایا گیا، یہاں تک کہ ان کو سولی پر لٹکا دینے کی سازش تیار کی گئی لیکن اللہ تعالیٰ نے انہیں بچا لیا۔

مختصر یہ کہ دُنیا میں حق و باطل کی جنگ ہمیشہ جاری رہی ہے اور اس جنگ میں کامیابی کا زینہ صرف صبر و استقامت ہے۔

یہاں پر یہ سوال بھی سامنے آتا ہے کہ اولوالعزم رسولوں سے کونسے رسول مراد ہیں؟ اس سوال کے مختلف جوابات دیئے گئے ہیں لیکن معصومین علیہم السلام کی روایات کے مطابق ان کی تعداد جنابِ رسولِؐ خدا سمیت پانچ ہے اور ان سے مراد صاحبِ شریعت رسول ہیں۔

ساتویں آیت میں اللہ تعالیٰ جنابِ رسولِؐ خدا کو عرب کے متعصب مشرکین اور کفار کی طرف سے تمسخر اور تکذیب اور اذیت پہنچائے جانے پر صبر کرنے کا حکم دیتے ہوئے فرماتا ہے:

"فَاصْبِرْ صَبْرًا جَمِيلًا"۔ (معارج:5)

اس سے مراد وہ صبر ہے جس میں لوگوں کے سامنے شکایت نہ کی جائے۔

''پس صبر کرو، ایسا صبر جو خوبصورت ہو''۔ (یعنی ہر قسم کی ناشکری سے پاک ہو)۔

صبرِ جمیل کی تفسیر میں ہم اس سلسلہ کی آیت 2 میں مفسرین کے مختلف اقوال بیان کر چکے ہیں۔ یہاں ایک حدیث نقل کر کے ہم اس بحث کو مکمل کر دیتے ہیں:

حضرت امام جعفر صادقؑ سے پوچھا گیا کہ صبرِ جمیل کیا ہے؟ آپؑ نے فرمایا:

"صَبْرٌ لَيْسَ فِيهِ شِكْوىٰ إِلَى النَّاسِ"۔ (اصولِ کافی، 93:2)

آٹھویں آیت میں اللہ تعالیٰ نے صبر اور مصابرہ کا حکم دیا ہے (جس کی تفسیر آگے آ رہی ہے) اور اسے فلاح اور نجات کی کنجی قرار دیتے ہوئے فرماتا ہے:

"يَاأَيُّهَا الَّذِينَ اٰمَنُوا اصْبِرُوْا وَصَابِرُوْا وَرَابِطُوْا ۟ وَاتَّقُوا اللهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ"۔ (آلِ عمران:200)

''اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو! صبر و استقامت سے کام لو، نیز دُشمن کے مقابلہ میں (بھی) صبر و استقامت دکھاؤ اور اپنی سرحدوں کی حفاظت کرو اور اللہ سے ڈرتے رہو، تا کہ تم فلاح پا جاؤ''۔

اس آیت میں چار چیزوں کا حکم دیا گیا ہے اور انہیں کامیابی اور فلاح کی کنجی قرار دیا گیا ہے۔

1۔ حوادث ومشکلات ومصائب اوررُکاوٹوں کے سامنے صبر واستقامت۔

2۔ مصابرہ، جوعربی گرائمر کی رو سے باب مفاعلہ سے ہے اوراس کے معنی یہ ہیں کہ دوسروں کے صبر واستقامت کے سامنے صبر واستقامت کرنا۔ اس سے مراد دشمن کے سامنے صبر واستقامت کرنا ہے۔ بایں معنی کہ جس قدر وہ صبر واستقامت کا مظاہرہ کریں، اہلِ ایمان پر لازم ہے کہ اس سے زیادہ صبر واستقامت سے کام لیں تاکہ کامیاب ہوجائیں۔

3۔ ''رَابِطُوْا'' جومرابطہ یا رباط سے مشتق ہے جس کے معنی کسی چیز کوکسی جگہ باندھنے کے ہیں۔ عام طور پر عربی زبان میں یہ لفظ سرحدوں کی حفاظت کے معنی میں بولا جاتا ہے، اس لئے کہ اسلامی لشکر کے سپاہی اپنے گھوڑوں اور دیگر جنگی ساز وسامان کو وہاں رکھتے تھے۔

4۔ آخری حکم تقویٰ کا ہے جوایک چھتری کی طرح پہلی تین چیزوں پر محیط ہے۔ اگر صبر، مصابرہ اور مرابطہ، ریاکاری، ذاتی اور گروہی مفادات سے بالاتر تقویٰ کے ساتھ ملا ہوا ہوتو دنیا اور آخرت میں نجات اور فلاح کا سبب ہوتا ہے۔

بعض مفسرین نے کہا ہے کہ مصابرہ کے معنی عادات اور ہوائے نفس کے مقابلے میں صبر واستقامت کرنا ہے جبکہ مرابطہ سے مراد نفس کو اللہ کی اطاعت کے ساتھ اور دل کو اللہ تعالیٰ کے ساتھ جوڑنا ہے۔

کتاب ''رُوح البیان''، ج2، ص 158 پر ایک حکایت ہے کہ ایک عارف پیدل حج کیلئے جارہا تھا۔ راستے میں اُونٹ پر سوار ایک بدو نے اسے کہا:

''اے شیخ! کہاں جارہے ہو؟''

اس نے کہا: ''بیت اللہ کو جارہا ہوں''۔

اس نے پوچھا: ''پیدل کیوں جارہے ہو؟''

عارف نے جواب دیا: ''میرے پاس بہت سی سواریاں ہیں جو تمہیں نظر نہیں آرہی ہیں''۔

اس عرب نے سوال کیا: ''وہ کونسی سواریاں ہیں جو نظر نہیں آتی ہیں؟

عارف نے جواب دیا: ''جب کوئی بلا اور مصیبت نازل ہوتی ہے تو میں صبر کی سواری پر سوار ہوجاتا ہوں۔ جب کوئی نعمت نازل ہوتی ہے تو شکر کو اپنی سواری بنالیتا ہوں۔ قضاوقدر کے معاملہ میں رضا کی سواری پر سوار ہوجاتا ہوں اور جب میرا سرکش نفس مجھے کسی بات کی طرف دعوت دیتا ہے تو میں اس بات پر توجہ کرتا ہوں کہ میری جتنی عمر رہ گئی ہے، وہ اس عمر سے کم ہے جو گزر چکی ہے''۔

یہ سن کر عرب نے کہا: ''درحقیقت سوار تو ہو، پیدل تو تم میں ہی ہوں، جاؤ اللہ حافظ''۔

نویں آیت میں اللہ تعالیٰ تمام اہلِ ایمان کو مخاطب کرتے ہوئے حکم دے رہا ہے کہ مشکلات میں صبر اور نماز کی طاقت سے مدد حاصل کرو۔

"یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِیْنُوْا بِالصَّبْرِ وَ الصَّلٰوةِؕ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِیْنَ"

''اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو! صبر اور نماز کے ذریعے مدد طلب کرو، بے شک اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے''۔(بقرہ:153)

اس آیت کا مفہوم بہت وسیع ہے اور ہر قسم کے صبر واستقامت کو اپنے دامن میں لے لیتا ہے، خواہ وہ صبر اطاعت کیلئے ہو یا معصیت وگناہ کے خلاف یا جہاد وغیرہ جیسے کسی کام کی انجام دہی کیلئے۔ بنابرایں ضروری ہے کہ ہر کام کو انجام دینے کیلئے صبر کی کسی ایسی شاخ سے مدد لی جانی چاہئے جو اس کے ساتھ مطابقت رکھتی ہو۔

بعض علمأ نے اس آیت میں صبر سے روزہ مراد لیا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ روزہ صبر کا ایک نمایاں ترین مصداق تو ضرور ہے لیکن صبر کا مفہوم روزے کے مساوی نہیں ہے۔

یہاں یہ سوال بھی رونما ہوسکتا ہے کہ صبر کے وسیع مضمون اور نماز کے درمیان کیا رابطہ پایا جاتا ہے؟

بعض مفسرین نے اس سوال کے جواب میں کہا ہے کہ بعض اوقات انسان کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوجاتا ہے اور اس کی صبر کرنے کی ہمت اور طاقت جواب دے جاتی ہے۔ ایسی صورت میں نماز اسے قوتِ قلب فراہم کرتی ہے، اس کے اندر اللہ پر توکل پیدا ہوتا ہے اور نماز کی بدولت اس کے صبر کی قوت میں اضافہ ہوجاتا ہے۔

بالفاظِ دیگر جب انسان نماز کے ذریعے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں حاضری دیتا ہے تو وہ اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کی لامحدود اور لازوال طاقت کے ساتھ جوڑ لیتا ہے۔ اس طرح مشکلات کے مقابلے میں اس کی قوت اور ہمت اس قدر زیادہ ہوجاتی ہے کہ انسان ایک ناقابلِ شکست طاقت میں تبدیل ہوجاتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ جنابِ رسولِ خدا اور حضرت علی علیہ السلام کے بارے میں روایات میں آیا ہے:

"اِذَا اَهَالَهُ اَمْرٌ فَزِعَ اِلَى الصَّلٰوةِ ثُمَّ تَلٰى هٰذِهِ الْآيَةَ وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلَاةِ"۔ (اصولِ کافی، 1:154۔ رُوح البیان، 1:257)

''جب آپ کو کوئی مشکل پیش آتی تھی تو آپ نماز کیلئے کھڑے ہوجاتے اور (نماز کے بعد اپنی مشکل کے حل کیلئے عملی کوشش میں مصروف ہوجاتے) پھر اس آیت کی تلاوت کرتے: ''وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلَاةِ''[1]

بہرحال یہ آیت واضح ترین آیات میں سے ایک ہے جو زندگی میں کامیابی کے عامل اور سبب کی حیثیت سے صبر کی اہمیت کو آشکار کرتی ہے۔

---

[1] مؤلف محترم نے اس روایت کے ترجمہ میں بریکٹ کے اندر کے مطالب کا اضافہ کرکے جو مفہوم بیان کیا ہے، بظاہر وہ درست معلوم نہیں ہوتا۔ روایت کا واضح اور سیدھا مفہوم یہ ہے کہ ''آنحضرتؐ نماز پڑھتے اور پھر اس آیت کی تلاوت کرتے''، اس کا مطلب یہ ہے کہ نماز پڑھنے کے بعد اس آیت کو پڑھتے تھے، جیسا کہ نماز کے بعد تعقیبات پڑھی جاتی ہیں (مترجم)۔

دسویں آیت میں جنابِ رسولؐ خدا کوحکم دیا جارہا ہے کہ (اللہ کی طرف سے) اللہ کے سب بندوں تک یہ پیغام پہنچادیں:

"قُلْ يٰعِبَادِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوْا رَبَّكُمْ ؕ لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةٌ ؕ وَاَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةٌ ؕ اِنَّمَا يُوَفَّى الصّٰبِرُوْنَ اَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ"۔ (زمر:10)

کہہ دو اے میرے بندو، جو ایمان لائے ہو! تقویٰ اختیار کرو۔ جن لوگوں نے اس دنیا میں نیک کی، ان کیلئے نیک جزا ہے اللہ کی زمین وسیع ہے اور صبر کرنے والوں کو ان کا اجر بے حساب دیا جائے گا۔

اس آیت میں یہ بات واضح کردی گئی ہے کہ ظالموں کے مقابلے میں انسان پر لازم ہے کہ صبر واستقامت کی راہ اختیار کرے اور اگر ایسا نہ کرے گا تو اس کے پاس اس کے سوا کوئی راستہ نہیں ہوگا کہ ان کے سامنے اپنی شکست تسلیم کرلے۔ صرف یہی نہیں بلکہ اس آیت میں صبر کرنے والوں سے بے حساب اجر کا وعدہ بھی کیا گیا ہے۔ ''بے حساب'' کے الفاظ سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ اللہ انہیں اتنا اجر عطا فرمائے گا کہ خود اس کے سوا کوئی اس کا حساب نہ کرسکے گا۔

جنابِ رسولِ خدا سے مروی ایک حدیث میں ہے کہ جب اعمال نامے کھولے جائیں گے اور اعمال کو تولنے کے ترازو نصب کئے جائیں گے تو وہ لوگ جو مصائب میں مبتلا ہوئے اور ان پر صبر کرتے رہے، ان کیلئے کوئی ترازو نصب کیا جائے گا، نہ کوئی اعمال نامہ کھولا جائے گا (بلکہ انہیں بے حساب اجر دیا جائے گا)۔

پھر آپؐ نے اس آیت کی تلاوت فرمائی: (مجمع البیان، قرطبی، رُوح البیان)۔

"اِنَّمَا يُوَفَّى الصّٰبِرُوْنَ اَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ"۔ (زمر:10)

''بِغَيْرِ حِسَابٍ'' کے الفاظ متعدد آیات میں استعمال ہوئے ہیں جن میں سے زیادہ تر دُنیوی رزق کے بارے میں ہیں۔ صرف اس آیت اور سورۂ مومن کی آیت 40 میں یہ الفاظ اُخروی اجر کے بارے میں استعمال ہوئے ہیں۔

یہ یقینی بات ہے کہ بے حساب روزی یا اجر کا انسان کے اعمال کی کمیت اور کیفیت یعنی مقدار اور معیار سے کوئی تعلق نہیں ہے بلکہ صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کے لطف وکرم کا نتیجہ ہے جو بہت عظیم الشان ہے۔

گیارہویں آیت میں صبر کی اہمیت کو خوبصورت پیرائے میں بیان کیا گیا ہے۔ وہ یہ کہ جب فرشتے اہلِ جنت کی ملاقات کو جائیں گے تو کہیں گے:

"سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ فَنِعْمَ عُقْبَى الدَّارِ"۔ (رعد:24)

''تم پر سلام ہو، تمہارے صبر واستقامت کے نتیجہ میں اس دُنیا میں تمہیں کیا حسین انجام نصیب ہوا ہے''۔

یہ بات نہایت قابلِ توجہ ہے کہ اہلِ جنت کے تمام اعمال، عبادات اور اطاعات میں سے صرف صبر کو جنت میں داخل ہونے کا سبب قرار دیا گیا ہے۔ اگر ہم غور کریں تو یہ بات واضح ہوجائے گی کہ انسان کی سعادت اور اس کے جنت میں داخل ہونے میں صبر کا

بہت اہم کردار ہے، اس لئے کہ صبر کے بغیر نہ تو گناہوں سے پرہیز ممکن ہے اور نہ ہی عبادات کو انجام دینا ممکن ہے۔ اپنے نفس کے خلاف جہاد ہو یا بیرونی دشمن کے خلاف جنگ، صبر کے بغیر یہ بھی ممکن نہیں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ فرشتے اہلِ جنت کو مبارکباد دیتے وقت صبر کا ذکر کرتے ہیں۔

اسی سورت کی آیت 22 بھی اس بات کی تائید کرتی ہے کہ تمام عبادات صبر کے زیر سایہ ہی انجام پاتی ہیں:

"وَالَّذِيْنَ صَبَرُوا ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِمْ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً وَّيَدْرَءُوْنَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ

''غور وفکر سے کام لینے والے صاحبانِ عقل وہ ہیں جو اپنے رب کی خوشنودی کیلئے صبر کی راہ پر چلتے ہیں، نماز قائم کرتے ہیں، جو کچھ ہم نے انہیں دیا ہے، اسی میں سے اعلانیہ اور پوشیدہ خرچ کرتے ہیں اور نیکی کے ذریعے برائی کو دُور کرتے ہیں''۔

اس آیت کی تفسیر میں حضرت امام علی ابن الحسین زین العابدین علیہم السلام سے ایک بہت خوبصورت حدیث نقل کی گئی ہے جس میں آپؑ فرماتے ہیں کہ جب قیامت برپا ہوگی تو آواز دی جائے گی کہ صبر کرنے والے کھڑے ہوجائیں۔ ایک گروہ کھڑا ہوگا۔ ان سے کہا جائے گا کہ جنت میں داخل ہوجاؤ۔

اس وقت فرشتے ان کے استقبال کو آئیں گے اور کہیں گے: کہاں جارہے ہو؟''

وہ کہیں گے: ''جنت''۔

فرشتے کہیں گے: ''حساب سے پہلے؟''

وہ جواب دیں گے: ''جی ہاں''۔

فرشتے پوچھیں گے: ''تم لوگ کون ہو؟''

وہ جواب دیں گے: ''ہم اہلِ صبر ہیں''۔

فرشتے پوچھیں گے: ''تمہارا صبر کیا تھا؟''

وہ کہیں گے: ''ہم اللہ کی اطاعت، گناہوں سے پرہیز اور دُنیا میں غموں اور دُکھوں پر صبر کرتے تھے''۔

فرشتے کہیں گے: ''جنت میں داخل ہوجاؤ، عمل کرنے والوں کیلئے کیا عمدہ اجر ہے!''

بعض روایات میں آیا ہے کہ اسی موقع پر فرشتے کہیں گے: ''سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ'' (تفسیر قرطبی، 4532:5)

بارہویں آیت میں اللہ تعالیٰ کے رحمٰن کے بندوں کی بارہ صفات کو بیان کیا گیا ہے۔

"اُولٰٓئِكَ يُجْزَوْنَ الْغُرْفَةَ بِمَا صَبَرُوْا وَيُلَقَّوْنَ فِيْهَا تَحِيَّةً وَّسَلٰمًا"۔ (فرقان: 75)

''انہیں ان کے صبر کے بدلے میں جنت میں اعلیٰ درجات ملیں گے''۔

''غُرْفَةَ''، غُرْف سے مشتق ہے۔اس کے معنی کسی چیز کو اُٹھا لینے کے ہیں۔اسی وجہ سے اس پانی کو بھی غرفہ کہا جاتا ہے جو انسان پینے کیلئے اپنے ہاتھوں کے چُلّو میں اُٹھاتا ہے۔اس آیت میں غرفہ سے مراد جنت کے وہ بلند درجات ہیں جو صابروں کو ملیں گے۔

صد ہزاراں کیمیا حق آفرید
کیمیائی ہمچو صبر، آدم ندید

''حق تعالیٰ نے لاکھوں قسم کی کیمیا خلق کی ہیں لیکن انسان نے صبر جیسی کیمیا نہیں دیکھی''۔

اس آیت سے یہ بات معلوم ہوجاتی ہے کہ صبر 'عبادالرحمٰن' کی بارہ صفات میں ایک مشترک مقام رکھتا ہے۔

تیرھویں آیت میں، جو صبر کے بارے میں بہت مشہور آیت ہے، اللہ کی طرف سے آنے والی آزمائشوں پر صبر کرنے والوں کو بشارت دیتے ہوئے کہا جارہا ہے:

''وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ ؕ وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ ۔ الَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ ۙ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ۔ اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ ۟ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ''۔

''یقیناً ہم کچھ خوف، بھوک، جان و مال کے نقصان اور پھلوں میں کمی کے ذریعے تمہاری آزمائش کریں گے اور آپ صبر کرنے والوں کو بشارت دے دیں کہ جب بھی ان پر کوئی مصیبت آتی ہے، وہ کہتے ہیں کہ ہم اللہ کیلئے ہیں اور ہم اُسی کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں۔یہی وہ لوگ ہیں جن پر ان کے رب کی طرف سے رحمت ہے اور یہی ہدایت یافتہ ہیں''۔(بقرہ:155 تا 157)

اگرچہ ان آیات میں صرف صبر کے ایک شعبے یعنی مصیبتوں پر صبر کا ذکر کیا گیا ہے لیکن اس کی اہمیت اتنی ہے کہ اس کی وجہ سے ان صابرین پر اللہ کی طرف سے صلوات و رحمت کی بارش برستی ہے اور اسی صبر کی بدولت وہ ہدایت کی راہ پر گامزن رہتے ہیں۔

اس نکتہ کی طرف توجہ ضروری ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی ناقابلِ تغیر و تبدل سنت ہے کہ اس دُنیا میں انسان پر مختلف قسم کی آزمائشیں آتی رہتی ہیں اور صبر کے بغیر ان آزمائشوں پر پورا اترنا ممکن نہیں ہے۔یہاں سے ہم صبر کی اہمیت کو بخوبی جان سکتے ہیں۔

انسان کیلئے اس سے بڑھ کر کیا اعزاز ہوسکتا ہے کہ صرف صبر کی بدولت یہ تین الٰہی عنایات (صلوات، رحمت اور ہدایت) اسے نصیب ہوجائیں۔

اس آیت میں صَلَوٰتٌ کا لفظ استعمال ہوا ہے جو جمع کا صیغہ ہے۔اس کی دو تشریحات کی گئی ہیں اور دونوں صحیح ہوسکتی

ہیں۔ایک یہ کہ اس سے مراد اللہ تعالیٰ کی طرف سے مختلف قسم کے اکرام وانعام ہوں، دوسرے یہ کہ اس میں صلوٰۃ کے تکرار کی طرف اشارہ بھی مراد ہوسکتا ہے(یعنی بار بار صلوات ہے)۔

اسی طرح رحمت کیلئے اسم نکرہ کا استعمال بھی اس کی عظمت واہمیت کو واضح کرنے کی خاطر استعمال کیا گیا ہے۔

چودھویں اور آخری آیت، جو سورۃ العصر میں آئی ہے، قرآن مجید اس حقیقت کو بیان کرتا ہے کہ سب انسان نقصان اور خسارے میں ہیں، صرف وہ لوگ اس خسارے سے محفوظ ہیں جو اس سورۃ میں بیان شدہ چار نکاتی پروگرام پر عمل پیرا ہیں جن میں سے ایک صبر واستقامت ہے۔

"وَالْعَصْرِ۔اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ۔وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ ۙ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ"۔(والعصر 1تا3)

''قسم ہے عصر کی، ہر انسان خسارے میں ہے، سوائے اُن لوگوں کے جو ایمان لائے اور عملِ صالح کرتے رہے اور ایک دوسرے کو حق کی تلقین کرتے رہے اور وصیت کرتے رہے''۔

''تَوَاصَوْا'' کا مصدر ''تواصی'' ہے جس کے معنی ایک دوسرے کو تلقین اور وصیت کرنے کے ہیں۔اس آیت میں اس لفظ کا استدلال اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ مومنین ایمان اور عملِ صالح کے بعد حق کو قائم کرنے کی طرف توجہ کریں، خود حق کو پہچانیں اور دوسروں کو اس کی وصیت وتلقین کریں۔

چونکہ انسانی معاشرے میں حق کو قائم کرنا ایک مشکل کام ہے، جس میں لامحالہ رکاوٹیں پیش آتی ہیں، لہٰذا یہ کام صبر کے بغیر ممکن نہیں ہے۔

اسی طرح صبر، جو اس چار نکاتی پروگرام کا چوتھا نکتہ ہے، درحقیقت پہلے تین نکات بھی اسی کی بدولت نافذ ہوسکتے ہیں۔ بنابرایں صبر انسانوں کی سعادت کی اصلی بنیاد ہے جسکے بغیر ایمان کا درخت پھل نہیں دیتا۔اس کے بغیر اعمالِ صالح انجام پانا ممکن نہیں اور اس کے حق کا قیام اور نفاذ بھی ممکن نہیں ہے۔اس میں کچھ شک نہیں کہ حق کا قیام اور دوسروں کے حقوق کی ادائیگی مشکل ترین کاموں میں سے ایک ہے، اس لئے کہ ممکن ہے کہ یہ حق اس کے عزیزوں اور اقربا میں سے کسی کے خلاف ہو۔اس صورت میں صبر کی مدد کے بغیر حق کی ادائیگی امکان پذیر نہیں ہوسکتی۔

نتیجہ:۔

مندرجہ بالا آیات میں جو کچھ بیان ہوا، ان سب کا نتیجہ اور ماحصل یہ ہے کہ صبر وشکیبائی اور استقامت کی اہمیت اس سے کہیں زیادہ ہے جتنا ہم تصور کرتے ہیں۔بعض مفسرین کا کہنا ہے کہ قرآن مجید میں صبر کا لفظ ستر بار یا تقریباً سو بار مذکور ہوا ہے جبکہ انسانی فضائل میں سے کسی فضیلت اور اس قدر تاکید نہیں کی گئی ہے۔اس سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ قرآن مجید اس انسانی فضیلت کو غیر معمولی اہمیت دیتا ہے اور اسے تمام فضائل کا نچوڑ اور خلاصہ قرار دیتا ہے اور اسے تمام سعادتوں کے حصول اور ہر قسم کی خوش بختی

تک پہنچنے کا سبب اور ذریعہ سمجھتا ہے۔

صبر، احادیث کی روشنی میں

بعض علمائے اخلاق کا کہنا ہے کہ صبر کی فضیلت کے بارے میں جو روایات معصومین علیہم السلام سے ہم تک پہنچی ہیں، وہ احاطہ شمار سے باہر ہیں۔

بعض کتب میں، جو صبر کے بارے میں لکھی گئی ہیں، جنابِ رسولؐ خدا اور آئمہ معصومین علیہم السلام کی نوسو (900) احادیث ہوئی ہیں۔ ہم نمونے کے طور پر چند احادیث کا ذکر کرتے ہیں:

1۔ جنابِ رسولؐ خدا نے فرمایا: (میزان الحکمہ، 10025:2)

"اَلصَّبْرُ خَيْرُ مَرْكَبٍ مَا رَزَقَ اللهُ عَبْدًا خَيْرًا لَهُ وَلَا أَوْسَعُ مِنَ الصَّبْرِ"۔

''صبر بہترین سواری ہے، اللہ نے کسی بندے کو صبر سے بہتر اور کھلا رزق نہیں دیا''۔

اس حدیث میں صبر کو بہترین سواری قرار دینے سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ صبر ہر قسم کی سعادت اور خوش بختی تک پہنچنے کا ذریعہ ہے۔ اس کے بغیر انسان دنیا اور آخرت میں کسی مقام تک نہیں پہنچ سکتا۔

2۔ حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا: (نہج البلاغہ، کلماتِ قصار: 82)

"عَلَيْكُمْ بِالصَّبْرِ فَإِنَّ الصَّبْرَ مِنَ الْإِيمَانِ كَالرَّأْسِ مِنَ الْجَسَدِ"۔

''تم پر صبر و استقامت فرض ہے، اس لئے کہ صبر کا ایمان سے وہی رشتہ ہے جو سر کا بدن سے ہے''۔

اس حدیث میں یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ صبر انسان کی زندگی کے ہر پہلو میں کلیدی کردار ادا کرتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اس حدیث کے ذیل میں یہ جملہ بھی بیان ہوا ہے:

"لَا إِيمَانَ لِمَنْ لَا صَبْرَ لَهُ"۔

''جس شخص میں صبر نہیں، اُس کے پاس ایمان نہیں ہے''۔

3۔ امیر المومنین علیہ السلام ایک اور حدیث میں فرماتے ہیں:

"لَا يَعْدَمُ الصَّبُورُ الظَّفَرَ وَإِنْ طَالَ بِهِ الزَّمَانُ"۔ (نہج البلاغہ، کلماتِ قصار: 153)

''صبر کرنے والا کبھی کامیابی سے محروم نہیں رہتا، چاہے کامیابی حاصل کرنے میں طویل عرصہ لگ جائے''۔

اس حدیث میں صبر اور کامیابی دونوں مطلق ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس حکم کا تعلق انسان کی زندگی کے

تمام مادی اور معنوی پہلوؤں سے ہے۔

4۔ جنابِ رسولؐ خدا نے فرمایا:

"اَلصَّبْرُ نِصْفُ الْاِیْمَانِ"(المحجة البیضأ، 7:106)

''صبر نصف ایمان ہے''۔

بعض روایات میں شکر کو نصف ایمان اور باقی نصف ایمان صبر کو قرار دیا گیا ہے۔ نعمتوں کے حصول کیلئے صبر واستقامت کے ساتھ عمل کرنا اور نعمتوں کے حصول کے بعد ان کا شکر ادا کرنا، یعنی اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو صحیح راہ میں استعمال کرنا۔

یہ بات بالکل واضح ہے کہ یہ حدیث گزشتہ احادیث کی نفی نہیں کرتی، اس لئے کہ جیسا ہم بیان کر چکے ہیں کہ اگر مومن میں صبر موجود نہ ہو تو ایمان کی راہ میں پیش آنے والے رُکاوٹوں کے مقابلہ میں اس کا ایمان ختم ہو جائے گا اور اگر وہ نعمتوں کا شکر ادا نہیں کرے گا تو نعمتوں سے محروم ہو جائے گا۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

"وَلَئِنْ كَفَرْتُمْ اِنَّ عَذَابِیْ لَشَدِیْد"۔

''اور اگر تم ناشکری کرو گے تو میرا عذاب شدید ہے''۔

5۔ ایک اور حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"اَلصَّبْرُ كَنْزٌ مِنْ كُنُوْزِ الْجَنَّةِ"۔(المحجة البیضأ، 7:107)

''صبر جنت کی چابیوں میں سے ایک چابی ہے''۔

6۔ مندرجہ بالا احادیث کی تائید امیر المومنینؑ کے اس ارشاد سے بھی ہوتی ہے جس میں آپؑ نے فرمایا:

"اَلصَّبْرُ عُوْنٌ عَلٰی كُلِّ اَمْرٍ"۔(غرر الحکم، حدیث:765)

''صبر ہر معاملے میں ترقی کرنے میں مددگار ہے''۔

اسلئے کہ زندگی میں ہر اہم کام کی راہ میں رُکاوٹیں موجود ہوتی ہیں جن کو صرف صبر کی بدولت ہی عبور کیا جا سکتا ہے۔

7۔ گناہ کے مقابلے میں صبر کے بارے میں ایک حدیث میں ہے:

"وَمَنْ صَبَرَ عَنْ مَعْصِیَةِ اللهِ فَهُوَ كَالْمُجَاهِدِ فِیْ سَبِیْلِ اللهِ"۔

''جو شخص اللہ کی نافرمانی کے مقابلے میں صبر کرتا ہے، وہ اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والے مجاہدین کی مانند

ہے''۔(جامع احادیثِ شیعہ،253:14)

جی ہاں! یہ دونوں مجاہد فی سبیل اللہ ہیں۔فرق صرف یہ ہے کہ ایک بیرونی دشمن کے خلاف جہادِ اصغر کرتا ہے اور دوسرا اندرونی دشمن یعنی گناہ کی خواہش کے خلاف جہادِ اکبر کرتا ہے۔

8۔ ایک حدیث میں امیر المومنینؑ فرماتے ہیں:

"اِنْ صَبَرْتَ اَدْرَکْتَ بِصَبْرِكَ مَنَازِلَ الْاَبْرَارِ،وَاِنْ جَزِعْتَ اَوْرَدَكَ جَزَعَكَ عَذَابَ النَّارِ"۔(شرح غرر الحکم،حدیث:3713)

''اگر تم صبر کرو تو اپنے صبر کی بدولت ابرار (نیک لوگوں) کے درجات پالو گے اور اگر بے صبری کرو گے تو تمہاری بے صبری تمہیں جہنم میں لے جائے گی''۔

9۔ زندگی کے تلخ حوادث اور مصائب پر صبر کے بارے میں حضرت امام جعفر صادقؑ فرماتے ہیں:

"مَنِ ابْتَلٰی مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ بِبَلَاءٍ فَصَبَرَ عَلَیْهِ کَانَّ لَهٗ مَثْلُ اَجْرِ اَلْفِ شَهِیْدٍ"۔

''جو مومن کسی مصیبت میں مبتلا ہو جائے اور صبر کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑے تو اس کیلئے ایک ہزار شہیدوں کا اجر ہے''۔(اصولِ کافی،92:2)

علامہ مجلسیؒ بحار الانوار کی جلد 68 میں اس حدیث کا ذکر کرنے کے بعد اس سوال کو زیر بحث لاتے ہیں کہ یہ اجر کس طرح ممکن ہے، حالانکہ شہید خود بھی صابرین میں سے ہوتا ہے اور صبر ہی کی بدولت دشمن کے مقابلے میں صبر و استقامت دکھاتا ہے، یہاں تک جامِ شہادت نوش کر جاتا ہے؟

اس سوال کا جواب اس طرح دیا جا سکتا ہے کہ شہید دشمن کے حملوں کے مقابلے میں صبر کرتا ہے جبکہ صابرین زندگی کے تلخ حوادث مثلاً بیماریوں، ناکامیوں اور عزیز و اقارب کی موت وغیرہ پر صبر کرتے ہیں۔شہید کی نسبت ان کے اجر کی برتری کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ شہید ایک بار شہید ہوتا ہے جبکہ زندگی کے دکھ اور مصائب بار بار حملہ آور ہوتے ہیں۔

10۔ صبر کرنے والوں کے معنوی و رُوحانی ثواب کے بارے میں ایک حدیث میں جنابِ رسولِؐ خدا نے فرمایا:

"مَنِ ابْتُلِیَ فَصَبَرَ وَاُعْطِیَ فَشَکَرَ وَظُلِمَ فَغَفَرَ اُولٰٓئِكَ لَهُمُ الْاَمْنُ وَهُمْ مُّهْتَدُوْنَ"۔(مجمع الانوار،526:2)

''جن لوگوں پر آزمائش آئے اور وہ صبر کریں اور انہیں نعمت عطا ہو اور وہ شکر کریں اور ان پر ظلم ہو اور وہ معاف

کریں تو ان کیلئے امن ہے اور یہی لوگ ہدایت یافتہ ہیں۔''

11۔ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

"اَلصَّبْرُ یُظْهِرُ مَافِیْ بَوَاطِنِ الْعِبَادِ مِنَ النُّوْرِ وَالصَّفَاءِ وَالْجَزَعُ یُظْهِرَ مَافِیْ بَوَاطِنِهِمْ مِنَ الظُّلْمَةِ وَالْوَحْشَةِ"۔(بحار الانوار،90:68)

''صبر بندوں کے اندر کے نور اور پاکیزگی کو ظاہر کرتا ہے جبکہ بے صبری ان کے اندر اندھیرے اور وحشت کو آشکار کرتی ہے''۔

12۔ صبر کے بارے میں احادیث کو امیر المومنینؑ کی اس حدیث پر ختم کرتے ہیں:

"اَلصَّبْرُ مَطِیَّةٌ لَاتَکْبُوْا وَالْقَنَاعَةُ سَیْفٌ لَایَنْبُوْا"۔ (بحار الانوار، 96:68)

''صبر ایک ایسی سواری ہے جو کبھی نہیں گرتی اور قناعت ایسی تلوار ہے جو کبھی کند نہیں ہوتی''۔

صبر کے اثرات اور نتائج

گزشتہ مباحث میں اس مطلب کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ دنیوی زندگی کی طبیعت اور مزاج ہی یہ ہے کہ یہ مشکلات ،رکاوٹوں اور آفات کے ساتھ جڑی ہوئی ہے۔ اوامر ونواہی کی پابندی میں انسان ایسی رکاوٹوں سے روبرو ہوتا ہے کہ اگر وہ انہیں عبور نہ کرے تو اپنی منزل تک نہیں پہنچ سکتا۔ اس کے علاوہ آفات ومشکلات نعمتوں کی تاک میں رہتی ہیں تاکہ انہیں برباد کردیں۔ یہ آفات ومشکلات اموال وانفس کے نقصان اور عزیزوں، دوستوں اور دیگر نعمتوں کی جدائی اور زوال کی شکل میں بھی ہوسکتی ہیں۔

صبر کے بغیر انسان مثبت سمت میں حرکت کرسکتا ہے نہ مشکلات وموانع کے مقابلے میں قدم رہ سکتا ہے۔ اسی لئے صبر واستقامت کو کامیابی کی اصل کنجی قرار دیا گیا ہے۔ چونکہ دین اوامر ونواہی کا مجموعہ ہے اور اطاعت کی انجام دہی اور معاصی سے اجتناب صبر واستقامت کے بغیر ممکن نہیں ہے، اس لئے صبر اور ایمان کا وہی رشتہ بیان کیا گیا ہے جو سر اور بدن کا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ بعض احادیث میں، جیسا کہ حضرت علیؑ سے مروی ایک حدیث میں صبر کو ہی کامیابی قرار دیا گیا ہے:

"اَلصَّبْرُ الظَّفَرُ"۔(غرر الحکم، حدیث:213)

''صبر ہی کامیابی ہے''۔

قرآنی آیات میں بھی صبر کو اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والوں کی کامیابی کی بنیادی شرط قرار دیا گیا ہے۔

﴿۰ اِنْ یَّکُنْ مِّنْکُمْ عِشْرُوْنَ صٰبِرُوْنَ یَغْلِبُوْا مِائَتَیْنِ ۚ وَاِنْ یَّکُنْ مِّنْکُمْ مِّائَةٌ یَّغْلِبُوْٓا اَلْفًا

مِّنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا

''اگرتم میں بیس صبر کرنے والے ہوں تو دوسو کافروں پر غالب آجائیں گے اور اگرتم میں سوصبر کرنے والے ہوں تو ایک ہزار کافروں پر غالب آجائیں گے''۔(انفال۔65)

یہ صبر ہی کی قوت ہے جو ایک انسان کو دس دُشمنوں کا مقابلہ کرنے کی طاقت فراہم کرتی ہے۔کمزور ارادے کے مالک،کم حوصلہ اور بے صبر افراد جلد ہی حوادث کے میدان سے بھاگ جاتے ہیں یا مشکلات کے سامنے گھٹنے ٹیک دیتے ہیں۔ صبر واستقامت کے بغیر انسان کو دنیا ملتی ہے نہ آخرت۔یہی وجہ ہے کہ جن اقوام میں صبر واستقامت کا عنصر پایا جاتا ہے،وہی اقوام دُنیا میں ترقی کرتی ہیں۔

بڑے علماًاور موجدوں اور سائنس دانوں میں ایک چیز مشترک ہوتی ہے اور وہ صبر ہے جو ان کی دیگر خصوصیات کے مقابلہ میں زیادہ درخشاں اور نمایاں ہوتی ہے۔بعض اوقات ایک سائنس دان کو سالہا سال تک کتب خانوں اور لیبارٹری میں محنت کرنا پڑتی ہے،پھر کہیں جا کر کسی سائنسی قانون کو دریافت کرنے میں کامیاب ہوتا ہے۔

حضرت علی علیہ السلام سے مروی ایک حدیث میں ہے:

"مَنْ رَكِبَ مَرَاكِبَ الصَّبْرِ اهْتُدِيَ اِلٰى مَيْدَانِ النَّصرِ"۔

''جو شخص صبر کی سواری پر سوار ہوتا ہے،کامیابی کے میدان میں قدم رکھتا ہے''۔(کنزالفوائد:58)

ایک اور حدیث میں آپؑ فرماتے ہیں:

"مِفْتَاحُ الظَّفَرِ لُزُوْمِ الصَّبْرِ"۔(غرر الحکم،حدیث:9809)

''صبر پر کاربند رہنا ہی کامیابی کی کنجی ہے''۔

اگر دوسری طرف دیکھا جائے تو یہ حقیقت بھی واضح طور پر نظر آتی ہے کہ جن لوگوں میں صبر اور استقامت کی کمی ہوتی ہے،وہ جلدی گناہ سے آلودہ ہوجاتے ہیں۔اس کی وجہ یہ ہے کہ گناہ میں انسان کے سرکش نفس کیلئے بڑی کشش ہوتی ہے۔اگر اس کشش کے مقابلہ میں انسان کے اندر صبر واستقامت کی مناسب قوت نہ پائی جاتی ہو تو گناہ کی اس کشش کا مقابلہ انسان کیلئے ممکن نہیں ہوتا۔

ایک حدیث میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

"كَمْ مِنْ صَبْرِ سَاعَةٍ قَدْاَوْرَثَتْ فَرَحًاطَوِيْلاً وَكَمْ مِنْ لَذَّةِ سَاعَةٍ قَد اَوْرَثَتْ حُزْنًا طَوِيْلًا۔"(بحار الانوار،45:68)

''اکثر اوقات گھڑی بھر کا صبر انسان کو ایک طویل راحت سے ہمکنار کر دیتا ہے اور اکثر اوقات گھڑی بھر کی لذت انسان کو ایک طویل غم واندوہ سے دوچار کر دیتی ہے''۔

ممکن ہے انسان کو زندگی کے مختلف مراحل میں مادی اور معنوی نقصانات کا سامنا کرنا پڑے۔ اگر دیکھا جائے تو ایسا نہیں ہوتا کہ سارے دوست، عزیز اور رشتہ دار اکٹھے پیدا ہوں اور اکٹھے مر جائیں۔ بعض کی موت پہلے آجاتی ہے۔ اس طرح مرنے والے اپنے پسماندہ گان کو فرقت اور جدائی کا صدمہ دے جاتے ہیں۔ ایسے میں اگر پسماندگان میں صبر نہ ہو تو بہت جلد زندگی سے دلبرداشتہ ہو کر بیمار ہو جاتے ہیں۔ زندگی سے مایوس ہو جاتے ہیں اور کسی کام میں ان کا دل نہیں لگتا۔

لیکن اگر انسان میں صبر ہو تو ان تمام تلخ حوادث کے باوجود انسان کے دل اور اس کی روح میں زندہ رہنے کی آرزو تازہ رہتی ہے۔ اس سے پہلے ہم ایک حدیث میں یہ پڑھ چکے ہیں کہ حضرت امام جعفر صادقؑ نے صابر کے اجر کو شہید کے اجر کا ہزار گنا قرار دیا ہے۔

مختصر یہ کہ صبر کی اہمیت اور زندگی میں اس کے کردار کے بارے میں جتنا بھی کہا جائے، کم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مذکورہ بالا احادیث میں صبر کے بارے میں جو کچھ بیان ہوا ہے، اسے مبالغہ نہیں سمجھنا چاہئے۔

"اَنَّهُ مَنْ صَبَرَنَا بِصَبْرِهٖ دَرَجَةَ الصَّائِمِ الْقَائِمِ، وَدَرَجَةَ الشَّهِيْدِ الَّذِیْ ضَرَبَ بِسَفِيْنِهٖ قُدَّامَ مُحَمَّدٍ ﷺ"۔ (وسائل الشيعه، 209:11)

''جو شخص صبر کرے، وہ اپنے صبر کی بدولت شب بیداری کرنے والے روزہ اور اس شہید کے درجہ کو پالیتا ہے جس نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے تلوار سے جہاد کیا ہو''۔

صبر کی شاخیں

علمائے اخلاق اور بزرگانِ دین کی اکثر تحریروں اور تقریروں میں صبر کو تین شاخوں میں تقسیم کیا گیا ہے:

1۔ اطاعت پر صبر 2۔ گناہ پر صبر 3۔ مصیبت پر صبر

اطاعت پر صبر سے مراد یہ ہے کہ اللہ کے احکام کی اطاعت کرتے ہوئے جو مشکلات پیش آئیں، صبر و استقامت سے ان کا مقابلہ کیا جائے۔ نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، جہاد، خمس اور مستحب عبادات میں پیش آنے والی مشکلات پر صبر کرنے کا دائرہ بہت وسیع ہے۔

گناہ پر صبر سے مراد یہ ہے کہ انسان خواہشاتِ نفسانی کے ہیجان سے پیدا ہونے والے شہوت کے سرکش شعلوں کے مقابلے میں صبر و استقامت سے کام لے۔ اگر انسان ایسا نہ کرے تو شہوت کے یہ شعلے ایمان، تقویٰ اور باطنی پاکیزگی کے سارے سرمائے کو جلا کر راکھ کر دیں۔

مصیبت پر صبر سے مراد یہ ہے کہ زندگی کے مختلف مراحل میں انسان کو جو مالی اور معنوی نقصانات، عزیزوں اور دوستوں کی موت اور دیگر حوادث و مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے، ان تمام مراحل اور مصیبتوں میں انسان صبر کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑے۔

علمائے اخلاق نے صبر کی اقسام احادیث کی بنیاد پر بنائی ہیں، مثلاً جنابِ رسولِؐ خدا کی ایک حدیث میں نقل ہوا ہے کہ آپؐ نے فرمایا:

"اَلصَّبْرُ ثَلَاثَةٌ، صَبْرٌ عَلَى الْمُصِيْبَةِ وَصَبْرٌ عَلَى الطَّاعَةِ وَصَبْرٌ عَلَى الْمَعْصِيَةِ فَمَنْ صَبَرَ عَلَى الْمُصِيْبَةِ حَتّٰى يَرُدَّهَا بِحُسْنِ عَزَائِهَا، كَتَبَ اللهُ لَهٗ ثَلَاثَ مِأَةَّ دَرَجَةٍ كَمَابَيْنَ السَّمٰاءِ اِلَى الْاَرْضِ وَمَنْ صَبَرَ عَلَى الطَّاعَةِ كَتَبَ اللهُ لَهٗ سِتَّ مِأَةٍ دَرَجَةٍ، مَابَيْنَ الدَّرَجَةِ اِلَى الدَّرَجَةِ كَمَابَيْنَ تُخُوْمُ الْاَرْضِ اِلَى الْعَرْشِ وَمَنْ صَبَرَ عَلَى الْمَعْصِيَةِ كَتَبَ اللهُ لَهٗ تِسْعَ مِأَةٍ دَرَجَةٍ مَابَيْنَ الدَّرَجَةِ كَمَابَيْنَ تُخُوْمِ الْاَرْضِ اِلٰى مُنْتَهَى الْعَرْشِ"۔

''صبر کی تین اقسام ہیں: مصیبت پر صبر، جو شخص کسی مصیبت پر صبر کرے اور صبر جمیل کے ساتھ مصیبت کو برداشت کرے، اللہ اسکے لیے تین سو درجات لکھ دے گا جن میں سے ہر درجے کے درمیان زمین اور آسمان جتنا فاصلہ ہے۔ جو شخص اطاعت پر صبر کرے، اللہ اس کیلئے چھ سو درجات لکھ دے گا جن میں سے ہر درجے کا دوسرے سے اتنا فاصلہ ہے جتنا زمین اور عرش کے درمیان فاصلہ ہے۔ جو شخص گناہ پر صبر کرے گا، اللہ اس کیلئے نو سو درجات لکھ دے گا جن میں سے ہر درجے کا دوسرے درجے سے اتنا فاصلہ ہے جتنا زمین سے عرش کے درمیان فاصلہ ہے''۔(بحارالانوار، 77:68)

اس حدیث سے یہ بات بھی واضح ہوجاتی ہے کہ گناہ کے خلاف صبر کرنا سب سے افضل ہے۔ اطاعت پر صبر کا درجہ دوسرا اور مصیبت پر صبر کا درجہ تیسرا ہے۔

حضرت علیؑ نے ایک حدیث میں ایمان کو چار شعبوں میں تقسیم کرکے فرمایا، جن میں سے پہلا شعبہ صبر ہے، اس کے بعد یقین، عقل اور جہاد کو بالترتیب دُوسرا، تیسرا اور چوتھا شعبہ قرار دینے کے بعد فرمایا:

"وَالصَّبْرُ مِنْهَا عَلٰى اَرْبَعَ شُعَبٍ، عَلَى الشَّوْقِ وَالشَّفَقِ وَالزُّهْدِ وَالتَّرَقُّبِ"

''اور صبر کے بھی چار شعبے ہیں: شوق، خوف، زہد اور انتظار''۔(نہج البلاغہ، کلماتِ قصار، حدیث:31)

پھر اس کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ جو شخص جنت کا شوق رکھتا ہو، شہوت اور خواہشاتِ نفسانی سے دُور رہتا ہے۔ جو شخص جہنم سے ڈرتا ہے، حرام کاموں سے پرہیز کرتا ہے، جو شخص زاہد ہو، وہ نیکی کے کاموں میں سرعت کے ساتھ عمل کرتا ہے۔

اگر غور کیا جائے تو یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ اس ارشادِ گرامی میں حضرت علی علیہ السلام نے صبر واستقامت کے محرکات کو بیان فرمایا ہے۔ ایسی ہی ایک حدیث جنابِ رسولِؐ خدا سے بھی نقل کی گئی ہے۔

صبر واستقامت کے محرکات

اطاعت میں پیش آنے والی مشکلات، ترکِ گناہ اور مصائب پر صبر کے بہت سے محرکات ہو سکتے ہیں جن میں سے ہر ایک کی اپنی مخصوص تاثیر ہے جو انسان کے اندر اس عظیم فضیلت کے پیدا ہونے کا باعث ہوتی ہے۔

ان میں سے چند اہم محرکات یہ ہیں:

1۔ ایمان اور یقین کی بنیادوں کو مضبوط کرنا، خصوصاً اس نکتے پر توجہ رکھنا کہ اللہ تعالیٰ ارحم الراحمین ہے جو ہر ایک سے بڑھ کر اپنے بندوں پر مہربان ہے۔ وہ اپنے بندوں کی بہتری اور ان کی مصلحت کیلئے ان کی زندگی میں حوادث اور مشکلات پیدا کرتا ہے جن کا فائدہ عام طور پر پوشیدہ ہوتا ہے اور انسان کے اندر صبر وشکیبائی کی پرورش کرتا ہے۔ اگر انسان اللہ کے فرمانبردار بندوں، گناہوں سے دوری اختیار کرنے والوں اور مصائب ومشکلات پر صبر کرنے والوں کے اجر وثواب پر توجہ رکھے تو اس سے بھی انسان کے اندر صبر واستقامت کی رُوح مزید پختہ ہوتی ہے۔

اس بات کے پیش نظر امیر المومنینؑ نے فرمایا:

"اَصْلُ الصَّبْرِ حُسْنُ الْیَقِیْنِ بِاللّٰہِ"

''صبر کی بنیاد اللہ تعالیٰ پر حسنِ یقین ہے''۔ (غرر الحکم، حدیث: 3082)

ظاہری بات ہے کہ جس قدر اللہ تعالیٰ کی رحمت اور حکمت پر انسان کا ایمان پختہ ہوگا، اس کا صبر بھی اتنا ہی زیادہ ہوگا۔

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے اس نکتے کے پیش نظر اپنے بعض اصحاب سے فرمایا:

"اِنَّا صُبَّرٌ وَشِیْعَتُنَا اَصْبَرُ مِنَّا"۔

''ہم بڑے حوصلے والے ہیں اور ہمارے شیعہ ہم سے بھی بڑے صبر والے ہیں''۔

امام علیہ السلام نے مزید فرمایا:

"لِاَنَّا نَصْبِرُ عَلٰی مَا نَعْلَمُ وَشِیْعَتُنَا یَصْبِرُوْنَ عَلٰی مَا لَا یَعْلَمُوْنَ"۔

''اس لئے کہ ہم جن باتوں پر صبر کرتے ہیں، ہم ان کے اسرار سے آگاہ ہوتے ہیں جبکہ ہمارے شیعہ جن باتوں پر صبر کرتے ہیں، ان کے اسرار سے آگاہ نہیں ہوتے''۔ (کافی، 2:93)

2۔ دیگر تمام اخلاقی فضائل کی طرح صبر بھی مشق اور مختلف قسم کی مشکلات کا مقابلہ کرنے سے حاصل ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت علیؑ نے ایک حدیث میں ارشاد فرمایا ہے:

"مَنْ تَوَالَتْ عَلَیْہِ نَکَبَاتُ الزَّمَانِ اَکْسَبَتْہُ فَضِیْلَۃُ الصَّبْرِ"۔ (غرر الحکم: 9144)

''جس شخص پر پے در پے حوادث نازل ہوتے ہیں، اسے صبر کی فضیلت حاصل ہوتی ہے''۔

بالفاظِ دیگر جب انسان پر کوئی مصیبت نازل ہوتی ہے تو ابتدأ میں آہ وفغاں اور نالہ وفریاد کرتا ہے۔اسی طرح جب وہ اللہ تعالیٰ کی بندگی اور اطاعت کی طرف آتا ہے تو ابتدأ میں جلدی تھک جاتا ہے لیکن آہستہ آہستہ انسان کے اندر صبر کی فضیلت ایک پختہ عادت بن جاتی ہے۔

3۔ اس بات پر توجہ رکھنا کہ دُنیا حوادث اور مشکلات کا گھر ہے، یہاں کسی بھی مادی اور معنوی نعمت کا حصول رکاوٹوں اور مشکلات کے بغیر ممکن نہیں ہے اور یہ کہ کم ہمت اور صبر وحوصلہ سے محروم افراد اس دُنیا میں کوئی مقام اور کامیابی حاصل نہیں کر سکتے۔اگر انسان ان باتوں کی طرف توجہ رکھے تو لامحالہ اُس کے اندر ایک ایسا عزم وارادہ پیدا ہوجائے گا جو مشکلات وحوادث کا مقابلہ کرنے کیلئے اس کے اندر صبر واستقامت کو مزید مستحکم اور پختہ کردے گا۔

اس دُنیا میں ایک پھول حاصل کرنے کیلئے کانٹوں سے واسطہ پڑتا ہے۔ایک گھونٹ شہد حاصل کرنے کیلئے شہد کی مکھی کے ڈنگ کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے۔قدرتی خزانے نکالنے کیلئے صحراؤں اور پہاڑوں کو کھودنا پڑتا ہے۔اسی طرح جنت کے حصول کے لئے سخت، ناخوشگوار اور کٹھن حالات وواقعات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

اگر کوئی شخص ان باتوں پر غور کرے تو یقیناً اس میں صبر واستقامت حاصل کرنے کی استعداد اور مزید پختہ ہوجائے گی۔اسی لئے حضرت علیؑ ایک حدیث میں فرماتے ہیں:

''لِكُلِّ نِعْمَةٍ مِفْتَاحٌ وَمِغْلَاقٌ وَمِفْتَاحُهَا الصَّبْرُ وَمِغْلَاقُهَا الْكَسَلُ''۔

''ہر نعمت کیلئے ایک تالا اور کنجی ہے۔کنجی صبر اور تالا سستی وکاہلی ہے''۔(شرح نہج البلاغہ، ابن ابی الحدید،322:20)

4۔ صبر کے محرکات وعوامل میں سے ایک یہ بھی ہے کہ انسان صابرین کے ساتھ مشابہت اور مماثلت پیدا کرے۔ یہ مسئلہ تمام اخلاقی فضائل میں مشترک ہے کہ اگر انسان کسی صفت سے آراستہ نہ ہو تو بظاہر ایسا رویہ اختیار کرے گا کہ گویا یہ صفت اس میں موجود ہے۔ایسا کرنے سے بتدریج یہ صفت انسان کے اندر پیدا ہوجائے گی۔جنابِ رسولِؐ خدا کی ایک حدیث میں ہے:

''مَنْ يَّتَصَبَّرْ يُصَبِّرْهُ اللهُ وَمَنْ يَّسْتَعْفِفْ يَعُفَّهُ اللهُ وَمَنْ يَّسْتَغْنِ يُغْنِهِ اللهُ وَمَا أُعْطِيَ عَبْدٌ عَطَاءً هُوَ خَيْرٌ وَاَوْسَعُ مِنَ الصَّبْرِ''۔(میزان الحکمہ، 10128:2)

''جو شخص صابروں جیسی مماثلت بنالے، اللہ تعالیٰ اسکے اندر صبر کی روح پیدا کردیتا ہے، جو شخص پاک دامن افراد کی مماثلت اختیار کرلے، اللہ تعالیٰ اسے پاکدامنی کی زینت عطا فرمادیتا ہے، جو شخص غنی ہونے کا مظاہرہ کرے، اللہ اسے غنی کردیتا ہے اور کسی بھی شخص کو صبر سے زیادہ وسیع کوئی نعمت عطا نہیں ہوئی ہے''۔

5۔ صبر کا انسان کے وجود کے ظرف کے ساتھ براہِ راست تعلق ہے۔جس قدر انسان کا ظرف وسیع ہوگا، اُتنا ہی اس کا صبر زیادہ ہوگا۔یہی وجہ ہے کہ بچوں اور بوڑھوں میں صبر کم ہوتا ہے لیکن جن افراد کا ظرف وسیع ہوتا ہے، وہ حوادث اور مشکلات کے سامنے اپنے ماتھے پر ذرا سی شکن بھی نہیں آنے دیتے۔بڑی شخصیات خصوصاً انبیاؑ اور اولیائے الٰہی، جو صبر کی بدولت اعلیٰ درجات پر فائز ہوئے، ان کے حالاتِ زندگی کا مطالعہ بھی ایک اہم عامل اور محرک کا کردار ادا کرسکتا ہے۔

مشکلات کے سامنے صبر واستقامت دکھانا صرف ایک اخلاقی مسئلہ نہیں ہے بلکہ اس کا انسان کی صحت اور سلامتی کے ساتھ بھی گہرا تعلق ہے۔جن لوگوں میں صبر کی کمی ہوتی ہے، وہ دل اور اعصاب کی بیماریوں کا شکار ہوجاتے ہیں جبکہ صبر کی دولت سے مالا مال افراد صحت وسلامتی کے ساتھ طویل عمر پاتے ہیں۔

ماہرین نفسیات نے مذہب کو انسان کی جسمانی اور نفسیانی صحت کا ایک اہم سبب قرار دیا ہے جس کی وجہ صرف یہ ہے کہ مذہب انسان کو صبر واستقامت کی دولت عطا کرتا ہے۔

ایک حدیث میں حضرت علیؑ فرماتے ہیں:

"مَنْ اَحَبَّ الْبَقَاءَ فَلْيُعِدَّ لِلْمَصَائِبِ قَلْبًا صَبُوْرًا"۔

''جس شخص کو یہ پسند ہو کہ اس کی عمر طویل ہو تو اسے چاہئے کہ مصائب کے مقابلے کیلئے صبر کرنے والا دل پیدا کرے''۔(بحارالانوار، 81:75)

جزع وبیتابی:۔

جزع صبر کی ضد ہے یعنی بے صبری۔اس سے مراد وہ حالت ہے جس میں انسان حوادث اور مشکلات کے سامنے ہمت ہار جاتا ہے، مایوس ہوجاتا ہے، بیتابی کرتا ہے اور اپنے مقاصد کے حصول کیلئے کوشش اور جدوجہد ترک کردیتا ہے۔

جزع بدترین اور مذموم ترین صفت ہے جو دُنیا اور آخرت میں انسان کو ذِلت اور بدبختی سے دوچار کرتی ہے اور انسان کو بلند مقامات تک پہنچنے سے روک دیتی ہے۔اس صفت کی بدولت معاشرے میں انسان کی عزت بھی جاتی رہتی ہے اور اس کی زندگی بھی تلخ ہوجاتی ہے۔

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے اس صفت کے حوالے سے انسان کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:

"اِنَّ الْاِنْسَانَ خُلِقَ هَلُوْعًا ۔ اِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ جَزُوْعًا ۔ وَّاِذَا مَسَّهُ الْخَيْرُ مَنُوْعًا"۔

''انسان تھوڑے دل والا پیدا کیا گیا ہے۔جب اُسے کوئی برائی پیش آتی ہے تو بے صبری کرتا ہے اور جب کوئی خیر اور بھلائی نصیب ہوتی ہے تو سخت بخل سے کام لیتا ہے''(معارج:19 تا 21)

ان آیات میں جن انسانوں کی مذمت کی جارہی ہے، وہ غیر تربیت یافتہ انسان ہیں لیکن جن لوگوں کی ایمان تربیت ہوجاتی

ہے، وہ اس سے مستثنیٰ ہیں۔ لہٰذا آگے چل کر فرمایا گیا:

"اِلَّا الْمُصَلِّيْنَ۔ الَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ دَآئِمُوْنَ۔ وَالَّذِيْنَ فِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ۔ وَالَّذِيْنَ يُصَدِّقُوْنَ بِيَوْمِ الدِّيْنِ۔ وَالَّذِيْنَ هُمْ مِّنْ عَذَابِ رَبِّهِمْ مُّشْفِقُوْنَ۔ اِنَّ عَذَابَ رَبِّهِمْ غَيْرُ مَاْمُوْنٍ۔ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ۔ اِلَّا عَلٰٓى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ۔ فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ۔ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ۔ وَالَّذِيْنَ هُمْ بِشَهٰدٰتِهِمْ قَآئِمُوْنَ۔ وَالَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ۔

''سوائے نماز پڑھنے والوں کے جو اپنی نماز کا التزام رکھتے ہیں اور جن کے مالوں میں مانگنے والے اور نہ مانگنے والے کیلئے ایک حصہ مقرر ہے اور جو لوگ روزِ جزا کی تصدیق کرتے ہیں اور جو لوگ اپنے پروردگار کے عذاب سے ڈرتے رہتے ہیں، بے شک ان کے پروردگار کے عذاب سے بے خوف نہ ہونا چاہئے اور جو لوگ اپنی شرمگاہوں کی اپنی بیویوں اور اپنی لونڈیوں کے سوا اوروں سے حفاظت کرتے ہیں تو ان لوگوں کی ہرگز ملامت نہیں کی جائے گی۔ تو جو ان کے سوا اور کے خواستگار ہوں تو یہی لوگ حد سے بڑھ جانے والے ہیں اور جو لوگ اپنی امانتوں اور اپنے عہد کا لحاظ رکھتے ہیں اور جو لوگ اپنی شہادتوں پر قائم رہتے ہیں اور جو لوگ اپنی نمازوں کا خیال رکھتے ہیں''۔ (معارج: 22 تا 34)

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ وہ باایمان افراد جو نماز کا اہتمام کرتے ہیں، ضرورت مندوں کی مدد کرتے ہیں، اپنی زندگی عفت اور پاکدامنی کے ساتھ گزارتے ہیں، امانتوں کی حفاظت کرتے ہیں اور اپنی گواہیوں پر قائم رہتے ہیں، انہیں ''ھلوع'' کے دائرے سے نکال دیا گیا ہے۔

مندرجہ بالا آیات سے یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ عموماً صبر واستقامت سے محروم لوگ بخیل بھی ہوتے ہیں، جس طرح کہ بخیل، بے صبر بھی ہوتے ہیں۔ بالفاظِ دیگر بخل اور جزع کا ایک دوسرے کے ساتھ گہرا تعلق ہے، اس لئے ان دونوں کو ''ھلوع'' میں جمع کر دیا گیا ہے۔

احادیث میں بھی اس سلسلہ میں قابلِ توجہ اور عمیق مطالب ونکات بیان کئے گئے ہیں۔ نمونے کے طور پر چند احادیث یہاں نقل کی جاتی ہیں:

1۔ حضرت علیؑ نے جزع کی مذمت میں فرمایا:

"اِيَّاكَ وَالْجَزَعَ فَاِنَّهُ يَقْطَعُ الْاَمَلَ وَيُضَعِّفُ الْعَمَلَ وَيُوْرِثُ الْهَمَّ"۔

''جزع اور بے صبری سے پرہیز کرو، اس لئے کہ یہ انسان کی امید کو منقطع کر دیتی ہے، کوشش اور عمل کو ضعیف کر دیتی ہے اور غم واندوہ کا سبب ہوتی ہے''۔ (بحار الانوار، 144:79)

2۔ ایک اور ارشادِ گرامی میں حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

"اَلْجَزَعُ وَاَتْعَبُ مِنَ الصَّبْرِ"۔ (بحار الانوار، 131:79)

''جزع صبر سے زیادہ تکلیف دہ ہے''۔

اس کی وجہ بالکل واضح ہے۔ جزع، بے صبری اور بیتابی کسی بھی مشکل کو حل نہیں کرتی بلکہ انسان کی روح اور جسم کو کچل کر رکھ دیتی ہے۔ اسی وجہ سے اسے صبر سے زیادہ تکلیف دہ قرار دیا گیا ہے مثلاً اگر کسی انسان کا کوئی عزیز فوت ہو جائے اور وہ صبر کی بجائے جزع کی راہ پر چل پڑے، کبھی اپنا سر دیوار سے مارے، گریبان پھاڑ دے، آہ وفغاں کرے یا خودکشی کر لے تو ان سب کاموں میں سے کوئی بھی اس کے فوت شدہ عزیز کو تو زندہ نہیں کر سکتا لیکن اس کی اپنی جسمانی، نفسیاتی اور روحانی صحت ضرور متاثر ہوگی۔ مزید برآں اس کے یہ سارے کام اسے صبر کے اجر وثواب سے بھی محروم کر دیں گے۔ یہ بات اگلی حدیث میں بھی بیان ہوئی ہے۔

3۔ حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

"اَلْجَزَعُ لَا یَدْفَعُ الْقَدَرَ وَلٰکِنْ یُحْبِطُ الْاَجْرَ"۔ (غرر الحکم، حدیث: 1876)

''جزع تقدیر کو تو نہیں ٹال سکتی لیکن انسان کے اجر کو برباد کر دیتی ہے''۔

ظاہر سی بات ہے کہ جزع اور بے صبری اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ جزع کرنے والا انسان اللہ تعالیٰ کے فیصلوں پر راضی نہیں ہے اور اس کی تقدیر کو تسلیم نہیں کر رہا ہے۔ بالفاظِ دیگر وہ اللہ تعالیٰ کے عدل اور اس کی حکمت پر اعتراض کر رہا ہوتا ہے، خواہ خود اسے اس بات کا احساس ہو یا نہ ہو۔

4۔ ایک حدیث میں حضرت امام تقی علیہ السلام فرماتے ہیں:

"اَلْمُصِیْبَةُ لِلصَّابِرِ وَاحِدَةٌ وَلِلْجَازِعِ اَثْنَانِ"۔ (بحار الانوار، 124:79)

''صبر کرنے والے کی ایک مصیبت ہوتی ہے جبکہ جزع کرنے والے کیلئے دو مصیبتیں ہوتی ہیں''۔

جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے کہ جزع اور بے صبری بہت سی جسمانی، نفسیاتی اور رُوحانی تکالیف ساتھ لاتی ہے اور انسان کے اجر وثواب کو بھی برباد کر دیتی ہے۔ اسی طرح جزع کرنے والے افراد کی مصیبت دوگنا ہو جاتی ہے۔

5۔ حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نصائح کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:

"وَلَا تَجْعَلُوْا قُلُوْبَکُمْ مَأْوًی لِلشَّهَوَاتِ اِنَّ اَجْزَعَکُمْ عَلُمْ عِنْدَ الْبَلَاءِ لَا شَدَّکُمْ حُبًّا لِلدُّنْیَا اِنَّ اَصْبَرَ کُمْ عَلَی الْبَلَاءِ لَاَزْهَدُ کُمْ فِی الدُّنْیَا"۔ (بحار، 106:1)

''اپنے دِلوں کوشہوات کی پناہ گاہ میں نہ رکھو۔تم میں سے مصیبتوں پر زیادہ جزع وہی کرتا ہے جو دُنیا سے زیادہ محبت کرتا ہےاورتم میں سے مصیبتوں پر زیادہ صبروہی کرتا ہے جو دُنیا سے زیادہ بے رغبتی برتتا ہے''۔

اس روایت سے یہ بات بخوبی واضح ہوجاتی ہے کہ جزع کا بنیادی سبب حرص اورحُبِ دُنیا ہے۔جزع کوکم کرنے کیلئے ضروری ہے کہ حرص اورحُبِ دُنیا کوکم کیا جائے۔

6۔ ایک حدیث میں حضرت امام جعفرصادق علیہ السلام سے روایت ہے کہ جنابِ رسولِؐ خدانے ملک الموت سے فرمایا:اس کی رُوح پیار سے قبض کرو،اس لئے کہ یہ مومن ہے۔

ملک الموت نے جواب دیا:میں ہرمومن کی روح پیار سے قبض کرتا ہوں۔جب اس کے گھر والے جزع اور بیتابی کرتے ہیں تو میں گھر کے ایک کونے میں کھڑا ہوکر کہتا ہوں۔کیا میں نے اس کی عمر پوری ہونے سے پہلے اس کی رُوح قبض کرلی ہے؟ میں نے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے عائد کی ہوئی ذمہ داری پوری کی ہے،میرا کیا قصور ہے؟(بحارالانوار،169:6)

7۔ حضرت علی علیہ السلام سے مروی ایک مختصرمگر پُرمعنی حدیث میں آیا ہے:

''مَنْ لَمْ يُنْجِهِ الصَّبْرُ اَهْلَكَهُ الْجَزَعُ''۔(بحار الانوار، 96:68)

''جس شخص کوصبرنجات نہ دے، بےصبری اسے ہلاک کردیتی ہے''۔

اس حدیث میں ہلاکت سے مرادُدنیااورآخرت دونوں کی ہلاکت ہوسکتی ہے۔

8۔ ہم اس بحث کوجنابِ رسولِؐ خدا کی اس حدیث پرختم کرتے ہیں جس میں ہے کہ آپؐ کے ایک صحابی کے بیٹے کا انتقال ہوگیا۔جنابِ رسول اللہ ﷺ نے ان کے نام ایک تعزیتی پیغام بھیجا جس میں آپؐ نے لکھوایا:

''اللہ تعالیٰ تمہارے اجر میں اضافہ فرمائے اورتمہیں صبرعطا فرمائیے۔۔۔۔''۔

خبردار! جزع اور بےصبری کے ذریعے اپنے اجرکو برباد نہ کردینا ورنہ قیامت کے دن اس مصیبت پرصبر کرنے کے ثواب سے محرومی پر پشیمان ہوگے۔اس بات کوجان لوکہ جزع اور بیتابی سے تمہارا بیٹا زندہ نہیں ہوجائے گا۔غم واندوہ اللہ کے فیصلوں کو بدل نہیں سکتا۔لیکن یہ باتیں بیٹے کی موت کی مصیبت پرصبر کرنے کے اجرکوضائع کردیں گی''۔(میزان الحکمہ ،1563:2)

محدث قمی نے''سفینۃ البحار''میں''بوذرجمہر''اور''صبروجزع''کے بارے میں ایک واقعہ نقل کیا ہے جوتاریخ کی بعض کتب میں مذکورہوا ہے۔واقعہ یہ ہے کہ ایک بارنوشیرواں کسی بات پر بوذرجمہر سے ناراض ہوگیااوراس کوایک تاریک کمرے میں قید کرنے کا حکم دے دیا۔چندروز کے بعدنوشیرواں نے کسی کواس کا حال معلوم کرنے کیلئے بھیجا۔اس شخص نے بوذرجمہر کوخوشحال اور مطمئن دیکھ کر اس سے پوچھا کہ اس سختی میں اس قدرمطمئن کیونکر ہو؟

بوذر نے جواب دیا کہ میں ہرروز ایک معجون استعمال کرتا ہوں جو چھ چیزوں سے مل کر بنی ہے۔اسی کا نتیجہ ہے کہ میں

خوشحال اور مطمئن ہوں۔

نوشیرواں کے نمائندے نے پوچھا: وہ معجون اور وہ چھ اجزا کیا ہیں؟

بوذرجمہر ے نے جواب دیا:

1۔ اللہ پر توکل

2۔ جو کچھ تقدیر میں ہے، وہ ہو کر رہے گا۔ جزع اور بے صبری کسی مسئلے کو حل نہیں کرتی۔

3۔ صبر اللہ تعالیٰ کی طرف سے آنے والی آزمائشوں میں انسان کا سب سے بڑا مددگار ہے۔

4۔ اگر صبر نہ کروں تو کیا جزع کر کے خود کو ہلاک کر دوں!

5۔ اس وقت میں جس مصیبت میں گرفتار ہوں، اس سے بڑی مصیبت بھی ممکن ہے۔ اللہ کا شکر کہ میں کسی بڑی مصیبت میں گرفتار نہیں ہوں۔

6۔ ساعت بہ ساعت مصیبت سے رہائی ملتی ہے۔

جب اس کی یہ بات نوشرواں تک پہنچی تو اس نے اسے آزاد کر دیا اور اس کا احترام کرنا شروع کر دیا۔

جزع اور بے صبری کا علاج

دوسری بہت سے بیماریوں کی طرح اس باطنی بیماری کے علاج کے بھی مختلف طریقے ہیں۔ ذیل میں ہم ان کی طرف اشارہ کرتے ہیں:

1۔ بیماری کی تشخیص اور بہترین طریقۂ علاج تجویز کرنا:۔

جب ایک روحانی طبیب اس بیماری کی علامات (منہ اور سر پیٹنا، انگلیاں چپانا، آہ وفغاں کرنا، بداخلاقی سے پیش آنا، دوسروں کے ساتھ درشت رویہ رکھنا، بیوی بچوں کے ساتھ برا سلوک کرنا یا کم از کم اپنی زبان سے حالات کا شکوہ کرنا) کی موجودگی سے اس بیماری کی تشخیص کرتا ہے تو اس کا علاج کرنے کیلئے آمادہ ہو جاتا ہے اور مختلف طریقوں سے اس کا علاج کرتا ہے۔

2۔ جزع کے منحوس نتائج کی یاد آوری:۔

جزع اور بتیابی کے برے اور منحوس اثرات ونتائج کی یاد آوری اس رُوحانی بیماری کے علاج میں مؤثر کردار ادا کرتی ہے۔ اس دُنیا میں شاید ہی کوئی ایسا انسان ہو جو جزع و بے صبری کے ان اثرات سے بچنے کا خواہش مند نہ ہو جن کی کچھ تفصیل گزشتہ سطور میں بیان ہو چکی ہے۔ ان اثرات ونتائج کو انسان جس قدر دقتِ نظر سے دیکھے گا، بتدریج صبر کی صفت اس کے اندر

پیدا ہوتی چلی جائے گی۔

3۔صابرین کے اجر کے بارے میں آیات واحادیث کا مطالعہ:۔

انسان کے اندر صبر کی رُوح کو پختہ کرنے اور جزع کی حالت کو دُور کرنے کیلئے ان آیات واحادیث کا مطالعہ بہت گہرا اثر رکھتا ہے جن میں صبر کرنے والوں کے اجر وثواب کا ذکر کیا گیا ہے، خصوصاً یہ آیۂ شریفہ:

"وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ۔ الَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ۔ اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ ۟ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ"۔

''اور بشارت دے دو ان صبر کرنے والوں کو کہ جب ان پر کوئی مصیبت آتی ہے تو وہ کہتے ہیں کہ ہم تو اللہ ہی کیلئے ہیں اور اسی کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں۔ان پر ان کے رب کی طرف سے صلوات اور رحمتیں ہیں اور یہی لوگ ہدایت یافتہ ہیں''۔

اس آیت میں ''اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ'' (یہی لوگ ہدایت یافتہ ہیں) کی مختلف تفاسیر بیان کی گئی ہیں۔ان میں سے ایک تو وہی ہے جو اوپر بیان ہو چکی ہے اور وہ یہ کہ صبر کرنے والے مشکل حالات میں دوسروں کی نسبت جلدی حالات کا صحیح حل تلاش کر لیتے ہیں اور مشکلات سے نکلنے کی راہیں ان پر کھلتی چلی جاتی ہیں۔ جزع اور بے صبری کا اصل سبب ''ضعفِ نفس'' ہے۔انسان جس قدر ضعیف النفس ہوگا، اس قدر جزع اور بے صبری اس میں زیادہ ہوگی۔اسکے برعکس انسان جس قدر اپنی نفسیاتی حالت کو بہتر بنانے کی کوشش کرے گا، اسی قدر جزع و بے صبری کی حالت سے دور ہوتا جائے گا۔

4۔انبیاؑ واولیاؑ کے حالات کا مطالعہ:۔

جزع کی بیماری کا علاج کرنے کا ایک اور طریقہ یہ ہے کہ انسان انبیاؑ واولیاؑ اور بزرگانِ دین کے حالات، خصوصاً مشکلات کے مقابلے میں ان کے صبر واستقامت کے واقعات کا مطالعہ کرے۔ان باتوں کی یاد آوری انسان کے اندر یہ جذبہ پیدا کرتی ہے کہ انسان کو مشکلات کے مقابلہ میں جزع اور بیتابی نہیں کرنی چاہئے۔

5۔تلقین بہ نفس:۔

ہمیں اس نکتے کو فراموش نہیں کرنا چاہئے کہ تلقین، خواہ اپنی طرف سے ہو، خواہ دوسروں کی طرف سے، نفس انسانی سے ناپسندیدہ صفات کا خاتمہ کرنے میں موثر کردار ادا کرتی ہے۔اگر صبر واستقامت سے محروم افراد ہر روز اپنے آپ کو صبر کی تلقین کریں اور ان کے اردگرد رہنے والے افراد بھی تلقین صبر میں کوتاہی نہ کریں تو یقیناً ان میں صبر کے آثار ظاہر ہونے لگیں گے۔

ہم اب بحث کو حضرت امام زین العابدینؑ کی ایک دعا پر ختم کرتے ہیں:

"اَللّٰهُمَّ اجْعَلْ اَوَّلَ يَوْمِيْ هٰذَا صَلَاحًا وَاَوْسَطَهُ فَلَاحًا وَآخِرَهُ نَجَاحًا اَعُوْذُبِكَ مِنْ يَوْمٍ اَوَّلَهُ فَزَعٌ وَاَوْسَطُهُ جَزَعٌ وَآخِرُهُ وَجَعٌ"۔

''یا اللہ! میرے اس دن کے آغاز کو صلاح، درمیان کو فلاح اور آخر کو کامیابی قرار دے۔ میں اس دن سے تیری پناہ مانگتا ہوں جس کا آغاز فرع (بیتابی)، درمیان جزع اور آخر رنج والم ہو۔''

اس دعا سے یہ بات بھی واضح ہوجاتی ہے کہ جزع وفزع کا نتیجہ رنج والم ہوتا ہے۔

جزع اور معقول جذبات کے درمیان فرق

انسان کا دل جذبات اور احساسات کا مرکز ہے۔ اگر انسان کے کسی عزیز کی موت واقع ہوجائے تو اسے دکھ ہوتا ہے اور اشک اس کی آنکھوں سے جاری ہوجاتے ہیں۔ لیکن ان جذبات کا اظہار جزع وفزع سے بالکل مختلف چیز ہے۔ انسان کا دل مختلف حالات وواقعات سے متاثر ہوتا ہے اور چونکہ انسان کی آنکھ اس کے دل کا دریچہ ہے، لہٰذا عین ممکن ہے کہ آنکھ قلبی کیفیات سے متاثر ہوجائے۔

بنابرایں کسی عزیز کی موت پر رونا یا غمگین ہونا ایک قدرتی سی بات ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ ایسے حالات میں انسان کی زبان سے ایسی کوئی بات نہ نکلے جو ناشکری اور شکوہ کی غمازی کرتی ہو۔ انسان کی زبان پر ایسی کوئی بات نہیں آنی چاہئے جو ایک فرمانبردار بندے کے شایانِ شان نہیں ہے۔ گریبان چاک کرنے اور منہ سر پیٹنے سے اجتناب کرے۔ اس سلسلہ میں جناب رسولؐ خدا فرماتے ہیں:

"لَيْسَ مِنَّا مَنْ ضَرَبَ الْخُدُوْدَ وَشَقَّ الْجُيُوْبَ وَدَعَا بِدَعْوَى الْجَاهِلِيَّةِ"۔

''جو شخص اپنے گالوں پر طمانچے مارے، گریبان چاک کرے یا زمانہ جاہلیت کی باتیں زبان پر لائے، وہ ہم سے نہیں ہے''۔ (امالی الطوسی:388)

جنابِ رسولِ خدا کے حالاتِ زندگی میں ہے کہ جب آپؐ کے صاحبزادے حضرت ابراہیم کا انتقال ہوا تو آپؐ اس طرح روئے کہ اشکوں کا ایک سیلاب آپؐ کی آنکھوں سے نکل کر آپؐ کے سینے پر بہنے لگا۔ صحابہ نے عرض کیا: یارسولؐ اللہ! آپ ہمیں رونے سے منع فرماتے ہیں لیکن خود رو رہے ہیں؟''

آپؐ نے فرمایا:

"لَيْسَ هٰذَا بُكَاءً وَاِنَّ هٰذِهٖ رَحْمَةٌ وَمَنْ لَمْ يَرْحَمْ لَا يُرْحَمُ"۔

''یہ رونا نہیں ہے، یہ محبت اور رحمت کا اظہار ہے۔ جو رحم نہیں کرتا، اس پر رحم نہیں کیا جاتا''۔

یہی واقعہ بحار الانوار میں قدرے تفصیل کے ساتھ اس طرح بیان ہوا ہے:

''جب جنابِ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صاحبزادے حضرت ابراہیم کی آخری سانسیں چل رہی تھیں، حضورؐ نے انہیں اپنی گود میں لیا اور کہنے لگے: اے میرے بیٹے! اللہ کی تقدیر کے سامنے میں تیرے لئے کچھ نہیں کر سکتا'۔

یہ کہتے ہی آپؐ کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ عبدالرحمٰن ابن عوف وہاں موجود تھے۔ انہوں نے کہا: یارسول اللہ! آپؐ رو رہے ہیں؟ کیا آپؐ نے ہمیں رونے سے منع نہیں فرمایا؟

آنحضرتؐ نے جواب میں فرمایا: ''میں نے تمہیں زمانہ جاہلیت کی نوحہ گری اور دو احمقانہ اور جاخرانہ آوازوں سے منع کیا ہے: ایک نعمت کے وقت لہو ولعب اور شیطانی دُھنوں سے آراستہ آواز اور دوسری مصیبت کے وقت منہ نوچنا، گریبان چاک کرنا اور شیطانی نغمے۔ لیکن جو کچھ تم نے مجھ سے دیکھا ہے، وہ جذبہ اور محبت ہے۔ جو شخص جذبات نہ رکھتا ہو اور رحم نہ کرتا ہو، اس پر بھی رحم نہیں کیا جاتا''۔

پھر آپؐ نے اپنے صاحبزادے جنابِ ابراہیم کو مخاطب کر کے فرمایا:

"وَاِنَّابِكَ لَمَحْزُوْنُوْنَ تَبْكِي الْعَيْنُ وَيَدْمَعُ الْقَلْبُ وَلَا نَقُوْلُ مَا يُسْخِطُ الرَّبَّ عَزَّوَجَلَّ"۔

''ہم تمہاری وجہ سے غمگین ہیں، آنکھ رو رہی ہے اور دل اشک بہا رہا ہے لیکن ہم کوئی ایسی بات نہیں کرتے جو اللہ تعالیٰ کو ناراض کر دے''۔ (بحار الانوار، 90:79)

بعض اوقات ممکن ہے کہ انسان آپے سے باہر ہو جائے، چیخے اور گریبان چاک کر دے یا یہ کہ اظہارِ بیتابی کرے اور پیٹنے لگے۔ اگر یہ سب کچھ ایک معقول حد کے اندر ہو اور اس کا مقصد دشمن کے خلاف قوم کے جذبات کو متحرک کرنا ہو تو یہ ضروری بھی ہو سکتا ہے۔ لہٰذا استثنائی حالات کو، جو بعض بزرگوں کے حالات میں نظر آتے ہیں، ان کو عام ضابطے سے مستثنیٰ سمجھنا چاہئے۔ ہم اس بحث کو جنابِ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اس حدیث پر ختم کرتے ہیں:

"اَلنِّيَاحَةُ عَمَلُ الْجَاهِلِيَّةُ"۔ (بحار الانوار، 130:79)

''نوحہ گری زمانہ جاہلیت کا عمل ہے''۔

یہاں نوحہ گری سے عزاداری، ذکرِ مصائب، رونا اور انفرادی یا اجتماعی عزاداری نہیں ہے بلکہ ان اعمال کی طرف اشارہ ہے جو زمانہ جاہلیت میں عربوں میں رائج تھے۔ اگر ان کا کوئی عزیز مرجاتا تو پیشہ ور رونے والیوں کو بلایا جاتا تھا جو مصنوعی آہ وفغاں کے ساتھ مرنے والے کی ان خوبیوں کا مبالغہ آرائی کے ساتھ ذکر کرتی تھیں جو اس میں سرے سے پائی ہی نہیں جاتی تھیں۔ کبھی وہ اپنا گریبان چاک کر دیتی تھیں اور منہ اور سر پیٹتی تھیں اور ان بیہودہ اعمال سے سوگ کی محفل کی رونق میں اضافہ کرتی تھیں۔